ے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا   اقبال

ہندستانی ادب

ت ولا ۔ ۱۷-۱۱-۱۶ ۔ سلیم نگر کالونی ۔ ۱ ۔ ملک پیٹ ۔ حیدرآباد ۳۶ ۔ آندھرا پردیش ۔ انڈیا۔

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان

ام۔اے (عثمانیہ)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالا
رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱٦) ۵ جلد (۳۵) نمبر (۱-۲-۳)
آذر - دے - بہمن سنہ ۱۳۸۴ ف اکتوبر - نومبر - دسمبر سنہ ۱۹۷۴ء
چندا سالانا بارا روپے

35742

ہندستانی ادب

سعادت ولا - ۱٦-۱۱-۱۷ اسلیم نگر کالونی ۱ - ملک پیٹ - آندھرا پردیش - انڈیا -

ایڈیٹر
جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

جی - ام - خان نے دائرہ پریس - چھتا بازار - حیدرآباد ۲ میں چھپوا کر
سعادت ولا - ۱۶ - ۱۱ - ۷ اسلیم نگر کالونی - ۱ - ملک پیٹ حیدرآباد ۳۶ سے شایع کیا -

ہمارے خیالات

"ہندستانی ادب" پینتیس (۳۵) ویں سال میں

ایک علمی ادبی رسالے کے لیے (۳۵) سال کی مدت بہت زیادا ہے، خصوصاً "ہندستانی ادب" جیسے رسالے کے لیے، جس کی عام خریداری کا دائرا صفر کے برابر ہے - یہ رسالا حیدرآباد کے ایک سرکاری ادارے کے دوسو (۲۰۰) لائبریریوں یا ریڈنگ روموں کے لیے خریدا جاتا ہے، اور نئی دلی کی ایک ایجنسی (۱۲) کاپی خریدتی ہے - ہم نے حیدرآباد کے جس سرکاری ادارے کا ذکر کیا ہے، یہ ادارا مسلسل بیس (۲۰) سال سے "ہندستانی ادب" اپنے دارچنا یا ریڈنگ روموں کے لیے خریدتا ہے - ابتدا میں صرف (۴۰) پرچے خریدے جاتے تھے - اس کے بعد ہماری کوششوں سے یہ تعداد بچاس (۵۰) ہوگئی - پھر ہم نے کوشش کی تو تعداد ایک سو بچاس (۱۵۰) تک پہنچ گئی - ہماری آخری کوشش کا نتیجا دوسو (۲۰۰) کی تعداد میں نکلا - اس تعداد خریداری کے لیے ہر سال بھاگ دوڑ اور کوشش کرنی پڑتی ہے - خریداری کی تجدید کے لیے ہر سال درخاست دینی پڑتی ہے، اور اس سلسلے میں کافی سے زیادا بھاگ دوڑ اور کوشش کرنی پڑتی ہے - اصل میں "تقدیر" اور "تدبیر" کی کشاکش اور جنگ سے دوچار ہوجاتے ہیں، اور چونکے ہم تہمل اور بے معنی لفظ "تقدیر" کے قایل نہیں ہیں، اس لیے "تدبیر" پر "تدبیر" کیے جاتے ہیں، اور آخر میں "تدبیر" کا بول بالا ہوتا ہے، اور اس کی فتح بھی ہوتی ہے، چنانچے پچھلے سال بھی یہی ہوا، اور ہماری مسلسل "تدبیری" کوششوں سے اس سال کے لیے دوسو (۲۰۰) کی منظوری ملی، مگر ہم کہہ نہیں سکتے کہ آیندا سال کیا ہو؟

ہم اصول اور انصاف کے نقطۂ نظر سے موجودا اسپیشل افسر صاحب بلدیا یا میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد سے نیز میونسپل کارپوریشن بورڈ کے چیرمن، اور اس بورڈ کے تمام ممبروں یا ارکان سے پرزور طریقے پر اپیل اور درخاست کرتے ہیں کہ "ہندستانی ادب" کی (۳۵) سالا مسلسل انتھک، اور بلا وقفا علمی ادبی - سوشل - کلچرل اور سب سے بڑھ کر قومی یا نیشنل خدمات کے صلے میں، اور چونکے عددا بیس (۲۰) سال سے زیادا عرصے سے یہ رسالا بلدیا یا میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد کے دارچنا لوں یا ریڈنگ روموں کے لیے بلا وقفا ہر سال خریدا جا رہا ہے، اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ "ہندستانی ادب" کی سالانا رقم دوہزار چارسو (۲،۴۰۰) روپے بلدیا کے سالانا بجٹ میں شریک کرکے اس رسالے کی خریدی کو دوامیت یا ہمیشگی کی شکل دیدی جائے، تاکے ہمیں آیندا سے ہر سال درخاست دینی نہ پڑے - بلدیا کے کئی کروڑ روپے کے موازنے میں (۲،۴۰۰) روپے کی رقم ایک تنکے کے برابر نہیں ہے - اگر اسپیشل افسر صاحب، اور چیرمن میونسپل اڈوائیزری بورڈ، اور ممبر صاحبان بورڈ ذرا وسیع نظری سے کام لیتے ہوے ہماری واجبی، مناسب اور معقولیت پر مبنی اپیل اور درخاست کو شرف قبولیت بخشیں تو ہم ان تمام حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکریا ادا کرینگے!

اس سلسلے میں انہیں حضرات کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کاغذ کی بے پناہ گرانی کے باعث تمام روزانا اخبارات اور ہفتا وار، اور ماہوار رسالوں وغیرا نے اپنا اپنا سالانا چندا بڑھا دیا، صرف "ہندستانی ادب" ہی ایک ایسا ماہوار رسالا ہے، جس نے اپنا سالانا چندا نہیں بڑھایا - اس وقت اس رسالے کا سالانا چندا بارا روپے ہے، اور یہ چندا تقریباً دس بارا سال سے قایم ہے ہم نے سالانا چندے میں اس لیے اضافا نہیں کیا کہ اس معمولی چندے ہی پر عام خریدار نہیں بن رہے ہیں تو سالانا چندا بڑھا کر کیا کریں، یعنی چندے کی زیادتی کی وجہ سے اس وقت ایک بھی خریدار نہ بنے گا - ہم طلب منفعت کے قایل نہیں ہیں، ہم رسالے سے کوئی مالی فائیدا حاصل کرنا نہیں چاہتے ہیں، ہم صرف اور صرف یہ چاہتے ہیں کہ کم چندے ہیں دو چارسو مستقل خریداروں کی طمانیت حاصل ہو جائے تو ہم اطمینان اور سکون کے ساتھ "ہندستانی ادب" کو جاری رکھتے ہوے اسے "ہندستانی ادب" کا ترجمان بنا کر [illegible]

پورا کر سکینگے !

کاغذ کی بے پناہ اور عقل کو حیران کر دینے والی گرانی صرف حیدرآباد کی حد تک نہیں ہے، بلکے ہندستان گیر ہے۔ نیوز پرنٹ پر حکومت کا کنٹرول ہے، اور اسی وجہ سے یہ کاغذ چور بازار سے یا BLACK MARKET میں بہت زیادہ ملتا ہے۔ ہم خود چور بازاری یا چور بازار کے قطعی قایل نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود ہمیں رسالے کے ہر نمبر کے لیے نیوز پرنٹ کاغذ چور بازار سے کاغذ بے پناہ بڑھی قیمت کے ساتھ خریدنے پر مجبور ہیں۔ نیوز کے قیمتوں میں اضافے کی ایک مثال ہم آپکے سامنے پیش کیے دیتے ہیں۔ ہم اس رسالے کے ایک نمبر کے لیے دو ریم نیوز پرنٹ کاغذ خریدنے بازار گئے اور (۲۸) روپے فی ریم کاغذ خریدا۔ تین مہینے بعد ہم نے وہی کاغذ (۴۸) روپے فی ریم خریدا، اور تین مہینے بعد وہی کاغذ ہم نے (۶۰) روپے ریم خریدا، اور تین مہینے بعد وہی کاغذ ہم نے (۷۰) روپے ریم سے خریدا، اور اب یہ نرخ (۶۰) یا (۶۵) یا (۷۰) روپے فی ریم قایم ہوگیا ہے، چونکہ یہ کاغذ چور بازار میں ملتا ہے، اس لیے ہر کاغذ فروش کی دکان سے نہیں ملتا، بلکے وہ دکاندار جو دوسرے اخباروں یا ہفتہ واروں وغیرا کے کوٹے کا کاغذ حاصل رہتے ہیں، صرف انہیں کے پاس ملتا ہے۔ یہ دکاندار حقیقت میں فرعون بے سامان بن گئے ہیں، وہ خریدار سے نرخ جوڑ کر بات تک نہیں کرتے ہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ خریدار نیوز پرنٹ خریدنے پر مجبور ہے، اس لیے جوک مار کر پھر سے ہماری ہی دکان پر آئے گا، اور کاغذ لازمی طور پر خریدے گا، اور یہ بالکل سچ ہے کہ ہم جیسے خریدار مجبور ہوکر اسی دکان پر جاتے اور اس کی منھ مانگی قیمت دے کر نیوز پرنٹ خریدتے ہیں۔ نہ خریدیں تو کیا کریں، بغیر کاغذ کے رسالا کیسے چھپے اور رسالا نہ چھپے تو بلدیا میں کیسے داخل کریں، اگر بلدیا میں ہر نمبر بل کے ساتھ نہ داخل کریں تو ہر سہ ماہی پر ہمیں رقم کہاں سے ملے گی، اگر ہر تین مہینے رقم نہ ملے تو ہمارا سارا کاروبار ہی چوپٹ ہو جائے، اور کاروبار چوپٹ ہونے کے معنی ہوے اپنا عزیز ترین دیرینا اور قدیم ساتھی "ہندستانی ادب" بند کر دینا پڑے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ رسالے کو کسی بھی قیمت پر بند نہیں کرنا چاہتے، اس لیے کاغذ کی بے پناہ گرانی کے باوجود ہم نقصان کے ساتھ ہی رسالے کو برابر چلائے جا رہے ہیں۔ اس رسالے کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ (۳۵) سال کی طویل ترین مدت میں اس کا ایک نمبر بھی ناغا نہیں ہوا۔ یہ رسالا ابتدا میں (۴۶) صفحے کا تھا، اور اس وقت نارویے اور سویڈن وغیرا کے چکنے کاغذ پر شیٹ کا ایک ریم کاغذ حیدرآباد کے سات یا ساڑھے سات روپے والی روپے میں ایک ریم ملتا تھا، اور سستا آپ نے (۴۶) صفحے کے سالانا بارا نمبر کا چندا کیا تھا، صرف چار روپے۔ اس کے بعد اس رسالے کا چندا پانچ روپے ہوگیا۔ یہ چندا ایک طویل عرصے تک چلتا رہا۔ اس کے بعد ہم نے چندے میں ایک اور روپے کا اضافا کیا، اور سالانا چندا چھ روپے رہا۔ اس کے بعد ہم نے دو روپے کا اضافا کیا، اور سالانا چندا آٹھ روپے ہوگیا، آخر میں ہم نے ایک دم چار روپے کا اضافا کیا اور چندا بارا روپے ہوگیا، جو تقریبا بارا سال سے قایم ہے، حالانکے اس طویل عرصے میں کاغذ کی قیمتوں میں بے پناہ طریقے پر اضافا ہوگیا، مگر ہم نے چندے میں مزید اضافا گوارا نہ کیا۔ اس سے ہمارا مقصد ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ ہم یہ چاہتے اس کم یا قلیل چندے کے ساتھ خریداروں کی تعداد میں اضافا ہو جائے تو یہی چیز ہمارے لیے طمانیت، سکون اور اطمینان کا باعث ہوگی! آمدم برسر مطلب یہ کہ ہم اصل میں یہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے رسالے کی (۳۵) سالا طویل مدت میں اس کا ایک نمبر بھی ناغا نہیں ہونے دیا، مثلاً جب رسالا (۴۶) صفحے پر نکلتا تھا اور اتفاق سے اگر کسی مہینے نہ نکلا ہو تو دوسرے مہینے میں دو مہینے کے (۱۲۸) صفحے دیے، یہ نہیں کیا کہ صرف (۴۶) صفحے پر دو مہینے نکالدیے۔ اس کے بعد رسالا (۴۸) صفحے پر نکلنے لگا، اس وقت بھی ہم نے یہی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد (۴۰) صفحے پر نکلتا تھا، اس وقت بھی یہی صورت کار فرما رہی، آخر میں ہم نے (۳۲) صفحے کا کر دیا، جو آج تک قایم ہے۔ (۳۲) صفحے کے دور میں بھی ہم نے دو مہینے میں (۶۴) صفحے دیے، اور تین مہینے میں برابر (۹۶) صفحے دیے، اور ہر تین مہینے میں ایک بار اس وقت ایک سو صفحے کا نمبر آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، یہ چار صفحے ہم نے اس رسالے کی (۳۱) ویں سالگرہ کے موقع پر بڑھائے تھے، اور وہ چار صفحے قایم ہوگئے اور ہر تین مہینے کے نمبر کا مستقل جز بن گئے ہیں، حالانکے ان چار صفحوں کے اضافے سے بھی ہمیں لکھائی، چھپائی اور کاغذ کی خریدی کا مزید نقصان ہوتا ہے، لیکن ایک (۱۰۰) صفحے کے نمبر کے پیش نظر ہمیں یہ مزید نقصان بھی گوارا ہے!

اس نوبت پر ہمیں سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے نے ہمیں، ہماری مسلسل، اور انتھک، اور بلا رکاوٹ علمی ادبی، سوشل، کلچرل اور قومی یا نیشنل خدمات کا کوئی صلا نہیں دیا، ظالم زمانے نے ہمارے جادو نگار، سحر آفریں، اور لاجواب، بے نظیر اور بے مثال تکملی صلاحیتوں کی کوئی قدر نہ کی۔ ہماری ... [illegible] ... اور ... صلاحیتوں کا ... دعوا "اف نت"

یا EGOISM کی حد تک پہنچتا ہے، مگر حقیقت حال یہ ہے کہ ہمارا یہ دعوا بلکل صحی اور سو فیصد حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے، جس کا ثبوت ہم نے اداریوں میں، اپنے نوٹس میں، اور اپنے ترجموں میں، نیز خد اپنے اصلی مضامین میں دیا ہے - ہم اب بھی پوری قوت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارا قلم جب چلنے لگتا ہے تو ریس میں اول آنے والے گھوڑے کی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتا ہے، اور ہماری دماغی صلاحیتوں کا یہ عالم ہے کہ کسی مضمون وغیرا پر نوٹ لکھتے ہوے ہم بیسیوں مثالیں پیش کرنے کے بعد قاری کو بھول بھلیوں میں مبتلا کرتے ہوے پھر سے اپنے اصل مرکز پر آ جاتے ہیں - آپ یقین جانیے کہ یہ غیر معمولی دماغی صلاحیت "ہر کس و ناکس" میں نہیں ہوتی - ہماری انہیں غیر معمولی قابل تعریف صلاحیتوں کا خون ہوا جا رہا ہے، اس لیے کہ ان کا کوئی بھی قدر داں نہیں ہے - اس وقت ہم اپنی عمر کے (۷۲) ویں سال میں ہیں - ہماری صحت کا ناس ہو چکا ہے، آخر کیا ہے ؟ اگر مرکزی حکومت یا اسٹیٹ گورنمنٹ یا کوئی اور مستند ادارا ہمارے رسالے کی یا ہماری مالی مدد کرتا تو ہرگز ہرگز ہماری صحت کا ناس نہ ہوتا - غیر معمولی آمدنی کے باعث ہم اپنی ذات پر خرچ کرتے، جس کے سبب ہماری صحت گرنے نہ پاتی - ہماری صحت اس حد تک خراب ہو گئی ہے کہ ہم بلا مبالغا چراغ سحری بنے ہوے ہیں - ہماری زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے، نہ معلوم کس آن ایک ہلکے سے جھونکے میں بجھے - یہی چیز ہمارے لیے سوہان روح بنی ہوئی ہے کہ اگر زمانا ہماری قدر کرتا، اور کسی نہ کسی طرح ہماری اور رسالے کی مالی امداد ہوتی تو ہم اس قدر جلد اس دار فانی سے کوچ نہ کرتے، بلکے کچھ اور عرصے تک زندہ رہتے اور "ہندستانی" زبان اور ادب کے مشن کو پورا کرتے، موجودا ناگوار اور تلخ و ترش حالات نے ہمیں بلکل ہی مایوس کر دیا ہے، اس لیے ہم اپنے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے بلکل ہی قاصر اور مجبور ہیں -

اپنی انہیں مالی مجبوریوں کے سبب ہم اپنی تصانیف کو کتابی شکل میں چھپوا نہ سکے - ہم نے کئی ایک ڈرامے لکھے ہیں، جو اسٹیج اور اسکرین کے قابل ہیں - ہمارے ان ڈراموں کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی، ہم نے جس طرح سے لکھے تھے، جوں کے توں رکھے ہیں - اب ہم ان ڈراموں کو کتابی شکل دینا چاہتے ہیں - اس کے علاوا ہمارے اپنے مضامین "مضامین جی - ایم - خان" کے نام سے ایک اچھا خاصا مجموعا چھپ سکتا ہے - ہم نے سنہ ۱۹۳۵ء میں اپنے ایم - اے کے امتحان کے سلسلے میں دلی کے صوفی شاعر خواجہ میر درد پر مقالا یا THESIS لکھا تھا - یہ مقالا ہم نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی نگرانی میں لکھا تھا - ایم - اے کے مقالے کے سلسلے میں ہر طالب علم کا ایک نگران یا GUIDE ہوا کرتا تھا، اور ہم نے صدر شعبۂ اردو، مولوی عبدالحق کو اپنا GUIDE بنایا تھا، چنانچے ہمارا پورا مقالا انہیں کی نگرانی میں لکھا گیا تھا، اس لحاظ سے ہمارے مقالے کی اہمیت ظاہر ہے، اسی وجہ سے اب ہم اس (۳۹) سالا یادگار مقالے کو کتابی شکل میں چھاپنا چاہتے ہیں - اس کے علاوا ناول "شہزادی کا رومان" بھی کتابی شکل میں چھاپنے کا ارادا ہے - "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والے بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ یہ ناول مسلسل نو قسطوں میں چھپا ہے - اس نمبر میں اس ناول کی نویں یا آخری قسط چھپی ہے - اس ناول کی پہلی قسط اکتوبر - نومبر - دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء کے "راز دار خان بزرگ نمبر" میں دی گئی تھی، اسی وقت ہمارا خیال تھا کہ رسالے کی تعداد چھپنے کے بعد ہم کتابت کے لیے چار یا پانسو (۵۰۰) کاپیاں چھپوانا چاہتے، اس شکل میں، اس وقت دوبارا لکھائی کے خرچ سے ہم بچ جاتے تھے، مگر ہاتھ میں مزید کاغذ کی خریدی کے لیے پیسا نہ تھا، اس لیے مجبورًا اس ارادے کو ترک کر دینا پڑا - اب موجودا شکل میں لکھائی چھپائی کا بار دوبارا برداشت کرنا پڑے گا - یہ ایک تاریخی یادگار ناول ہے، اس لیے ہم یہ تمام اخراجات برداشت کرتے ہوے اس اہم اور دل چسپ ناول کو ضرور بضرور کتابی شکل میں چھپوا دیں گے - اس ناول کے کتابی شکل میں چھپنے کے بعد اس کو ہم اسکرین پلے کی شکل دینا چاہتے ہیں - اس کی فلم بڑی ہی دل چسپ اور یادگار رہے گی، اور جو شخص کہ اس کی فلم بنائے گا فائدے میں رہے گا -

"شہزادی کا رومان"

"شہزادی کا رومان" نام خد ہم نے دیا ہے - اس ناول کا

اصلی نام "روماٹس آف اے زنانا" - ROMANCE OF A ZENANA تھا - یہ ناول آرنلڈ - جی - فرنانڈز - ARNOLD G - FERNANDEZ نے لکھا تھا - پانسو (۵۰۰) صفحے کا یہ انگریزی ناول ۱۹۰۰ء میں HOE & CO مدراس میں چھپا تھا - ہم انگریزی کتابوں اور خصوصاً انگریزی ناولوں کا مطالعہ بہت زیادہ کیا کرتے تھے، چنانچہ یہ ناول بھی ہماری نظر سے گذرا۔ پورا ناول ہم نے پڑھ ڈالا اور ناول کو بہت ہی دلچسپ بھی پایا، اور چونکہ یہ ناول حیدرآباد کے ایک امیر کبیر نواب آسمان جاہ بہادر، امیر کبیر پائیگاہ، اور وزیر اعظم حیدرآباد کی لڑکی رحیم النساء سے متعلق تھا، اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ اس کا ترجمہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ شروع کیا، اور قسط وار "ہندستانی ادب" کے ہر نمبر میں دیتے رہے - نویں اور آخری قسط کا ترجمہ ابھی باقی تھا کہ ایسے میں اپنے مکان میں ایک زبردست [illegible] حادثہ پیش آیا، ہمارا پیر پھسل گیا اور ہم [illegible] چنانچہ [illegible] کا [illegible] کھا گیا [illegible] طرح سے [illegible] گیا، [illegible] ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ گھر والوں نے ہمیں اٹھا کر آرام کرسی پر لٹا دیا، اور ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ عثمانیہ ہسپتال میں [illegible] کروا دیا جائے۔ ہم نے [illegible] اس کی مخالفت کی، اور یہ کہا کہ عثمانیہ دواخانے میں [illegible] سرجری کا عمل ہوگا، [illegible] ہمارا پیر [illegible] ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر ہو [illegible] اور [illegible] ان سے ہمیں نجات نہ ملے گی، [illegible] ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ اسی وقت [illegible] سید صاحب جراح کو بلواؤ، اور ان سے کہا کہ [illegible] کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، اس لیے آپ فوراً ہمارے ساتھ چلے چلیں۔ سید صاحب ہمارے جانتے پہچانتے تھے۔ ان کے باپ [illegible] نے (۱۹) سال پہلے ہمارا علاج کیا تھا، اس وقت [illegible] ہمارے اسی پیر کا گھٹنا بری طرح سے سرک گیا تھا۔ چالیس روز تک ہم زیر علاج رہے تھے، اور بعد میں وہ گھٹنا بالکل ٹھیک ہوگیا۔ خود ہمارا یہ تجربہ تھا۔ وہ سید صاحب ماہر مشہور جراح تھے، وہ مرحوم ہو گئے اور موجودہ سید صاحب جراح ان کے بیٹے [illegible] فن میں باپ سے کچھ کم نہیں ہیں۔ چونکہ ہم ان سے واقف ہیں، اسی لیے انہیں بلوایا، اور وہ فوراً ہمارے گھر چلے آئے، اور مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ ایک دن آڑ آیا کرتے ہیں، اور پٹی کھول کر مالش بھی کرتے ہیں، اور تازہ مرہم بھی لگایا کرتے ہیں۔ ہم چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہیں، بستر ہی پر لیٹے رہتے ہیں۔ ہمیں کھانا وغیرہ بھی بستر پر بیٹھے بیٹھے کھلایا جاتا ہے، روزانہ ہمیں منہ بھی بستر ہی پر دھلایا جاتا ہے۔ جب کبھی ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے تو دو تین آدمی ہمیں اٹھا کر پاخانے میں لے جا کر بٹھا دیتے ہیں، اور ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد پھر اسی طرح سے اٹھا کر لے آتے اور بستر پر بٹھا یا لٹا دیتے ہیں۔ پیشاب تو ہم بستر پر بیٹھے بیٹھے قارورے کے بڑے شیشے میں کیے دیتے ہیں، ملازم سے جا کر شیشا خالی کرنے کے بعد پانی سے دھو کر پھر سے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ہم نے یہ کہنا بھلا دیا کہ جس وقت حادثہ پیش آیا تھا، ہم گر پڑے اور ہمارا پیر سرک گیا اور ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی تو تکلیف کی وجہ سے ہم نے رونا شروع کر دیا تھا، چیخنا چلانا، اور ہمارا آہ و بکا کا یہ عالم تھا کہ اس سے آسمان پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے بعد جب جراح سید صاحب نے سرکے ہوئے ٹخنے کو اپنی جگہ بٹھانے کے لیے ہمارا پیر کھینچا ہے تو اس وقت بھی ہماری آہ و زاری کا وہی عالم تھا، جو حادثے کے وقت ہم نے بیان کیا ہے۔ اس تمام تفصیل کے بیان کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ [illegible] بدترین تکالیف کے باوجود ہم نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی، بلکہ بستر علالت پر بیٹھے بیٹھے اس اہم اور دلچسپ ناول "شہزادی کا رومان" کی نویں اور آخری قسط کا ترجمہ کر ڈالا۔ ہمیں اس وقت بھی چین آرام اور سکون اور اطمینان نہیں ہے کہ پیر ابھی درد [illegible] ہے۔ بستر پر بیٹھ کر کام کرنے یا لکھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن اس تکلیف کو ہم نے گوارا کر لیا، اور اگر تن آسانی سے کام لے کر ترجمہ نہ کرتے تو نویں اور آخری قسط اس نمبر میں نہ دی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کے نمبر میں پیش کی جاتی، اس طرح سے ناول کی قسط میں وقفہ پیدا ہو جاتا، اور یہ وقفہ ایک ناگوار سی شکل ہے، اسی لیے اس ناگوار سی شکل کو دور کرنے کے لیے ہم نے کمر ہمت باندھی، اور تکلیف کی حالت میں بستر پر بیٹھے بیٹھے اسی ناول کی آخری قسط کا ترجمہ کر ڈالا، جو اس نمبر میں آپ کی خدمت میں پیش ہے — ناول

"شہزادی کے رومان" کے ترجمے میں ہم نے ایک جان سی پھیر دی ہے - اصل ناول انگریزی میں بلکل روکھا پھیکا سا ہے - فرنانڈز رحیم النسا کے معاشقے سے واقف ہوگیا تھا، اس لیے اس نے اس واقعے کو ناول کی شکل میں لکھ ڈالا - اس نے اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ نواب آسمان جاہ کون ہیں اور کیا ہیں، حیدر آباد میں ان کا مقام کیا ہے، اور ان کی حیثیت کیا ہے ؟ اس نے یہ تک خیال نہیں کیا کہ جب کوتوال شہر اور دوسرے عہدے داران حیدر آباد آسمان جاہ سے ملنے آتے ہیں تو وہ آسمان جاہ کو کس طرح سے مخاطب کرتے ہیں، اور آسمان جاہ انہیں کس طرح سے مخاطب کرتے ہیں - ہم نے ترجمہ کرتے وقت خاص طور پر اس بات کا لحاظ کیا ہے - اس طرح سے کوتوال شہر اور دوسرے عہدے داروں کے نام ہم نے گنائے ہیں -

فرنانڈز نے مجسٹریٹ کو پلیگ کا شکار بنایا، اور اس کو ختم کردیا، لیکن اس نے لیڈی ڈاکٹر مسز کرک پیٹرک کو باقی رکھا، اور آسمان جاہ کی گارڈن پارٹی میں بھی اس کو نمایاں مقام دیا ہے، حالانکہ یہ اس کی سراسر غلطی ہے، اس لیے کہ خود فرنانڈز نے مس کرک پیٹرک کو ایک بدکردار عورت ثابت کیا ہے، اس لیے اس کا فرض تھا کہ کسی موقع سے اس کو ختم کر دیتا، چنانچہ ہم نے اپنے ترجمے میں یہ فرض ادا کیا ہے، وہ اس طرح کہ مجسٹریٹ پلیگ میں مبتلا ہو گیا تھا، اس پر مرض کا بڑا ہی شدید حملا تھا، مس کرک پیٹرک مجسٹریٹ کے گھر گئی تھی اور مریض کا علاج کیا، اس کو فائدہ نہیں ہوا، اور مجسٹریٹ مرگیا - یہ اپنے گھر گئی اور پلیگ کا شکار بن کر مرگئی - اس طرح سے ہم نے ایک نانی ہوئی بدکردار عورت کو ختم کر دیا - بیرسٹر ولیسٹر کا یہ زبردست کارنامہ تھا کہ اس نے حضور نظام تک رسائی کی اور وہاں بحث کرکے ملزم افضل خان کو موت کی سزا سے بچا لیا، اور رہا بھی کروادیا، مگر فرنانڈز نے اس کو کوئی اہم مقام نہیں دیا، اور ہم نے اس کو اہم مقام دیا ہے، یہاں تک کہ چونکے وہ مس کرک پیٹرک کا شوہر تھا، اس لیے کرک پیٹرک کے مرنے کے بعد اس کو وارث بناکر مالدار بنا دیا، اور اور ایک مقامی اینگلو انڈین سے شادی کراکے حیدر آبادی وطنیت اختیار کرنے پر مجبور کردیا، چنانچہ بیرسٹر ولیسٹر نے حیدر آباد اور سکندر آباد میں پراکٹس بھی شروع کردی تھی - فرنانڈز کی ایک بھاری بھول یا غلطی یہ ہے کہ اس نے افضل خان کے باپ کا نام تو ظاہر کردیا، یعنی میر علی خان، مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا، کہاں رہتا ہے، اور کیا کرتا ہے - ہم نے یہ کہا کہ میر علی خان اور اس کی بیوی کو ان کی جاگیر میں رکھا - یہاں افضل خان پر جو بھی گذری، ماں باپ قطعی واقف نہیں تھے اور نہ افضل خان نے انہیں واقف کرانے کی سعی اور کوشش نہیں کی - افضل خان پر پولیس نے زہر خورانی کا الزام لگاکر عدالت میں چالان بھی کیا اور مجسٹریٹ سے اس کو موت کی سزا بھی دلوادی، اور اس کو جیل میں رکھا گیا - ان تمام واقعات سے اس کے ماں باپ بالکل ہی لاعلم اور ناواقف تھے - جب بیرسٹر ولیسٹر نے حضور نظام کے پاس بحث کرکے افضل خان کو جیل سے رہا کروادیا اور اس کی موت کی سزا معاف کروادی، اور افضل خان جب اپنے گھر واپس آیا ہے تو بیرسٹر ولیسٹر کو اپنے گھر مہمان رکھ کر اپنے ماں باپ کو اس سارے واقع کی اطلاع کرنے جاگیر گیا، اور اس کے بعد انہیں اپنے گھر شہر لے آیا - ماں باپ آئے، اور باپ افضل خان کو نواب آسمان جاہ کے پاس لے کر گئے، اس طرح سے ربط پیدا ہوگیا، اور اس بڑھتے ربط کے نتیجے کے طور پر میر علی خان آسمان جاہ کو ان کی لڑکی رحیم النسا کے لیے اپنے بیٹے افضل خان کی شادی کا پیام دیا، جس کو آسمان جاہ نے قبول کرلیا، اور لڑکی کے ماموں حضور نظام نواب میر محبوب خان والئ دکن کی اجازت سے افضل خان سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کردی -

اب آپ ملاحظہ فرمایے کہ اس کی ایجاے فرنانڈز نے اپنے ناول میں کیا لکھا ہے - اس نے یہ بیان کیا ہے کہ آسمان جاہ نے اپنی لڑکی رحیم النسا کی صحت یابی کی خوشی میں ایک گارڈن پارٹی دی، جس میں سینکڑوں آدمی حیدر آباد اور سکندر آباد کے بڑے بڑے عہدے دار اور سکندر آباد کے انگریز عہدے دار، اور آسمان جاہ کا ایک دوست انگریز کرنل اور رزیڈنٹ حیدر آباد اور حضور نظام خود بھی اس اٹ ہوم میں موجود تھے - اس نے لکھا ہے کہ اٹ ہوم کے ختم پر آتش بازی کا

اصلی نام "رومانس آف اے زنانا" ROMANCE OF A ZENANA تھا - یہ ناول آرنلڈ - جی - فرنانڈز ARNOLD G. FERNANDEZ نے لکھا تھا - پانسو (۵۰۰) صفحے کا یہ انگریزی ناول سنہ ۱۹۰۰ء میں H O E & C O - مدراس میں چھپا تھا - ہم انگریزی کتابوں اور خصوصاً انگریزی ناولوں کا مطالعہ بہت زیادہ کیا کرتے تھے، چنانچہ یہ ناول بھی ہماری نظر سے گذرا۔ پورا ناول ہم نے پڑھ ڈالا اور ناول کو بہت ہی دلچسپ بھی پایا، اور چونکہ یہ ناول حیدرآباد کے ایک امیر کبیر نواب آسمان جاہ بہادر، امیر کبیر پائیگاہ، اور وزیر اعظم حیدرآباد کی لڑکی رحیم النسا سے متعلق تھا، اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ اس کا ترجمہ کرنا چاہیے، چنانچہ ہم نے ترجمہ شروع کیا، اور قسط وار "ہندستانی ادب" کے ہر نمبر میں دیتے رہے - نویں اور آخری قسط کا ترجمہ ابھی باقی تھا کہ ایسے میں اپنے مکان میں ایک زبردست ... حادثہ پیش آیا - ہمارا سیدھا پیر پھسل گیا اور ہم گر ... ، چنانچہ پیر کا ... بری طرح سے سرک گیا، اور اس ... ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ گھر والوں نے ہمیں اٹھا کر آرام کرسی پر لٹا دیا، اور ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ عثمانیہ ہسپتال میں شریک کروا دیا جائے۔ ہم نے ... اس سب کی مخالفت کی، اور یہ کہا کہ عثمانیہ دواخانے میں ... سرجری کا عمل ہوگا اور ہمارا پیر لٹکا کر چھوڑ ... دیں گے، ہم ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر ہوں گے اور مہینوں ... سے ہمیں نجات نہ مل سکے گی، اس لیے ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ اسی وقت چیلکوڑہ ... آدمی بھیج کر سید صاحب جراح کو بلوائیں، اور ان سے کہنا کہ ... صاحب کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، اس لیے آپ فوراً ہمارے ساتھ چلے چلیں ... سید صاحب ہمارے جانے پہچانے تھے۔ ان کے باپ نے ... سے (۱۹) سال پہلے ہمارا علاج کیا تھا، اس وقت ... کے موقع پر ہمارے اسی پیر کا گھٹنا بری طرح سے سرک گیا تھا۔ چالیس روز تک ہم زیر علاج رہے تھے، اور بعد میں وہ گھٹنا بالکل ٹھیک ہوگیا۔ خود ہمارا یہ تجربہ تھا۔ وہ سید صاحب ماہر مشہور جراح تھے، وہ ... ہو گئے، اور موجودہ سید صاحب جراح ان کے بیٹے ... فن میں باپ سے کچھ کم نہیں ہیں، چونکہ ہم ان سے واقف ہیں، اس لیے انہیں بلوایا، اور وہ فوراً ہمارے گھر چلے آئے، اور مرہم لگا کر پٹی باندھ دی - ایک دن آڑ آیا کرتے ہیں، اور پٹی کھول کر مالش بھی کرتے ہیں، اور تازہ مرہم بھی لگایا کرتے ہیں - ہم چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہیں، بستر ہی پر لیٹے رہتے ہیں - ہمیں کھانا وغیرہ بھی بستر پر بیٹھے بیٹھے کھلایا جاتا ہے، روزانہ ہمیں منہ بھی بستر ہی پر دھلایا جاتا ہے - جب کبھی ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے تو دو تین آدمی ہمیں اٹھا کر پاخانے میں لے جا کر بٹھا دیتے ہیں، اور ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد پھر اس طرح سے اٹھا کر لے آتے اور بستر پر بٹھا یا لٹا دیتے ہیں - پیشاب تو ہم بستر پر بیٹھے بیٹھے قارورے کے بڑے شیشے میں کیے دیتے ہیں، ملازم لے جا کر شیشا خالی کرنے کے بعد پانی سے دھو کر پھر سے لا کر رکھ دیتا ہے - ہم نے یہ کہا بھلا دیا کہ جس وقت حادثہ پیش آیا تھا، ہم گر پڑے اور ہمارا پیر سرک گیا اور ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی تو تکلیف کی وجہ سے ہم نے رونا شروع کر دیا تھا، چیختا چلاتا تھا اور ہماری آہ و بکا کا یہ عالم تھا کہ اس سے آسمان پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے بعد جب جراح سید صاحب نے سرکے ہوئے حصے کو اپنی جگہ بٹھانے کے لیے ہمارا پیر کھینچا ہے تو اس وقت بھی ہماری آہ و زاری کا وہی عالم تھا، جو حادثے کے وقت ہم نے بیان کیا ہے - اس تمام تفصیل کے بیان کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ ... ترین تکالیف کے باوجود ہم نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں برتی، بلکہ بستر علالت پر بیٹھے بیٹھے اس اہم اور دلچسپ ناول "شہزادی کا رومان" کی نویں اور آخری قسط کا ترجمہ کر ڈالا - ہمیں اس وقت بھی چین آرام اور سکون اور اطمینان نہیں ہے، پیر ابھی درد ... ہے - بستر پر جھک کر کام کرنے یا لکھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے، لیکن اس تکلیف کو ہم نے گوارا کر لیا، اور اگر تن آسانی سے کام لے کر ترجمہ نہ کرتے تو نویں اور آخری قسط اس نمبر میں نہ دی جا سکتی تھی - اس کے بعد کے نمبر میں پیش کی جاتی اس طرح سے ناول کی قسط میں وقفہ پیدا ہو جاتا، اور یہ وقفہ ایک ناگوار سی شکل ہے، اسی لیے اس ناگوار سی شکل کو دور کرنے کے لیے ہم نے کمر ہمت باندھی اور تکلیف کی حالت میں بستر پر بیٹھے بیٹھے اس ناول کی آخری قسط کا ترجمہ کر ڈالا جو اس نمبر میں آپ کی خدمت میں پیش ہے - ناول

"شہزادی کے رومان" کے ترجمے میں ہم نے ایک جان سی پھر دی ہے۔ اصل ناول انگریزی میں بلکل روکھا پھیکا سا ہے۔ فرنانڈز رحیم النسا کے معاشقے سے واقف ہوگیا تھا، اس لیے اس نے اس واقعے کو ناول کی شکل میں لکھ ڈالا۔ اس نے اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ نواب آسمان جاہ کون ہیں اور کیا ہیں، حیدرآباد میں ان کا مقام کیا ہے، اور ان کی حیثیت کیا ہے؟ اس نے یہ تک خیال نہیں کیا کہ جب کوتوال شہر اور دوسرے عہدے داران حیدرآباد آسمان جاہ سے ملنے آتے ہیں تو وہ آسمان جاہ کو کس طرح سے مخاطب کرتے ہیں، اور آسمان جاہ انہیں کس طرح سے مخاطب کرتے ہیں۔ ہم نے ترجمہ کرتے وقت خاص طور پر اس بات کا لحاظ کیا ہے۔ اس طرح سے کوتوال شہر اور دوسرے عہدے داروں کے نام ہم نے گنائے ہیں۔

فرنانڈز نے مجسٹریٹ کو تو پلیگ کا شکار بنا دیا، اور اس کو ختم کر دیا، لیکن اس نے لیڈی ڈاکٹر مسز کرک پیٹرک کو باقی رکھا، اور آسمان جاہ کی گارڈن پارٹی میں بھی اس کو نمایاں مقام دیا ہے، حالانکہ یہ اس کی سراسر غلطی ہے، اس لیے کہ خود فرنانڈز نے مسز کرک پیٹرک کو ایک بدکردار عورت ثابت کیا ہے، اس لیے اس کا فرض تھا کہ کسی موقع سے اس کو ختم کر دیتا، چنانچہ ہم نے اپنے ترجمے میں یہ فرض ادا کیا ہے کہ وہ اس طرح کہ مجسٹریٹ پلیگ میں مبتلا ہو گیا تھا، اس پر مرض کا بڑا ہی شدید حملا تھا، مسز کرک پیٹرک مجسٹریٹ کے گھر گئی تھی اور مریض کا علاج کیا، اس کو فائدہ نہیں ہوا، اور مجسٹریٹ مر گیا۔ یہ اپنے گھر گئی اور پلیگ کا شکار بن کر مر گئی۔ اس طرح سے ہم نے ایک فانی ہوئی بدکردار عورت کو ختم کر دیا۔ بیرسٹر ولیبرڈ کا یہ زبردست کارنامہ تھا کہ اس نے حضور نظام تک رسائی کی اور وہاں بحث کرکے ملزم افضل خان کو موت کی سزا سے بچا لیا، اور رہا بھی کروادیا، مگر فرنانڈز نے اس کو کوئی اہم مقام نہیں دیا، اور ہم نے اس کو اہم مقام دیا ہے، یہاں تک کہ چونکہ وہ مسز کرک پیٹرک کا شوہر تھا، اس لیے کرک پیٹرک کے مرنے کے بعد اس کو وارث بنا کر مالدار بنا دیا، اور ایک مقامی اینگلو انڈین سے شادی کرا کے حیدرآبادی وطنیت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ بیرسٹر ولیبرڈ نے حیدرآباد اور سکندرآباد میں پراکٹس بھی شروع کر دی تھی۔ فرنانڈز کی ایک بھاری بھول یا غلطی یہ ہے کہ اس نے افضل خان کے باپ کا نام تو ظاہر کر دیا، یعنی میر علی خان، مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا، کہاں رہتا ہے، اور کیا کرتا ہے۔ ہم نے یہ کہا کہ میر علی خان اور اس کی بیوی کو ان کی جاگیر میں رکھا۔ یہاں افضل خان پر جو بھی گذری، ماں باپ قطعی واقف نہیں تھے اور نہ افضل خان نے انہیں واقف کرانے کی سعی اور کوشش نہیں کی۔ افضل خان پر پولیس نے زہر خورانی کا الزام لگا کر عدالت میں چالان بھی کیا اور مجسٹریٹ سے اس کو موت کی سزا بھی دلوادی، اور اس کو جیل میں رکھا گیا۔ ان تمام واقعات سے اس کے ماں باپ بالکل ہی لاعلم اور ناواقف تھے۔ جب بیرسٹر ولیبرڈ نے حضور نظام کے پاس بحث کرکے افضل خان کو جیل سے رہا کروادیا اور اس کی موت کی سزا معاف کروادی، اور افضل خان جب اپنے گھر واپس آیا ہے تو بیرسٹر ولیبرڈ کو اپنے گھر مہمان رکھ کر اپنے ماں باپ کو اس سارے واقعے کی اطلاع کرنے جاگیر گیا، اور اس کے بعد انہیں اپنے گھر شہر لے آیا۔ ماں باپ آئے، اور باپ افضل خان کو نواب آسمان جاہ کے پاس لے کر گئے، اس طرح سے ربط پیدا ہو گیا، اور اس بڑے ربط کے نتیجے کے طور پر میر علی خان آسمان جاہ کو ان کی لڑکی رحیم النسا کے لیے اپنے بیٹے افضل خان کی شادی کا پیام دیا، جس کو آسمان جاہ نے قبول کر لیا، اور لڑکی کے ماموں حضور نظام نواب میر محبوب خان والیٔ دکن کی اجازت سے افضل خان سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کر دی۔

اب آپ ملاحظہ فرمایئے کہ اس کی بجائے فرنانڈز نے اپنے ناول میں کیا لکھا ہے۔ اس نے یہ بیان کیا ہے کہ آسمان جاہ نے اپنی لڑکی رحیم النسا کی صحت یابی کی خوشی میں ایک گارڈن پارٹی دی، جس میں سینکڑوں آدمی حیدرآباد اور سکندرآباد کے بڑے بڑے عہدے دار اور سکندرآباد کے انگریز عہدہ دار، اور آسمان جاہ کا ایک دوست انگریز کرنل اور رزیڈنٹ حیدرآباد اور حضور نظام خود بھی اسی اٹ ہوم میں موجود تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ اٹ ہوم کے ختم پر آتش بازی

شروع ہوئی۔ اس آتش بازی کا ایک راکٹ رحیم النسا کے زنانی محل میں گیا، اور فوراً کپڑوں کو آگ لگ گئی، اور یہ آگ تیزی سے پھیلتی گئی، اور سارے محل میں پھیل گئی۔ تمام عورتیں پریشانی کی حالت میں بھاگ نکلیں، اور کچھ عورتیں اندر ہی بری طرح سے پھنس گئیں، جن میں شہزادی رحیم النسا بھی تھی۔ آگ کا یہ ڈراونا اور بھیانک منظر دیکھ کر آسمان جاہ لاچار سے، اور چیختے چلاتے ہوئے ہات اٹھا کر کہا، ارے کوئی ہے میری بچی کو بچانے والا، ارے کوئی میری بچی کو بچائے۔ یہ سن کر مجمع میں سے افضل خان آگے بڑھتا ہے، اور آسمان جاہ سے کہتا ہے میں بچاتا ہوں آپ کی بچی کو، آسمان جاہ نے کہا جاؤ دوڑ کر جلد جاکر میری بچی کو بچا لے آؤ، چنانچہ نوجوان افضل خان دوڑے دوڑے جاتا ہے، اور اوپر محل میں آگ کا مقابلا کرتے ہوئے رحیم النسا کے کمرے میں داخل ہوتا ہے، وہاں جو عورتیں تھیں ان سے دریافت کرتا ہے کہ رحیم النسا کہاں ہے، ایک عورت بتاتی کہ وہ پڑی ہوئی رحیم النسا یہی ہے، چنانچہ افضل خان پھرتی اور تیزی کے ساتھ آگ کے لپٹوں کا مقابلا کرتے ہوئے رحیم النسا کو سارے مجمع اور آسمان جاہ کے مقابل لے آکر کھڑا ہوتا ہے، تھوڑی ہی دیر میں سکندر اباد کا کرنل افضل خان اور آسمان جاہ کے مقابل آنکر انگریزی میں افضل خان کی پیٹ ٹھونکتا ہے، اور شاباشی دیتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ چونکہ تم نے آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النسا کو جلنے سے بچالیا ہے، اس لحاظ سے یہ لڑکی تمہاری ہے، افضل خان بھی انگریزی زبان میں کرنل کا شکریا ادا کرتا ہے، اس کے فوراً ہی بعد کرنل نواب آسمان جاہ بہادر امیر پائیگاہ، رئیس اعظم حیدر اباد سے مخاطب ہوکر کہتا ہے، یہ لڑکی افضل خان کی ہوگئی، اس لیے تم اس کی شادی افضل خان سے کر دو۔ نواب نے فوراً رضامندی ظاہر کی اور رحیم النسا سے آگے چلکر افضل خان کی شادی ہوگئی۔ اس کے بعد فرنانڈز نے بڑے ہی بدتمیز اور بداخلاق کا مظاہرا کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ اتنی دیر میں رحیم النسا نے آنکھیں کھولدیں، اور افضل خان کو دیکھتے ہی فوراً لپٹ گئی اور چیخ اٹھی کہ افضل میرے پیارے افضل، میرے سرتاج افضل اسی وقت اپنے پیار سے اور شیریں لبوں سے میرے بوسے لو، چنانچہ رحیم النسا کی خواہش پر، تقریباً ایک ہزار آدمیوں کے سامنے پے در پے چند بوسے لیتا ہے، اور یہاں پر فرنانڈز ہندستانی کلچر اور تہذیب کا خون ہی کر دیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ خود رحیم النسا نے بھی افضل خان کو چمٹ چمٹ کر پیا پے بوسے لے رہی تھی۔ آیا ہندستانی تہذیب اور کلچر اس بات کا متقاضی ہے کہ نواب آسمان جاہ کی لڑکی تمام دعوتیوں کے بھر پور مجمع میں مرد، عورت لڑکا، لڑکی اور خصوصاً آسمان جاہ کی لخت جگر رحیم النسا اپنے منظور نظر افضل خان کے مسلسل بوسے لے، اور افضل خان بھی اسی طرح سے اس کی تابڑ توڑ جواب دے؟ فرنانڈز کے ناول ——

ROMANCE OF A ZENANA

کی ابتدا اور اٹھان تو اچھی تھی، لیکن آخر میں اس نے اس ناول کی مٹی پلید کر دی ہے۔ ہم نے اس نامناسب اور قابل اعتراض حصے کو یوں بدل دیا ہے کہ افضل خان کے باپ میر علی خان، اپنے ایک لوتے لڑکے افضل خان کا پیام لے کر آسمان جاہ کے پاس جاتے ہیں۔ آسمان جاہ رضامندی ظاہر کرتے ہیں، اور دونوں پارٹیوں کی رضامندی سے شادی کی تاریخ مقرر ہوتی ہے۔ نکاح کے بعد رحیم النسا دلہا کے ساتھ اپنے سسرال چلی جاتی ہے، اس کے بعد دونوں پارٹیوں کی طرف سے جو تھی اور ولیمے کی شاندار اور یادگار دعوتیں ہوتی ہیں، اور آخر کار رحیم النسا اور افضل خان ہنسی خوشی کی زندگی گذارتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اگر ہم خود بھی فرنانڈز کے اصل متن کا اندھا دھند ترجما کر ڈالتے ہندستانی روایاتی مشہور و معروف تہذیب اور کلچر پر ہمیشا ہمیشا کے لیے ایک ناگوار، نامناسب اور بدنما سا بھیانک داغ رہ جاتا، اور ہم جیسے ایک مشاق اور ماہر مترجم کے دماغ و قلم سے ایسی فاش غلطی ہرگز ہرگز سرزد نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے اس مشہور زمانا ہندستانی تہذیب اور کلچر کے مطابق ہم نے اس ناول کے انجام کو ایک خوشنما سانچوں کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔

جی۔ آرنلڈ فرنانڈز
ترجمہ جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)
ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

شہزادی کا رومان

رومانس آف اے زنانا

ROMANCE OF A ZENANA

(نویں اور آخری قسط)

باب (۲۲)

کرک پیٹرک کے جانے کے بعد رحیم النسا پھر سے بڑے صوفے پر لیٹ گئی، اور افضل خان کے خیالات میں کھو گئی، اور یہ کہنے لگی، اے افضل، تو ہی بتا کہ کب تک میں تیرے فراق میں میری زندگی تلخ ہو گئی ہے، ایک ایک دن مجھ پر سے ایک ایک برس ہو کر گذر رہا ہے، اور اب میں تیرے بغیر تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتی، اس لیے، اے افضل تو اس وقت ایک پرندے کی طرح اڑتا ہوا میرے گھر آجا، اور مجکو تو اپنی باہوں میں لے لے، تاکہ ہم دونوں بچھڑے ہوئے ہمیشا ہمیشا کے لیے ایک ہو جائیں، اور زندگی بھر الگ نہ ہونے پائیں! اے میرے پیارے، اور میری آنکھوں کے تارے افضل، تو نہیں جانتا کہ میں نے تیری خاطر بہت دکھ سہے ہیں، میں تیری یاد میں (۲۴) گھنٹے تڑپتی اور روتی رہتی ہوں، جدائی کے یہ صدمے آخر کب تک مجھ سے سہے جائینگے، تو اگرچہ مجھ سے دور ہے، مگر مجکو یقین ہے کہ ہوا میری دردناک آواز کو تجھ تک ضرور پہنچا دیگی، اور تو اسی وقت میرے ہاں ایک آزاد پنچھی کی طرح اڑتا چلا آ، اور مجکو تو اپنے گلے اور سینے سے لگا لے۔ صرف اس وقت مجکو چین آرام اور سکون نصیب ہوگا۔ سن اے افضل سن، تجھ پر سے فدا اور نثار ہونے والی رحیم النسا کیا کہہ رہی ہے، یعنی تجکو وہ اپنے سے قریب تر کرنا چاہتی ہے،

اور ہمیشا ہمیشا کے لیے تیرے ساتھ رہتی زندگی کے دن گزارنا چاہتی ہے۔ اس قسم کی دیوانا وار بکواس کرتے ہوے رحیم النسا اٹھ کر ایک کھڑکی کی طرف گئی، اور اس کا ریشمی پردا ہٹا کر باہر مایوسانا انداز میں دیکھنے لگی کہ شاید اس کی یہ درد بھری آہیں، اور آوازیں اس کے عاشق صادق تک پہنچی ہوں، اور ہوسکتا ہے کہ افضل خان گھوڑے پر بیٹھ کر تیز رفتاری کے ساتھ اڑا اڑا چلا آرہا ہو، اور آتے ہی اس کو اپنی باہوں میں لیے ہوے یہ کہے گی کہ دیکھو پیاری رحیم النسا تیری یاد پھر میں یہاں آگیا، اور اب یہ کبھی میں یہاں سے واپس نہیں جاؤنگا۔ ہم دونوں کی شادی ہو جاے گی، اور ہم دونوں مرتے دم تک ایک ہوکر رہنگے، انہیں فالتو خیالات میں غرق رحیم النسا کی آنکھوں سے آنسوں کی جھڑی سی لگ گئی تھی، اور انہیں آنسوؤں کی مسلسل بوچھار سے اس کے سینے پر کے کپڑے تربتر ہوگئے تھے۔ اس نے بڑھونے پر سے دستی اٹھائی، اور اپنے دہنے ہات میں پکڑے ہوے آنسو پونچھنا شروع کیا، اور پھر سے بڑھونے کو ٹیکا دیے مغموم حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایسے میں ایک عورت روتے بلانے اور چیختے چلاتے آکر اس کے قدموں پر گر پڑا۔ اس عورت کو اپنے ہات سے قدموں پر سے ہٹاتے ہوے، رحیم النسا کہا، کہو تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ یہ عورت۔ اصل میں بڑی ماماجی تھی، جس کو عبدالقادر نے مار ڈالنے کی غرض سے باولی میں ڈھکیل دیا تھا، مگر وہ پانی میں ڈوب کر مری نہیں تھی، بلکہ بچ گئی تھی۔ اس کے بعد محلے والوں نے اس کو باولی سے باہر نکال کر بچالیا تھا۔ اس کو بچانے والا اصل میں فراز علی عامل تھا، اور اس فراز علی نے بڑی ماماجی کو اپنے ساتھ لے جاکر پولیس میں بیان دلوایا تھا کہ آسمان جاہ کی ڈیوڑھی کے ملازم اور نواب صاحب کے مصاحب خاص نمک حرام اور بدمعاش عبدالقادر نے ایک لاکھ روپے کی موتیوں کی مالا ہڑپ کر لینے کی خاطر ایک تاریک رات میں ایک [illegible] بڑی ماماجی کو پکڑ جکڑ کر زبردستی باولی میں ڈھکیل دیا تھا، تاکہ اس کے مرجانے کے بعد یہ راز کسی دوسرے شخص پر ظاہر نہ

ہونے پاے۔ پولیس میں بیان دلوانے کے بعد عامل فراز علی نے یہ بھی زبردست کام کیا تھا کہ افضل خان کے انگریز وکیل یا ایڈوکیٹ بیرسٹر ولیسٹر سے بھی لے جاکر ملایا تھا۔ بیرسٹر ولیسٹر نے بڑی ماماجی کا سارا قصا سنا، اور اپنے طور پر سوالات کر کے اس سے بہت سی ضروری باتیں بھی معلوم کیں، اور افضل خان کی پیشی کے روز اس ماماجی کو اپنے ساتھ عدالت بھی لے گیا۔ حاکم عدالت نے افضل خان کو جب موت کی سزا سنادی تو ولیسٹر نے اس ماماجی کو بطور گواہ پیش کیا کہ حقیقت میں افضل خان نے شہزادی رحیم النسا کے ہاں افیون ملی ہوئی مٹھائی نہیں بھجوائی تھی، بلکے چور، ڈاکو، لٹیرا، اور بدمعاش نمبر ایک آسمان جاہ کے مصاحب خاص نمک حرام عبدالقادر نے خد اپنے ہاتوں سے مٹھائی میں افیون ملائی تھی۔ عورت کا بھیس بدلنے کے لیے اس نے داڑھی مونچھ منڈوا دی تھی، اور ساڑی پہن کر ڈیوڑی کی قیمتی کشتیوں اور ڈشوں میں مٹھائی رکھ کر رحیم النسا کے محل پر لے کر گیا تھا، اور انہیں ماماجی کے ذریعے یہ کہلوایا تھا کہ افضل خان کے گھر سے ایک عورت مٹھائی لے کر آئی ہے، اور اس کا کہنا ہے کہ نواب افضل خان بہادر نے یہ مٹھائی آپ کے لیے بھجوائی ہے۔ یہ سنتے ہی رحیم النسا خوشی سے اچھل پڑی، اور بڑی ماماجی سے کہا کہ ماماجی فوراً اس عورت کو اندر لے آو، وہ عورت سر پر کشتی لیے اندر آئی، اور آداب بجالانے کے بعد مٹھائی کی کشتی میز پر رکھ کر سرپوش اس پر سے ہٹا دیا، اور کہنے لگی کہ ہمارے سرکار نواب افضل خان بہادر نے یہ مٹھائی شہزادی صاحبہ کے لیے بھجوائی ہے، اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ آپ یہ مٹھائی کسی دوسرے کو نہ دیں، یہ بہت ہی خاص قسم کی مٹھائی ہے، شاہی حلوائی کو آرڈر دے کر خاص طور پر تیار کروائی گئی ہے، اس لیے صرف آپ خود ہی روزانا یہ مٹھائی کھائیں، اور اس لذیذ اور شیریں اور مزیدار مٹھائی کا ایک ٹکڑا بھی کسی دوسرے کو نہ دیں۔ شہزادی یہ سن کر کہ افضل خان نے خاص طور پر خاص مٹھائی اس کے لیے بھجوائی ہے، بے حد خوش ہوگئی۔ اس عورت کو بیٹھنے کے لیے کہا، وہ عورت آداب بجالا کر بیٹھ گئی۔ شہزادی کے کہنے سے بڑی ماماجی ایک بڑی خوشنما پلیٹ اور

چاندی کا چمچا لے کر آئی، اور مٹھائی پلیٹ میں رکھ کر شہزادی کو دی، اور سامنے ایک چھوٹا سا خوبصورت لکڑی کا میز بھی رکھ دیا، تاکے شہزادی پلیٹ اس پر رکھ کر مٹھائی کھا سکے۔ شہزادی نے مٹھائی کھائی، اور اس عورت سے اس نے کہا، عورت یہ مٹھائی تو واقعی بڑی ہی لذیذ اور مزیدار ہے، اس پر عورت نے جواب دیا، کیسے نہ ہوگی شہزادی صاحبہ، یہ تو ہمارے سرکار افضل خان بہادر نے بڑے ہی اہتمام کے ساتھ خاص طور پر آپ کے لیے شاہی حلوائی سے تیار کروائی ہے۔ اس عورت یعنی نمک حرام عبدالقادر نے جب یہ دیکھا کہ شہزادی اس تحفے سے بے حد خوش اور مسرور ہے تو اس نے اپنی کارگذاری اور خدمت کا معاوضہ شہزادی سے مانگا۔ اس پر شہزادی نے خوش ہوکر ایک لاکھ روپے موتیوں کی مالا نکال کر اس عورت کو دیدی، اور اس عورت نے بے حد شکریہ ادا کیا، اور ہزاروں دعائیں دیتی ہوئی وہ مالا لے لی، اور سیدھی لے جاکر ڈیوڑھی سے دو بیچ فاصلے پر وہ موتیوں کی مالا زمین میں دفن کردی، جس سے صرف وہ عورت یا نمک حرام عبدالقادر اور دونوں ماماِئیں واقف تھیں۔ چھوٹی ماما جی کو تو ڈرا دھمکا کر عبدالقادر نے اپنا ہم نوا اور ہم خیال بنا لیا تھا، مگر بڑی ماما جی سے اس کو ڈر اور خطرہ لگا ہوا تھا، اس لیے ایک تاریک رات میں باتیں کرتے ہوئے بڑی ماما جی کو وہ ڈیوڑھی سے بہت دور ایک ویران اور غیر آباد۔ تمام پر میدان میں ایک غیر مستعمل باؤلی میں لے جاکر زبردستی نیچے ڈھکیل دیا۔ اس ظالمانہ حرکت سے اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ بڑی ماما جی کے مرجانے کے بعد وہ چھوٹی ماما جی کو کچھ دے دلاکر اس کا منھ بند کر دیگا، اور اس کو اپنا ہم خیال بنانے کے بعد ایک لاکھ روپے کی مالا بیچ کر خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کریگا۔ بہرحال اس بڑی ماما جی نے اپنی شہزادی سے حقیقت حال بیان کرنے کے لیے آئی تھی، چونکہ وہ خود بھی اس جرم میں برابر کی شریک تھی، اس لیے معافی چاہنے کے لیے اپنی شہزادی کے پیروں پر گر پڑی تھی، تاکے شہزادی اس کا قصور معاف کردے تو وہ بالکل صحیح اور سچی باتیں اس کو کہہ سنائے گی۔ اس خیال سے شہزادی رحیم النساء نے اس سے کہا، تم کو اجازت ہے تم جو چاہے مجھ سے کہہ سکتی ہو۔ یہ سنکر وہ ماما جی، رحیم النساء کے سامنے بیٹھ گئی، اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔

میری شہزادی، میں حقیقت میں ایک گناہگار عورت ہوں، آپ مجکو ہزار لاتیں ماریے، ٹھوکریں لگائیے، اور میری تکا بوٹی کر کے چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیجیے، واقعی میں ایسی ہی اور خطرناک سزا کی مستحق ہوں، میں گناہ گار ہوں، میری شہزادی، مجھ پر مصیبت کے آسمان ٹوٹ پڑیں، اور میں زندہ درگور ہو جاؤں، تب بھی میرا قصور معاف نہیں ہو سکتا!

یہ سن کر رحیم النساء نے کہا، ماما جی، میں تو نہیں جانتی کہ تم نے میرے حق میں کونسا قصور اور پاپ کیا ہے، اور واقعی تم نے ایسی کوئی غلطی کی ہے تو میں تم کو معاف کیے دیتی ہوں، اس لیے اب تم اپنی کہانی اور داستان مجکو سنا سکتی ہو، اور جو کچھ بھی کہنا سچ سچ کہنا۔

اس کے بعد ماما جی نے کہا، شہزادی اب میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بیان کرونگی، میرا سارا بیان سو فیصد صداقت اور حقیقت پر مبنی ہوگا۔ شہزادی صاحبہ! سب سے پہلے میں نے ایک موتیوں کی مالا آپ سے عامل فراز علی کو دینے کے لیے حاصل کی تھی، وہ مالا عامل کو نہیں دی گئی، بلکہ اس کو بیچکر میں، چھوٹی ماما جی، اور عبدالقادر نے وہ رقم آپس میں تقسیم کرلی اس کے کچھ دنوں بعد پھر عامل فراز کے بہانے ہم نے آپ سے کچھ روپے حاصل کیے اور وہ رقم بھی ہم تینوں نے مل کر بانٹ لی، اس طرح سے عامل فراز علی یا دوسرے عامل وغیرہ کے نام سے ہم نے جو بھی زیور، اور رقم حاصل کی، ایک حبہ بھی دوسرے کو نہیں دیا، بلکہ ہم تینوں نے آپس میں تقسیم کرلی۔ اس کے بعد آپ نے ایک لاکھ روپے کی موتیوں کی مالا ایک عورت کو دی تھی۔ وہ عورت نواب افضل خان بہادر کے ہاں سے کشتی میں مٹھائی لے کر آئی تھی، اور اس نے آپ سے یہ کہا تھا کہ ہمارے سرکار نے یہ مٹھائی خاص طور پر ایک شاہی حلوائی سے صرف آپ کے لیے تیار کروائی ہے، اس لیے آپ یہ مٹھائی رکھ کر روزانہ تھوڑی تھوڑی کھائیں، اور اس میں کا ایک ٹکڑا بھی کسی دوسرے شخص کو نہ دیں۔ وہ عورت اصل میں عبدالقادر ہے، جس نے عورت کا بھیس

اختیار کرنے کے لیے داڑھی مونچھ منڈوا دی تھی۔ اسی عبدالقادر نے وہ مٹھائی شاہی حلوائی سے خریدی تھی، اور اس میں زیادہ مقدار میں افیون ہم دونوں ماماؤں کی موجودگی میں اپنے کمرے میں ملائی تھی، اور خنجر نکال کر ڈرایا دھمکایا تھا کہ اگر کسی پر بھی یہ راز فاش کر دیا تو تم دونوں کو اس خنجر سے فوراً ختم کر دونگا۔ ہم دونوں واقعی ڈر گئے تھے، اور اس بارے میں ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہا تھا، دلوڑی ہی میں سے کشتی بھی لی، اور بہترین ڈشس بھی لیں، اور ایک سرپوش بھی لیا، اور ہم دونوں سے کہا کہ تم دونوں شہزادی صاحبہ کے یاد میں مٹھائی کی کشتی سر پر رکھ کر لے آتا ہوں۔ میرے آنے کے بعد تم اطلاع کرنا کہ نواب افضل خان بہادر کے گھر سے ایک عورت آئی ہے، اور وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے، افضل خان کا نام سنتے ہی شہزادی خوش ہو جائے گی، اور مجھکو اندر آنے کی اجازت دے گی۔ اندر جانے کے بعد میں آداب بجا لاکر کہوں گی کہ شہزادی صاحبہ! میں نواب افضل خان بہادر کے گھر سے آئی ہوں، اور ہمارے سرکار نے یہ مٹھائی آپ کے لیے بھجوائی ہے، ظاہر ہے کہ افضل خان کا نام سنتے ہی شہزادی خوش ہو جائے گی، اور مجھکو بیٹھنے کی اجازت دے گی، اور خوشی کے ساتھ مٹھائی کا تحفہ قبول کرے گی۔ میں اس سے کہونگی کہ اس صلے میں مجھکو انعام اکرام سے نوازا جائے، اور کم سے کم موتیوں کی ایک قیمتی مالا اس خوشی میں دی جائے، چونکہ ہماری شہزادی بڑی ہی دل والی ہے، اس لیے کم سے کم ایک لاکھ روپئے کی مالا مجھکو دے گی۔ وہ مالا لاکر تم بازار میں بیچ دینا، اور ہم تینوں مل کر عیش و عشرت اور ٹھاٹ کی زندگی بسر کریں گے۔ اپنے ان تمام اعمال قبیحہ اور بدعنوانیوں، اور بدتمیزیوں کو چھپانے کی واحد صورت یہ ہے کہ خود شہزادی کو ختم کر دیا جائے، اور اس کو ختم کرنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ مٹھائی میں افیون ملاکر اس کو دیں، اور یہ کہیں کہ یہ تحفہ آپ کے لیے نواب افضل خان نے بھجوایا ہے تو خوشی سے مٹھائی قبول کرلے گی، اور خود اکیلی کھائے گی۔ ظاہر ہے کہ زیادہ مقدار میں افیون ملی ہوئی مٹھائی کھانے کے بعد فوراً اس پر زہر کا اثر ہوگا، اور بہت جلد وہ مر جائے گی! اپنے ان ظالم کارناموں کو راز میں رکھنے، اور ایک لاکھ روپے کی موتیوں کی مالا اپنے قبضے میں رکھنے کی غرض سے اس نے ایک ظالمانہ حرکت یہ کی کہ ایک تاریک رات مجھکو دلوڑی سے دور بہت دور، ایک ویران میدان میں مجھکو باتیں کرتے ہوئے لے گیا، اور وہاں ایک غیر مستعمل باولی میں زبردستی پکڑ کر اندر ڈھکیل دیا، میں باولی میں گر پڑی، اور چیختے چلاتے رات گذار دی، کسی نے بھی میری آواز نہیں سنی۔ صبح میں بھی میں بری طرح سے چلاتی رہی، چند بچوں نے جھانک کر دیکھا تو میں نے ان سے کہا کہ دوڑو، تم اپنے ماں باپ سے کہو کہ ایک عورت باولی میں گر پڑی ہے، اس کے نکالنے کے لیے رسی لے کر آؤ۔ یہ سن کر بچے گئے اور انہوں نے بڑے آدمیوں سے یہ سارا قصہ کہہ سنایا، دو ایک آدمی آئے، اور اندر جھانک کر دیکھا تو میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ بھائی میں باولی میں گر پڑی ہوں، تم رسی لاکر مجھکو اوپر نکال لو۔ یہ سن کر وہ بڑے آدمی واپس گئے اور تھوڑی دیر میں کئی بڑے آدمی رسی وغیرہ لے کر آئے، اور ایک مضبوط، موٹی بڑی رسی اندر چھوڑی، اور مجھ سے کہا کہ تم دو تین لپیٹے دے کر اس رسی کو اپنی کمر سے باندھ لو، اور پھر اس کو دوسری طرف اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر اشارہ دو اور یہاں ہم سب مل کر تم کو اوپر کھینچ لینگے، اور انہوں نے مجھکو یہ بھی تاکید اور ہدایت کی کہ خبردار! بغیر رسی کو ڈھیلی نہ چھوڑنا ورنہ پھر پلٹ کر باولی میں چلی جاؤگی، چنانچہ ان کے کہنے پر میں نے پورا پورا عمل کیا، اور ان لوگوں نے مجھکو باولی سے کھینچکر باہر نکالا، میں بے ہوش ہوگئی، اس لیے مجھکو کچھ خبر نہیں، وہ مجھکو اپنے گھر لے گئے تھے، اور ان کی عورتوں نے میرا بھیگا ہوا لباس بدلا، اور اپنے گھر کے کپڑے پہنائے۔ میرے ہوش میں آنے کے بعد مجھکو کھلایا پلایا۔ ان صاحب نے مجھ سے باولی میں گر پڑنے کا واقعہ دریافت کیا تو میں نے ان کو اوپر کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔ یہ صاحب مجھکو اپنے ساتھ قریب کے پولیس تھانے لے گئے، اور پولیس نے بھی میرا سارا بیان قلمبند کرلیا۔ اتفاق سے یہ صاحب فراز علی عامل تھے، جن کے گھر

ہم تینوں، شہزادی کے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے سلسلے میں کئی بار جا چکے تھے، چونکہ فراز علی مجکو جانتے تھے، اس لیے وہ میرے ساتھ بڑی مہربانی کے ساتھ پیش آئے۔

یہی فراز علی مجکو افضل خان بہادر کے بیرسٹر دلیسٹر کے پاس لے گئے، اور بیرسٹر دلیسٹر نے ساری داستان بڑی ہی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنی، اور دوسرے روز وہ مجکو عدالت لے گئے۔ حاکم عدالت نے افضل خان کو زہر دینے کی علت میں موت کی سزا سنادی تھی۔ پولیس نے افضل خان کے خلاف جھوٹا مقدمہ پیش کیا تھا، ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے اپنے گھر کی ایک عورت کے ذریعے آپ کو فیول ملی ہوئی مٹھائی بھجوائی تھی، تاکہ یہ مٹھائی کھانے کے بعد آپ مر جائیں اسی لیے حاکم عدالت نے افضل خان کو موت کی سزا سنادی تھی۔ میرے سچے بیان کے بعد بھی حاکم عدالت نے اپنا فیصلا نہیں بدلا، سزا بحال رکھی، اور افضل خان کو جیل بھیجدیا گیا۔ صرف حضور نظام کی آخری منظوری درکار تھی، تاکہ ان کے حکم سے دن اور تاریخ مقرر کر کے موسا ندی کے کنارے افضل خان کو قتل کر دیا جائے، مگر بیرسٹر دلیسٹر نے رزیڈنٹ بہادر حیدرآباد کے توسط سے حضور نظام کے پاس پیروی کی، اور کئی گھنٹے تک بحث کرنے کے بعد حضور نظام نے حکم سے افضل خان کی رہائی کا حکم مہتمم جیل کے نام بھجوایا۔ حضور نظام کی دیوڑھی کے ایک ملازم کے ساتھ یہ حکم لے کر بیرسٹر دلیسٹر فوراً جیل گئے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کا حکم مہتمم جیل کے حوالے کرنے کے بعد نواب افضل خان بہادر کو جیل سے رہا کروالیا۔ جیل کے سامنے ہزاروں ہی آدمی جمع ہوئے تھے، اور وہ لوگ افضل خان، اور بیرسٹر دلیسٹر کو اپنے کندھوں پر بٹھاکر افضل خان کے گھر لے گئے، جہاں لوگوں نے ان دونوں کی گلپوشی بھی کی، اور ان کو مٹھائی وغیرہ کے تحفے بھی دیے!

ماماجی کی یہ دکھ بھری طویل داستان سننے کے بعد رحیم النسا نے کہا، ماماجی، جب تم یہ جانتی تھیں کہ نمک حرام عبدالقادر میری جان کا دشمن تھا تو تم نے اس وقت مجھ سے کیوں نہیں کہا؟

یہ سن کر بڑی ماماجی نے اپنا سر رحیم النسا کے پیروں پر رکھدیا، اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے پیروں کو پکڑتے ہوئے کہا، شہزادی صاحبا! میں سچ کہتی ہوں کہ اس حد تک میں ضرور قصوروار ہوں۔ ہم سب اس دیوڑھی کا نمک کھاتے ہیں، اس لیے میرا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ میں نمک حرام عبدالقادر کے ان ظالمانہ کارناموں سے آپ کو واقف کرائی، مگر وہ ظالم مجکو بار بار خنجر سے مار ڈالنے کی دھمکی دیا کرتا تھا، اس لیے اس کے خوف سے میں نے یہ راز آپ پر ظاہر نہ کیا۔

رحیم النسا نے اپنے ہاتھ سے ماماجی کا سر اپنے پیروں سے ہٹاتے ہوئے دریافت کیا، عبدالقادر کہاں ہے، آیا دیوڑھ ہی میں ہے۔ یہ سن کر ماماجی نے جواب دیا، نہیں، شہزادی صاحبا! عدالت میں ہمارے بڑے سرکار موجود تھے۔ عبدالقادر کے خلاف میرا بیان سننے کے بعد جب سرکار دیوڑھی گئے تو عبدالقادر کو دوسرے ملازم کے ذریعے بلوایا، اور اس نمک حرام کو ستون سے رسی سے بندوا کر کوڑے سے اتنا پٹوایا کہ سارا جسم زخمی ہو گیا تھا، اور وہ مرگیا سرکار، مرگیا سرکار، اور معاف کردو سرکار اور رحم کرو سرکار کہتے ہوئے چیخ رہا اور چلا رہا تھا۔ بعد میں سرکار نے اپنے دوسرے ملازمین کو حکم دیا کہ اس کو لاتیں مار کر دیوڑی سے باہر کردو، اور اس سے کہدو کہ اب کی بار پھر سے دیوڑی میں قدم رکھے گا تو اس کی دھجیاں ادھیڑ کر رکھدی جائینگی۔ عبدالقادر کے ساتھ سرکار نے چھوٹی ماماجی کو بھی بلوایا تھا، مگر اس کو مارا پیٹا نہیں، بلکے دوسروں کو حکم دیا کہ اس نمک حرام کو دھکے دے کر اور لاتیں مار کر دیوڑی سے باہر کردو، اور کہدو کہ پھر سے اس دیوڑی میں قدم نہ رکھے، چنانچہ اسی وقت دیوڑی کے دوسرے ملازمین نے دونوں کو دھکے دے کر دیوڑی سے باہر کردیا۔ یہ کہتے ہوئے بڑی ماماجی پھر سے رونے لگی، اور رحیم النسا کے دونوں پیر اپنے ہاتوں سے پکڑے ہوئے کہنے لگی، شہزادی صاحبا! بڑے سرکار سے سفارش کرکے میرا قصور معاف کرا دیجیے، اور پہلے کی طرح مجکو اپنی خدمت کا موقع دیجیے، سرکار! میں آپ سے پکا وعدا کرتی ہوں، آیندا پھر کبھی مجھ سے ایسی بھول نہ ہوگی، اور اپنی ساری زندگی آپ کی خدمت ایک وفادار اور اطاعت گذار خادما کی طرح گذار دونگی۔ یہ سن کر رحیم النسا نے اپنے پیروں سے ماماجی کا سر ہٹایا، اور کہنے لگی، موقع محل سے میں ضرور

ابا سرکار سے تمہاری سفارش کرونگی، اور مجکو یقین ہے کہ وہ میری سفارش سن کر تمہارا قصور معاف کر دینگے، اور حسب سابق تمہیں میری خدمت میں رہنے کی اجازت دینگے۔ اچھا، اب تم اسی وقت جاؤ اور بٹلر سے کہو کہ میرے لیے شام کی چائے لے آئے۔ یہ سن کر بڑی ماما جی اٹھی اور بٹلر سے کہنے کے لیے چلی گئی۔

باب (۲۳)

بیرسٹر ولسٹر [illegible]

کے سلسلے میں افضل [illegible] رکھ لیا تھا، اور اسکا بہت [illegible] تھا۔ اس [illegible] خان، میر علی خان جاگیردار [illegible] تھا۔ اس کے گھر میں دولت کی کمی نہیں تھی، اس [illegible] باٹ کی زندگی [illegible] تھا چونکہ وہ سات سال تک انگلینڈ میں رہ چکا تھا، اس لیے اس کو [illegible] سے بھی دلچسپی تھی، اس لیے اس کے گھر میں [illegible] کے علاوہ، بورے بٹلر بھی تھے، اس سے ایک انگریز بیرسٹر کے کھانے کا انتظام کرنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ نہ صرف یہ دونوں مل کر انگریزی اور خلائی کھانے ایک ساتھ کھایا کرتے تھے۔ بلکہ روزانا افضل خان اپنے دو ایک انگریزی داں عزیزوں اور دوستوں کو بھی، کبھی بریک فسٹ، کبھی لنچ، کبھی ڈنر اور کبھی شام کی چائے پر مدعو کرلیا کرتا تھا۔ اس طرح سے کئی ایک حضرات بیرسٹر ولیسٹر سے مانوس ہو چکے تھے۔ اس نظام کو قایم رکھتے ہوئے افضل خان نے ولیسٹر سے دو چار روز کے لیے اپنی جاگیر جانے کی اجازت چاہی۔ ان کے ماں باپ دونوں ہی جاگیر میں رہا کرتے تھے، اور تعلیم کی خاطر افضل خان اپنے شہر کے مکان میں آرہے تھے۔ ولیسٹر نے خوشی سے افضل خان کو جاگیر جانے کی اجازت دیدی، اور افضل خان جاگیر چلا گیا۔ جاگیر پہنچ کر افضل خان سے اپنے ماں باپ کو یہ ساری داستان کہہ سنائی، جس کو سن کر ان کے ماں باپ اور تمام دوسرے لوگ حیران اور پریشان ہو گئے اور ماں باپ نے اپنے لخت جگر کو بار بار گلے سے لگایا اور اس کی درازیٔ عمر کے لیے بلائیں لیں اور دعائیں دیتے رہے۔ دو چار روز رہنے کے بعد افضل خان اپنے ماں باپ کے

ساتھ گھر آگیا، اور بیرسٹر ولیسٹر سے اپنے باپ کا تعارف کردیا۔ مگر چونکہ میر علی خان انگریزی نہیں جانتے تھے، اس لیے خود افضل خان نے تعارف کے سلسلے میں دو طرفا ترجمان کا کام انجام دیا۔ میر علی خان نے بیرسٹر ولیسٹر سے ہاتھ بھی ملایا، اور گلے بھی ملے اور اپنی دلی مسرت اور خوشنودی کا اظہار کیا کہ انہوں نے اپنے ایک لوتے عزیز از جان لڑکے افضل خان کی جان بچالی اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ تا زیست یا عمر بھر وہ بیرسٹر [illegible] احسان رہینگے! یہ سن کر بیرسٹر ولیسٹر [illegible] نے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے، آپ کا [illegible] بے قصور اور بے خطا تھا، اس کے باوجود مجسٹریٹ نے اس کو موت کی سزا دیدی تھی، اس لیے [illegible] توسط سے حضور نظام کی خدمت [illegible] اعلیٰ کی اجازت سے ڈیڑھ گھنٹے [illegible] دلائل اور براہین سے یہ ثابت کردیا کہ افضل خان بالکل ہی بے خطا اور بے قصور ہے، اس لیے حق و صداقت اور انصاف کے نام پر میں حضور پر نور سے پر زور طریقے پر اپیل کر رہا ہوں کہ وہ اسی وقت اپنے دست مبارک سے افضل خان کی رہائی کے احکام راست مہتمم جیل کے نام جاری فرمائیں، اور اپنی ڈیوڑھی کے ملازم کے ہاتھ اپنا وہ فرمان اسی وقت روانا فرمائیں، اور خود مجکو بھی آپ کے ملازم کے ساتھ جیل جانے اور مہتمم جیل سے راست ملنے کی اجازت مرحمت فرمائیں تو اس غریب پروری اور ذرا نوازی کے لیے میں عمر بھر آپ کا احسان مند رہونگا۔ حضور نظام نے میری درخواست منظور فرمائی اور اسی وقت اپنا فرمان ڈیوڑھی کے ایک ملازم کے ذریعے روانا کیا، اور ساتھ ہی مجکو بھی جانے کا حکم دیا، چنانچہ میں اسی وقت ڈیوڑھی کے ملازم کے ساتھ جیل گیا اور اس شخص نے اعلیٰ حضرت حضور پر نور بندگان عالی کا فرمان مبارک مہتمم جیل کے حوالے کیا، اور یہ بھی کہا کہ مسٹر افضل خان کو اسی وقت جیل سے رہا کرکے بیرسٹر ولیسٹر کے حوالے کیا جائے۔ یہ سن کر مہتمم جیل نے اعلیٰ حضرت کا فرمان پڑھ کر دیکھا، اور اپنے ایک ماتحت سے کہا کہ افضل خان کو یہاں لے آؤ، چنانچہ

وہ شخص گیا، اور تھوڑی ہی دیر میں افضل خان کو لے آیا۔ افضل خان کے آتے ہی مہتمم جیل نے کہا، افضل خان، تم اعلیٰحضرت حضور پر نور بندگان عالی کے حکم سے رہا کیے جاتے ہو، یہ سنتے ہی افضل خان مجھ سے لپٹ گیا، اور ہم دونوں جیل سے باہر گئے۔ باہر سینکڑوں ہی آدمی ہمارے منتظر تھے۔ ہم دونوں کو گھیرے اور پھول کے ہار پہنائے اور چیئر Chair کرتے ہوئے آپ کے گھر تک لے آئے۔

بیرسٹر ولیسٹر کی اس تفصیل کا ترجمہ افضل خان نے اپنے باپ کو ہندستانی زبان میں سنایا، تو اس کو سن کر میر علی خان نے پھر سے کہا، بیرسٹر صاحب! آپ کا یہی ایک زبردست احسان ہے جس کو میں عمر بھر نہیں بھلا سکتا، اس کا ترجمہ افضل خان نے ولیسٹر کو انگریزی میں کہہ سنایا، اس کے بعد پھر سے ولیسٹر سے ہاتھ ملاتے ہوئے میر علی خان مکان میں چلے گئے، اور افضل خان، بیرسٹر ولیسٹر اور دوسرے احباب دیوان خانے میں چائے خوری میں معروف ہو گئے۔

گھر آنے کے دوسرے ہی روز میر علی خان، اپنے بیٹے افضل خان اور بیرسٹر ولیسٹر کے ساتھ اپنی گئی میں آسمان جاہ کی ڈیوڑھی گئے۔ آسمان جاہ کے پرائیویٹ سکریٹری سے مل کر یہ کہا کہ وہ اپنے بیٹے افضل خان اور بیرسٹر ولیسٹر کے ساتھ آسمان جاہ سے ملنا چاہتے ہیں یہ سن کر سکریٹری نے ایک کاغذ اور قلم دیا کہ آپ اپنی خواہش اس کاغذ پر لکھ دیجیے تو میں خدمتگار کے ذریعے سرکار کے پاس بھجوا دیتا ہوں، چنانچہ میر علی خان نے ہندستانی زبان میں اپنی وہی خواہش کاغذ پر لکھ دی۔ اس کے بعد سکریٹری نے وہ کاغذ ایک ملازم کے ذریعے آسمان جاہ کے پاس بھجوایا۔ اس وقت آسمان جاہ بیٹھے صوفے پر لیٹے حقا پی رہے تھے۔ ملازم نے چاندی کی کشتی میں وہ چٹھی رکھ کر ان کے ملاحظے میں پیش کی۔ چٹھی دیکھ کر آسمان جاہ نے کہا، یہ کیا ہے، ملازم نے کہا، نواب میر علی خان جاگیردار، اور ان کے بیٹے افضل خان، اور ایک انگریز بیرسٹر ولیسٹر سرکار سے ملنا چاہتے ہیں یہ سنتے ہی آسمان جاہ نے جواب دیا، جاؤ ان لوگوں کو اسی وقت ساتھ لے آؤ۔

ملازم واپس گیا، اور فوراً ان تینوں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ان تینوں کے اندر داخل ہوتے ہی آسمان جاہ خوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور آئیے میر علی خان کہاں تھے اتنے عرصے تک کہتے ہوئے ان تینوں کا پرتپاک استقبال کیا، اور میر علی خان سے گلے ملے۔ میر علی خان نے افضل خان کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا یہ غلام زادا افضل خان ہے۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے کہا، ہاں اس کو میں جانتا ہوں، افضل خان نے جھک کر پانچ آداب بجا لائے، آسمان جاہ نے افضل خان کو اپنے گلے لگایا، اور ان کی رہائی پر خدا افضل خان اور باپ میر علی خان کو مبارکباد دی۔ اس کے بعد افضل خان نے انگریزی زبان میں بیرسٹر ولیسٹر کا تعارف آسمان جاہ سے کرایا۔ آسمان جاہ نے خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بیرسٹر ولیسٹر سے ہاتھ ملایا، اور انگریزی میں اس کی خدمات کا اعتراف بھی کیا اور ستائش بھی کی۔ پھر سب صوفوں پر بیٹھ گئے۔ پہلے آسمان جاہ کچھ دیر میر علی خان سے باتیں کرتے رہے۔ میر علی خان نے کہا، سرکار! میں یہاں شہر میں نہیں تھا، اپنی بیوی کے ساتھ جاگیر گیا ہوا تھا۔ یہاں جو کچھ ہوا، اس کا مجھکو مطلق علم نہیں تھا، جب آپ کا یہ غلام زادا افضل خان چند روز پہلے جاگیر آیا تو ہم دونوں کو یہ سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ہم دونوں نے اس کی نئی زندگی پر مبارکباد دی، اور اس کو اپنے گلے سے لگایا۔ اس کے بعد ہم تینوں اپنے گھر آ گئے، اور آج سرکار کی خدمت میں دعوت دینے حاضر ہوا ہوں کہ آئندہ جمعہ کو غریب خانے میں سرکار اپنے دست مبارک سے اس غلام زادے اور بیرسٹر صاحب کو پھول پہنائیں، چنانچہ آسمان جاہ نے خوشی سے دعوت قبول کر لیا، اور غریب خانے میں دونوں کی گلپوشی پر بھی اپنی دلی رضامندی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میر علی خان نے آسمان جاہ سے کہا، سرکار! اسی روز صاحبزادی رحیم النسا صاحبہ کی بھی دعوت ہے، اگر سرکار کی اجازت ہو تو یہ غلام عصرانے کی تمام چیزیں صاحبزادی کی خدمت میں بھجوائے گا، اور سرکار بطور خاص صاحبزادی کو اجازت دیں کہ وہ ہمارے دعوت کو قبول

زمائیں اور وہ تمام چیزیں بلاتکلف نوش زمائیں۔ یہ سن کر مسکراتے ہوئے آسمان جاہ نے کہا، میں صاحبزادی سے ضرور کہونگا کہ وہ آپ کی دعوت قبول کرے، اور آپ جو بھی چیز بھجوائیں بلاتکلف اور خوشی سے کھائے۔ اس پر میر علی خان نے آسمان جاہ کا شکریہ ادا کیا۔ ایسے میں ہوٹل سے بٹلر بڑی بڑی کشتیوں میں چائے، کافی، آئسکریم، کیک، پیسٹری، بسکٹس، جیم کیک، اور ہر قسم کا تر اور خشک میوا لے کر آئے۔ دوسرے ملازمین نے سب کے سامنے چھوٹے چھوٹے خوبصورت میز رکھ دیے اس پر تمام چیزیں سجادی گئیں، اور باقاعدہ سروس شروع ہوگئی۔ آسمان جاہ خود فصیح انگریزی بولتے تھے۔ اس لیے وہ بیرسٹر ولیسٹر سے انگریزی میں ہی مخاطب ہوگئے۔ ولیسٹر نے ساری تفصیل کہہ سنائی۔ اس کے بعد آسمان جاہ نے ولیسٹر کو ان کی غیر معمولی کامیابی پر مبارکباد دی۔ ولیسٹر نے آسمان جاہ کا ... کے بعد میر علی خان ... اجازت چاہی ... سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور آسمان جاہ سے ہاتھ ملانے کے بعد واپس چلے گئے۔

افضل خان نے اپنے باپ میر علی خان کے نام سے دونوں کی گلپوشی کے سلسلے میں رقعے چھپوا لیے تھے۔ یہ رقعے انگریزی اور ہندستانی دونوں زبانوں میں تھے۔ اس رقعے میں یہ لکھا گیا تھا کہ افضل خان کی رہائی کے سلسلے میں نواب آسمان جاہ بہادر امیر پائیگاہ مہمان خصوصی ہونگے اور اپنے دست مبارک سے افضل خان اور بیرسٹر ولیسٹر کی گلپوشی کرینگے۔ رقعے چھپتے ہی میر علی خان اور افضل خان، باپ بیٹے دونوں مل کر نواب آسمان جاہ کی ڈیوڑھی گئے، اور دونوں زبانوں کا ایک ایک رقعہ نواب صاحب کو دیا، اور اسی طرح دو رقعے صاحبزادی رحیم النساء کے نام کے دیے۔ آسمان جاہ نے دونوں رقعوں کو دیکھ کر اپنی دلی مسرت اور خوشی کا اظہار کیا۔ میر علی خان نے عصرانے میں اپنی شرکت اور صاحبزادی رحیم النساء کی قبول دعوت کا وعدہ لے کر اپنے گھر واپس گئے۔ حیدرآباد کے امرائے عظام، عہدے داروں، جاگیرداروں، منصبداروں، جمعداروں، اور مشہور مشہور شہریوں کے نام بھی دعوت نامے گئے تھے، جن میں حیدرآباد اور سکندرآباد کے بعض انگریز اور اینگلو انڈین عہدے دار بھی شامل تھے۔

جمعہ کے روز میر علی خان کے مکان کے وسیع کمپونڈ میں شامیانے نصب کیے گئے تھے۔ انہیں شامیانوں میں عصرانے پارٹی کا انتظام تھا۔ پانسو آدمیوں کے ایٹ ہوم کا انتظام شہر کی ایک قدیم اور مشہور کیٹرنگ کمپنی کو دیا گیا تھا۔ صبح سے میدان کی صفائی شروع ہوگئی تھی اور بار بار پانی کا چھڑکاؤ بھی ہو رہا تھا۔ اس کمپنی کو میز کرسیوں اور تخت وغیرہ کی سپلائی کا کنٹراکٹ بھی دیا گیا تھا۔ پھولوں اور پودوں کے کئی کونڈے ایک باغ سے حاصل کیے گئے تھے۔ شامیانے کے اندر اور باہر روشنی کا ٹھیکا ایک دوسری کمپنی کو دیا گیا تھا۔ اس طرح آتش بازی کے سامان کی سپلائی کا ٹھیکا بھی ایک تیسری کمپنی کو دیا گیا تھا۔ چار عدد قد آدم پھولوں کے گجروں کا آرڈر چار معیار کے ایک مشہور پھولارے کو دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک گجرا میر علی خان کے لیے تھا، اور دوسرا افضل خان، اور تیسرا بیرسٹر ولیسٹر کے لیے تھا۔ چوتھا گجرا مہمان خصوصی نواب آسمان جاہ بہادر کے لیے تھا، اور یہ گجرا ان تینوں گجروں سے بڑا تھا۔ دوسری طرف زنانے میں ان کی ماں اور دوسری رشتے دار عورتوں کی نگرانی میں بلکل ایسے ہی انتظامات ہو رہے تھے۔ زنانے میں بھی تقریباً دوسو عورتوں کی دعوت تھی، اور افضل خان کی ماں نے گلپوشی کے انتظامات بھی بلکل ایسے ہی تھے، جیسے باہر گجروں کا انتظام کیا گیا تھا، زنانے میں بھی ایٹ ہوم اور آتشبازی کے الگ انتظامات تھے، اور اندر کاماں عورتیں اور مزدورنیاں کام کر رہی تھیں۔ صبح ناشتے کے بعد سے میر علی خان، افضل خان اور ان کے دوست احباب اور عزیز اقربا سب ہی انتظامات میں مصروف ہوگئے تھے۔ شام کے (۳) بجے تک پورے انتظامات مکمل ہوگئے تھے۔ میزوں پر سامان چنا شروع کر دیا گیا تھا۔ ۳½ بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ مہمانوں کے استقبال میں میر علی خان، افضل خان، اور ان کے عزیز اقربا اور دوست احباب تھے۔ مہمان میزوں کے اطراف کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے۔ ٹھیک پونے (۴) بجے نواب آسمان جاہ بہادر آئے تو ... نے شہوار، بیرسٹر ولیسٹر ان کا استقبال

پہلے ہی سے پولیس بینڈ کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ نواب صاحب آتے ہی بینڈ نے سامعہ نوازی شروع کر دی۔ آسمان جاہ کے بیٹھنے کا انتظام درمیان میں تھا۔ چند عدد بڑے تختوں پر میز کرسیاں جما دی گئی تھیں۔ اس پر آسمان جاہ کے علاوا، میر علی خان، افضل خان، اور بیرسٹر ویسٹر کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ یہ چاروں آدمی اوپر گئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد تالیوں کی گونج میں میر علی خان نے آسمان جاہ کی گلپوشی کی۔ گجرا اتنا بڑا اور گھنا تھا کہ آسمان جاہ کا صرف چہرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد میر علی خان نے ایک اور بڑا گجرا دیا، اور آسمان جاہ سے درخواست کی یہ ہار بیرسٹر ویسٹر کو پہنایا جائے۔ اس کے بعد دوسرا ہار اپنے بیٹے افضل خان کے لیے پیش کیا۔ ان دونوں کی گلپوشی کے بعد ایک ہار بیرسٹر ویسٹر نے آسمان جاہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ یہ ہار افضل خان کے باپ میر علی خان کو پہنایا جائے۔ آخری گلپوشی کے بعد پھر سے بینڈ بجنا شروع ہوا، اور ٹھیک (۴) بجے سے اٹ ہوم شروع ہوا۔ اٹ ہوم میں چائے۔ کافی۔ آئسکریم۔ لیمن۔ کیک۔ پیسٹری۔ بسکٹ۔ پلم کیک۔ دیسی کھاری چیزیں، خشک اور تر میوں وغیرا افراط سے تھا۔ سروس شروع ہوئی۔ بوائے بٹلر عالا درجے کا نفیس لباس پہنے ہوئے تھے، اور کراکری بھی عالا درجے اور نفیس قسم کی تھی۔ بوائے بٹلر کے ساتھ افضل خان کے کئی ایک نوجوان عزیز اقربا رشتے دار اور دوست احباب پھر رہے تھے، اور یہ دیکھ رہے تھے کہ کہیں کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے، بہرحال یہ اٹ ہوم نہایت ہی کامیاب رہا، اور برابر دو گھنٹے تک چلتا رہا۔ اس کے بعد سر شام آتش بازی شروع ہوئی۔ اس میں رنگا رنگ اور مختلف قسم کی آتش بازی تھی، جس کو دیکھ کر مہمان خصوصی نواب آسمان جاہ بہادر اور دوسرے تمام مہمان بے حد خوش اور محظوظ بھی ہوئے۔ زنانے میں بھی بالکل اسی قسم کا انتظام تھا۔ اندر سروس کے لیے عورتوں کو متعین کیا گیا تھا۔ اٹ ہوم کے بعد زنانے میں بھی مردانے کی طرح آتش بازی کا انتظام تھا۔ اس انتظام میں مصروف ہونے سے پہلے میر علی خان اور افضل خان نے کئی کشتیوں میں رحیم النسا کے لیے تمام چیزیں اپنی نگرانی میں نکلوا کر، دو مجھیوں میں یہ سب سامان رکھ کر اپنے گھر کی مستند عورتوں کے ذریعے بھجوا دیا تھا، تا کے ٹھیک (۴) بجے شام اٹ ہوم کا سامان اور ایک بڑا گجرا رحیم النسا کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ چونکے باپ نے پہلے سے اجازت دے رکھی تھی، اس لیے رحیم النسا نے خوشی سے وہ چیزیں قبول کر لیں اور کھائیں بھی۔

آتش بازی کی تقریب شام کے (۷) بجے ختم ہوئی۔ اس کے بعد پہلے آسمان جاہ گئے، اور ان کو سبھوں نے مل کر رخصت کیا، اور ان کی تشریف آوری، اور اتنی دیر تک بیٹھنے کی جو زحمت گوارا کی اس کا بھی شکریا ادا کیا۔ اس کے بعد سب ہی مہمان رخصت ہو گئے۔ بیرسٹر ویسٹر افضل خان کے اس سلوک سے بے حد متاثر اور خوش بھی ہوا۔ ایک ہفتے تک رہنے کے بعد اس نے اپنے وطن جانے کی اجازت چاہی تو افضل خان نے اس کو جواب دیا کہ آپ ایک آدھ ہفتا اور ٹھہر جائے، اس لیے کہ نواب آسمان جاہ بہادر نے مجھ سے کہا ہے کہ ان کی لڑکی کی صحت یابی کی خوشی میں وہ ایک گرانڈ اٹ ہوم دینا چاہتے ہیں، جس میں وہ آپ کو بھی خصوصی طور پر مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ وہ امیر پائیگاہ اور حیدر اباد کے وزیر اعظم ہیں، آپ ان کا اٹ ہوم دیکھ کر حیران ہو جائنگے!

اس زمانے میں حیدر اباد میں پہلی بار پلیگ آیا تھا، اور یہ دبا خوب زوروں پر چل رہی تھی۔ روزانا سینکڑوں آدمی مرض طاعون کا شکار بن رہے تھے۔ اس مرحلے میں وہ مجسٹریٹ بھی پلیگ کا شکار بن گیا تھا، جس نے بے گناہ افضل خان کو بلا وجہ بھی موت کی سزا دیدی تھی، اور یہ موت کی سزا اس نے لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک کے مجبور کرنے پر دی تھی۔ مس کرک پیٹرک ایک نوجوان حسین عورت تھی، جو افضل خان کی جانی دشمن بن گئی تھی۔ افضل خان پر پولیس نے یہ غلط، بے بنیاد اور جھوٹا الزام لگایا تھا کہ اس نے

افیون ملی ہوئی مٹھائی آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النسا کے پاس بھجوائی تھی، تاکہ یہ زہریلی مٹھائی کھانے کے بعد رحیم النسا مر جائے۔ یہ مٹھائی اصل میں آسمان جاہ کے مصاحب خاص عبدالقادر نے خود رحیم النسا کی خدمت میں پیش کی تھی، اور اس سے یہ کہدیا تھا کہ یہ عالا درجے کی نفیس اور شیریں اور نہایت ہی لذیذ مٹھائی آپ کے عاشق زار نواب افضل خان بہادر نے بطور خاص آپ کے لیے بھجوائی ہے، اور یہ ہدایت کی ہے کہ چونکہ یہ مٹھائی مر شاہی حلوائی کے ذریعے خاص طور پر آپ کے لیے تیار کرائی گئی ہے، اس لیے اس کو رکھ کر آپ خود ہی کھائیں، کسی اور کو نہ دیں۔ اس جعلسازی، مکاری اور فریب دھوکہ بازی سے عبدالقادر کا واحد مقصد یہ تھا کہ رحیم النسا سے زر و جواہر اور بھاری تحفے تحایف حاصل کرے، اور آخرکار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ رحیم النسا نے افیون ملی ہوئی مٹھائی کھائی اور اس پر زہر کا فوراً اثر ہوگیا، اور وہ سخت بیمار پڑ گئی، چنانچہ آسمان جاہ نے لیڈی ڈاکٹر کرک پیٹرک کو بلوایا۔ اس نے رحیم النسا کا علاج کیا، اور رحیم النسا صحت یاب ہوگئی۔ چونکہ زہر کا کیس تھا، اس لیے پولیس نے اپنی کارروائی شروع کردی۔ رحیم النسا کی بیٹی کی دونوں مامائیں اور عبدالقادر نے پولیس میں یہ بیان دیا کہ یہ مٹھائی افضل خان کے گھر کی ایک عورت لے آئی تھی، اس بنا پر پولیس نے اقدام قتل کی علت میں فوراً افضل خان کو گرفتار کرکے عدالت میں پیش کردیا، اور ادھر افضل خان خود حیران اور پریشان ہے کہ یہ ماجرا کیا ہے، اس لیے کہ اس نے رحیم النسا کو ہرگز ہرگز مٹھائی نہیں بھجوائی تھی۔ اس نوبت پر مس کرک پیٹرک نے اپنا خاص رول ادا کیا کہ کسی طرح افضل خان کو موت کی سزا دلوا جائے، اس لیے اس نے عبدالقادر اور دونوں ماماؤں کو بھی افضل خان کے خلاف بیان دینے کے لیے راضی کرلیا، اور پولیس میں خود بھی اس نے بیان دیا کہ میں نے رحیم النسا کا علاج کیا ہے، اور میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ افضل خان نے افیون ملی ہوئی مٹھائی بھجوائی تھی، تاکہ رحیم النسا کھانے کے بعد مر جائے، اور وہ رحیم النسا کو مارنا اس لیے چاہتا تھا کہ وہ اس کا عاشق زار تھا، مگر چونکہ رحیم النسا کے حاصل کرنے میں اس کو سو فیصد ناکامی اس کو سو فیصد ناکامی ہوگئی تھی، اس لیے اس نے یہ ذلیل حربا اختیار کیا تھا کہ زہریلی مٹھائی بھجوائی تھی تاکہ اس کے کھانے کے بعد رحیم النسا ختم ہو جائے۔ افضل خان سے کرک پیٹرک کی دشمنی کا سبب یہ تھا کہ لندن میں افضل خان اور مس کرک پیٹرک نے سات سال تک ایک ساتھ تعلیم پائی تھی، جب افضل خان نے اپنے وطن لوٹنے سے پہلے مس کرک پیٹرک سے شادی کا مطالبہ کیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تمہارے وطن حیدرآباد آکر تم سے شادی کروں گی۔ افضل خان اپنے وطن چلے آیا، اور ادھر کرک پیٹرک نے ایک بیرسٹر ویسٹر سے شادی کرلی۔ ایک سال کے بعد اس سے علحدگی اختیار کرکے اور اپنے بچے کو اس کے حوالے کرکے حیدرآباد چلی آئی۔ یہاں آنے کے بعد بھی اس نے افضل خان سے شادی پر رضامندی ظاہر نہیں کی، اور اس کو دھوکے پر دھوکا دیتی رہی۔ افضل خان کی وجہ سے اس کی میڈیکل پریکٹس زوروں پر چلنے لگی۔ دیوڑیوں میں اس کا جانا آنا تھا، اور نواب آسمان جاہ کی دیوڑی میں بھی آیا کرتی تھی، اس بنا پر رحیم النسا سے بھی اس کے تعلقات گہرے تھے۔ غلط طریقے پر سہی، ماماؤں اور عبدالقادر کے ذریعے جب اس کو یہ معلوم ہوگیا کہ افضل خان رحیم النسا کا عاشق صادق ہے، اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، اور جب اس کو رحیم النسا کے حاصل کرنے میں ناکامی ہوگئی جس کے نتیجے کے طور پر افضل خان نے یہ چال چلی کہ رحیم النسا کے ہاں افیون ملی ہوئی مٹھائی بھجوائی تاکہ اس مٹھائی کے کھانے کے بعد رحیم النسا مر جائے تو کرک پیٹرک نے افضل خان سے بدلا لینے کی ٹھان لی، اور بحیثیت لیڈی ڈاکٹر پولیس افضل خان کے خلاف بیان دیا، اور جب پولیس نے افضل خان کا کیس عدالت میں پیش کیا تو پیشی کے روز خود کرک پیٹرک مجسٹریٹ کے چیمبر میں پہنچ گئی، اور اس کی پیشی کے چپراسی سے مجسٹریٹ سے کہلوایا کہ چیمبر میں ایک انگریز میم صاب آئی ہیں، اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ انگریز میم صاب کا نام سن کر مجسٹریٹ کے منھ میں پانی آگیا اور فوراً چیمبر میں چلا گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک نوجوان حسین انگریز میم صاب اس کے سامنے کھڑی ہے۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے دریافت کیا کہیے میم صاحب میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ اس پر کرک پیٹرک نے کہا، میں آپ کی ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہوں

افضل خان پر پولیس نے اقدام قتل کا جو الزام لگایا ہے، وہ بلکل صحیح ہے، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ قاتل افضل خان کو موت کی سزا سنا دیں۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے کہا "اس کا مجکو کیا صلا ملے گا؟" تو مسکرا کر کرک پیٹرک نے جواب دیا "مجسٹریٹ صاحب! آپ فکر نہ کریں، آپ جو بھی چاہیں وہ پورا ہو کر رہے گا، آپ پہلے افضل خان کو موت کی سزا سنا دیجے۔ مجسٹریٹ چیمبر سے عدالت میں آیا، اور تمام مباحث سننے کے بعد اس نے اپنا یہ فیصلا دیا کہ چونکے پولیس اور لیڈی ڈاکٹر کے بیانات سے یہ ثابت ہے کہ ملزم افضل خان نے آسمان جاہ کی لڑکی رحیم النسا کے ہاں افیون ملی ہوئی مٹھائی بھجوائی تھی، تا کہ اس کے کھانے کے بعد زہریلے اثرات سے رحیم النسا مر جائے، اس لیے اقدام قتل کی علت میں، میں افضل خان کو موت کی سزا دیتا ہوں، جس کا نفاذ عالا حضرت حضور پر نور کی منظوری کے بعد ایک مقررا تاریخ پر ہوگا۔ اس فیصلے کے وقت لڑکی کے والد آسمان جاہ بھی خد عدالت میں بیٹھے ہوے تھے، اور سب لوگ حیران اور پریشان تھے کہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سزا کس طرح دی گئی ہے۔ کسی کو وہم دگمان بھی نہیں تھا کہ اس پہلے مرحلے میں افضل خان کو موت کی سزا دیدی جائے، اور یہ سزا اصل میں مس کرک پیٹرک کا کارنامہ تھا، جس سے صرف حاکم عدالت اور کرک پیٹرک دونوں ہی واقف تھے۔

افضل خان کو موت کی سزا سنا کر مجسٹریٹ گھر گیا، اور خد بھی پلیگ کا شکار بن گیا۔ وہ اکیلا رہتا تھا، باہر پہرے کے سپاہی تھے، گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ دوسرے روز مس کرک پیٹرک مجسٹریٹ کا شکریا ادا کرنے اس کے گھر آئی، پہلے تو پہرے والوں نے اس کو اندر جانے سے روکا، مگر اپنے آپ کو لیڈی ڈاکٹر بتا کر وہ اندر گئی اور دیکھا کہ مجسٹریٹ مرض پلیگ میں مبتلا ہے، اور اس کا حال بہت ہی برا ہے۔ اس لیے اس کے سر اور پیٹ پر پانی کی پٹیاں رکھیں تا کہ جسم ٹھنڈا ہو، مجسٹریٹ نے آنکھیں کھولیں اور کرک پیٹرک کو دیکھ کر پہچانا، اور یہ کہا کہ آپ آئی ہیں ڈاکٹر صاحب، اس نے جواب میں، ہاں میں آئی ہوں، آپ کا علاج کر رہی ہوں، آپ گھبرائیں نہیں، میں اپنے علاج سے آپ کو ٹھیک کر دوں گی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجسٹریٹ کا انتقال ہو گیا۔

لیڈی ڈاکٹر باہر آئی اور پہرے داروں کو مجسٹریٹ کی موت کی اطلاع کر کے اپنے گھر چلی گئی اور خد بھی پلیگ کا شکار بن گئی۔ مرض کا حملا شدید تھا، اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

جب پولیس کو اس کے انتقال کی خبر ملی تو پولیس نے فوراً افضل خان کو اس کی موت کی اطلاع دی، اس لیے کہ افضل خان نے پہلے ہی سے پولیس کو یہ معلوم کرا دیا تھا کہ اس کے گھر مقیم شخص بیرسٹر ویبسٹر اصل میں لیڈی ڈاکٹر مس کرک پیٹرک کا شوہر ہے۔ پولیس کی اطلاع کے فوراً بعد پولیس کے ساتھ افضل خان اور بیرسٹر ویبسٹر مس کرک پیٹرک کے گھر گئے اور پولیس کی موجودگی میں ان دونوں نے دیکھا کہ مس کرک پیٹرک مری پڑی ہے۔ پولیس کی اجازت سے اس کے شوہر بیرسٹر ویبسٹر اور افضل خان نے مقامی بشپ کے ذریعے اس کے دفنانے کے انتظامات پورے کر لیے۔ دوسرے ہی روز افضل خان بیرسٹر ویبسٹر کو اپنے ساتھ کوتوال شہر کے پاس لے گئے اور اپنے ساتھ مس کرک پیٹرک مرحوم کی چچی لیڈی ہیرٹس بورٹس، مقیم برائٹن انگلینڈ کا وہ لیٹر بھی اپنے ساتھ لیتے گئے جس میں لیڈی ہیرٹس بورٹس نے افضل خان کو لکھا تھا کہ مس کرک پیٹرک نے لندن کے ایک مشہور بیرسٹر ویبسٹر سے شادی کر لی ہے، اور ان بیرسٹر سے کرک پیٹرک کو ایک لڑکا بھی ہے۔ بیرسٹر ویبسٹر کو مس کرک پیٹرک مرحوم کا شوہر اور وارث حقیقی ثابت کرنے کے لیے افضل خان کا بیان اور لیڈی ہیرٹس بورٹس کا لیٹر بہت کافی تھا، اس لیے ان دونوں واقعات اور کافی ثبوت کی موجودگی میں کوتوال شہر نے شہر کے مجسٹریٹ کی اجازت سے مس کرک پیٹرک کی تمام جائیداد منقولا اور غیر منقولا کا وارث حقیقی قرار دیتے ہوے اس کے مکان میں رہنے اور اس کا سب سامان اور روپیا پیسا وغیرا استعمال کرنے کی اجازت دیدی، چنانچے اسی روز سے بیرسٹر ویبسٹر اپنی مرحوما بیوی مس کرک پیٹرک کے مکان میں رہنے لگا۔ اس کا روپیا پیسا بھی اپنے قبضے میں لے لیا، اور اس کو بھی استعمال کرنے لگا، اور پکوان کے لیے گھر میں پرانے جیلر اور دوسرے ملازم بھی تھے۔ افضل خان بھی روز انا اس کے گھر آیا کرتے تھے، اور یہ دونوں مل کر اس کی گلی میں سیر اور تفریح کو جا

جایا کرتے تھے، اور افضل خان بیرسٹر دلیسٹر کو حیدرآباد اور سکندرآباد کے اپنے بعض انگریز اور اینگلو انڈین اور حیدرآباد میں دوست احباب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ مس کرک پیٹرک نے جو مکان خریدا تھا وہ بڑا اور عالا درجے کا مکان تھا، اور یہ مکان دلیسٹر کو پسند بھی آگیا۔ اس کے علاوہ سواری کے لیے عالا درجے کی نئی بگی بھی تھی، اور گھر میں پرانے بٹلر اور دوسرے ملازم بھی خدمت کے لیے تھے، نیز کرک پیٹرک نے زر و جواہرات اور کافی نقد رقم بھی چھوڑی تھی، اس لیے ان آسائشوں اور سہولتوں کے پیش نظر بیرسٹر دلیسٹر نے سکندرآباد کی اینگلو انڈین نوجوان لڑکی سے شادی کرلی اور حیدرآباد کی عدالتوں میں پریکٹس بھی شروع کردی، اور یہاں مستقل طور پر وہ بس گیا۔

ایک روز افضل خان نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ جب نواب آسمان جاہ بہادر کی لڑکی رحیم النسا خود ہی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے تو آپ لوگ نواب صاحب کے ہاں میرا پیام کیوں نہیں لے کر جاتے۔ یہ سن کر ماں باپ دونوں نے جواب دیا کہ ہاں بات واجبی ہے، ان کی لڑکی تمہیں سے شادی کرنا چاہتی ہے، اس لیے نواب صاحب کے ہاں تمہارا پیام ضرور جانا چاہیے۔ افضل خان نے اپنے باپ میر علی خان سے کہا، چونکہ ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے، اس لیے میرا پیام آپ خود نواب صاحب کے ہاں لے جائیے، اور آپ اکیلے نہ جائیں، بلکہ ہمارے دو ایک معمر عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ میر علی خان ایک روز اپنے ساتھ اپنے ہم عمر دو اور عزیزوں کو ساتھ لیتے ہوئے آسمان جاہ کی دیوڑی گئے۔ ان کے سکریٹری سے ملے اور نواب صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ سکریٹری نے ان کی چٹھی نواب صاحب کے ہاں ملازم کے ذریعے بھجوادی۔ ملازم نے وہ چٹھی لے جاکر نواب آسمان جاہ کے ملاحظے میں پیش کی۔ نواب صاحب نے ملازم سے کہا کہ ان تینوں حضرات کو اپنے ساتھ یہاں لاؤ، چنانچہ ملازم واپس گیا اور اپنے ساتھ ان تینوں حضرات کو لے آیا۔ یہ لوگ اندر داخل ہوتے ہی جھک کر آداب بجالایا، آسمان جاہ نے اٹھ کر ان تینوں سے ہاتھ ملایا، اور پھر سب صوفوں پر بیٹھ گئے۔ آسمان جاہ نے ملازم سے کہا کہ بٹلر سے کہو کہ کافی لے آئے۔ یہ سن کر جو حکم سرکار کہتے ہوئے ملازم چلا گیا۔ آسمان جاہ نے میر علی خان سے ان دو حضرات کے بارے میں دریافت کیا تو میر علی خان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں میرے قریبی عزیز ہیں، اور ان میں سے ایک کا نام ثابت علی خان اور دوسرے کا باسط علی خان ہے، اور یہ دونوں منصبدار ہیں۔ اس کے بعد آسمان جاہ نے میر علی خان سے دریافت کیا، کیسے آنا ہوا آج آپ کا۔ اس کے جواب میں میر علی خان نے کہا، سرکار! میں اپنے لڑکے افضل خان کا پیام لے کر آیا ہوں۔ سرکار تو بخوبی جانتے ہیں کہ میرا لڑکا لائق و فائق اور عالا تعلیم یافتہ ہے، لندن میں سات سال رہ کر اس نے آرکیٹکچر کی عالا ڈگری حاصل کی ہے، اور اب یہاں ام۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہا ہے، اسی سال امتحان بھی دیگا، اور یہ تو سرکار پر بہتر طریقے پر واضح ہے کہ یہ میرا ایک لوتا لڑکا ہے، میری ساری جائیداد، مکانات وغیرہ اور جاگیر کا بھی وہی واحد مالک ہے۔ وہ عالا تعلیم یافتہ ہے، اور اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی، اور سرکار اس وقت اس کی عمر (۲۶) سال کی ہے، ان تمام خوبیوں کا لحاظ کرتے میں سرکار والا تبار سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کو دامادی طور پر اپنا بچا سمجھتے ہوئے اپنی غلامی میں قبول فرمائیں تو میں ہمیشا ہمیشا کے لیے سرکار کا ممنون احسان رہوں گا۔ سرکار! میں اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوں کہ سرکار امیر پائیگاہ اور وزیر اعظم حیدرآباد ہیں، اور میں ایک معمولی سا جاگیردار، ہم دونوں میں آفتاب اور ذرے کا فرق ہے، لیکن اس کے باوجود موجودہ حالات کی روشنی میں، میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ کی لڑکی صاحبزادی رحیم النسا کے لیے اپنے لڑکے افضل خان کے پیام دینے کی جرات کروں۔ مجھ کو یقین کامل ہے کہ سرکار والا تبار اپنے اس ادنا خادم کی گذارش کو ضرور بالضرور شرف قبولیت بخشینگے۔ یہ سنکر مسکراتے ہوئے آسمان جاہ نے کہا، میں بہتر طریقے پر جانتا ہوں آپ کا لڑکا افضل خان نہایت ہی قابل اور لندن پلٹ بھی اور وہ اسی وقت ام۔ اے کی تعلیم پا رہا ہے۔ ایسے میں بوڑھے بٹلر دو چار کشتیوں میں کافی کیک۔ پیسٹری بسکیں و تر اور خشک میوا وغیرا وغیرا لے کر آئے اور دوسرے ملازمین سامنے چھوٹے چھوٹے خوبصورت میزوں پر پورا سامان جمادیا، اور پھر باقاعدا سرویس شروع

کردی۔ یہ جلدوں کافی بھی پی رہے تھے اور کھا بھی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں آپ کے لڑکے سے بہتر طریقے پر واقف ہوں، وہ آپ کے ساتھ کبھی کبھار آیا کرتے تھے۔ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں خوبیوں سے متصف ہے، اور لڑکی صاحب کردار بھی ہے۔ حالیا کیس میں اس نے بڑی ثابت قدمی کا ثبوت دیا، اور ایک نالائق مجسٹریٹ کے غلط طریقے پر سزا دینے کے بعد جیل بھی چلا گیا جس وقت حاکم عدالت نے اس کو موت کی سزا سنائی تھی، میں خدبی حاکم کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ خد مجھکو سخت ناگوار گذرا، اور روحی تکلیف ہوئی کہ ایک بے خطا اور بے گناہ نوجوان کو مجسٹریٹ نے غلط طریقے پر سخت ترین سزا دیدی تھی۔ اس پر عدالت میں موجود سب ہی لوگ برہم اور مشتعل ہو گئے تھے، مگر آپ کے لڑکے نے اس غلط سزا کا کوئی اثر نہ لیا اور پولیس کے ہاتھ جیل چلا گیا۔ بیرسٹر ولیسٹر نے کمال ہی کر دیا کہ حضور نظام تک رسائی حاصل کر کے آپ کے بے گناہ اور بے قصور لڑکے کے لیے رہائی کے احکام حاصل کر لیے۔ اس وقت سے خد مجھکو بھی آپ کے لڑکے سے محبت سی پیدا ہو گئی ہے، رہا آپ کا پیام، مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ میری لڑکی خد بھی آپ کے لڑکے کو چاہتی ہے تو اس سے بہتر اور کون رشتہ ہو سکتا ہے، مگر میر علی خان، آپ جانتے ہیں کہ حضور نظام میرے سالے ہیں یہ لڑکی ان کی بڑی بہن کی یادگار ہے، میں آج کل میں حضور کے پاس جا کر آپ کا پیام ان کو سناؤں گا، اور وہاں سے اجازت چاہونگا کہ آیا آپ کی بھانجی افضل خان کے نکاح میں دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ مجھکو یقین کامل ہے کہ حضور والا اس پیام کو ناپسند نہیں کریں گے اس طرح سے ان کی رضامندی کے بعد ہی میں آپ کو قطعی جواب دے سکونگا۔ یہ سن کر میر علی خان اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے آسمان جاہ کی ذرہ نوازی کا دلی شکریہ ادا کیا۔ تقریبًا ایک گھنٹے کے بعد ان تینوں کی واپسی ہوئی۔ آسمان جاہ نے اٹھ کر ان تینوں کو رخصت کیا، اور ان تینوں حضرات نے جھک کر آسمان جاہ کی خدمت میں آداب بجا لائے، اور واپس ہو گئے۔ گھر آنے کے بعد میر علی خان اور ان کے دونوں عزیزوں نے آسمان جاہ سے جو کچھ بات چیت رہی سارا حال احوال افضل خان اور ان کی ماں سے کہہ سنایا۔ چونکہ یہ خبر خوش آیند تھی، اس لیے ان دونوں نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ دوسری طرف نواب آسمان جاہ

دوسرے ہی روز حضور نظام نواب میر محبوب علی خان بہادر کی کوٹھی گئے اور مصاحب خاص کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع کروائی تو حضور نے انہیں فورًا دیوڑی میں بلوا لیا۔ یہ دیوڑی میں گئے اور حضور کو جھک کر پانچ آداب بجا لائے۔ حضور کے حکم سے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئے۔ آسمان جاہ کے آنے کے بعد حضور نظام نے اپنے مصاحبوں کو حکم دیا کہ وہ چائے کافی وغیرہ فورًا لے آئیں۔ یہ سن کر مصاحبوں نے جو حکم سرکار کہتے ہوئے آداب بجا لایا اور فورًا چلے گئے۔ ادھر نظام آسمان جاہ سے مخاطب ہو گئے۔ خیر خیریت کے بعد نظام نے خد ہی دریافت کیا کہ کیسے آنا ہوا۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے کہا، سرکار آپ کی بھانجی رحیم النسا کے لیے ایک پیام آیا ہے۔ نظام نے دریافت کیا، کس کا پیام ہے، وہ لڑکا کون ہے، اور کس کی اولاد ہے؟ (اتنے میں والے بٹلر اور مصاحبین وغیرہ کچھ کشتیوں میں کافی اور کھانے پینے کی مختلف چیزیں لے کر آئے اور دونوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے میزوں پر پورا سامان رکھ کر سروس شروع کر دی۔ نظام اور آسمان جاہ کافی بھی پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے) اس کے جواب میں آسمان جاہ نے کہا، سرکار، لڑکے کا نام افضل خان ہے، یہ میر علی خان جاگیردار کا اکلوتا لڑکا ہے۔ میر علی خان صاحب جائیدادی ہے۔ یہ میرے ہاں اکثر و بیشتر آیا کرتے ہیں، اور ان سے میرے قدیمانہ دوستانہ تعلقات ہیں یہ کبھی کبھار اپنے ساتھ لڑکے کو بھی لایا کرتے ہیں۔ لڑکا نوجوان حسن صورت اور حسن سیرت دونوں خوبیوں سے متصف ہے۔ لندن میں سات سال تک آکسفورڈ کی ڈگری حاصل کی ہے، اور اب یہاں ام۔ اے کی تیاری کر رہا ہے۔ یہ سن کر درمیان میں نظام نے کہا، لڑکا عالا تعلیم یافتہ ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آسمان جاہ نے کہا، سرکار یہ وہی افضل خان ہے جس کو حاکم عدالت نے غلط طریقے پر موت کی سزا سنا دی تھی، اور بیرسٹر ولیسٹر نے ریزیڈنٹ کے توسط سے سرکار کے حضور میں اس کا کیس پیش کیا تھا سرکار نے اپنی دیوڑی میں وہیں انگریزی میں بیرسٹر کو آنے اور بحث کرنے کی اجازت دیدی تھی، چنانچہ تقریبًا دو گھنٹے تک بیرسٹر ولیسٹر نے انگریزی میں سرکار کے سامنے بحث کی تھی۔ اسی بیرسٹر کی بحث کی روشنی میں سرکار نے افضل خان کی موت کی سزا منسوخ کر کے اس کی رہائی کا حکم صادر فرمایا تھا، اور حضور والا کا وہی حکم لے کر بیرسٹر ولیسٹر جیل گیا، اور جیل کے ہام سرکار کا حکم دکھا کر افضل خان کو جیل سے چھڑا لایا۔

یہ سنتے ہی نظام نے کہا، آہا یہ وہی افضل خان ہے۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے جواب دیا، جی ہاں سرکار یہ وہی بے خطا اور بے قصور افضل خان ہے جو سرکار کے منصفانہ فیصلے کی بنا پر مرتے مرتے بچ گیا۔ اس کے بعد نظام نے کہا کہ حاکم عدالت نے بالکل غلط طریقے پر اس کو موت کی سزا دی تھی۔ جی ہاں سرکار بالکل سچ ہے کہ حاکم عدالت نے سراسر غلط طریقے پر سزا سنائی تھی۔ سزا سنانے وقت میں خود بھی عدالت میں حاکم عدالت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سزا سن کر مجھکو بھی بڑا ہی دکھ ہوا تھا، اور عدالت میں جتنے بھی لوگ موجود تھے، حاکم عدالت کو بری بری گالیاں دے رہے تھے۔ سزا سنانے کے بعد وہ ایک منٹ بھی نہیں ٹھہرا اٹھکے چیمبر میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں خود بھی اٹھکا اپنے گھر چلا گیا تھا۔ آسمان جاہ کی یہ باتیں سن کر نظام نے دریافت کی۔ لڑکا تو اچھے کردار کا معلوم ہوتا ہے، یہ سن کر آسمان جاہ نے کہا، جی ہاں سرکار، نہایت ہی قابل اور لائق فائق بھی ہے، میں نے اس کو کئی بار باپ کے ساتھ دیکھا ہے، نوجوان بھی ہے اور حسین بھی ہے۔ آپ کی بھانجی کے لیے اچھا جوڑا ہے۔ اس پر نظام نے کہا، اب تو اس پیام کو قبول کر لینا چاہیے۔ آسمان جاہ نے جواب دیا، سرکار کا خیال بہتر ہے، خود مجھے بھی اس سے اتفاق ہے، صرف سرکار کی منظوری کی ضرورت ہے۔ اگر حضور والا تبار اس غلام کو اجازت دیں تو میں میر علی خان کو بلوا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیے دیتا ہوں۔ نظام نے کہا، خوشی سے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کر دو۔ اس کے بعد آسمان جاہ، واپسی کی اجازت چاہی، اور نظام کا شکریہ ادا کرتے ہوے اپنی دیوڑھی واپس آ گئے۔ اپنی دیوڑھی آنے کے بعد آسمان جاہ نے اپنے ایک مصاحب خاص کو بگھی میں بٹھا کر میر علی خان کے گھر بھجوایا، اور یہ کہلوایا کہ وہ اسی وقت اس بگھی میں ان کی دیوڑھی کو آ جائیں۔ مصاحب جس وقت گیا تھا، میر علی خان اور افضل خان دونوں بھی گھر ہی پر تھے۔ مصاحب نے میر علی خان سے کہا کہ سرکار نے آپکو یاد فرمایا ہے، اور اسی وقت آنے کے لیے کہا ہے، چنانچہ میر علی خان مصاحب کے ساتھ ہو لیے اور اسی بگھی میں دیوڑھی کو گئے۔ مصاحب کے ساتھ ہی آسمان جاہ کے پاس پہنچ گئے، آسمان جاہ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا، اور ہات بھی ملایا، پھر دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ آسمان جاہ نے میر علی خان سے کہا کہ وہ حضور نظام کے ہاں کل گئے تھے، ان سے پیام کا ذکر کیا تھا، حضور نظام نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی ہے (ایسے میں کافی اور دوسرا سامان آ گیا۔ بٹلر اور دوسرے ملازم سروس کر رہے تھے۔ یہ دونوں کافی بھی پی رہے تھے، اور کھا بھی رہے تھے، اور باتیں بھی کر رہے تھے۔) یہ سن کر میر علی خان نے آسمان جاہ

اور نظام دونوں کا بھی شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد میر علی خان نے کہا، سرکار بطور خود شادی کی تاریخ مقرر فرما دیں تو خادم اس پر عمل کرے گا۔ اس پر آسمان جاہ نے کہا کہ میں نے ایک انگریز کرنل اور دوسرے احباب سے وعدہ کیا ہے کہ میری لڑکی رحیم النساء کی صحت یابی کے سلسلے میں ایک گرانڈ اٹ ہوم پارٹی دونگا، جس میں دوسرے ایک ہزار افراد کے علاوہ، خود حضور نظام اور رزیڈنٹ حیدرآباد بھی شریک رہینگے۔ اس اٹ ہوم میں آپ اور آپ کا لڑکا افضل خان بھی رہے گا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوے میں افضل خان کو حضور نظام کی خدمت میں پیش کر دونگا، اس طرح سے وہ آپ کے لڑکے کو خود بھی دیکھ پائینگے۔ اٹ ہوم کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے، اور انگریزی میں اس کے رقعے بھی چھپ گئے ہیں۔ رقعوں کی تقسیم کے بعد اٹ ہوم کے انتظامات کا مرحلہ ہے میں چاہتا ہوں کہ یہ اٹ ہوم ایک یادگار اٹ ہوم ہو، جس کو لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد کرتے رہینگے۔ بہرحال ایک گھنٹے تک بیٹھنے کے بعد میر علی خان اپنے گھر واپس آ گئے اور یہ خبر اپنی بیوی اور لڑکے کو کہہ سنائی۔

اٹ ہوم کی تاریخ مقرر ہو گئی اور انگریزی میں دعوت کے رقعے چھپ گئے۔ یہ رقعے بہت بڑے اور بڑے ہی شاندار اور خوبصورت بھی تھے۔ رقعے ایک ہزار کی تعداد میں چھپے تھے۔ حیدرآباد اور سکندرآباد کے بڑے بڑے عہدہ داروں، جاگیرداروں، منصبداروں اور جمعداروں کے نام تقسیم کیے گئے تھے۔ حضور نظام اور رزیڈنٹ حیدرآباد اور سکندرآباد کے اپنے دوست انگریز کرنل کے تینوں رقعے آسمان جاہ نے بہ ذات خود جا کر دیے۔ سکندرآباد کے کئی ایک انگریز اور اینگلو انڈین فوجی اور سول عہدے داروں کے نام بھی اٹ ہوم کے دعوت نامے بھیجے گئے تھے۔ اٹ ہوم ان کی دیوڑھی کے خانہ باغ میں دیا گیا تھا۔ بیئر، سوڈا، لیمن اور دوسرے ڈرنکس کی سپلائی کا ٹھیکہ ایک فرم کو دیا گیا تھا۔ روشنی کے انتظامات ایک اور کمپنی کے سپرد کیے گئے تھے۔ آتش بازی کا کنٹراکٹ شہر کے ایک مستند آتش باز کو دیا گیا تھا، اور کیٹرنگ کا کنٹراکٹ حیدرآباد کی ایک قدیم اور مشہور کیٹرنگ کمپنی کو دیا گیا تھا۔ اس سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ ایک ہزار مدعوین کے لیے حالا اور بے جی کی کیک، پیسٹری، بسکٹس، پلم کیک، کری پفس، اور دوسرے لوازمات کے ساتھ ہر قسم کی دیسی نمکین یا کھاری چیزیں بھی سپلائی کرنی ہونگی۔ اس کے علاوہ، ہر قسم کا تر اور سوکھا میوا بھی رکھنا ہوگا۔ چائے اور کافی کے علاوہ آئسکریم بھی سپلائی کرنی ہوگی۔ اس کے سوا لیمن کی سپلائی بھی ضروری ہوگی، اور اس کمپنی کو خاص طور پر یہ ہدایت کی گئی تھی کہ سروس شام کے (۵) بجے سے رات کے (۷) بجے تک یعنی آتش بازی کے ختم ہونے تک سروس برابر جاری رہے گی۔ اٹ ہوم کی سرگرمیوں کے انتظامات دیکھنے کے لیے اب آسمان جاہ کی طرف سے خاص طور پر پچاس آدمی کھڑا کیے گئے تھے۔ آتش بازی کے انتظامات دیکھنے کے لیے بھی کئی آدمی مقرر کیے گئے تھے۔ حیدرآباد میں جمعہ کے روز عام تعطیل ہوا کرتی تھی، ۲۱

نواب آسمان جاہ کا اٹ ہوم بھی جمعہ کے روز مقرر تھا۔ اٹ ہوم کے روز صبح سے انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ ان کے خانا باغ اور دوسرے محلات کے کئی مالی مالن ملازم تھے۔ اس روز سب ہی مالی مالن دوڑی کے خانا باغ میں آ گئے تھے اور تمام باغات کے پھولوں اور پودوں کے گملے اس خانا باغ میں منتقل کر دیے گئے تھے۔ بڑے وسیع میدان میں صبح سے پانی کا مسلسل چھڑکاؤ ہو رہا تھا، اور اس انتظام کے سلسلے میں انکے باغات کے کئی داروغا کام کر رہے تھے۔ سہ پہر کے بعد سے میز کرسیاں رکھدی گئی تھیں ۳ بجے شام میں چار قسم کے بیانڈ آ گئے تھے ۴ بجے سے میزوں پر سامان رکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۴½ بجے سے مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ آسمان جاہ بذات خود مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ میر علی خان، افضل خان، اور میر علی خان کے دو عزیز ثابت علی خان، اور باسط علی خان اور بیرسٹر ولیسٹر کے ساتھ آئے اور آسمان جاہ سے ملے۔ آسمان جاہ نے ان سے کہا کہ وہ ڈائس کے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھ جائیں تاکہ حضور نظام کے ادھر سے گزرتے وقت افضل خان اور میر علی خان اور بیرسٹر ولیسٹر کا تعارف کرایا جائے۔ وہ سب لوگ حسب ہدایت سامنے جاکر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد مہمان مسلسل آنے لگے آسمان جاہ نے چند مخصوص ساتھیوں کے ہمراہ گیٹ پر چلا گئے تاکہ بڑے بڑے عہدے داروں اور مہمانوں کا استقبال کریں۔ سب عہدہ دار آ گئے رزیڈنٹ حیدرآباد اور آسمان جاہ کا خاص دوست سکندرآباد کی فوج کا کرنل بھی آ گیا تھا اور وہ خود بھی آسمان جاہ کیساتھ مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ آسمان جاہ اور کرنل دونوں نے رزیڈنٹ حیدرآباد کو ڈائس تک لے جاکر چھوڑ آئے۔ یہ ڈائس بالکل سامنے حضور نظام، رزیڈنٹ حیدرآباد۔ آسمان جاہ اور چند دوسرے مخصوص اور بڑے بڑے عہدیداروں کے لیے مخصوص تھا۔ اس اونچے ڈائس سے گیٹ تک حضور نظام کے آنے کے لیے سرخ کپڑے کا فرش تھا۔ ٹھیک پونے پانچ بجے حضور نظام کی سواری آئی۔ نظام چھکڑے کی عالیشان نئی گاڑی میں آئے تھے ان کے ساتھ ان کے کئی ایک مصاحب خاص اور دوسرے افراد بھی تھے۔ نظام کے آتے ہی آسمان جاہ اور ان کے ساتھیوں نے جھک کر پانچ آداب بجا لاکر ان کا استقبال کیا، اور چاروں بینڈ ایک ساتھ بجنا شروع ہوئے۔ نظام آگے تھے اور آسمان جاہ نظام کے پیچھے چل رہے تھے۔ نظام کے آتے ہی تمام مہمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈائس کے قریب پہنچتے ہی آسمان جاہ آگے بڑھ گئے اور افضل خان اور میر علی خان کو نظام کے آگے کرتے ہوئے دونوں کا تعارف بھی کرایا۔ سرکار یہ وہی نوجوان افضل خان ہے جس کو حضور پرنور نے اپنے حکم محکم سے موت سے بچا لیا، اور اس افضل خان کا ذکر میں نے گوش مبارک میں کیا تھا، اور حضور یہ میر علی خان، میرے دوست اور افضل خان کے باپ ہیں، ان کے یہ کہتے ہی باپ بیٹے دونوں ہی جھک کر پانچ پانچ آداب بجا لائے اور حضور نظام نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اظہار خوشنودی کیا، اس کے بعد نظام ڈائس کی طرف آگے بڑھ گئے اور آسمان جاہ انکے پیچھے تھے، اور افضل خان اور میر علی خان کو اپنے ساتھ ڈائس پر لے گئے۔ ڈائس پر جاتے ہی نظام نے رزیڈنٹ حیدرآباد سے ہاتھ ملایا اور پھر دونوں بازو بازو صوفوں پر بیٹھ گئے۔ آسمان جاہ نے حضور نظام کی گلپوشی کی اور نظام نے آسمان جاہ کی گلپوشی کی اور ایک گرا صاحبزادی رحیم النسا کو گلپوشی کے لیے اندر زنانے میں بھجوا دیا گیا کہ آپکے ماموں حضور نظام کی طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ زنانے میں بھی بالکل اسی طرح اٹ ہوم کے انتظامات تھے جیسے مردانے میں تھے۔ وہاں انتظام میں تمام عورتیں مشغول تھیں۔ ٹھیک (۵) بجے آسمان جاہ نے نظام کی خدمت میں کیک۔ پیسٹری۔ بسکٹ۔ پلم کیک اور مٹھائی وغیرہ کی ایک خوبصورت چینی کی ڈش پیش کی، اور نظام نے مسکراتے ہوئے اس میں سے ایک ٹکڑا اٹھا کر کھایا، اس کے بعد پھر سے بینڈ بجنا شروع ہوا، اور تمام مہمان کھانے میں مصروف ہو گئے۔ آسمان جاہ اور رزیڈنٹ نظام سے مسلسل باتیں کر رہے تھے۔ افضل خان اور میر علی خان دونوں بھی اوپر نظام کی نظروں کے سامنے تھے۔ آتش بازی کا انتظام ایک بڑے حوض کے اطراف تمام مہمانوں کے درمیانی حصے میں کیا گیا تھا، اور وہ اونچا ڈائس، جس پر حضور نظام بیٹھے ہوئے تھے، وہ بھی بالکل اوپر یا مقابل تھا۔ ٹھیک ۶½ بجے آتش بازی شروع ہوئی اور اس وقت بھی اٹ ہوم جاری تھا۔ مہمان تمام چیزیں کھا پی بھی رہے تھے اور آتش بازی بھی دیکھ رہے تھے۔ آتش بازی کے ایسے لاجواب اور بے نظیر نمونے پیش کیے جا رہے تھے کہ تمام مہمان اور حضور نظام اور رزیڈنٹ بھی حیران اور پریشان تھے۔ آتش بازی کا بالکل ایسا ہی انتظام اندر زنانے میں بھی تھا، اور وہاں بھی عورتیں، آتش بازی کے یہ عجیب و غریب نمونے دیکھ کر حیران تھیں۔ ٹھیک (۷) بجے آتش بازی "حضور نظام زندہ باد" کے آتشی مظاہرے پر ختم ہوئی۔ اس مظاہرے سے نظام نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد نظام جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے سب حاضرین نے جھک کر پانچ پانچ آداب بجا لائے، اور آسمان جاہ رزیڈنٹ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسی راستے سے واپس ہوئے۔ ان کے پیچھے آسمان جاہ اور رزیڈنٹ حیدرآباد تھے۔ نظام کے چھکڑے میں سوار ہوتے ہی چاروں بینڈ ایک ساتھ بجنا شروع ہوئے اور ادھر آسمان جاہ نے جھک کر نظام کو پانچ آداب بجا لائے۔ نظام کا چھکڑا چلا گیا، اس کے بعد رزیڈنٹ آسمان جاہ سے ہاتھ ملا کر گئے اور پھر تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ آخر میں میر علی خان۔ افضل خان اور بیرسٹر ولیسٹر نے آسمان جاہ سے اجازت چاہی۔

میر علی خان اور افضل خان جب اپنے گھر پہنچے ہیں تو ان کی بیوی اور دوسری عورتوں نے کہا کہ نواب آسمان جاہ بہادر نے ہم کو بھی اٹ ہوم کھلایا۔ باپ بیٹوں نے دریافت کیا کہ وہ کس طرح؟ تو ان کی بیوی نے کہا کہ چھ کشتی میں اٹ ہوم کے پورے لوازمات اور ایک کشتی میں آتش بازی کا سامان، اور ایک آئس کریم کا پھر لوڈ آیا اور کشتیوں میں تیار چائے اور کافی بھی بھجوائی۔ دو گاڑیوں میں یہ سامان آیا تھا اور ہر گاڑی میں دو دو ملازم تھے، جو یہ سات کشتیاں لاکر گھر میں رکھدیں، اور یہ کہا کہ سرکار کا حکم ہے پورا سامان وہیں چھوڑ دو، اور کل جاکرکے آنا۔ غالباً اٹ ہوم پانچ بجے شروع ہوا ہوگا، اور ٹھیک پانچ بجے اٹ ہوم کا سامان گھر میں موجود تھا۔ آسمان جاہ کی اس غیر معمولی عنایت اور

مہربانی کو دیکھ کر باپ بیٹے دونوں ہی حیران ہو گئے۔

اس مہم کے دو چار روز بعد آسمان جاہ پھر سے حضور نظام کے پاس گئے۔ مصاحبوں کے اطلاع کرتے ہی نظام نے انہیں اندر بلوالیا۔ مزاج پرسی کے بعد نظام نے دریافت کیا کیسے آنا ہوا، اس پر ہاتھ جوڑ کر آسمان جاہ نے کہا، حضور والا نے اپنی بھانجی رحیم النسا کے لیے افضل خاں کا رشتہ منظور فرمایا تھا۔ میں نے آپ کی منظوری سے افضل خان کے باپ میر علی خان کو واقف کرادیا تھا۔ انہوں نے شادی کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ میں حضور پرنور کی خدمت میں جاکر عرض کرتا ہوں کہ کس مہینے میں کس تاریخ شادی کی جائے۔ اس غرض سے یہ خادم حاضر خدمت ہوا ہے۔ حضور جو بھی تاریخ مقرر فرمائیں، میں میر علی خان سے کہہ دونگا۔ یہ سن کر حضور نے فرمایا کہ رجب کے مہینے میں کوئی بھی تاریخ مقرر کرلی جائے تو مناسب ہوگا۔ اس کے جواب میں آسمان جاہ نے کہا کہ مناسب ہے حضور، رجب کے مہینے میں میر علی خان سے مشورہ کرنے کے بعد شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے بعد حضور والا کو ضرور مطلع کرونگا۔ یہ کہتے ہوئے آسمان جاہ نے واپسی کی اجازت چاہی، اور پانچ آداب بجالاتے ہوئے واپس آئے۔

اپنی ڈیوڑھی آنے کے بعد آسمان جاہ نے اپنے مصاحب خاص کو میر علی خان کے گھر بھیجکر بلوایا کہ وہ اسی بگھی میں اسی وقت ڈیوڑھی چلیں۔ مصاحب میر علی خان کے گھر آیا اور آسمان جاہ کا یہ پیام سنایا کہ سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے، اور اسی وقت بگھی میں میرے ساتھ آنے کے لیے کہا ہے۔ یہ سنتے ہی میر علی خان اسی وقت بگھی میں بیٹھکر ڈیوڑھی گئے۔ مصاحب، اور میر علی خان دونوں آسمان جاہ کے پاس گئے۔ آسمان جاہ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا، اور ہاتھ بھی ملایا۔ دونوں بازو بازو ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ آسمان جاہ نے مصاحب سے کہا کہ سکر سے کہو کہ کافی لے آئے۔ یہ سنکر جو حکم سرکار کہتے ہوئے مصاحب چلا گیا۔ ادھر آسمان جاہ اور میر علی خان باتوں میں مصروف ہو گئے۔ آسمان جاہ نے کہا کہ میں حضور والا کے پاس گیا تھا۔ میں نے ذکر کیا کہ میر علی خان نے مجھ سے شادی کی تاریخ دریافت کی تو میں نے کہا کہ میں خود کوئی تاریخ مقرر نہیں کرسکتا میں حضور والا کی خدمت میں جاؤنگا اور ان سے عرض کرونگا کہ وہ بطور خود شادی کی کوئی تاریخ مقرر فرمادیں تو ہم دونوں پارٹی اس پر عمل کرینگے (ایسے میں برا سے ٹبلر دو چار کشتیوں میں چائے۔ کافی۔ بسکٹ۔ پیسٹری۔ کیک نمکین چیزیں اور خشک میوا وغیرہ لے کر آئے اور دوسرے ملازمین نے سامنے چھوٹے چھوٹے خوبصورت میز رکھ دیے جس پر تمام کشتیاں جا دینے کے بعد سروس شروع کردی گئی۔ دونوں کھا بھی رہے تھے، اور کافی پی بھی رہے تھے) چنانچہ حضور نے رجب کا مہینا منتخب فرمایا، اور عقد کی تاریخ ہم دونوں کی مرضی پر چھوڑ دی ہے۔ آپ اپنی سہولت سے فرمائے کہ عقد کی تاریخ کونسی ہو یہ سن کر میر علی خان نے کہا، سرکار جو بھی تاریخ مقرر فرمائیں مجھے اس سے پورا اتفاق ہے، چنانچہ آسمان جاہ نے ۲۰ رجب عقد کی تاریخ مقرر فرمائی جس کو میر علی خان نے منظور کرلیا۔ اس کے بعد میر علی خان نے کہا کہ ۲۰ رجب تاریخ عقد کے رقعے چھپوانے کی مجھکو اجازت ہے، اس پر آسمان جاہ نے کہا ضرور آپ اس تاریخ کے رقعے چھپوائیے، اور ہمارے رقعے بھی اسی تاریخ کے چھپینگے یہ سن کر میر علی خان نے آسمان جاہ کا شکریہ ادا کیا، اور واپسی کی اجازت چاہی تو آسمان جاہ نے اٹھ کر ان کو رخصت کیا۔ میر علی خان گھر گئے اور اپنی بیوی اور لڑکے افضل خان کو یہ خوش خبری سنائی کہ آسمان جاہ نے حضور نظام کی منظوری سے ۲۰ رجب کی تاریخ عقد مقرر فرمائی ہے، چنانچہ ادھر شادی کی تیاریاں زور وں پر شروع ہوگئیں اور چند روز بعد شادی کے رقعے بھی چھپوا کر تقسیم کردیے گئے۔ ادھر آسمان جاہ کی ڈیوڑھی میں بھی ان کی عزیز اور رشتے دار عورتوں نے شادی کی تیاریاں شروع کردیں، اور نواب صاحب نے اپنے سکریٹری کے ذریعے شادی کے ایک ہزار اعلا درجے کے رقعے چھپوا کر تقسیم بھی کروادیے۔ ایک رقعہ لے کر حضور کی خدمت میں پہنچے۔ باریابی کے بعد وہ شاندار رقعہ حضور کی خدمت میں پیش کیا تو حضور اس رقعے کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور بہت تعریف وستائش بھی کی۔ آسمان جاہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ رحیم النسا حضور والا کی بھانجی ہے، اس لیے عقد کے روز حضور کی شرکت ضروری ہے۔ آسمان جاہ کی اس درخواست کو حضور نے بطیب خاطر منظور فرمایا اور یہ کہا کہ میں ضرور آؤنگا اور اپنی بھانجی کے عقد میں ضرور شرکت کرونگا۔ یہ سن کر آسمان جاہ نے جھک کر پانچ آداب بجالائے اور حضور کی ذرا نوازی کا شکریہ ادا کیا۔

۲۰ رجب کو افضل خان دولہا بنا۔ گھوڑے پر سوار، دوست احباب، عزیز اقربا اور رشتے داروں کے جلوس کے ساتھ گھر سے نکل کر تمام رستے طے کرتے ہوئے آسمان جاہ کی ڈیوڑھی آن پہنچا۔ جلوس کے آگے چار قسم کے بینڈ باجے تھے۔ گھوڑے سے اتر کر دولہا جلوس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہاں پہلے سے ہزار پانسو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ شہ نشین پر دولہا کے بیٹھنے کا انتظام تھا، وہیں آسمان جاہ اور قاضی شہر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دولہا کو بھی قاضی کے سامنے بٹھایا گیا۔ قاضی نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ اس کے بعد مبارکبادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ شہ نشین پر حضور نظام بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے دولہا نظام سے ملا۔ اس کے بعد آسمان جاہ سے اور پھر اپنے باپ میر علی خان سے ملا، اس کے بعد دوست احباب وغیرہ سے۔ شامیانے میں ایک ہزار آدمیوں کے کھانے کا انتظام تھا۔ دن بھر مہمان آرہے تھے اور کھا کر جارہے تھے۔ حیدر آباد کے مشہور طوائفوں کا انتظام تھا، جو الگ الگ بیٹھے اپنے فن کا مظاہرا کر رہے تھے۔ پوری رسمیں ادا کی گئیں اور رات میں (۹) بجے جلوے کی رسم ادا ہوئی۔ اس کے بعد دو بجے رات میں دولہا دلہن کو خدا آسمان جاہ نے رخصت کی۔ دولہا دلہن کے ساتھ جلوس کی شکل میں روانہ ہوا، اور اس کے سامنے چار قسم کے بینڈ باجے [illegible] جلوس کے آگے دولہن پر آتش بازی کے مظاہرے بھی ہو رہے تھے۔ دولہا نے گھر پہنچنے کے بعد تمام [illegible] پہنچنے کے بعد دولہا دلہن کو تربیت ہاتھ کے ایک [illegible] یہ سنکر سکر [illegible] اور دونوں ایک [illegible]

مرزا احسن بیگ

جوشؔ کی شاعری کا روشن اور تاریک پہلو

جوشؔ ملیح آبادی نے کوئی اعلا تعلیم حاصل نہیں کی، لیکن اپنی ذہانت، مذاق سلیم اور صلاحیت سے اس وقت ہندستانی کے ان شعرا میں سے ہیں جو ہندستانی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی شاعری پر سخت تنقیدیں بھی ہوتی رہی ہیں، لیکن ان کے حامی ان کے کلام کی شوخی، رنگینی، منظر کشی، مصوری اور زبان دانی کے لحاظ سے ان کو ہندستانی کا منفرد شاعر تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جوشؔ نے نظم کو مسلسل موضوع سخن بنایا، اور ہر رنگ میں اس کثرت سے نظمیں لکھی ہیں کہ اب ہندستانی شاعری پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا دامن نظم مسلسل سے بالکل معرا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کی نظموں میں منظر کشی اور مصوری کے جتنے بہتر نمونے ملتے ہیں وہ دوسرے شاعروں کو نصیب نہیں۔ وہ محاکات یعنی مناظر قدرت، کیفیات باطنی، احساسات قلبی اور دوسرے مواقع کی تصویر کھینچنے میں اپنی مثال آپ ہیں مثلاً جمنا کے کنارے کی ایک تصویر کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

فردوس سے در کھُلے ہوئے باز
ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگیں کلائیوں کو جوڑے
چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گلزار میں پھول ہنس رہا ہے
قرآن ہے کہ رحل پر دھرا ہے

گنگا کے کنارے کی ایک تصویر کھینچتے ہوئے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

دراز زلف میں جادو سیاہ آنکھوں میں مدھ
نسیم صبح بنارس اور ہلال شام اودھ

تبسم کی مرقع آرائی کتنے اچھے طریقے سے کی ہے ؎

عارض گل رنگ پہ پھول سا کھلتا ہوا
یہ تبسم جو طلوع صبح سے ملتا ہوا

جوانی، تبسم اور شوخی کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

سرشار جوانی تھی کہ اڈتے ہوئے بادل
شاداب تبسم تھا کہ جنت کا نظارا
زلفیں تھیں کہ ساون کی مچلتی ہوئی راتیں
شوخی تھی کہ سیلاب کا مڑتا ہوا دھارا

ایک حسینہ خواب نوشی یعنی میٹھی نیند سے بیدار ہوتی ہے تو کہتے ہیں ؎

یہ کون اٹھا ہے شرماتا
رین کا جاگا نیند کا ماتا
نیند کا ماتا دھوم مچاتا
انگڑائیاں لیتا بل کھاتا
یہ کون اٹھا ہے شرماتا
پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل
الجھا الجھا زلف کا بادل
نازک گردن پھول سی ہیکل

سرخ پپوٹے نیند سے بوجھل
یہ کون اٹھتا ہے شرماتا

اگر ہم اس حالت کی تصویر بھی دیکھیں تب بھی وہ کیف و سرور حاصل نہیں ہو سکتا جو ان اشعار کے پڑھنے سے ہوتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جوشؔ اپنی شاعری میں بڑی صناعی سے کام لیتے ہیں اور شاید ان سے بڑھ کر ہندستانی میں کوئی صناع پیدا نہیں ہوا۔ وہ اس صناعی کے خیال سے مرد، عورت، بچے اور بوڑھے کی گفتگو کو اسی انداز میں قلمبند کرتے ہیں مثلاً ایک شوہر پردیس جاتا ہے تو اس کی بیاہتا بیوی رو رو کر گھڑیاں کاٹتی ہے۔ برسات کا موسم آتا ہے تو ساون کی کالی کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر اور پپیہے کی آواز سن کر کہتی ہے ؎

جلدی اس دیس سے گذر جاؤ
وار تا اک بوند بھی نہ ٹپکاؤ
یوں نہ پاپی پپیہے تان لگا
جس جگہ ہیں پی وہیں اڑ جا
دل کی نگری میں جا کے بھر مل تھل
میرے سر پہ گرج نہ او بادل

جوشؔ موقع و محل کی خصوصیات کا مطالعہ کر کے جو بات کو دل آویز طریقے پر قلمبند کرتے ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں فطری رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً دریا میں موجوں کی روانی کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں ؎

جھاگ اڑاتی بچاندتی اڑتی ہوئی
کپکپاتی لوٹتی ہوئی اٹھتی ہوئی
چلبلی ابھری ہوئی نکھری ہوئی
چینٹیں سے چھوڑتی ابھری ہوئی
بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی
دم بدم آتی ہوئی جاتی ہوئی

جوشؔ نے بکثرت نظمیں کہی ہیں۔ مالن، جامن والیاں، حسن بیمار، صبح سکندر، مفلسوں کی عید، غریب الوطن کا پیام وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں جن میں انھوں نے صحت الفاظ، ندرت بیان، نزاکت تشبیہات، لطافت استعارات،

نفسیات اور جذبات کی مصوری کا پورا خیال رکھا ہے۔ جوانی اور شباب کی اتنی صحیح تصویر کھینچتے ہیں کہ ان کو شاعر شبابیات بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً جوانی کی آمد آمد میں کہتے ہیں ؎

کلی لڑکپن نئی جوانی نئی اداؤں سے آرہی ہے
جبیں پہ غنچے کھلا کھلا کر نظر میں دھومیں مچا رہی ہے
ہوا طبیعت کے رخ بدل کر چھٹک رہی ہے نئی فضا میں
کلی لڑکپن کے گل کھلا کر نئے شگوفے کھلا رہی ہے
جھلک چاندی پہ کسنی کی چڑھا رہا ہے شباب سونا
سفید ہلکی سی چاندنی کو سحر گلابی بنا رہی ہے

سن بلوغ اور شباب کے زمانے میں ایک انسان کو جس روحانی اور جسمانی کرب سے گذرنا پڑتا ہے اور جو جھنجلاہٹ اور بے چینی اس وقت ہوتی ہے وہی جوشؔ اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ جوانی کی آمد آمد، جوانی کا تقاضا، جوانی کی رات، جوانی کے ساز و برگ وغیرہ اسی قسم کے جذبات ہیں۔

جوشؔ کی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ بھی بہت پایا جاتا ہے۔ جنگ آزادی کے سلسلے میں بہت سی نظمیں لکھیں، اس لیے شاعر انقلاب بھی کہلائے۔ ہندستانی میں انقلابی شاعری جوشؔ ہی سے شروع ہوتی ہے۔ یوں تو چکبست، حالی، اکبر اور اقبال کی شاعری کو بھی ہم اس زمرے میں رکھ سکتے ہیں، لیکن موجودہ ذہن میں جو انقلابی شاعری کا مفہوم ہے اس کی بنیاد جوشؔ ہی نے استوار کی۔ جوشؔ نے انقلاب کا نعرہ ایک روحانی گھن گرج کے ساتھ لگایا تھا جس میں رجز کی بھی گونج ہے۔ آزادی کے بعد وہ کسان اور مزدور کو بھی پیام حیات دیتے رہے اور ایک اشتراکی بن کر رہے ؎

اٹھ کہ اٹھتی نہیں اب سینۂ ایام سے آگ

جوشؔ نے مختلف موضوع پر نظمیں لکھ کر نئی نئی راہیں نکالیں اور انسان کی کیفیات اور جذبات کی مرقع نگاری کر کے بقول پنڈت برج موہن کیفی "ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کیے بغیر اپنی شاعری کو دنیا کی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔"

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں۔ "جوش نے نظم کو غزل کی رنگینی اور شیرینی بخشی ہے۔ ان کے کلام میں رومان کا جادو اور حقیقت کی آنچ مل گئی ہے۔ ان کے یہاں فن کی پختگی ہے۔ ان کی شاعری میں ہندستانی شاعری کی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔"

جوش کی شاعری کے نقاد بھی ہیں اور پرستار بھی۔ ان کے نقاد کہتے ہیں کہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں اس لیے ان میں علمی کھوکھلا پن ہے وہ صرف جذبات کے سہارے شاعری کرتے ہیں۔ ان کے مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے یہاں کوئی نظام فکر نہیں ہے۔ شروع میں انہوں نے اقبال کے انداز بیان کا چربا اڑانے کی کوشش کی مثلاً اقبال کی ایک فارسی نظم ہے ؎

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں برخیز

جوش نے اسی انداز میں ایک نظم کہی ؎

بیدار ہو، بیدار ہو بیدار
ہشیار ہو، ہشیار ہو، ہشیار

اقبال نے اپنی نظم "خضر راہ" لکھ کر پہلی بار سرمایا دار اور محنت کی کشمکش کا اظہار ہندستانی شاعری میں کیا۔ جوش نے بھی اس کو اوڑھنا بچھونا بنایا، لیکن ان نقادوں کا کہنا ہے کہ اقبال اور جوش میں وہی فرق ہے جو ایک مفکر اور ایک ڈھنڈورچی میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں فلسفا پیش کرنا چاہتے ہیں، لیکن اقبال کا علم ان کو نصیب نہیں، اسلیے جب وہ گہرائیوں میں جاتے ہیں تو ان کی ادنیٰ درجے کی لیاقت نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں سوشلزم اور کمیونزم کی تلقین ضرور ہے، لیکن اصل میں رقیب کی جگہ سرمایہ دار، معشوق کی جگہ مزدور اور وصل کی جگہ انقلاب آ گیا، اس لیے ان کی شاعری صحیح معنوں میں انقلابی شاعری نہیں، بلکے صرف شور شغف کی شاعری ہے جس میں محض الفاظ کی گھن گرج، لہجے کا ابال اور گرمی ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری "جوش کی شاعری ایک چیخ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور ان کے ناداں قدرداں اس چیخ اور پکار کو کمال شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔"

آل احمد سرور لکھتے ہیں۔

"جوش ابھی رند ہیں اور میکدے میں دادِ عشرت دے رہے ہیں اور ابھی کفر و ایمان کی دھجیاں اڑا ڈالنے کا عزم کر رہے ہیں۔ ابھی خدا کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ ابھی حسین پر مرثیہ لکھ رہے ہیں اور ابھی انقلاب پر بھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ وہ انقلاب اور رندی کو ملانا چاہتے ہیں، حالانکے دونوں میں ازلی تضاد ہے۔ جوش خیالات انقلابی رکھتے ہیں اور مشرب رندانا۔"

اس تضاد کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جوش کے سارے رجحانات خدرو قسم کے ہیں۔ ان کی طبیعت جن باتوں کو پسند کرتی ہے وہ اس کے ساتھ جذباتی طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو کسی نظریۂ حیات سے وابستا نہیں کرتے۔ انہوں نے مذہب سے بغاوت کر کے اشتراکیت کا سہارا لیا، تاکہ وہ انقلاب کے ہیرو سمجھے جائیں اس لیے مزدور اور کسان کا قصیدا پڑھتے ہیں ان کی مظلومی پر ترس کھاتے ہیں، لیکن ترس کھا کر مے خانے میں بھی چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی ساری گھن گرج ایک نادان ہاتھ کی تلوار بن جاتی ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں کہ کس سمت رخ کرے گی اور کس کا گلا کاٹے گی۔

چونکے جوش کے پاس کوئی نظریۂ حیات نہیں اس لیے وہ بہکا ہوا ذہن اور بھٹکا ہوا شعور رکھتے ہیں۔ ان کو ایک بات یا ایک نقطہ ہاتھ لگ جاتا ہے تو اس پر ایک نظم بھی کہہ ڈالتے ہیں۔ اندرونی تہوں کا پتا لگانا ان کے مزاج کے خلاف ہے اس لیے ایک بات کو ایک شعر میں کہہ کر اس کو مختلف طریقے سے دہراتے ہیں۔ ان کے نقاد نے کہا ہے کہ وہ ہندستانی میں بہت چیختے اور چنگھاڑتے ہیں، لیکن انگریزی میں ان کی نظموں کا ترجما کیا جائے تو وہ گھاس معلوم ہو گی۔

وہ اپنی نظموں میں محض الفاظ سے کھیلتے ہیں۔ جتنی ترکیبیں اور تشبیہیں ان کا ذہن سوچ سکتا ہے کسی کے بس کی بات نہیں وہ ایک نوع گراؤ ہے وہ

جذبات سے بعض الفاظ کے ذریعے کھیلتے ہیں۔ اندرونی گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ شاید ان کو یہ احساس خود بھی ہے اس لیے کہتے ہیں ؎

میرے کاخ شاعری کی نیو میں سنگ نستور
ایک طفلانہ بلوغ اک کم کھلا سن شعور
چند زلفوں کی سیاہی چند رخسار وں کی آگ
گاہ حرف بے نوائی گاہ شور انقلاب
گاہ مرنے کے عزائم گاہ جینے کی امنگ
بس یہی سطحی سا باتیں بس یہی ادبچے سے رنگ

بادل سلطان پوری

عہد و پیماں

دل کو مل جائے سکوں درد کچھ ایسا دے دو
مست آنکھوں سے چھلکتی ہوئی صہبا دے دو
رخ سے زلفوں کو ہٹا کر کے اجالا دے دو
میرے سجدوں کے لیے نقش کف پا دے دو
کل دیوانہ سمجھ کر ہی مجھے پیار کرو
تم مجھے بھول نہ جاؤ گے یہ اقرار کرو

وقت رخصت ہے ذرا اور قریب آ جاؤ
میری بھیگی ہوئی پلکوں کو سماں بن جاؤ
رخ سے اس سرمئی گھونگھٹ کو ذرا سرکاؤ
پھر نئے ڈھنگ سے اے جان جہاں خرماؤ
میری خاموش محبت پہ اعتبار کرو
تم مجھے بھول نہ جاؤ گے یہ اقرار کرو

لٹ نہ جائے بھری برسات میں یہ دل کا چمن
پھوٹ نکلے نہ ان آنکھوں سے کہیں گنگ و جمن
ڈر سے دنیا کے نہ بدلو یہ محبت کا چلن
پھر خدا جانے کبھی ہو کہ نہ ہو تم سے ملن
آج للّٰہ خیالات کا اظہار کرو
تم مجھے بھول نہ جاؤ گے یہ اقرار کرو

جب بھی گھنگھور گھٹا آ کے برس جائے گی
جب کبھی دور سے پی پی کی صدا آئے گی
سیج سے جب کوئی دلہن پی کے نگر جائے گی
یا کسی شب کو مجھے نیند نہ جب آئے گی
آ کے کہہ جانا کہ اب صبر اختیار کرو
تم مجھے بھول نہ جاؤ گے یہ اقرار کرو

میرے سینے میں وہ اٹھتے ہوئے جذبات کہاں
کوچۂ عشق میں گذرے ہوئے لمحات کہاں
وہ حسیں صبح کہاں، شام کہاں رات کہاں
اب وہ پہلے کی طرح جشن ملاقات کہاں
ہاں انہیں یاد دلا کر نہ بیقرار کرو
تم مجھے بھول نہ جاؤ گے یہ اقرار کرو

میری پر کیف محبت کے حسیں نظارو
گیسوئے شب پہ لرزتے ہوئے اے شہ پارو
چھپ کے بادل میں چمکتے ہوئے شعلہ زارو
جھلملاتے ہوئے حسین رات کے دلکش تارو
میں پلٹ آؤں گا تم میرا انتظار کرو
تم مجھے بھول نہ جاؤ گے یہ اقرار کرو

خان محمد عاطف ملیح آبادی

فارسی شاعری میں لطافت و ظرافت

لطافت و ظرافت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔ اس سے قوموں کے ادبی ذوق اور خوش مزاجی کا پتا چلتا ہے۔ بذلہ سنجی اور لطافت و ظرافت کے ذریعے ہی کسی قوم کی ذہنیت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ جواب چبھتا ہوا ہونا چاہیے۔ ذرا سا بھونڈا پن پورے جملوں کو حدود ادب سے خارج اور سامع کی طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے، اور ذہن انسانی ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے لوگ حاضر جواب، پر مذاق اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں جو دنیائے ادب کو لقائے دوام عطا کرتے ہیں۔ عربی اور فارسی ادب میں حاضر جوابی، لطافت و ظرافت اور بذلہ سنجی کے اعلا نمونے ملتے ہیں۔ اہل فارس کے استاد عرب ہیں۔ عربوں نے اس میدان میں بہت زیادہ ترقی کی اور اس فن کو معراج کمال تک پہنچایا، شاگردوں نے اساتذا کی روایات کو قایم رکھتے ہوئے اس میدان میں ترقی کی راہیں طے کیں۔

لطافت اور ظرافت آزادانہ فضا اور ماحول کی دین ہے۔ آزاد اور باذوق درباری ماحول میں ہی ظرافت اور بذلہ سنجی پروان چڑھی ہے۔ جابرانہ اور استبدادی نظام حکومت ذہنوں کو کند اور تنگی عطا کرتا ہے، ساتھ ہی انسان رواداری کے اعلا جذبے سے محروم ہو جاتا ہے، اور وسیع نظری پیدا نہیں ہو سکتی۔ وسیع نظری کا پہلا زینہ رواداری کا جذبہ ہے، اور رواداری کے بغیر وسیع نظری کا تصور ہی باطل ہوکر رہ جاتا ہے۔

فارسی ادب کا زریں عہد ہندستان (برصغیر) میں سلطنت اسلامیہ کا قیام اور مغل بادشاہوں کی قدر دانی اور علم پروری کا مرہون منت ہے، یہی وہ عہد ہے جب ہمیں فارسی زبان وادب میں اعلا پایہ کا مذاق، بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور لطافت و ظرافت کے لطیف و نازک اشارے ملتے ہیں جو ذوق سلیم کے عین مطابق، باذوق، اور رسا طبیعتوں کے لیے لذت کا سامان فراہم کرکے کبھی مسکرانے اور کبھی قہقہہ لگانے کا موقع عطا کرتے ہیں۔ میدان ظرافت میں فارسی ادب کو ایک خاص مقام حاصل ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس ادب میں تنوع اور وسعت خیال کی کمی ہے، لیکن منظوم لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں فارسی ادب دنیا کے کسی ادب سے پیچھے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ظرافت و لطافت کو صنف شاعری میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک تو حاضر جوابی اور لطافت دوسرے قالب شعری! اس سے پتا چلتا ہے کہ اہل فارس کے مزاجوں میں شاعری اور مزاح رچ بس گئے تھے، اور ان کے ذہن طبع رسا اور مزاج موزوں کا تقاضا یہی تھا کہ ہر بات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر اس کو بقائے دوام عطا کردیں۔

اچھے اور ستھرے مزاحیہ ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرے میں آزادیٔ خیال کے ساتھ ساتھ احترام کا رشتہ بھی پیدا موجود ہو، لیکن یہ جذبہ محدود

اعتدال کو نہ پار کرلے۔ وسعت نظر تنگ نظری کے پھندوں میں گم ہو جاے اس لیے کہ وسیع نظری کے بغیر خوش طبعی کا تصور ناممکن ہو جاتا ہے، اور آزادی کے بغیر یہ جوہر نمایاں نہیں ہوتا۔ مزاح کے لیے ایک آزاد معاشرا اور فلاحی ریاست کی تشکیل ضروری ہے، اس کے بغیر معیاری مزاح پیدا نہیں ہوسکتا۔ طنز، مزاح اور لطافت اور ظرافت کے درمیان فرق پیدا کرنا مشکل امر ہے۔ طنز ہی اصل میں مزاح ہے، اور لطافت و ظرافت اس تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ یہ بات مزاح نگار پر تکیا کرتی ہے۔ یا اس کی ذکاوت طبعی پر منحصر ہے کہ وہ تلوار کی طرح کام کرے یا کند و زنگ آلود چاقو کی طرح تڑپائے۔ ذرا سا بھونڈاپن یا پھوہڑپن مزاح کو حد ادب سے گزار کر ابتذال کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ قومی آزادی کی پختگی کے ساتھ ہی ساتھ اعتدال و وسعت نظر قوموں میں پیدا ہو جاتی ہے، جس کو کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ قومی آزادی کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں جوں جوں معاشرے میں امن و سکون کی فضا پیدا ہوتی جاتی ہے، اور عوام کو سماجی سکون و تحفظ اور افکار گندم و خوف و دہشت سے نجات ملتی جاتی ہے۔ طنز اور مزاح میں بلندی، افکار اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے، اور اس سے ہر طبقے کو لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

مزاح اور جذبات لطیف کا اظہار اسی وقت ہوسکتا ہے، جب با اقتدار اور حکمران طبقے اور درباری ماحول اعتدال پسند رہا ہو۔ اگر حاکم سخت گیر، جابر اور آمرانہ ذہن کا مالک ہو اور وہ دوسرے کی بات سننے پر گرانی محسوس کرتا ہو یا لوگوں کو اس کی ہیبت سے زبان ہلانے کی جرات نہ ہو تو ظاہر ہے کہ خوش مزاجی کا ماحول پیدا نہیں ہوسکتا، اور حاضر جوابی کا گلا گھٹ کر رہ جائے گا، لیکن اگر بادشاہ اور امرا خود با ذوق اور شوخ طبع ہوں اور خوش مزاجی اور شوخی طبع کو پسند کرتے ہوں تو درباری ماحول حاضر جوابی، مزاح و لطیف و نازک جذبات و خیالات کا مرکز بن جاتا ہے۔ بلندی افکار اور بذلہ سنجی پورے ماحول پر چھا جاتی ہے، ہر بات میں نکتہ اور ہر نکتے میں کام کی بات نکل آتی ہے۔

عرب فطرتاً جری، بہادر اور نڈر تھے، اس لیے حاضر جواب بھی تھے، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں عربوں کا مرتبہ انتہائی بلند رہا ہے۔ اہل فارس عربوں کے شاگرد تھے، اسلامی نظریات اور آزادی خیال ان کو ورثے میں ملے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی ادب لطافت اور نازک خیالی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں دنیا کے دوسرے ادبیات سے بہت آگے ہے۔ شاہی درباروں، بادشاہوں اور امرائے سخت گیر کی موجودگی میں ایک شاعر اور ادیب ایسے چبھتے ہوے اشعار و فقرات چست کرتا کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

سلطان محمود سبکتگین کے زمانے میں صوبۂ قبا پر یعقوب بن نعمان حکمران تھا، اس کی موت کے بعد اس کی سلطنت اس کے پانچ بیٹوں کے حصے میں آئی۔ محمود معاملات حکمرانی میں انتہائی سخت گیر تھا، اس نے جب سمرقند اور ترانسکینیا فتح کرلیا تو حکم دیا کہ پانچوں بھائیوں کو باجگذاری پر مجبور کیا جاے۔ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا، نیچے کے اشعار جواب میں لکھ بھیجے ؎

پانچ برادر از قبا ئیم
دریا دل و آفتاب رائیم
ملک زمیں ہمہ گرفتیم
اکنوں بتفکر سمائیم
گر چرخ بکام ما نگردد
چنبرز ہمش فرو کشائیم

ترجما۔ ہم پانچوں بھائی اہل قبا۔ دریا دل ہیں اور آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ ہم نے تمام زمین کی سلطنت حاصل کرلی ہے، اور اب آسمان کی فکر میں ہیں اگر آسمان بھی ہماری موافقت نہ کرے تو اس کو بھی کھینچ کر گردن کے بل گرا دینگے۔

ان کو سزا دینے کے لیے بادشاہ نے ایک لشکر روانہ کیا اور درباری شاعر انصاری سے خط لکھنے کو کہا، جسے انصاری نے اس طرح شروع کیا ؎

نمرود بہ عہد پور آذر
می گفت خدای خلق مائیم
جبار منیم پشۂ او را
خوش داد سزا و ما گوائیم

ترجمہ۔ نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں تھا، اور کہتا تھا کہ میں خالق مخلوق ہوں لیکن ایک مچھر اس پر غالب آیا، اس کو کیسی اچھی سزا ملی ہم اس کے شاہد ہیں۔

اب ان کو ہوش آیا اور یہ اشعار اس نے روانہ کیے

ما پنج برادر از قبائیم
در قحط و نیاز مبتلائیم
شاہا تو عزیز مصر جودی
ما خوان گناہگار مائیم
ما را بہ بضاعتی است مزجات
شرمندۂ حضرت شمائیم
بر حالت زار ما بخشائی
از فضل و کرم کہ بی نوائیم

ترجمہ۔ ہم پانچوں بھائی اہل قبا قحط اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ اے شاہ تو عزیز مصر ہے (یوسف علیہ السلام) ہم تیرے گنہگار بھائی کرم کے طالب ہیں۔ ہمارے پاس تھوڑی سی پونجی ہے۔ آپ سے شرمندہ ہیں۔ ہماری حالت اچھی نہیں ہے، ہم بے نواؤں پر فضل و بخشش کر۔

یہ جواب سن کر بادشاہ مسکرایا، اور ان کو باجگذاری سے معاف کر دیا۔ ان اشعار میں ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ کر کے خاص قسم کی لذت پیدا کر دی ہے۔ جس کو سن کر آدمی بے اختیار مسکرا دے پہلے جواب میں دون کی ہانکنے کے بعد عجز و انکساری کو ایک لطیف پیرائے میں بیان کرنا لطافت و نزاکت کی ایک اعلا مثال ہے۔ اس پر بادشاہ کا مسکرا کر انہیں معاف کر دینا یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کا ماحول پیدا کرنے میں خود شاہان وقت کس قدر دلچسپی لیتے تھے۔ وہ عفو و درگزر سے کام لے کر دوسروں کو موقع دیتے تھے، اس سے لوگوں کی ذہنی صلاحیتیں آزاد فضا اور آزاد ماحول پا کر وسعت خیال کا روپ دھار سکیں۔

عبداللہ خان ازبک رستم کے مقبرے کے پاس سے نکلا اور یہ شعر پڑھا

سر از خاک بر دار و ایران ببین
بکام دلیران توران زمین

ترجمہ۔ خاک سے سر اٹھا اور ایران کو دیکھ جو دلیران توران کے قبضے میں آچکا ہے۔

عبداللہ خاں کا وزیر ساتھ تھا اس نے کہا اگر رستم زندہ ہوتا تو میں جانتا ہوں کہ کیا جواب دیتا۔ عبداللہ خان نے پوچھا۔ "کیا جواب دیتا؟" اس نے کہا رستم کا جواب یہ ہوتا

چو بیشہ تہی ماند زۂ شیر
شغالان بیشہ در آید دلیر

ترجمہ۔ جب کچھار شیروں سے خالی ہو گیا تو گیدڑ دلیرانہ طور پر سامنے آ گئے۔

شاہی درباروں میں شعر و شاعری کا ایک ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ بادشاہوں کی شاعر نوازی، درباروں میں ذہنی آزادی، اچھی اور بہتر بات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر فی البدیہہ کہنے پر جس طرح شاہان کج کلاہ شاعروں کو نوازتے تھے۔ اس نے ایسی فضا پیدا کرنے میں مدد دی تھی۔ خود شاہوں اور ان کے حرم میں شاعرانہ ہنسی مذاق اور نوک جھونک کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ جہانگیر اور نورجہاں کی ادبی نوک جھونک بہت شہرت رکھتی ہے۔ ایک بار جہانگیر نورجہاں کے ساتھ بالا خانے پر کھڑا تھا، نیچے ایک بوڑھا آدمی کمر جھکائے جا رہا تھا، جہانگیر نے اس کو دیکھ کر کہا

چرا خم گشتہ می گردند پیران جہاں دیدہ

ترجمہ۔ بوڑھے آدمی کمر جھکائے کیوں گھومتے ہیں۔

نورجہاں نے جواب دیا ع

بہ زیر خاک می جویند ایام جوانی را

ترجمہ۔ مٹی میں اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو تلاش کرتے ہیں

ایک مرتبہ نورجہاں باغیچے میں ٹہل رہی تھی، اتفاقاً ایک شاعر سے سامنا ہو گیا، اسے دیکھتے ہی نورجہاں نے مذاق کے طور پر کہا ع

ترجمہ۔ زمین پھٹی اور گدھا ظاہر ہوا۔

شاعر نے فی البدیہہ کہا ع
شمیدہ بوی مادہ آمدہ تر

ترجمہ ـ مادہ کی بو پر تر آگیا ـ

لیکن ملکۂ نورجہاں نے اس جواب کو بھی برداشت کیا اور کوئی سزا نہ دی، اگر شاہی درباروں میں گھٹن کی فضا پیدا ہو جاتی اور شاعروں، ادیبوں اور دوسرے لوگوں کو آزادانہ طور پر اپنی بات کہنے کی اجازت نہ ہوتی تو ادبی نکات ظاہر نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی طنز و مزاح کا ماحول پیدا ہو سکتا تھا ـ

خاقانی نے منوچہر شیروانی شاہ کو یہ شعر روانہ کیا ؎

وشقی دہ کہ در ہرم گیرد
یاد ساقی کہ در پرستش گیرم

ترجمہ ـ ایک لونڈی عطا کر کہ وہ میری بغل میں بیٹھے یا مالا اونٹنی کہ میں اس کی کوکھ میں بیٹھوں ـ

لفظ "یا" نے خاقان کو ناراض کر دیا ـ اس نے سوچا کہ میری سخاوت پر شک کیا ہے ـ شاعر سے کہلا بھیجا کہ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ ـ خاقانی نے شاہی قاصد کی موجودگی میں مکھی کی طرف دیکھا، اس کی "ٹانگ" اور "پر" کاٹ لیے اور کہلا بھیجا کہ میں نے لفظ "با" لکھا تھا "یا" نہیں، یہ بدبخت مکھی آگئی روشنائی تر تھی جس کی وجہ سے دو نکتے ہو گئے ـ خاقان اس جواب سے خوش ہوا، اور اسے معاف کر دیا ـ

شاہوں کا ادبی ذہن و مزاج کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ اورنگ زیب جیسا شخص جو شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتا تھا، بعض اوقات مجبور ہو جاتا تھا کہ شعر و شاعری میں دلچسپی لے ایسی بات نہیں ہے کہ وہ ادبی ذوق کا مالک نہیں تھا یا شعر و سخن سے لگاؤ نہ رکھتا تھا ـ اصل بات یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا کہ وہ شعر و سخن کی محفلیں جاتا، اور داد سخن دیتا ـ اس کی ساری عمر گھوڑے کی پیٹھ پر گذر گئی ـ اورنگ زیب کے زمانے میں ایران سے ایک مصرع بھیجا گیا ـ اورنگ زیب نے شاعروں سے اس پر گرہ لگانے کو کہا، لیکن جب کوئی مصرع اسے پسند نہ آیا تو اس نے اپنی بیٹی کو بلا کر اس پر مصرع لگانے کو کہا ـ

زیب النسا نے کہا آپ کا حکم نہیں ہے کہ شعر و شاعری کروں ـ اورنگ زیب نے اجازت دی ـ تو مصرع کے بارے میں پوچھا، بادشاہ نے مصرع سنایا ـ

کہ آسمان رود و کار آفتاب کند

زیب النسا نے اس پر گرہ لگائی ع

اگر بذرہ نظر مہر بوتراب کند
کہ آسمان رود و کار آفتاب کند

ترجمہ ـ اگر بوتراب یعنی حضرت علی ذرہ کو محبت کی نظر سے دیکھ لیں تو وہ آسمان پر پہنچ کر مثل آفتاب چمکنے لگے ـ

شعر و شاعری کا تبادلہ باپ اور بیٹوں کے درمیان بھی ہوا کرتا تھا، نظام الملک آصف جاہ اول بانیٔ سلطنت نظام دکن، اچھے شاعر تھے ـ ان کا دربار شعرا سے بھرا رہتا تھا ـ ناصر جنگ شہید آصف جاہ کے بیٹے تھے ـ وہ بھی شعر کہتے تھے ـ باپ بیٹے کے درمیان شعری نوک جھونک چلتی رہتی تھی، ناصر جنگ نے ایک شعر باپ کی خدمت میں روانہ کیا ؎

مرنجان خاطر جانا مزاجی نازکی دارم
تو گر از حسن مغروری من از عشق تو مغرورم

ترجمہ ـ میری جان مجھے دکھ نہ دے ـ میں انتہائی نازک مزاج ہوں، تو اگر اپنے حسن کا غرور رکھتا ہے تو میں بھی اپنے عشق پر مغرور ہوں ـ

نواب آصف جاہ نے شعر دیکھنے کے بعد کہا کہ قیامت یہ ہے کہ عاشق کے لیے مغرور ہونا اچھا نہیں اس پر بیٹے نے کہا بجز حضرت کے میرا عاشق و معشوق کا کوئی رشتہ موجود نہیں، اور یہ میں نے حضرت کے بارے میں کہا ہے، یہ کہا اور روانہ ہو گئے ـ

آصف جاہ نے ناصر جنگ کو یہ مصرع روانہ کیا ع

اندکی بگذار تا سیر تحمل می کنم

ترجمہ ـ تھوڑی دیر ٹھہر تاکہ میں تیرے جمال کا نظارہ کروں ـ

اس کے جواب میں ناصر جنگ نے یہ مصرع روانہ کیا ع

گر تو استغنا کنی من ہم تغافل می کنم

ترجمہ ـ اگر آپ نے بے پروائی کا اظہار کیا تو میں چشم پوشی کروں گا ـ

اس طرح کی آزاد فضا میں فارسی علم و ادب کی ترقی

جاری تھی۔ آداب شاہی خردگی و بزرگی باپ و بیٹے کا حجاب، درباری رسم و رواج اور آداب بالائے طاق رکھ دیے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر موضوع پر آپ کو فارسی اشعار ملیں گے۔

نازک خیالی، لطافت و نزاکت، ہجو و لطائف، مبالغہ آرائی، پہیلیاں، ایک ہی لفظ کے مختلف معنی لینا اور شعر کے مطلب کو کہیں سے کہیں پہنچا دینا، فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

خواجو کرمانی اور عصمت ہم عصر تھے۔ ایک دوسرے سے شاعرانہ رشک و حسد بھی رکھتے تھے۔ بادشاہ کو بھی یہ بات معلوم تھی اور وہ کبھی کبھی دونوں میں نوک جھونک کرا دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ اور عصمت ایک جشن میں شریک تھے خواجو آ گیا۔

بادشاہ نے عصمت کو مخاطب کر کے کہا۔ "لو تمہارا دوست آ گیا، کیا تم اس سے ملو گے نہیں؟"

عصمت نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا؂

خواجو نگر، خواجو نگر، خواجو ز کرمان آمدہ
کرمان زگہ بیرون شوند ایں کرم ز کرمان آمدہ

ترجمہ۔ خواجو کو دیکھو! خواجو کو دیکھو خواجو کرمان سے آیا ہے۔ کرمان (کیڑے) کبھی گھورے میں چلے جاتے ہیں اور کبھی باہر آ جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ بادشاہوں نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ادب لطیف کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

ظرافت کے لغوی معنی تو خردمندی اور خوبی کے ہیں۔ ایسا شخص جس کی تقریر میں خوبی و دانائی پائی جائے اسے ظریف اللسان کہتے ہیں۔ ساتھ ہی خندہ اور بشاشت کا پہلو بھی رکھتی ہو جو لوگوں پر گراں نہ گزرے، لیکن ایسی گفتگو جو ہنسی اور مذاق سے پر ہو، مگر بے معنی ہو، لطافت و ظرافت کہے جانے کی مستحق نہیں۔ اس طرح کے جملے یا اشعار محض استہزا، تحول یا ٹھٹھوں کا نمونہ ہوں گے۔ اخلاقی دنیا میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو گی۔

مزاح کی تاریخ اصل میں طلوعِ اسلام سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے عرب مزاح کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ذرا سا مذاق یا خوش طبعی تلوار زنی میں بدل جاتی ہے۔ اسلام نے چہروں کی خشکی اور رکھائی کو دور کر کے خوش طبعی میں بدل دیا۔

ظرافت کے لیے ذکاوت اور حاضر جوابی ضروری ہے، لیکن فحش نہیں، دائرۂ اخلاق کے اندر رہ کر حاضر جوابی کے جوہر دکھانا ہی اصل میں ظرافت ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں قدیم رنگ ظرافت نہیں بھاتا۔ موجودہ عہد کی بیہودہ اور مضحک باتوں کو ظرافت کی معراج اور فن مانتے ہیں، قدیم ظرافت میں کچھ فحش باتیں آ گئی ہیں، لیکن زیادہ باتیں کام کی ہیں تو تہذیب سکھاتی ہیں۔ آدابِ محفل سے روشناس کراتی ہیں۔ بات کرنے کا ایک اچھوتا قرینہ معلوم ہوتا ہے۔ حاضر جوابی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ طرزِ معاشرت کے لیے اصلاحی پہلو تلاش کرتی ہیں، لیکن موجودہ عہد میں بیہودہ افسانوں اور فرضی معاشقوں کو افسانوں کی شکل دے دینا ظرافت کا معیار بن گیا ہے۔ اس طرح سے جو ادب پروان چڑھ رہا ہے اسے لطافت و ظرافت تو کہا نہیں جا سکتا۔ ظرافت روحانی سکون عطا کرتی ہے، اس کو مجروح نہیں کرتی۔

ڈاکٹر ایس۔ پی۔ تفتہ

رباعیات

اس دورِ سیاست کا تماشا دیکھا
خاک آلودہ۔ دین کا لاشا دیکھا
گرگٹ کی طرح رنگ، بدلتا ہے جہاں
پل میں تولہ، پل میں ماشا دیکھا

کشتی کو سمندر میں ڈبونا بہتر
بیداریٔ بے سود سے سونا بہتر
اس کارگہِ سعی و عمل میں تفتہ
بے کیف ترانوں سے تو رونا بہتر

محمد نعیم ندوی صدیقی ایم۔ اے رفیق دار المصنفین

سلطان عبد الحمید کی معزولی کا حقیقی سبب

(ایک جدید انکشاف)

تحقیق کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے، بہت سے مسلمات اور حقائق تحقیق کی کسوٹی پر آکر محض کذب وافترا ثابت ہوتے ہیں۔ نیچے کا مضمون بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ سلطان عبد الحمید کے متعلق یہ عام شہرت ہے کہ وہ ظالم و جابر اور مطلق العنان حکمران تھے، اسی کے نتیجے میں نوجوان ترکوں کی تنظیم "عثمانی انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے وجود میں آئی تھی، اور بقول خالدہ ادیب خانم عبد الحمید کی تخت نشینی کا دن عثمانی خاندان کے لیے قومی یوم ماتم کے طور پر منائے جانے کا مستحق ہے، لیکن کویت کے سرکاری ماہنامے "مجلۃ العربی" کے دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء کے شمارے میں دمشق کے ایک فاضل سعید الافغانی کے قلم سے ایک طویل مضمون شایع ہوا ہے، جس میں سلطان عبد الحمید کے ایک نادر دستخطی خط سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے کہ انجمن اتحاد و ترقی اصل میں یہودیوں کی ایجنٹ تھی، اور سلطان کی معزولی محض اس بنا پر ہوئی تھی کہ انہوں نے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کے مطالبے کو مسترد کر دیا تھا۔ رسالۂ مذکور نے سلطان کے اصل ترکی خط کا عکس بھی شایع کر دیا ہے۔ اس تحقیق کے سامنے آنے کے بعد سلطان کے متعلق عام بیانات بالکل بے وزن ہو جاتے ہیں، اور انکے عہد حکومت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا رخ ہی بدل جاتا ہے۔ قارئین "معارف" کے لیے اس کا ترجمہ اور تلخیص پیش کی جاتی ہے — نعیم

دولت عثمانیہ کے مشہور حکمران سلطان عبد الحمید ثانی کی معزولی کے حقیقی سبب کو واشگاف کرنے والی جو نادر تاریخی دستاویز ہم پہلی بار پیش کرنے جا رہے ہیں اس کا مطالعہ کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کے عہد حکومت پر ایک اجمالی تبصرہ کر دیا جائے، تاکہ مورخین محققین نے جن غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔

جب سلطان مراد خان خامس کی معزولی کے بعد سنہ ۱۸۷۶ء میں شہزادہ عبد الحمید ثانی تخت نشین ہوئے، تو دولت عثمانیہ شدید ترین داخلی اور خارجی بحران سے دوچار تھی۔ سلطان نے عنان حکومت سنبھالتے ہی تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی پوری جد و جہد کی۔ ان ہی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں یورپی اور ایشیائی ممالک میں ریلوے لائن بچھائی گئی تھی۔ متعدد بندرگاہ تعمیر ہوئیں اور بغیر کسی غیر ملکی تعاون کے دمشق اور مدینہ منورہ کے درمیان حجاز ریلوے کی بنا پڑی —

سلطان عبدالحمید کے عہد میں عرب کے بہت سے مشاہیر حکومت کے بلند مناصب پر فایز ہوے - یہ ایک حقیقت ہے کہ عربوں کو سلطان کی بارگاہ میں خصوصی تقرب حاصل تھا، چنانچہ انکا سکنڈ سکریٹری احمد عزا پاشا دمشق کا ایک عرب تھا - سلطان کے شیخ ابوالہدا الصیادی بھی مضافات حلب کے رہنے والے عرب تھے - سلطان کو عربوں سے اس حد تک شغف تھا کہ ان کے خاص محافظ دستے، فوج کے جنرل اور محل کے ملازمین میں عربوں کی بڑی اکثریت تھی - اس التفات خصوصی کے نتیجے میں سلطان کو ترکی اصل عوام کی شدید مخالفت اور غم اور غصے کا سامنا کرنا پڑا - اس کی عام داخلی پالیسی کو "عرب نواز اسلامی سیاست" کا نام دیا جاسکتا ہے - سلطان عبدالحمید کی خارجہ پالیسی بھی جذبات، ناتجربہ کاری اور ناعاقبت اندیشی کی سیاست نہیں تھی، جیسا کہ بعد میں انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوان ترکوں POUNGTURKS نے مشہور کر دیا تھا بلکہ پختہ شعور، کامل تجربے اور بالغ اندیشی کی سیاست تھی - سلطان کے ایک شدید مخالف سید جمال الدین افغانی نے بھی اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، وہ کہتے ہیں -

"میں نے انہیں امور جہانبانی کی باریکیوں اور دول یورپ کے عزائم سے مکمل طور پر باخبر دیکھا، وہ سلطنت کے خلاف ہر سازش سے آگاہ رہتے تے، جس چیز نے مجھکو سب سے زیادہ متحیر کیا، وہ ان کا جاسوسی کا مضبوط نظام ہے، جس کی وجہ سے یورپین حکومتیں دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی اہم قدم نہیں اٹھاسکتی تھیں، اور ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنا یورپی ممالک کی تباہی کے بغیر ممکن نہیں، اور جب یورپ نے ریاست ہاے بلقان کے بارے میں ترکی کے خلاف جنگ کرنے کے مسلے پر اتفاق کرنے کی کوشش کی تو سلطان نے اپنی ذہانت اور عجیب و غریب دانشمندی سے ان طاقتوں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنا دیا -"

ہرزل کی سلطان سے سودے بازی

۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک کے بانی ہرزل نے فلسطین میں یہودیوں کا ایک قومی وطن بنانے کی عبدالحمید سے سودے بازی کی تھی - اس کے معاوضے میں سلطان کی خدمت میں ایک خطیر رقم پیش کرتے ہوے یقین دلایا تھا کہ اگر سلطان سرزمین فلسطین میں یہودیوں کا وطن بنانے پر رضامند ہو جائیں تو سلطنت عثمانیہ کے ذمے تمام غیر ملکی قرضوں کو ادا کر دیا جاے گا، جو نادر دستاویز ہم پیش کر رہے ہیں اس سے بتصریح ثابت ہوتا ہے کہ سلطان نے ہرزل کی اس پیشکش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا، روس فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کو اس پر شدید غم اور غصا تھا کہ سلطان نے قسطنطنیہ اور بغداد کے درمیان ریلوے لائن بنانے کا ٹھیکا ایک جرمن کمپنی کو کیوں دیدیا، چنانچہ انہوں نے ایشیاے کوچک میں جدید ذرایع حمل و نقل کی عدم موجودگی کے باعث سفر کرنا وقت طلب تھا، جس کی وجہ سے جرمنی کو تجارت میں بہت دشواری ہوتا تھی - عثمانی حکومت کے صدر مقام سے ایشیاے کوچک تک جانے کے لیے کوئی ریلوے لائن نہ تھی، چنانچہ ایک جرمن کمپنی نے ۱۸۹۳ء میں ایک ریلوے لائن انقرا تک تعمیر کی - اس کی وجہ سے سفر اور تجارت میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی، چنانچہ سلطان نے اس ریلوے لائن کو بغداد تک بڑھانے کی اجازت دیدی، اور تعمیر کا کام ایک جرمن ریلوے کمپنی کے سپرد کیا گیا - اسی ریلوے کی تعمیر سے فرانس اور برطانیا طاقتوں کو تشویش پیدا ہو گئی تھی کیونکہ اس کی تکمیل سے نہ صرف ایشیاے کوچک میں جرمنی کا مکمل اقتصادی تسلط قایم ہو جاتا، بلکہ میسوپوٹامیا اور خلیج فارس کی اقتصادی تسخیر کا بھی خطرا تھا، جرمنی کے تاجر بغداد ریلوے کے جاری ہونے سے مشرق ادنی کے بازاروں پر قابض ہو جاتے اسکے علاوا نہر سویز کے مقابلے میں اس ریلوے کے ذریعے تجارتی اشیا بہت کم وقت میں خلیج فارس تک بھیجی جا سکتی تھیں - حکومت برطانیا کے لیے زیادا

تشویشناک بات یہ تھی کہ ممکن ہے جرمن حکومت جرمن ریلوے کمپنی کے تمام حقوق حاصل کرے اور اس طرح ایک اقتصادی مسئلے کہیں سیاسی حربا نہ بنجائے - ان ہی وجوہ کے باعث روس، فرانس اور برطانیا کو قسطنطنیا میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر ناگوار گزرا۔

سلطنت کے مختلف عناصر کو عبدالحمید کے خلاف بغاوت کے لیے اکسایا اور اس کے لیے انکی خفیا مدد بھی کی، جس طرح یہ طاقتیں اس سے قبل ریاستہائے بلقان میں کر چکی تھیں۔ اور اسی سبب سے ترکی میں علحدگی پسند جماعتیں ابھریں - ان سرکشوں کے رہنما بہت سے ایسے یہودی بھی تھے جو بظاہر اپنے کو مسلمان کہتے تھے۔ ان جماعتوں کے خفیا اجلاس غیر ملکوں میں منعقد ہوتے تھے - انجمن اتحاد و ترقی کے بانیوں نے بھی اپنے ابتدائی جلسے پیرس و جنیوا میں کیے تھے، غیر ملکی سفارت خانوں نے سلطان کے خلاف ہر سازش اور بغاوت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے خزانوں کے مونھ کھول دیے تھا اور انجمن اتحاد و ترقی کے یہودی اصل فوجی افسروں کے ذمے سلطان کو معزول اور دستوری حکومت قایم کرنے کی ذمے داری سپرد کی گئی تھی - انگلستان اور فرانس خاص طور پر حکومت کے باغیوں کو پناہ دینے میں پیش پیش تھے، اور اس کا تختا الٹنے کے لیے اپنے ملک میں کام کرنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی -

جب سلطان عبدالحمید نے ہرزل کے مطالبے کو مسترد کر دیا تو یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ جب تک عبدالحمید تخت نشین حکومت رہے گا فلسطین میں ان کے قومی وطن کا قیام ناممکن ہے، چنانچہ ترکی کا تختا الٹنے اور اس کے حصے بخرے کرنے کے لیے وہ دو میدانوں میں سرگرم عمل ہو گئے - بیرونی خصوصاً یورپین ممالک میں اپنی مشنریوں اور حکومت پر اپنے اثر و نفوذ کو استعمال کیا، اور اندرون ملک سلطنت کے مختلف عناصر کرد، عرب، ارمن اور چرکس وغیرا میں جداگانہ قومیت کا جذبا ابھارا - ان کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں، چنانچہ انجمن اتحاد و ترقی نے اپنی خفیا سوسائٹی کا صدر دفتر سالونیکا میں قایم کیا - یہ شہر اس قسم کی خفیا سرگرمیوں کے لیے نہایت موزوں تھا۔ یہاں تحریک انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے انجمن جو دُگرا مرتب کرتی غیر ملکی طاقتیں اس کی پوری پشت پناہی کرتی تھیں - چند دنوں میں باغیوں کی خفیا سازشیں علانیا ظاہر ہونے لگیں - لونیکا میں انجمن اتحاد و ترقی نے ۲۳ر جولائی سنہ ۱۹۰۸ء کو علم بغاوت بلند کر دیا، اور سرکش فوج کی طرف سے ترکی کے صدر اعظم کو تار موصول ہوا کہ اگر فوری طور پر دستوری حکومت نہ قایم کی گئی تو انقلابی فوجیں قسطنطنیا میں داخل ہو جائیں گی، جب سلطان کو یقین واثق ہو گیا کہ اب یہ شورش دبنے والی نہیں ہے، اور دولت عثمانیا کے خلاف یورپین حکومتوں نے گہری سازش کر لی ہے تو اس نے ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۰۸ء کو دوبارا دستوری حکومت کا قیام منظور کر لیا -

عرب نوجوانوں میں جو قومی احساس غیروں سے غیر شعوری طور پر پیدا کر دیا تھا وہ بھی ابھر آیا، غیر ملکی جماعتیں، تعلیمی ادارے اور سفارت خانے قومی بیداری کے نام سے اس کو ہوا دیتے تھے - سلطنت عثمانیا میں بیرونی قوموں کے جو اسکول اور کالج پھیلے ہوئے تھے انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نصرانی یہودی طلبا و الوں کو مسلمانوں کے رعب و خوف سے اتنا بھر دیا کہ ان کو عثمانی شہنشاہیت سے نفرت ہو گئی -

دولت عثمانیا کے خلاف تمام شورشوں کے پس پردا یہودیوں کا نمایاں ہاتھ ہوتا تھا - ان ہی نے غیر ترکی عناصر میں قومی شعور بیدار کیا اور ظلم و استبداد کے خلاف صف آرا ہونے کی حوصلا افزائی کی - انجمن اتحاد و ترقی نے بھی عوام خصوصاً نوجوان طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے "آزادی مساوات اور عدل" کا نعرا بلند کیا اور یہ جھوٹا پروپیگنڈا کیا کہ سلطان عبدالحمید نہایت استبداد پسند اور مطلق العنان حکمران ہے - اس کے عہد میں ہزاروں آدمی قتل و غارت کر دیے گئے، اور ہزاروں جیل خانوں میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں - ایسے حاکم کا معزول کیا جانا لازمی و ایمان بحد ضروری ہے - اس پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ اندرون ملک اور پوری دنیا میں یہ خیال عام ہو گیا کہ ترکی عوام شدید گھٹن کے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں

جیسا کہ ناظرین کرام جانتے ہیں کہ سالونیکا کی باغی فوج پیش قدمی کر کے پائے تخت قسطنطنیا میں داخل ہوگئی، اور قصر یلدیز کا محاصرا کر کے معزولی کی قرارداد سلطان کے سامنے پیش کر دی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس قرارداد کو سلطان تک پہنچانے والا کون تھا؟ "انجمن اتحاد و ترقی کا ایک یہودی نژاد رکن قرہ صوا"، جیسے ہی سلطان کی معزولی اور دستوری حکومت کے قیام کا اعلان ہوا پوری عثمانی مملکت میں شادیانے بجنے لگے، اور عنان حکومت "انجمن اتحاد و ترقی" کے نوجوان ترکوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ انہوں نے سلطان عبدالحمید کے خلاف جھوٹے الزامات اور افترا پردازی کی مہم تیز کر دی۔ پورا پریس اس پروپیگنڈے میں سرگرم ہوگیا کہ عبدالحمید نہایت ظالم و جابر، متعصب، استبداد پسند اور مطلق العنان حکمراں ہے، اس کے عہد حکومت میں ترکوں اور غیر ترکوں کے خون کا دریا بہایا گیا۔ ہزاروں بے گناہوں کو زنداں میں ڈالا گیا، اسکولوں اور کالجوں میں دولت عثمانیا کی جو تاریخ پڑھائی جاتی اس میں عبدالحمید کے عہد کو نہایت مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا۔ اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں یہ خیال عام ہوگیا کہ "انجمن اتحاد و ترقی" اصل میں مملکت عثمانیا کی نجات دہندا ہے۔ اس نے ملک کو ایک نازک وقت میں جور و استبداد کے چنگل اور تباہی کے دہانے سے بچا لیا، جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے، نوجوان ترکوں YOUNG TURKS نے حریت، مساوات اور عدل کے نام پر انقلاب کا علم بلند کیا تھا، لیکن بعد میں وقت نے خود ہی ان کے جھوٹے اصولوں کا کھوٹا پن ثابت کر دیا، اور اس انجمن کے قایدین کی نا اہلی کی بدولت سلطنت عثمانیا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فنا ہو گئی۔

ان واقعات پر زیادا عرصا نہیں گذرا تھا کہ فلسطین کا غم انگیز حادثا پیش آ گیا، اور اہل دانش کی نگاہوں میں اقعات و حقایق خود بخود منکشف ہو گئے۔ اگر سلطان عبدالحمید نے یہودیوں کا مطالبا تسلیم کر لیا ہوتا تو آخری سانس تک بڑے اطمینان سے حکومت کرتا رہتا۔ اب

رہ گئی ہے کہ حکومت ترکی کے خلاف تمام شورشیں اور انقلابی تحریکیں اصل میں ایک صیہونی ریاست کے قیام کا دیباچا تھیں، نوجوان ترکوں کے عہد حکومت میں ہمارے اساتذا نے سلطان عبدالحمید اور انجمن اتحاد و ترقی کے بارے میں جو معلومات ہمیں فراہم کیں وہ سراسر کذب و افترا کا پلندا تھیں جس حقیقت کا ادراک ہم کو اب ہو رہا ہے، دور اندیش عبدالحمید نے ساٹھ سال قبل ہی اسکو اپنی چشم بصیرت سے دیکھ لیا تھا، لیکن بدقسمتی سے سلطان کو کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو اسی کی طرح معاملے کی تہ کو پہنچ سکتا، عبدالحمید کا تخت حکومت اصل میں صیہونیت کا شکار اور فلسطین کی راہ میں پہلی قربانی ثابت ہوا، جس طرح حجاز کا سابق مرحوم فرمانروا حسین بن علی بھی اسی راہ میں قربانی کا بکرا بنا تھا، جب اس نے فلسطین کے عربوں کے حقوق کے تحفظ میں زیادا اہتمام کیا تو انگریزوں نے اسے تخت سے اتار کر قبرس میں جلا وطن کر دیا۔

سلطان عبدالحمید کی معزولی کے وقت قصر یلدیز میں جو واقعات پیش آئے وہ ایک مقرب درباری زاہد پاشا اکثر اپنے ہم نشینوں کو سنایا کرتا تھا، دمشق کے جن معمر بزرگوں نے ان تفصیلات کو زاہد پاشا کی زبانی سنا ہے انہوں نے خود راقم سطور سے اس کی پوری تفصیل بیان کی کہ جب انقلاب پسندوں کی شورش بے حد بڑھ گئی، اور سالونیکا میں بغاوت کا اعلان کر دیا گیا تو صدر اعظم نے فوراً سلطان کو اس سے آگاہ کیا، سلطان نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا "طیب" (یعنی اچھا) پھر اس نے سلطان کو مطلع کیا کہ باغی قسطنطنیا کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں، سلطان پھر "طیب" کہکر خاموش ہوگیا۔ صدر اعظم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سلطان کو خبر کرتا رہا کہ اب انقلابی فوج دارالسلطنت میں داخل ہو گئی ہے۔ اب وہ قصر شاہی کی طرف بڑھ رہی ہے اب اس نے قصر یلدیز کا محاصرا کر لیا ہے، اس سب کے جواب میں سلطان صرف ایک لفظ "طیب" کہتا رہا۔ صدر اعظم سلطان سے بہت خوف کھاتا تھا، اس لیے اسکو مزید کچھ کہنے کی

نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوکر باغیوں سے مقابلہ کرنے کی اجازت طلب کی، سلطان نے اسکو نہایت سختی سے روک دیا، تھوڑی دیر کے بعد اسی افسر نے دربار آکر عرض کیا کہ ہمارے سپاہی مقابلہ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں، عبدالحمید نے اُسکے جواب میں جو کچھ کہا وہ اس کی صلح جوئی، نیکی وصالحیت اور ایثار و قربانی کی بہت بڑی مثال ہے، اس نے کہا ۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ انقلابیوں کا مقصد یا تو میری معزولی ہے یا میرا قتل، اور ظاہر ہے میں فرد واحد ہوں، جب میں تم کو مقابلہ کرنے کا حکم دیدوں گا تو تمہارے اور باغیوں کے ہاتوں سینکڑوں افراد خاک و خون میں لوٹیں گے، اور تم سب اسی امت کے افراد ہو، اور یہ امت عنقریب پیش آنے والے شدائد و مشکلات میں تمہاری زیادہ ضرورت مند ہوگی ۔"

اوپر کے جواب سے "استبداد پسند" سلطان عبدالحمید کی جو تصویر نظر کے سامنے آتی ہے وہ اس سے قطعی مختلف ہے جو اتحادی نوجوانوں کی پروپگنڈا مشنری نے برسر اقتدار آنے کے بعد پیش کی تھی ۔ دستاویز اور اس کا واقعہ شیخ محمود ابوالشامات سلسلۂ یشرطیہ شاذلیہ کے مشہور صاحب نسبت بزرگ گذرے ہیں۔ ان کا مزار دمشق کے محلے قنوات میں مرجع انام ہے، شیخ کے مریدوں میں قصر یلدیز کے مہتم راغب رفا بے بھی تھے۔ جب شیخ قسطنطنیہ میں تشریف لاتے تو اپنے مرید کے پاس محل کے گوشے میں قیام کرتے۔ سلطان عبدالحمید جو سلطنت کی معمولی سے معمولی بات سے آگاہ رہتے تھے، اپنے محل میں شیخ کے قیام سے کس طرح ناواقف رہتے، انہوں نے راغب رفا بے سے اس بارے میں پوچھا، اس نے اپنے مرشد کا تعارف کچھ اس طرح کرایا کہ سلطان بھی ان سے ملنے کا مشتاق ہوگیا، اور پھر ان سے مل کر اتنا متاثر ہوا کہ طریقۂ شاذلیہ میں ان سے بیعت کرلی، سلطان کے ساتھ قسطنطنیہ کے سب سے معزز عہدہ، قصر شاہی کے ملازمین اور سپاہی و

فوجی بھی شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔

جب معزولی کے بعد سلطان کو سالونیکا کے ایک محل میں رکھا گیا تو اس کے حفاظتی دستے میں شیخ ابوالشامات کا ایک مسترشد بھی تھا، اسی کے واسطے سے سلطان اور شیخ کے درمیان خفیہ مراسلت ہوا کرتی تھی، چنانچہ سلطان عبدالحمید کا اسی قسم کا ایک اہم خط زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچا۔ اس تاریخی خط میں سلطان نے اپنی معزولی کے راز سے بہت صراحت کے ساتھ پردا اٹھایا ہے ۔

"انجمن اتحاد و ترقی کے دور اقتدار میں شیخ نے اس خط کو ایک سربستہ راز کے طور پر محفوظ رکھا۔ شیخ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادوں نے بھی اس کی پوری حفاظت کی، اور سوائے چند ثقہ اہل تعلق کے کوئی اس سے واقف نہیں ہوا، یہاں تک کہ جب اس دستاویزی خط پر مرور ایام کے اثرات ظاہر ہونے لگے تو بعض دمشقی احباب نے میری توجہ اس طرف منعطف کرائی میں نے شیخ کے لڑکوں سے اس خط کو دینے کی درخواست کی، کیونکہ اب اس کو پوشیدہ رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا، اور حق کو منظر عام پر لانا ہی چاہیے تھا، تاکہ علما و محققین اپنی غلط تحقیقات کی تصحیح کرلیں، میں نے اس خط کا عکس لے کر اصل ترکی خط کو شکریے کے ساتھ شیخ کے ورثا کو واپس کردیا ہے۔ اس خط کا عربی ترجمہ اسی عہد کے ایک ایسے اہل علم نے کیا ہے جو عربی و ترکی دونوں زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ شیخ ابوالشامات کے ورثا نے اصل ترکی خط کے ساتھ اس عربی ترجمے کو بھی حفاظت سے رکھا ہے، اب خط ملاحظہ فرمائیں ۔

" اس تمہید کے بعد میں آنجناب اور دوسرے اہل دانش کی خدمت میں تاریخ کی امانت کے طور پر ایک اہم معاملہ پیش کرتا ہوں۔ میں خلافت اسلامیہ سے کسی اور سبب کی بنا پر معزول نہیں کیا گیا - سوائے اس کے کہ نوجوان ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کے لیڈروں نے مجھے دھمکیاں دیں اور بہت تنگ کیا جس کی وجہ سے مجبور و لاچار ہوکر مجھے خلافت

چھوڑنی پڑی - بلا شبہا اتحادیوں نے حد درجہ اصرار کیا کہ میں ارض مقدس فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کا مطالبا منظور کر لوں - ان کے اصرار و دھمکی کے علی الرغم میں نے کسی صورت میں اس کو قبول نہیں کیا، آخر میں انہوں نے بطور رشوت ۱۵ کروڑ ڈالر سونے کی پیشکش کی - میں نے قطعی طور پر اس کو بھی ٹھکرا دیا، اور انہیں درج ذیل قطعی و حتمی جواب دیا -

اگر تم پندرہ کروڑ انگریزی ڈالر سونے کے بجائے پوری دنیا کو سونے سے بھر کر مجھے دو تو بھی میں کسی طرح اس مطالبے کو منظور نہیں کر سکتا - میں نے تیس سال تک ملت اسلامیا اور امت محمدیہ کی خدمت کی ہے، اور عثمانی خلفا و سلاطین میں سے میرے آبا و اجداد نے مسلمانوں کے صحیفۂ اعمال کو سیاہ نہیں کیا، اسلیے میں بھی تمہاری اس پیشکش کو کسی حال میں بھی قبول نہیں کر سکتا -

میرے اس قطعی جواب کے بعد انہوں نے میری معزولی پر اتفاق رائے کر لیا، اور مجھے مطلع کیا کہ وہ جلد ہی مجھے سالونیکا کے ایک محل میں نظر بند کر دینگے - میں نے ان کے اس عتاب کو گوارا کر لیا -

میں خداوند قدوس کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ ارض فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام سے جو ابدی ننگ و عار لاحق ہوتا میں نے عالم اسلام اور دولت عثمانیا کو اس سے آلودا کرنا قبول نہیں کیا، اور اس کے بعد جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا - میرا خیال ہے میں نے اس مسلے پر صراحت کے ساتھ تمام باتیں عرض کر دی ہیں، اور اسی پر اپنا یہ خط ختم کرتا ہوں -"

فی ۲۲ ایلول ۱۳۲۹ خادم المسلمین

عبدالحمید بن عبدالمجید

ہندستانی بولیے - ہندستانی لکھیے - ہندستانی پڑھیے -

ریاض گیاوی

ابر احسنی گنوری کے نام

آفتاب علم و دانش طوطیٔ شیریں مقال
واقف سر معانی شاعر و روشن خیال
خدمت علم و ادب تھا تیرا شیوہ عمر بھر
تیرے ہمعصروں میں جس کی کم ہی ملتی ہے مثال
اشہب خامہ کی جولانی کے قائل ہیں سبھی
اہل علم، اہل قلم، اہل نظر، اہل کمال
نکتہ فہم و نکتہ سنج و نکتہ داں نکتہ شناس
خوش سیر، خوش فکر، خوش رو خوش نگاہ و خوش خصال
نظم میں تیری ترقع تھا غزل میں بانکپن
شعر کے پردے میں ہے افسانہ ماضی و حال
خادم اردو زباں تھا قوم کا رہبر بھی تھا
تیری رحلت پر نہ ہوں کیوں نوحہ خواں اہل کمال
دولت فن سے نوازا دست قدرت نے تجھے
شاعر شیوہ بیاں تھا خوش نصیب و خوشحال
رونق بزم سخن تھا صاحب طرز ادا
تیرے غم سے دل ہوا اہل وطن کا پائمال
گھر گئی ہے کشتی شعر و سخن گرداب میں
اٹھ گیا صد حیف تجھ سا نا خدائے بیمثال
باندھ کر رحمت سفر ملک عدم کی راہ لی
اپنی ہجرت سے دیا احباب کے دل کو ملال
تھک کر آخر سو گیا شاعر ابد کی گود میں
قلب مضطر سے مٹا کر دار فانی کا خیال

علیا پروین

چچی چھمن نے نیا سلام سیکھا

چچی چھمن بے حد برا مونھ بنائے ہوئے تھیں۔ یوں جیسے کچی نمکولی اور ہری ہری نیم کی پتیوں کا سکاڑا پی کر آئی ہوں۔ میں نے خالا جان کو اشارا کیا تو انہوں نے پوچھا۔

چھمن بی! کیوں خیر تو ہے، کیا ہوا؟

"اے ہوتا کیا۔ اللہ رکھے سب خیریت ہے۔ واہ بھابھی تم تو خوب ہو۔ ہر وقت بری فال مونھ سے نکالا کرتی ہو۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ پوچھ ہوتا کیا۔"

"اے ہے! تم برا مان گئیں۔ میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ آؤ بیٹھو پان کھاؤ۔ ابھی ابھی تنبولن سے تازی ڈھولی لی ہے۔ بڑے عمدا پان ہیں۔"

خالا جان کی دعوت پر چچی نے کندھے پر پڑا برقعا پلنگ پر رکھا، "یا اللہ" کہہ کر بیٹھیں۔ پھر برقعا اپنے داہنے زانو تلے دبا کر بولیں۔

"اللہ اچھا رکھے بھابی اتنا خیال تو کرتی ہو میرا۔ اے ہاں! پان تو بڑے اچھے ہیں۔ ہائے! ترس گیا جی پانوں کو۔ کتنے اچھے پان لایا کرتا تھا منگو تنبولی! مرنی کی ڈلی کی طرح مونھ میں چور چور ہو جاتے تھے۔ اب کہاں نصیب وہ پان؟" بے حد ٹھنڈی سانس بھر کر۔ "سب کچھ خواب خیال ہو گیا۔" جلدی جلدی انہوں نے دو بڑے بڑے پانوں کی یہ موٹی تازی گلوری بنا کر رخسار کے گدے میں دبائی اور مجھ سے بولیں۔

"اے سنا پروین بی بی؟ کل اچھن میاں کے یہاں میلاد شریف تھا۔"

میں نے سوچا اب ملا کوئی اچھا سا مواد، جلدی سے پوچھا۔ اچھا چچی؟ مجھے نہیں پتا چلا۔ آپ گئی تھیں؟

چچی نے حیرت سے کہا۔

"اوئی! تمہیں نہیں بلایا اچھن کی بیوی نے۔ میں پوچھوں گی بی بہو کا مجاز۔ لو اور سنو! دنیا زمانے کی بھیڑ جمع کر لی اور اپنے محلے والوں کو بھول گئیں!"

"چلو ٹھیک ہے سب ہیں کوئی شکایت نہیں ہے۔" خالا جان نے کہا۔ "ذرا حال سنا دو بی وہاں کا! کون آیا؟ کیا تقسیم ہوا؟ کس نے پڑھا؟"

چچی نے پھر اسی طرح مونھ بنا لیا۔ بہت ہی بڑی پیک کی پچکاری چھوڑ کر بولیں۔

"حال کیا سناؤں بی۔ میں تو بس وہ کیا کہتے ہیں ٹکر ٹکر دیدا دم نہ درود بنی رہی۔"

"ٹکر ٹکر دیدا دم نہ درود۔ ماشا اللہ!" میں نے خالا جان کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس وقت چچی کو خفا کر کے قصے کا مزا کھونا نہیں چاہتی تھیں کہنے لگیں۔

کیوں؟ بہت گنے چنے لوگ آئے تھے؟"

"نہ گنے چنے یہ کہو بے گنتی" چچی جل کر بولیں "نہ جانے کس کس کو بلا لیا تھا۔ کونے کونے سے آئی"

تھیں عورتیں بس نہ پوچھو کیا شان تھی، کیا فیشن تھے؟ کہا نا! میں تو ٹکر ٹکر دیدا نی بیٹھی رہی۔"

"ٹکر ٹکر دید دم نہ کشیدم۔" میں نے ان کو سنا کر گویا اپنے آپ سے کہا۔ چچی نے برہم ہو کر کچھ کہنا چاہا، مگر خالا جان نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"بڑے بڑے لوگ آئے ہوں گے؟ بی! اچھن میاں کی بیوی بڑے آدمیوں ہی سے ملتی ہیں۔"

"ہاں بی! تھے تو بڑے بڑے ہی لوگ، مگر۔" چچی نے دو بار ایک تھوکی۔ "مگر اللہ جھوٹ نہ بلوائے نہ تمیز نہ سلیقا۔"

"تمیز نہ سلیقا؟" میں نے پوچھا۔

"اور کیا بیٹی!" چچی نے بھویں چڑا کر کہا۔

"چاواں چاواں کاوں کاوں، کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ دو چار ادھر بیٹھی ہوئی، دو چار ادھر بیٹھی ہوئی، چار چھ ادھر کھڑی مٹک تھرک رہی تھیں، چار چھ ادھر کھڑی اٹھلا رہی ہیں۔ ادئی! یہ کوئی طریقا ہوا! محفل میلاد نہ ہوئی میلا ٹھیلا ہو گئی۔ وہ کیا کہتے ہیں پارک ہو گئی جہاں پر سیر سپاٹا کرتے ہیں، وہی مثل ہے نہ ترم نہ نقص۔"

"ترم نقص۔؟" میں ہونقوں کی طرح کبھی چچی کا کبھی خالا جان کا منھ دیکھنے لگی۔

"ہاں بی! میں تو دیکھ کر الاق سم انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔"

"مگر یہ ترم و نقص۔؟" یہ عجیب و غریب الفاظ میرے حلق سے نہ اتر رہے تھے۔ چچی چڑ کر کچھ بولنا چاہتی تھیں، لیکن خالا جان اس بار بھی کود پڑیں اور بولیں۔

"توبا ہے پروین! تم تو سچ مچ بال کی کھال نکالنے لگتی ہو۔ اب چھمن بی غریب تم لوگوں کی طرح نابپ تول کر تو بولنے سے رہیں، یوں کہہ لو نظم و نسق۔"

"اوہ!" میں نے اطمینان کی سانس لی۔

چچی نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا، پھر پیک تھوکی، آنچل سے ہونٹ پونچھے، دو بارا چھالیا پھانکی، کتھا چونا چاٹا اور زردے کی ڈھیری ہتھیلی پر الٹتے ہوئے بولیں۔

"خیر! یہ نہ کہو بھابی! ہم لوگوں سے اچھا کون بولے گا۔ ہمارے ابا، اللہ ان کو جنت میں جگہ رہنا نصیب کرے، مشکلکشا قسم، کوثر تسنیم کی دھلی زبان بولتے تھے۔"

"ماشا اللہ" میں نے کہا تو چچی کی گردن غرور سے اونچی ہو گئی، بولیں۔

"دور دور سے لوگ سیکھنے آتے تھے۔ پورا مدرسا لگ جاتا تھا، بی پورا مدرسا، لڑکے بالے نہیں سفید بالوں اور داڑھی والے آتے تھے۔ ارے تم لوگوں نے کہاں سنی وہ اتالیق بولی۔"

"اتالیق۔" یہ لفظ میرے حلق میں پھر اٹک گیا۔

"ہاں ہاں! اتالیق" چچی کو جوش آ گیا۔

"اب تم میری بولی پر اعتراض کرتی ہو، بات بات پر ٹوکے دیتی ہو۔ الاق سم میرے باپ دادا کی روح کو جلال آ جاتا ہوگا۔ تم نے وہ مشہور واقیا (واقعا) نہیں سنا بی! جب ایک آدمی کو میرے ابا نے کھڑے قد اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔"

"اچھا! میں نے تو نہیں سنا چچی!" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ چچی کا جوش اللہ کی پناہ! سر تا پاندان پر جھک کر بر قعا ایک زانو تلے سے نکال دوسرے زانو تلے دباتی ہوئی بولیں۔

"کیا رستم سہراب کا قصا مشہور ہوگا بی! آلہا اودل کی کہانی پیچھے رہ گئی تھی۔ تم نے نہیں سنا تعجب ہے! ارے بیٹی بڑا لشت پشت آدمی تھا وہ۔"

"ہشت پشت۔" میری زبان نہ مانی۔

"اللہ کا شکر ہے! چچی چراغپا نہیں ہوئیں۔ اسی جوش کے عالم میں کہتی رہیں۔ "وہ بڑا لشت پشت آدمی تھا۔ یہ کلا ٹھلا، چار پہلوانوں کو بغل میں داب کر بزار ٹہل آئے۔ اعمال کی شامت، میرے ابا، اللہ ان کو بخشے، ابا کا شاگرد بن گیا۔"

"پہلوانی میں؟" میں نے حد درجا معصومیت سے سوال کیا۔

خالا جان کو بڑے زوروں کی ہنسی آئی، لیکن بلا وجہ بھی کھانس کر چھپا گئیں۔ چچی نے لات اور

گردن ایک ساتھ ہلا کر کہا۔

"ارے نہیں بی بی! لکھنے پڑتے ہیں۔ دس بچوں کا باپ تھا، مگر ابا کے سامنے بالشت بھر کا بچہ بنا رہتا۔"

"دس بچوں کا باپ" میں نے جھرجھری لے کر کہا۔

"ہاں ہاں دس بچوں کا۔ ہوئے تو پندرا، مگر پانچ جاتے رہے۔ دس بچے گھر بھرا تھا۔ ایسا اچھا لگتا کہ کیا کہوں۔"

غریب کی جان بچی رہتی ہوگی، میرے کہنے پر چچی چیخ کر بولیں۔

"ارے آج کل کی ایسی نحوست تھوڑے چھائی تھی کہ جان بچی رہتی۔ چھ روپے کا۔ یادا بھی آج کل کے وہ کیا کہتے ہیں ڈپٹی کلکٹر کے برابر مزے کرتا تھا۔ بچے اللہ کی رحمت سمجھے جاتے تھے۔ بھرے پرے کنبے والا خوش نصیب کہلاتا تھا۔ آج کل جس کے دو سے تین ہو جائیں نکو بنا لیا جاتا ہے وہ۔ مردے ناشاد فیملی پلاننگ والے پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ خدا کی پناہ!" گالوں پر چٹاچٹ ہاتھ مارتے ہوئے۔

"ایسی بے حیائی، بے غیرتی کبھی دیکھی نہ سنی۔ آسمان پھٹ کر زمین میں نہ سما جائے تب کہنا۔ ارے کل وہ بڑے میاں کا اتنا سا پوتا۔" ہاتھ سے اس کے قد کا اشارا کرکے۔ "ایک تو غضب سے آیا کہنے لگا بی بی جی دیکھو آدمیوں کی تصویریں بنی ہیں۔ اے میں سمجھی کوئی اچھی تصویر ہوگی۔ اللہ میرے!" سر پر ہاتھ رکھ کر۔ "اب جو دیکھا تو آنکھیں بند ہو گئیں۔ چل چل پسینا بہہ نکلا۔"

"کیا تھا آخر؟" خالا جان نے پوچھا۔

"ارے نہ پوچھو بھابی کیا تھا۔ کیا باقی رہ گیا تھا دکھانے میں۔ مردوں، عورتوں کی بری بری تصویریں۔ ارے ایسی کھلی کھلی ننگی کہ بڑے بڑے حیالوں کو عرق آ جائے۔"

"توبا توبا! اس لڑکے کو کہاں سے ملیں یہ تصویریں؟" خالا جان کے پوچھنے پر چچی پھر جوش میں آ گئیں۔

"ملیں کہاں سے؟ ارے بی! لوگوں نے دیں۔ گلیوں گلیوں، بانٹی گئیں۔ ارے یہ انہیں فیملی پلاننگ والوں کے کرتوت ہیں۔ یہ جو ہفتوں سے ہوا مرا کیمپ پڑا ہے لونڈی بیکر پر لیے لیے موشن دیتے جا رہے ہیں۔"

"موشن۔ نہیں چچی! پھاشن۔" میں نے ایک بے ساختہ قہقہے کی گردن مروڑ کر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

چچی نے میری بات یوں اڑا دی جیسے لوگ مکھی اڑاتے ہیں، بولیں۔

"کیا زمانہ آ گیا ہے بی! جو باتیں لوگ اپنے دوستوں کو نہیں بتاتے وہ اب ڈنکے کی چوٹ پر بتائی جاتی ہیں۔ ارے اس بے غیرتی سے بڑھ کے بھی کوئی بے غیرتی ہوگی۔ آج کل کے لڑکے لڑکیاں جو جامے سے باہر ہو رہے ہیں، یہ سب انہیں باتوں کی وجہ ہو رہے ہیں۔ بتاؤ بھلا! کنواری لڑکیوں لڑکوں کو چھوڑو بالشت بالشت بھر کے بچوں کو جب ایسی تصویریں ملیں گی تو کیا حشر ہوگا، اس نئی نسل کا؟ قصور ان سب کا نہیں بڑوں کا ہے۔ ارے اللہ محفوظ رکھیو، یہ سب قیامت کے آثار کی نشانیاں ہیں۔"

خالا جان نے بھی پر زور تائید کی، میں نے بھی۔ چچی بے انتہا خوش ہوئیں اسی خوشی میں ایک گلوری پھر نوش فرمائی اور کھنکار کے بولیں۔

"اب کل والے میلاد شریف ہی کی بات لو۔ یہی محفلیں پہلے ہوتی تھیں۔ ہزاری ہزار کا مجمع ہوتا تھا، مگر کیا مجال کوئی بلا بات ہنس تو دے، زور سے بول تو دے۔ ادھر میلاد شروع ہوا ادھر وہ خاموشی کہ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ارے ایسی محفلوں میں فرشتے بھی اتر آتے ہیں۔ وہ نور، وہ برکت، وہ جھک کر جی چاہتا تھا یہیں پر جان دے دو اور پھر کھنکار کر۔ "وہ محفل میلاد نہیں معاذاللہ میلا لگتا ہے، فیشنوں کی بزار لگتی ہے۔ اے مجھے اتنا غصہ آیا کہ کئی عورتوں کو ڈانٹ دیا۔"

"ڈانٹ دیا!" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں! ڈانٹ دیا!!" چچی نے گردن اکڑائی "کیوں نہ ڈانٹتی جب اور سب گھر والوں موتھ میں مکھن جما تھا تب کیا میں بھی دوا ہتھو (ہونٹ) جب بیٹھی تماشا دیکھتی۔ توبہ! میری جوتی دیکھتی بڑے ہوں گے اپنے گھر کے وہی مثل ہے بی! امیر اپنے مال میں مست غریب اپنی کھال میں مست

میری جوتی کی نوک پر رعایت و داب۔ اے ہاں ادھیڑ ادھیڑ عورتیں چم چم کرتے کپڑے پہنے۔ سرخی پوڈر تھوپے، سینما والیوں کی طرح مٹک چٹک رہی تھیں، ٹھٹھے لگ رہے تھے۔ میں نے کہا بی بیو! ٹھٹھے لگانا تھے، باتیں کرنا تھیں تو اپنے گھر بیٹھی ہوتیں۔ میلاد میں بیکار آئیں۔ ایک دوسرے کو فیشن دکھانا تھے تو کیا کہتے ہیں بزار چلی جاتیں۔ لو اور سنو! ادھر قصیدے ہو رہے ہیں، نعت ہو رہی ہے۔ ادھر ایک دوسرے کی خیریت پوچھی جا رہی ہے۔ ساری کے دام اور دکان دریافت (دریافت) کی جا رہی ہے۔"

"چچی! اور تو سب سمجھ گئی، لیکن کمبل والی بات سمجھ میں نہ آئی۔" میں آخر پوچھ ہی بیٹھی۔

"کمبل والی بات؟" جواباً چچی نے بھی سوالیا انداز میں مجھے دیکھا۔

"آپ نے کہا تھا! کمبل چلی جاتیں۔"

"اللہ رکھے۔" چچی نے ایک زور کا قہقہہ بلند کیا۔

"اوئی بیوی! لکھا پڑھا اتنی گھوڑے بوجھ برابر اور اتنی سی بات سمجھنے میں تو ہے لگ گئے۔"

میں سچ مچ احمقوں کی طرح ان کو دیکھتی رہی۔ ہنسی ضبط کر کے چچی بولیں۔

"اے بیٹی! وہی جہاں بڑے آدمیوں کی بی بیاں لڑکیاں اور صاحب لوگ شام رات میں جی بہلانے جمع ہوتے ہیں۔ نماز قضا ہو، روزہ قضا ہو، مگر کمبل جانا نہ قضا ہو۔"

"اوہو! اب میں سمجھی۔" میں ہنس پڑی۔ "کلب!"

چچی نے اپنا ڈھیلا ہو جانے والا ننھا منا سا آلو سا جوڑا کھول کر پھر سے باندھتے ہوئے مونھ بنا کر کہا۔

"ہاں وہی مردا چھاڑو پھرا کلب۔ دو دن کے لیے جاڑوں میں جب بریلی گئی تھی۔ اپنے بھانجے کی شادی میں۔ وہیں اس کا چرچا سنا تھا۔ شام ہوئی صاحب میم صاحب تیار ہو کے مہمانوں اور گھر بار کو نوکروں پر چھوڑا، کھٹ پٹ کرتے روانہ ہو گئے۔ اللہ غارت کرے کلب۔ ایسی ایسی جان جھلسی ہے میری کیا کہوں حد ہو گئی بی بہو ابھی ابھی آ کے اتری سمدیانہ ڈھلا چلا آ رہا ہے، مہمانوں کا تانتا بندھا ہے، مگر میزبان جو ہیں کلب بھاگے جا رہے ہیں۔ میں نے روکا تو بی بی بولیں (نقل اتار کر) "باجی! بہت فورمل ہے ہمارا جانا۔ آج کلب میں ایک خاص فیشن ہے اس میں شریک ہونا ہے۔" میں نے دل میں کہا غارت ہو۔"

"فنکشن کیا ہوگا۔" میں نے پھر ٹانگ اڑائی۔

"اے ہوگا موا۔ چولھے میں جائے جو کچھ ہو۔ بتاؤ بھلا بڑے بوڑھوں کا یہ حال ہے۔ اب لڑکے لونڈیوں کو کون کہے خانا خاہی پاگل ہے۔ سنا پروین بی بی! ایک نیا سلام چلا ہے۔"

"نیا سلام؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بی نیا سلام۔ اے میں نے نیا ہی سنا ہے۔ جس کو سنو، ہائے ہائے، اوئی! میں تو بت بن کے رہ گئی۔ یہ موا، ہائے ہائے، کیا۔ دو لونڈیاں ایک دوسری کو دیکھ کے بولیں! ہائے زینت! ہائے شہلا۔ اے میں ہکا بکا کہ یہ کیا اچھی بھلی ہنس بول رہی ہیں اور ہائے ہائے، کر رہی ہیں۔"

میں اور میرے ساتھ خالا جان بھی ہنس دیں چچی نے برا سا مونھ بنا کر کہا۔

"اور کیا بیٹی! یہ ہائے ہائے، دیکھو کدھر جاتی ہے سب کو۔ اپنا سلام بھولے، اپنا طور طریقا بھولے۔ ابھی تک بی بی میری ہلو اور ہلو سنتے تھے۔ اب اور سونے پر سہاگا ہوا، ہائے فلاں، ہائے ڈھکاں۔ جیسے ماتم کر رہے ہوں۔ لعنت ہے بی! اس فیشن پر، پھٹکار اس نقل پر۔ اللہ بی بیاں کیسے پیارے انداز میں جھک کر تسلیم کرتی تھیں۔ اب یا تو لٹ سا مار دیں گی، آداب! نہ جھکیں، نہ ہلیں، نہ ڈلیں۔ ٹھورنٹ سی کھڑی کی بیٹھی آداب کا گما رسید کر دیا خیر بی ہلو غنیمت تھا، اور بڑھیں تو ہلو (مٹک کر) ہلو پھر گوارا۔ مگر یہ ہائے۔ تو با میری کیا زمانا آگیا ہے۔"

خالا جان نے ہنس کر یاد دلایا۔

"یہ تو خیر ہوا، مگر ذرا وہ قصا تو بتا دو! تمہارے ابا نے اس پہلوان کو کیسے پچھاڑا تھا۔"

چچی تڑپ کر بولیں۔

" اے پچھاڑنا کیا ؟ کیا کشتی لڑی تھی ، دنگل جیتا تھا ' اکھاڑا اترے تھے ؟ واہ بھابی ! خوب عزت کرتی ہو بزرگوں کی - اللہ کی شان جب تم اس طرح کہو گی تو یہ لڑکے لڑکیاں کیوں نہ ٹھٹھے ماریں گی - یہ کہہ اس کو اٹھا کر ٹپک دیا تھا ۔"

" بات تو ایک ہوئی ۔" میرے کہنے پر چچی بھڑ بڑ ہیں -

" ایک کیسے ہوئی - اے وہیں تو لیا منانا شروع کر دیا تم لوگوں نے - کہا نا شاگرد بنایا تھا ' پڑھنے لکھنے میں کوئی بات غلط بول گیا تھا - ایک دفا (دفعا) بتایا ابا نے اللہ بخشے ، دو دفا بتایا ' تین دفا بتایا ' چوتھی دفا بھی جب اس نے غلط کہا تو وہ کیا کہتے ہیں صبر کا پیالا چھلک گیا ۔"

" ماشا اللہ - سبحان اللہ ۔" اچانک بھیا کی آواز آئی - وہ غسل خانے سے گیلے بالوں کو تولیے سے پونچھتے برآمد ہوئے تھے - چچی نے مڑ کر ان کو دیکھا تو بولنے -

" خدا کی قسم چچی جی خوش کر دیا آپ نے ۔"

" کیوں ؟ " چچی نے بھول کر پوچھا -

" خوب زبان بولی ہے آپ نے صبر کا پیالا - گویا ہندستانی کا موتھ کالا ۔"

" اے ہندستانی ہو یا انگریزی علا بھیا ! جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہوں - چچی کی تافرانا انکساری خدا کی پناہ ! - باپ دادا استاد تھے - میری اماں ' اللہ ان کو جنت میں سونے کی مسہری پر بٹھائے - ایسی ایسی اشعار ہی کہتی تھیں کہ بڑے بڑے کیا نام ہے شاعر لوگ انگشت یا دیدارہ جاتے تھے ۔"

" انگشت یا دیدا ۔" بھیا ہنستے ہنستے دم سے پلنگ پر گر پڑے -

" اے میاں ! کیسے ہنستے ہو اللہ رکھے پانگ کی چولیں چرچرا اٹھیں - نظر لگ جائے گی دشمنوں کی ۔" چچی نے بڑی محبت سے فرمایا - پھر بولیں -

" الاق سم ہانڈی بھونتے بھونتے اشعار کہتی تھیں میری اماں ۔"

" یہ بالکل نئی اطلاع ہے ۔" بھیا نے میری طرف دیکھا - " ہمیں بھئی یوں سمجھو نئی تاریخ بن رہی ہے ۔"

بچی سے ہم دونوں کی بات پر غور نہ ہو سکا - [illegible]

" تو بتاؤ بھلا ! میری زبان کیوں نہ منجھی دھلی ہو گی ' اب آج کل لوگ قدر نہ کریں یہ اور بات ہے - آج کل تو اگلی ہر چیز مردی تاخ پر اٹھا کے رکھ دی گئی ہے - ذرا دا آگے بڑیں گے تو کوڑے پر پھینک دیں گے - بی بی میری توبا - اب جو میں کسی محفل میں جاؤں - باز آئی - بھر پائی - نہ ثواب ملے ' نہ جی خوش ہو - ناز کمبل - وہ کیا کہتے ہیں کلب ہو آئی - اے ہاں اور کیا جی چاہے میلاد سننے کا خدا پڑھ کر ثواب لوٹ لو - اللہ ! وہ عورتیں کیسے مزے سے پڑھ رہی تھیں - ناز کو علیس کر رہی ہوں - جی لوٹ ہوا جا رہا تھا ' مگر اغل بغل آگے پیچھے کھر پھر باتیں ہوئے جا رہی تھیں ' ایک لونڈیا تو مردار ایک سال پھکڑ کی باتیں کیے جا رہی - بالی نے یہ پہنا وہ پہنا کا زُہار و بہن کے تالاب میں جیم سے الیسی کر دی کر دل لوٹ گیا ۔"

" کاسٹیوم ۔" بھیا ہنستے ہنستے اٹھ گئے -

" سمجھے کچھ - کاسٹیوم ۔" میں نے کہا تو بھیا پھر ہنسے - " ہاں ہاں سمجھ گیا بھئی خوب نام دیا چچی نے - بالی کون ہے چچی ' معلوم ہے آپ کو ؟

" میری جوتی کو معلوم ہو ' ہو گی کوئی ' پھکڑ کی عورت - اے میں نے ستائیس ہے فقط - بس اپنا سا موتھ لے کے رہ گئی ۔" چچی آگے کچھ کہتے جا رہی تھیں کہ بوا نصیرن دروازے سے چلاتی ہوئی نکلیں -

" ارے او بیٹا - جنم ساپ تمہاری در آبدار کو نزہت بی بی کا کتا دوڑا رہا ہے ۔"

چچی ایک چیخ مار کر ننگے پاؤں ننگے سر دروازے کی طرف لپکیں - پیچھے پیچھے میں بھی لپکی بھیا بھی دوڑے —

نوبہار صابر

رباعی

یہ طرفگیٔ فکر جواں کیا کہنا
یہ چاشنیٔ لطف زباں کیا کہنا
ہیں اور بھی شاعر بہت اچھے لیکن
غالب ! ترا انداز بیاں کیا کہنا

محمد نعیم ندوی صدیقی، ایم۔ اے

تاج محل کی تعمیر اور استاد احمد لاہوری

(تحقیق مزید کی روشنی میں)

دیوان مہندس کے علاوہ دوسرے ماخذ میں استاد احمد کا تذکرہ

دیوان مہندس کے علاوہ استاد احمد کا تذکرہ بعض دوسری ہم عصر دستاویزات میں بھی ملتا ہے مثلاً محمد صالح کنبوہ شہر دلی کی بنیاد رکھے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جمعہ کی رات پچیسویں ذی الحجہ مطابق انیسویں اردی بہشت دور شاہجہانی کے بارہویں سال (۱۰۴۸ھ / ۳۹-۱۶۳۸ء) کی ایک مبارک ساعت میں استاد احمد و حامد نے جو مشہور ماہرین فن تھے، ایک ایسے پروگرام کے مطابق اس شہر کی بنیاد رکھی جس کا تصور بھی دنیا کے کسی گوشے میں نہیں کیا گیا۔ یہ رسم اس علاقے کے گورنر اور اس مہم کے سربراہ خیرات خان کے زیر نگرانی انجام پائی۔"

اس کی تصدیق ایک اور فارسی مخطوطے تاریخ شاہجہانی سے بھی ہوتی ہے، جس کے دوسرے باب میں قلعے شاہجہان آباد اور اس کے اندر بنی ہوئی دوسری عظیم عمارتوں اور شالیمار باغ کا تفصیلی ذکر ہے۔

سرسید احمد خان نے بھی اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں استاد احمد اور استاد حامد کی مختلف علوم میں مہارت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

" یہ لوگ اپنے فن میں بے نظیر تھے، اور ہندسا اور نجوم میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے۔"

استاد احمد اور حامد کے علاوہ شاہجہان آباد کی تعمیرات میں کئی اور ماہر معماروں کا بھی اشتراک عمل تھا، جن میں سے ایک لطف اللہ مہندس بھی تھا۔ تذکرۂ سفینۂ خوشگو (مخطوطہ) اس کے بارے میں رقمطراز ہے۔

"دارالسلطنت شاہجہان آباد کا قلعہ لطف اللہ کے صلاح مشورے سے بنایا گیا تھا۔"

اسکی مزید تصدیق حسین قلی خان کے نشتر عشق سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے۔

"مولانا امام الدین لطف اللہ مہندس کے فرزند تھے، جن کے مشورے سے دارالخلافت شاہجہان آباد کے شاہی قلعے کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ امام الدین کا انتقال ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۳ء میں ہوا۔"

احمد علی سندیلوی کی تصنیف تذکرۂ "مخزن الغرائب" (۱۲۱۸ھ / ۱۸۳۰ء) صبح گلشن اور تاریخ علمائے ہند آخری عہد کے وہ ماخذ و دستاویزات ہیں جو شاہجہان آباد کی تعمیر میں لطف اللہ کی شرکت کی تصدیق کرتے ہیں

ان کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ استاد احمد اور ان کا خاندان لاہور سے دلی منتقل ہو گیا تھا، تاکہ شاہجہاں آباد اور آگرا کی تعمیرات میں شریک ہو سکے۔

اس عہد کی کئی ہم عصر تحریروں میں استاد احمد اور استاد حامد کا بار بار ایک ساتھ اس طرح ذکر آتا ہے کہ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں صرف رفیق تھے یا رشتے دار یا بھائی تھے، علاما ندوی کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال وہ بھائی تھے، ایک بار سید صاحب موصوف کی ملاقات دلی کے ایک معزز اور قدیم خاندان کے ایک شخص سے ہوئی، اس نے ان کو بتلایا کہ استاد احمد اور استاد حامد بھائی تھے، اس شخص کی یہ رائے ان روایات پر مبنی تھی جو اپنے اجداد سے سنی تھیں۔ دلی کے قدیم باشندوں نے بھی علاما ندوی کو بتلایا کہ جامع مسجد دلی کی تعمیر استاد حامد نے کی تھی، اور استاد ہیرا بھی اس کے ساتھ شریک رہا تھا۔ (ظاہر ہے کہ یہ نام اس کے ہندو ہونے کی دلیل ہے) جامع مسجد اور دریبا بازار کے درمیان ایک گلی ہے، جس کا نام "کوچۂ استاد حامد" ہے۔ مقامی روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ استاد حامد اور احمد کے ورثا جو ۱۹۵۰ء تک اس کوچے میں رہتے تھے "لاہور والاں" کے نام سے مشہور تھے۔

علاما ندوی کی مذکورۂ صدر رائے سے راقم سطور متفق نہیں، کیونکہ اس عہد کی کسی دستاویز سے احمد اور حامد کے رشتے دار ہونے کا ثبوت نہیں ملتا، یہاں تک کہ لطف اللہ کے دیوان مہندس میں بھی اس کا کوئی تذکرا نہیں ہے کہ حامد ان کے چچا تھے، ورنہ امام الدین حسن ریاضی ہی کی کسی تحریر سے اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، حالانکہ لطف اللہ مہندس اور امام الدین دونوں نے اپنے اسلاف و اہل خاندان کے بارے میں بکثرت تفصیلات دی ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ احمد اور حامد بھائی تھے، درست نہ ہوگا۔

استاد حامد کے ورثا کے بارے میں جو دریبا بازار دلی کے نزدیک "کوچۂ استاد حامد" میں رہتے تھے، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے لکھا ہے کہ یہ لوگ صراف تھے، لیکن اس کا تعین بہت دشوار ہے کہ یہ لوگ ان ہی استاد حامد کی اولاد ہیں، اس لیے ڈاکٹر چغتائی کی رائے ہے کہ لال قلعۂ دلی کی تعمیر میں شریک استاد حامد اور جن استاد حامد کے نام سے یہ گلی موسوم ہے دو مختلف افراد ہو سکتے ہیں، لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ معاصر دستاویزات میں کسی دوسرے استاد حامد کا تذکرا نہیں ملتا، دوسرے اس کی شہادتیں موجود ہیں کہ ماہر تعمیرات استاد حامد ہی نے لال قلعۂ دلی اور جامع مسجد کی تعمیر میں نمایاں حصا لیا تھا، اس لیے کوچۂ استاد حامد یقینی طور پر اسی معمار کے نام سے موسوم ہے جہاں تک تاج محل کی نقشا سازی اور معمار کے تعین کا تعلق ہے، اس سے استاد حامد اور احمد کے بھائی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ استاد احمد کا نام حسب ذیل تحریروں میں بھی ملتا ہے۔

(۱) کتبا میتانہ ارگلہ (ضلع راولپنڈی پاکستان)

اس کتبے میں تحریر ہے کہ شاہراہ سوری شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ اور اس کی مرمت مرزا محمد نے معمار استاد احمد کی نگرانی میں کی تھی۔ جن کے معاون جوگی داس اور دیال داس تحویل دار تھے۔ اس کتبے پر تاریخ ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء ہے، چونکہ استاد احمد کا انتقال ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں ہو چکا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد احمد کا تعلق اس شاہراہ کی مرمت سے ضرور تھا، لیکن یہ کتبا (۲۲) سال بعد اس وقت نصب کیا گیا، جب یہ تعمیری کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ کتبا شاہراہ سوری کے وسط میں ایک بلند پہاڑی کی چٹان پر سطح زمین سے ۱۰ ۔ ۱۵ فٹ اوپر نصب ہے، اور اکثر محققین کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔

(۲) اثنائے ہرکارا۔ یہ ایک فارسی مخطوطا ہے جس کا ایک باب مکمل استاد سے متعلق ہے۔ دریاؤں، سمندروں، محافظوں اور ملاحوں کے تذکرے میں مرقوم ہے کہ "چونکہ شاہی احکام کی تعمیل کے سلسلے میں احمد کو اکثر اس آبی شاہراہ سے گزرنا ہوتا ہے، اس لیے ہر متعلقا شخص کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ استاد احمد کے گزرنے میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے، اس سلسلے

ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی نظروں میں استاد احمد کی کتنی قدر و منزلت تھی، اور وہ تعمیرات کے سلسلے میں شاہی احکام کی بجا آوری کے لیے اکثر دور دراز ملکوں کا سفر بھی کیا کرتے تھے۔

(۳) خط مورخہ ۱۰۳۹ھ (۱۶۳۰ء) یہ خط ملا فرید ابراہیم کے ہے، اس میں مرقوم ہے کہ ملا فرید ابراہیم کو ریاضی داں اول بادشاہ استاد احمد سے بڑی تقویت ملی تھی یہ نام احمد ہمارے زیر بحث استاد احمد ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس خط پر ۱۶۳۰ء کے وسط کی تاریخ درج ہے، یعنی ممتاز محل کی وفات سے ایک سال قبل کی تاریخ۔ یہ وہ وقت تھا جب اس نادرۂ عصر معمار کا ستارۂ اقبال عروج پر پہنچنے والا تھا، چنانچہ اس کے صرف ایک سال بعد ۱۶۳۱ء میں اس کو ملکہ کے شاندار مقبرہ کی تعمیر کا کام سپرد ہوا۔

(۴) تذکرۃ الاولیا۔ مصنفہ فرید الدین عطار۔ اس کتاب سے پتا چلتا ہے کہ اس کا کاتب لطف اللہ بن یوسف بن حسن بن عبد اللطیف تھا۔ یہ کتاب ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷ء) میں بمقام دولت کدۂ محمد لکھی گئی۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ترکی مورخین نے دو معمار لیعنی عیسیٰ اور یوسف کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ۹۳۳ھ (۱۵۲۶-۲۷ء) میں شہنشاہ بابر کے ساتھ آئے تھے۔ عیسیٰ اور یوسف ترکی معماروں میں سب سے ہشیار و ماہر سنان پاشا (یا سنیان بے) کے شاگرد تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف ہندستان میں مقیم رہا، اور یہیں اس کے بیٹے احمد کی ولادت ہوئی۔

اتفاق سے ایک اور فارسی مخطوطے تذکرۂ باغستان مصنفۂ امام الدین ریاضی بن لطف اللہ مہندس بن استاذ احمد بھی دستیاب ہو گیا ہے۔ یہ کم و بیش ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) کا مکتوبہ ہے۔ مصنف نے اپنے والد بزرگوار کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"عظیم ترین ریاضی داں، معماروں میں بہترین لطف اللہ مہندس بن احمد ہروی لاہوری۔"

ان کے ابتدائی وطن کے بارے میں امام الدین لکھتے ہیں کہ "الہراوی (یعنی ہراۃ کا باشندہ) ثم لاہوری ثم دہلوی"، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ یوسف ہرات سے ترک وطن کر کے لاہور آئے تھے، اور وہیں مقیم ہو گئے، اور اس کے بعد استاذ احمد دلی منتقل ہو گئے، جہاں اب بھی ان کا خاندان لاہوری کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۵) مراۃ واردات۔ مصنفۂ محمد شفیع تکینوی مکتبہ ۱۱۴۶ھ اس میں عہد شاہجہانی ۱۳۲۸ء (۱۷۳۳-۳۴ء) تا ۱۶۵۸ء) کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ مصنف خانۂ آصف خان کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"شاہجہانی دور میں تعمیر کردہ شاہی عمارات لال قلعے، جامع مسجد، تاج محل، شالیمار باغ اور پنجم خانۂ آصف کا ساری دنیا میں ثانی نہیں مل سکتا ہے۔ نواب آصف خان کا محل بھی حیرت انگیز فن تعمیر کا نمونا ہے، جس کے کئی قطعے اور تعداد دیگرے ہیں۔ نواب آصف خان کی موت کے بعد شاہزادہ داراشکوہ نے شاہجہاں سے درخواست کی تھی کہ یہ محل اسے دیدیا جائے، چنانچہ وہ اسے مل گیا۔ اپنے محل کے سامنے داراشکوہ نے دو چھوٹی عمارتوں کی تعمیر شروع کی تھی، لیکن ابھی نصف کام بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس کا خزانا خالی ہو گیا، اور وہ بھی اس حالت میں کہ وہ ولی عہد شاہزادہ تھا، اور اسے پانچ لاکھ کا صرف خاص ملتا تھا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ جب خانۂ آصف خان مکمل ہو گیا تو معمار استاذ احمد نواب موصوف کو اپنے ساتھ محل دکھانے لے گیا۔ نواب اس کو دیکھ کر سخت برافروختہ ہوا، اور بولا "ارے کم بخت تو نے ایک ایسی عمارت بنائی ہے جس میں کوئی شخص پاؤں

پھیلا کر آرام سے لیٹ بھی نہیں سکتا۔" استاد احمد جس کو توقع رہی ہوگی کہ نواب اس کے فن کو سراہے گا، اور انعام و اکرام سے الااال کرے گا۔ شدید مایوس ہوا، اور موقع پر توڑ جواب دیا۔ "جناب والا! آج تک میں نے کوئی ایسا محل نہیں دیکھا جس میں کوئی اپنے پاؤں کو پھیلا سکے، اور آج مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میرے حضور کے پاؤں سوائے قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری کے اور کہیں نہیں پھیل سکتے۔"

اس دانشمندانہ جواب سے نواب آصف خان بہت خوش ہوا، اور اسی وقت ایک لاکھ روپے انعام خلعت فاخرہ اور دوسرے تحائف سے سرفراز کیا۔ ان شاندار عمارتوں میں وسیع ہال اور بیش قیمت سامان آرائش سے مزین لا تعداد کمرے ہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے استاد احمد لاہوری کو تاج محل کا نقشہ نویس اور معمار قرار دینے پر بہت شک و شبہ کا اظہار کیا ہے، ان کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے۔

"استاد احمد لاہوری دور شاہجہانی کے ایک ماہر معمار تھے، لیکن تاج محل کی تعمیر سے ان کے تعلق کو شبہے سے بالاتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے فرزند لطف اللہ مہندس نے دیوان مہندس میں شاہجہانی دور کے معماروں میں اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے افراد کو خصوصی طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان مہندس کا جو قلمی نسخہ ڈاکٹر چغتائی کو اپنے دوست ابو صالح محمد عمر یافعی حیدرآبادی سے پونا میں ملا تھا۔ اس میں وہ اہم نظم شامل نہیں ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہجہاں نے استاد احمد لاہوری کو ممتاز محل کے مقبرے کی تعمیر کا کام سپرد کیا تھا۔

ڈاکٹر چغتائی کو اگرچہ عمل صالح اور تاریخ شاہجہانی کے اس بیان سے اختلاف ہے کہ لال قلعے کے بنانے میں استاد احمد کا ہاتھ تھا، لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ تاج محل کی تعمیر سے بھی استاد موصوف کا کوئی تعلق تھا۔ اس یقین نہ کرنے کی وجہ محض یہ ہے کہ اس کے واحد گواہ لطف اللہ مہندس ہیں انہوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں عمارتوں کے معمار ان کے والد بزرگوار تھے، لیکن مہندس کی اس شہادت کو ناقابل یقین ہونے کا کوئی مدلل اور معقول جواب ڈاکٹر چغتائی نے نہیں دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیوان مہندس کے ایک سے زیادہ نسخے موجود ہیں، اور ان میں صرف ایک ہی نسخہ اصل ہوگا، ممکن ہے کہ پونا والا نسخہ (جو چغتائی [illegible]) اصلی نسخے کی ہو بہو نقل نہ [illegible]

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا دیوان مہندس کے تمام نسخوں کا سراغ لگایا جاچکا ہے؟ دیوان مذکور سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد [illegible] کے افراد دارا شکوہ کے پرزور حامی تھے، غالباً اسی سبب سے تاج محل اور دوسری اہم عمارتوں کے کاریگروں کی فہرست سے استاد احمد کا نام خارج کردیا گیا ہے، کیونکہ اس سے اورنگ زیب کی ناراضگی کا اندیشہ تھا۔ لطف اللہ مہندس اپنے عہد کی نہایت ذی علم اور معزز شخصیت تھے۔ ان کو دیوان مہندس کی حقیقتوں کو منظر عام پر لانے کے سوا کسی کذب بیانی سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی، اور اگر انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہوتا تو اس کا پردہ فاش ہونے میں زیادہ وقت نہ لگتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عہد مغلیہ سازشوں سے بھرا ہوا تھا۔

تاریخ کے طلبا اور محققین کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی کہ شاہجہانی دور کے تذکروں مثلاً عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ اور محمد صالح کنبوہ کے عمل صالح میں صرف مکرمت خان اور میر عبدالکریم ہی کے نام ملتے ہیں۔ ان دونوں کو تاج محل کی تعمیر کی نگرانی کا کام سپرد ہوا تھا۔ ظاہر ہے ان کو معماروں سے بھی نسبتاً زیادہ ملتے رہے ہوں گے۔ یہ محض ایک اتفاق ہی معلوم ہوتا ہے کہ ادپر کی کتابوں کے مصنفوں نے تاج محل کے معمار کی حیثیت سے استاد احمد کا تذکرہ نظر انداز کردیا، اور یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی یہ ذرا سا

غفلت" دو صدیوں کے بعد کتنی شعلہ سامانیوں کو جنم دے گی اور ایک ایسی غیر منتہی بحث کا دروازہ کھول دے گی، جس کی ابتدا ۱۸۴۴ء میں سر ولیم سلی مین — WILLIAMS ALEEMUAN نے آسٹن دی بوردو کو معمار تاج قرار دے کر کی تھی۔ اگر عبدالحمید لاہوری اور محمد صالح نے اس غفلت کے انجام پر غور کیا ہوتا تو وہ اس ضروری نکتے کو ظاہر کرنا اپنا فرض خیال کرتے، کیونکہ یہ دونوں شاہجہانی دور کے بلند پایہ محقق تھے۔

ایک اور نکتہ جو ہمیں دعوت فکر دیتا ہے، یہ ہے کہ جس طرح دیوان مہندس کے نسخے پونا میں استاد احمد کا نام معمار تاج کی حیثیت سے مذکور نہیں ہے، اسی طرح بہت ممکن ہے کہ بادشاہ نامہ اور عمل صالح کی بھی متعدد نقلیں ہوئی ہوں، جن میں سے بعض میں کسی مصلحت کے پیش نظر یا کسی وجہ سے تاج محل کے نقشہ نویس کا تذکرہ درج نہ کیا ہو۔ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ ان مخطوطات کی کتنی ہی نقلیں ہندستان اور ہندستان سے باہر موجود ہیں۔ ان تمام نسخوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اصل نسخے کا سراغ لگانے کی ضرورت ہے، تب یہ تحقیق ہو سکے گی کہ اس اصل نسخے میں معمار تاج کا تذکرہ ہے یا نہیں؟

جب تک یہ تحقیق مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک لطف اللہ کے بیان پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا، اور نہ کوئی ایسا معقول سبب نظر آتا ہے، جس سے دیوان مہندس میں لطف اللہ کے دیے ہوئے بیانات کی تردید کی جا سکے۔ محض اتنی بات تردید کے لیے کافی نہیں ہے کہ لطف اللہ مہندس استاد احمد معمار کے فرزند تھے، اور وہ اپنے والد بزرگوار کی صلاحیتوں اور شاندار کارناموں کے لیے ان کی توصیف کرتے تھے یا وہ اپنے اہل خاندان کے مداح تھے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مشہور محقق ڈاکٹر نذیر احمد کے نظریات کا مطالعہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے عالمانہ مقالے "امام الدین حسین ریاضی تبصرہ نادر العصر استاد احمد معمار تاج محل" میں بڑے پرزور الفاظ میں لکھا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کو مہندس کی تحقیق دکاوش کے بعد ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، کہ لطف اللہ مہندس کے والد بزرگوار استاد احمد ہی اس عجوبۂ روزگار تاج محل کے معمار تھے۔ دیوان مہندس میں اس بات کا بین ثبوت موجود ہے۔ اس میں ایک چھوٹی سی مثنوی ہے، جس میں مصنف نے اپنے والد اور دوسرے اہل خاندان کا تعارف کراتے ہوئے استاد احمد کا ذکر لال قلعے اور تاج محل کے معمار کی حیثیت سے کیا ہے۔

دیوان مہندس کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف فرماتے ہیں۔

"تمام مثنویوں میں وہ مثنوی سب سے اہم ہے، جس میں لطف اللہ مہندس نے اپنے والد اور بھائیوں کا ذکر کیا اور استاد احمد کو بام شہرت پر پہنچایا ہے۔"

مہندس خاندان کے داراشکوہ، اور اس کے بیٹے سے تعلقات کی تصدیق بھی ایک مثنوی سے ہوتی ہے۔ اس میں کچھ قطعات داراشکوہ سے متعلق ہیں، ایک قطعہ اس کی تعمیرات کے بارے میں ہے۔ ایک دوسرے قطعے کا تعلق اس کی خاص کلید سے ہے۔ تیسرے قطعے میں اس کے بیٹے سلیمان شکوہ کی جشن عروسی کا تذکرہ ہے۔ لطف اللہ مہندس ایک جگہ بہت پرزور الفاظ میں لکھتے ہیں۔ ہم سب معمار و ماہر تعمیرات ہیں میرے تیار کردہ نقشے اتنے صاف ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے مہر درخشاں کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی ہے، جب میں اپنا کام کرنے بیٹھتا ہوں تو بادشاہ امور سلطنت میں مصروف ہو جاتا ہے۔

لطف اللہ مہندس کا آبائی وطن ہرات تھا، جہاں سے اس کے مورث اعلا ترک وطن کر کے ہندستان آئے، اور لاہور میں سکونت اختیار کی، پھر وہاں سے ان کے والد (استاد احمد) دلی منتقل ہو گئے۔ امام الدین حسین ریاضی کے تذکرے باغستان کے بارے میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں۔

"ہم عصر مورخین نے استاد احمد کو دور شاہجہانی کے ایک ممتاز معمار کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ وہ تعمیرات کے

تمام شعبوں سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ ان کے فرزند ہندسی کے بیان کے مطابق انہیں کمال فن کے باعث، نادر العصر کا خطاب ملا تھا، لیکن ریاضی کے باغستان میں بھی نادر العصر کے بارے میں کچھ زیادا مواد نہیں ملتا۔ ریاضی نے اپنے باپ لطف اللہ کی تصنیف "تذکرے مہندس" (یعنی دیوان مہندس) کے حوالے سے محض یہ بتایا ہے کہ استاد احمد کے مولانا مرشد شیرازی سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ شیرازی کو کرمت خان کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اور وہ استاد احمد کے خلف اکبر عطا اللہ رشیدی کے استاد تھے۔"

یہ اقتباسات ڈاکٹر نذیر احمد نے یہ بتایا ہے کہ کن کن مواقع پر استاد احمد نے اپنے کو ریاضی اور دوسرے سائنسی علوم میں کرمت خان سے برتر وافضل ثابت کیا تھا۔ بقول ڈاکٹر صاحب موصوف یہ بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ استاد احمد علم کے ایک بحر بیکران تھے۔ کرمت خان جیسے عالم کا "نادر العصر" سپا ہو جانا اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ استاد احمد علم ریاضی نجوم ہیئت اور ہندسا اور دوسرے سائنسی علوم میں بڑی عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے درمیان بحث ومناظرے کے باوجود کرمت خان اور استاد نادر العصر نہایت گہرے دوست تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں عالم ایک ہی سال عالم جاودان کو سدھارے۔

استاد احمد کی دریافت سب سے پہلے کس نے کی؟

استاد احمد لاہوری کی شخصیت کا سب سے پہلے کس نے انکشاف کیا؟ اس کی وضاحت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اٹلی کے ماہر طغرا نگار انتونیو زوبی (Antonia Zabie (Nolize Stoniche Sullonigi nee Prognessi dei Lavarie dicm... musso in Piehre duno (C. Metcalfe) میں ایک خط کا حوالا دیا ہے جو انہیں ہندستان کے برطانوی گورنر جنرل چارلس مٹکاف نے ۱۸۵۳ء میں لکھا تھا اس خط میں ہے کہ۔

"تحریروں اور روایتوں سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہانی دور کی کل تعمیرات استاد احمد اور استاد حامد کی عظیم صلاحیتوں کا نتیجا تھیں۔ یہی دونوں وہ معمار تھے، جن کی ذہنی صلاحیت اور جمالیاتی ذوق نے ہمیں آفاقی شہرت کا حامل تاج محل عطا کیا، اور وہ تمام شاندار سنگی عمارتیں بھی تعمیر کیں جو دلی اور آگرا کی زینت بڑھا رہی ہیں۔"

اوپر کے اقتباسات پر تبصرا کرتے ہوئے پادری ایچ آسٹن REV. H. AUSTIN —— نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یقیناً مٹکاف کو بھی یہ بات اس ذریعے سے معلوم ہوئی ہوگی، جس سے سرسید احمد خان کو معلوم ہوئی تھی۔

لیکن راقم سطور چارلس مٹکاف کے جمالیاتی ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عرض کرتا ہے کہ ۱۸۵۳ء کے بہت پہلے سرسید احمد خان ایک ممتاز عالم، تاریخ داں اور ماہر آثار قدیما تسلیم کیے جا چکے تھے، اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ مٹکاف کو یہ اطلاع خود سرسید کی مشہور تصنیف آثار الصنادید سے ملی ہوگی، جو ۱۸۴۷ء میں شایع ہوئی تھی۔

مسلم یونیورسٹی لائبریری کے سبحان اللہ خان کلکشن میں "رسالا احمد معمار" نام کی ایک مخطوطا مکتوبہ ۱۸۳۶ء کا حوالا دیتے ہوئے سرسید احمد نے استاد احمد کا تذکرا دوسرے رسایل میں بھی ملنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ مثلاً ملا فرید ابراہیم کے نام ایک خط مکتوبہ ۱۹۸۰ء کی تصنیف "تذکرۃ الاولیا" شیخ فرید الدین عطار، محمد شفیع نگینوی کی کتاب "مراۃ واردات" کا مکتوبہ ۱۱۳۴ھ ممکن ہے ان کو مانڈو میں ہوشنگ شاہ کے مقبرے کے کتبے مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۶۵۹ء میں بھی استاد احمد کا نام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔

چونکہ مشکات نے سرسید احمد خاں کے اس بیان کی تائید کی ہے کہ استاد احمد ہی وہ شخصیت ہے، جس نے تاج محل کا نقشا تیار کیا تھا، اس لیے یہ نتیجا نکالا جا سکتا ہے کہ سرسید نے بھی لطف اللہ مہندس کے دیوان مہندس کا مطالعا کیا تھا، جو انہیں علی گڑھ میں دستیاب ہوا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید احمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے دنیا کو استاد احمد کے معمار تاج ہونے کی حقیقت سے روشناس کرایا۔

اختتامیہ

اوپر کے ماخذوں سے حاصل شدہ معلومات سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ استاد احمد اور ان کا خانوادہ صاحب علم وفن تھا، اور اس کے افراد مختلف سائنسی موضوعات پر بکثرت کتابوں کے مصنف، عالا درجے کے شاعر، اور سب سے بڑھ کر بہترین معمار اور نقشا نویس بھی تھے۔ یہاں یہ نکتا بھی قابل ذکر ہے کہ استاد احمد نے ممتاز محل کے مقبرے کی نقشا سازی اور تعمیر کی، اور ان کے بیٹے عطا اللہ رشیدی نے اورنگ آباد میں شہنشاہ اورنگ زیب کی محبوب بیوی دلرس بانو بیگم (رابعا دورانی) کے مقبرے کی تعمیر کی، جس کا انتقال زچگی کی حالت میں <u>۱۶۵۷</u>ء میں اسی طرح ہوا تھا۔ جس طرح ممتاز محل کا، چونکہ رابعا دورانی کے مقبرے کی تعمیر اس کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصا بعد یعنی <u>۱۶۵۹</u>ء میں شروع ہو گئی تھی اس لیے اس بات کو محض حسن اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یہ دونوں مقبرے (جن میں سے ایک کی تعمیر باپ نے کی اور دوسرے کی بیٹے نے) بہت حد تک باہم مشابہت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے بیٹے کو تعمیر کا فن اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اس لیے اگر اورنگ زیب نے بھی اپنے باپ شاہجہاں کی طرح خزانے کا منہ کھول دیا ہوتا تو عطا اللہ رشیدی اورنگ آباد میں اس بھونڈی نقال کے بجائے یقیناً تاج محل کا ثانی اور مد مقابل کھڑا کر دیتا۔

مذکورۂ بالا معلومات سے نکھا کر ہم استاد

احمد لاہوری کی داستان اسطرح ترتیب دے سکتے ہیں کہ جب <u>۱۵۲۵</u>ء میں بابر ہندستان آیا تو اس کے ساتھ آنے والے لوگوں میں بہت سے فنکار، معمار، اور صنعت کار بھی تھے، جو بادشاہ کے ذوق جمال کی تکمیل کے لیے اس کے ہمرکاب رہتے تھے۔ فنکاروں اور معماروں کے اس گروہ میں یوسف اور عیسا بھی تھے، جو ترکی کے عظیم ماہر تعمیرات سینان بے کے شاگرد تھے۔ بعض ترک مورخین کا خیال ہے کہ یہ دونوں شاگرد بھی ترک نژاد تھے، لیکن امام الدین ریاضی اور اس کے والد لطف اللہ کے بیانات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یوسف بن حسن بن عبداللطیف ہراۃ کے باشندے تھے جو غالباً سینان کے زیر نگرانی مزید تعمیری مہارت حاصل کرنے کے لیے ترکی گئے ہوں گے۔ یہاں سے وہ وسط ایشیا پہنچے، اور اس کے بعد ہندستان یوسف کی تعمیراتی مہارت کی بنا پر بابر اسے ہندستان لایا، یہ تو ثابت نہیں کہ یوسف نے بابر کے لیے بھی کچھ تعمیر کیا ہو، لیکن اتنا مسلم ہے کہ وہ لاہور میں مقیم ہو گیا تھا اور یہیں اس کے فرزند احمد کی ولادت ہوئی جو آگے چل کر بڑا ہونہار ثابت ہوا، احمد فن تعمیر میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ احمد کو علم نجوم، فن تعمیر، ریاضی اور ہندسا وغیرا علوم طبیعات سے گہری دلچسپی تھی۔ لاہور اور مغلیا سلطنت کے کسی حصے میں جہاں اس کی تعمیری نمونے دار ہاں اس کے گئیں اس کی ذہانت اور شہرت نے اسے ہر فن کے ماہرین سے روشناس کرایا۔ یہاں تک کہ میر عبدالکریم عرف ماہور خان جیسے لوگوں کے ساتھ اس کا شمار ہونے لگا۔ اس کی شہرت نے اسے نامور معمار ملا مرشد شیرازی الملقب بہ مکرمت خان اور استاد حامد کا (جو بعد میں لال قلعے کی تعمیر میں اس کے شریک کار رہے) ہم پلا بنا دیا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ دربار مغلیا کے بعض مقربین خاص خصوصاً نواب آصف خان اور نواب وزیر خان (شاہجہاں بیگ) سے بھی متعلق رہا۔

جس زمانے میں اس کا قیام پنجاب میں تھا، وہ

[illegible]

اسی دوران میں بادشاہ نے اس کو شاہراہ سوری کی مرمت کے کام پر مامور کیا۔ اس کام میں دو ہندو ماہرین جوگی داس اور دیال داس تحویلدار بھی اس کے معاون تھے۔ اس کام میں احمد کی شرکت کا ثبوت اوپر کے کتبے سے بھی ملتا ہے، یہ کتبہ اس کی وفات کے کئی سال بعد ۱۶۷۱-۷۲ء میں کام مکمل ہو جانے کے بعد مارگلا میں نصب کیا گیا۔ قیام لاہور کے دوران میں استاد احمد نے نورجہاں کے بھائی نواب آصف خان کے لیے ایک شاندار محل تعمیر کیا، اور شہزادہ داراشکوہ اور اس کے لڑکے سلیمان شکوہ کے بھی بہت سے تعمیری کام انجام دیے۔

استاد احمد کے تین لڑکے تھے۔ عطا اللہ۔ لطف اللہ۔ اور نوراللہ ان سب کو اپنے باپ کے تمام فنون ورثے میں ملے تھے۔ عطا اللہ کی تعلیم مکرمت خان کے زیر نگرانی ہوئی تھی، جو استاد احمد کے گہرے دوست تھے۔ شہرت کے عروج پر پہنچنے پر ان تینوں لڑکوں کو عطا اللہ رشیدی، لطف اللہ مہندس اور نوراللہ معمار کے نام سے موسوم کیا جانے لگا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔

جہانگیر کی وفات کے بعد شاہجہاں نے احمد کو شاہی ملازمت پر برقرار رکھا، اور اپنے دارالسلطنت آگرہ کی تحسین و تزئین کا کام سپرد کیا۔ جب شکستہ دل شہنشاہ نے اپنی ملکہ ممتاز محل کے لیے ایک لافانی شاہکار تعمیر کرانے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے وزرا کی ایک کمیٹی تشکیل دی، اور پورے ملک کے ماہر معماروں کو مقبرے کا بہترین نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ ان تمام نقشوں کا شاہجہاں نے بغور مطالعہ کیا اور آخر میں استاد احمد کے نقشے کو شرف قبولیت حاصل ہوا، اور اس نے استاد احمد کو اس کے نقشے کے مطابق لکڑی کا ماڈل تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس ماڈل کو شاہجہاں نے بہت پسند کیا، اور استاد احمد کو یہ شاہکار تعمیر کرنے کا حکم ملا، اور آج اسی تخلیق کو ہم نوادر میں شمار کرتے ہیں۔ اس تعمیر کے صلے میں استاد احمد کو نقد انعامات کے علاوہ "نادر العصر" کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔ اس تعمیر کے دوران استاد احمد کے دو قدیم رفقائے کار میر عبدالکریم اور مکرمت خان نگران

عالا کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ ۱۶۳۹ء میں جب تاج محل تکمیل کے آخری مرحلے میں تھا، شہنشاہ نے دلی میں ایک نیا دارالسلطنت تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت قدرتاً آگرہ میں استاد احمد لاہوری کی چابکدستی کا شاہکار دیکھنے کے بعد شاہجہاں کی نظر انتخاب استاد احمد ہی پر پڑی۔ اس کام میں احمد کا ہاتھ بٹانے کے لیے) ایک اور ماہر معمار استاد حامد کو آپ کا معاون مقرر کیا گیا، جس کے بارے میں کچھ مورخین کا خیال ہے کہ وہ استاد احمد کے بھائی تھے۔ استاد احمد کے دوسرے فرزند لطف اللہ بھی ان لوگوں میں تھے، جن کو لال قلعے کی تعمیر میں بطور کاریگر مقرر کیا گیا تھا، اور لطف اللہ کو اس کی مہارت کی بنا پر شاہجہاں نے مہندس یعنی انجینیر کا خطاب عطا کیا۔ شاہجہاں سے لطف اللہ کے قریبی روابط کی شاید وہ تحریریں بھی ہیں جن میں اس نے خود کو بشلہ جہانی لکھا ہے۔

استاد احمد غالباً ۱۶۳۱ء کے قریب لاہور سے آگرہ آئے، اور اس کے سات سال بعد وہ دلی پہنچے۔ جہاں ان کا خاندان سکونت پذیر ہو گیا، دلی میں مستقل اقامت اختیار کرنے کے باوجود ان لوگوں کو ہمیشہ لاہوری کہا جاتا رہا۔

اپریل ۱۹۶۷ء میں مقالہ نگار کو آگرہ میں ایک ایسے مقبرے کا پتا چلا جو کہ ڈی پالیوال پارک کی شمالی دیوار سے بالکل متصل ہے۔ اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ استاد عیسیٰ کا مقبرہ ہے، لیکن جیسا کہ راقم سطور پہلے ثابت کر چکا ہے کہ استاد عیسیٰ کا کوئی وجود نہیں، مگر ایک صدی سے زاید تک لوگ استاد عیسیٰ ہی کے تاج محل کے نقشہ نویس ہونے کا غلط تصور قایم کیے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اوپر کے مقبرے میں مدفون جسد خاکی استاد احمد کے علاوہ کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ مقبرہ اس شارع عام کے ٹھیک کنارے واقع ہے، جو نندگورا پارک اور سنٹرل ہندی انسٹیٹیوٹ لائبریری کے درمیان سے گذرتی ہے، اور یہ مقبرہ تاج محل سے بھی نظر آتا ہے۔

اس معمار کے ورثا وزیر پورا اور کریلا کی کالونیوں کے

آس پاس اب بھی موجود ہیں - وزیر پورا کا اول نواب وزیر خاں کے نام سے موسوم ہے، جو شاہی طبیب تھے۔ انہی نے ممتاز محل کے مرض الموت میں اس کا علاج کیا تھا۔ یہ بھی ممکن کہ وزیر خاں کے اہل خاندان نے استاد احمد کے گھر والوں کو اپنے یہاں پناہ دی، کیونکہ استاد احمد اور نواب وزیر خاں کے درمیان عرصے دراز سے دوستانا مراسم تھے۔

یہ دلیل کسی طرح قابل قبول نہیں کہ تاج محل کے نقشہ نویس کی شخصیت پر اس دور کی کوئی دستاویز ایسی روشنی نہیں ڈالتی، جس سے لطف اللہ کے اس بیان کی تصدیق ہو سکے کہ اس کے والد استاد احمد ہی تاج محل کے نقشہ نویس تھے، کیونکہ مغلیہ دور کی بہت سی مشہور عمارتوں کے معماروں کا تذکرا اس دور کی تحریروں میں نہیں ملتا - عہد شاہجہانی میں تعمیر کردا عمارتوں کی کہکشاں میں تاج محل ایک کوکب تاباں کی حیثیت رکھتا ہے، مغلیہ دور کے مورخین کے پاس تاریخ نگاری کا اتنا زیادا مواد تھا کہ اس میں ہر نام اور ہر واقعا کا ذکر کسی طرح ممکن نہ تھا، اس لیے مغلیہ دربار کے نقطۂ نظر سے صرف ایسے مشہور معماروں کا نام مورخین نے لکھا ہے، جو تعمیری شعبوں میں اقتدار عالا کے مالک تھے۔ استاد احمد لاہوری نادرالعصر کا نام رفتار زمانا کے ساتھ بدلتا رہا، چنانچے پہلے تو وہ استاد "نادرالعصر" ہوا۔ پھر استاد عصر ہوا، اور آخر میں استاد عیسا رہ گیا، انیسویں صدی کے اوایل تک یہی نام لوگوں کی زبانوں پر تھا، اور اس وقت تک قایم رہا، جب تک سنہ ۱۹۳۰ء میں لطف اللہ کے دیوان مہندس کی دریافت نہ ہوئی۔

ردعمل

صابر ابوہری

مری برسی منائی جا رہی ہے
مری عظمت بڑھائی جا رہی ہے
مگر یہ کیا ستم ہے ہم نشینو!
مری ہر لی شائی جا رہی ہے

غزل

مخمور سعیدی

یہ آخری پہر ہے گناہوں کی رات کا
مژدہ سناؤ شہر کو صبح نجات کا

اپنے حصار ذات میں گم ہو کے رہ گئی
کرنا تھا جس نظر کو سفر کائنات کا

ہم دشت کربلا میں سدا تشنہ لب رہے
بہتا تھا گرچہ پاس ہی دریا فرات کا

یادوں سے ہے حذر تو مجھے چھیڑتے ہو کیوں؟
میں سلسلہ ہوں بھولے ہوئے واقعات کا

چپ ہیں کسی سبب سے تو پتھر نہیں نہ جان
دل پر اثر ہوا ہے تری بات بات کا

دیکھا تجھے تو بڑھ گئی آنکھوں کی روشنی
دھندلا نہیں رہا کوئی منظر حیات کا

مخمور شہر بھر میں ہیں میرے ہی تذکرے
عنوان بن گیا ہوں میں کسی واردات کا

اطہر پرویز

قدسیا آپا

بیگم قدسیا زیدی، جنہیں دلی کے تہذیبی حلقوں میں بیگم زیدی اور ہم جیسوں میں قدسیا آپا کے نام سے جانا جاتا تھا، ہندستانی تہذیب کی علامت تھیں۔ گورا چٹا رنگ، صاف ستھرے لباس میں ملبوس۔ بیک وقت ایرانا اور قلندرانا انداز۔ قدیم وجدید کا ایک حسین امتزاج۔ ایک طرف وہ جواہر لال نہرو کے غیر ملکی سفر پر روانا ہونے سے پہلے امام ضامن باندھتی تھیں، اور دوسری جانب دلی کے تھیٹر اور اسٹیج پر لڑکیوں سے ڈراموں میں کام کراتی تھیں۔ بعض معاملات میں قدرت بے حد ستم ظریف ہوتی ہے۔ وہ دلی کے تخت پر آخری مغل شہنشاہ کی حیثیت سے ایک شاعر کو بٹھاتی ہے جب کہ یہ کام کسی اور سے بھی لیا جا سکتا تھا اور ٹیپو سلطان کو انگریزوں سے ایک فیصلا کن جنگ کے لیے دکن کی ایک چھوٹی سی ریاست میں پیدا کرتی ہے، جو ہندستان میں ہوتے ہوئے بھی ہندستان سے دور تھا۔

بیگم قدسیا زیدی ایک متمول گھرانے کی آنکھ اور اس کی روشنی تھیں، لیکن ان کے سینے میں ایک عام ہندستانی دل تھا۔ دولت، ثروت، منصب اوروں کے لیے نعمت ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے لیے لعنت ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں، یہ تمام چیزیں ان کے آڑے آئیں ان کو لوگوں نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ان کی شخصیت کی چمک دمک، ان کے رکھ رکھاو کی آب و تاب، سب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی تھی۔ وہ پٹودی کی بہن تھیں، کرنل بشیر حسین زیدی کی بیوی۔ ذاکر صاحب، سیدین صاحب، عابد صاحب، سرور صاحب، مجیب صاحب، جیسے اہل علم ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے، لیکن انہوں نے اپنی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں ان سے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ راشٹرپتی سے لے کر دفتر کے معمولی کارکنوں تک اُن کی رسائی تھی۔ وہ پلک جھپکتے کام کرنے کی عادی تھیں۔ انتظار اور ہڑاد، صبر و قرار، سکون و اطمینان، ان کی لغت میں یہ الفاظ نہیں تھے۔ ان کے دماغ میں خیال اور عمل ایک ساتھ آیا کرتے تھے۔ دونوں پیروں کی طرح ایک ساتھ چلا کرتے تھے۔ ان کی عجلت پسندی ان کے آڑے آئی۔ جس طرح وہ زندگی میں عجلت سے کام لیتی تھیں، مرنے میں بھی انہوں نے دیر نہ کی، اگر وہ اتنی جلدی نہ کرتیں تو شاید زیدی صاحب موت کو منا لیتے، لیکن آناً فاناً سب کچھ ہو گیا۔ زیدی صاحب نے یہ سب کچھ بے بسی سے دیکھا۔ روپیا پیسا کسی کام نہ آیا۔ وہ ایک لمحے میں بیمار ہوئیں، اور اسی لمحے موت کی آغوش میں پہنچ گئیں۔ انہوں نے مرنے کے لیے دواؤں، ڈاکٹروں اور تیمارداروں کا انتظار نہ کیا۔ اچانک دل کی حرکت بند ہوئی اور وہ آخری سفر پر روانا ہو گئیں، ایک سیدھے سادے غریب ہندستانی کی موت اسی طرح ہوتی ہے۔ اگر ان کی روح کہہ سکتی تو یہی کہتی کہ یہ ان کی پسندیدہ موت تھی۔

مجھ سے کہا تھا کہ ۱۷ر دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو صبح کچھ کام ہے۔ میں ان کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ جہاد صاحب انجمن ترقی اردو کے دفتر سے آئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ قدسیا آپا کا ٹیلی فون آیا ہے۔ انہوں نے بلایا ہے۔

میں نے سوچا قدسیا آپا نے اپنے معمول میں فرق آنے نہیں دیا۔ وہ پھر سبقت لے گئیں۔ میں نے بنیاد صاحب سے کہا "میں تیار ہوں بس قدسیا آپا ہی کے پاس جا رہا ہوں۔ ٹیلی فون آئے کتنی دیر ہوئی۔" کہنے لگے "مگر ان کا تو انتقال ہو گیا۔ میں یہی کہنے آیا تھا۔ سوچا شاید آپ کو نہ معلوم ہو۔" میں گھبرا گیا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ زمین پاؤں کے نیچے سے کیسے نکلتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا کیسے چھاتا ہے۔ پھر جیسے میرے حواس مجتمع ہوئے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ قدسیا آپا کیسے مر سکتی ہیں۔ کیا موت کو ان کے لیے آداب توڑنے پڑے۔ میں نے جلدی جلدی زیدی صاحب کی کوٹھی کی طرف قدم بڑھائے۔ اے کاش یہ خبر غلط ہو۔ جب میں پہنچوں تو وہ حسب معمول کہیں گی، تم نے اتنی دیر کر دی۔ ابھی کتنے کام کرنے ہیں۔ واقعی مجھے دیر ہو گئی تھی۔ قدسیا آپا جا چکی تھیں۔ جلد باز تھیں نا!

میں نے بہتوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ کام عبادت ہے لیکن قدسیا آپا کو یہ عبادت کرتے دیکھا ہے وہ محض کسی کام کو اپنے ذمے نہ لیتی تھیں، انہیں تو دھن سوار ہو جاتی تھی۔ دن رات اسی میں لگی رہتی تھیں، اور جب تک اسے ختم نہ کر لیتیں، چین سے نہ بیٹھتیں۔ کام ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے۔ ان کے کام کبھی ختم نہ ہوتے۔ اسی لیے وہ آخر دم تک چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ وقت کی طنابوں کو کھینچ کر بڑا کر لیتیں۔ ذاکر صاحب کا قول تھا کہ اگر کوئی کام اس لائق ہے کہ کیا جائے تو یقیناً اس لائق بھی ہے کہ سلیقے سے کیا جائے۔ قدسیا آپا میں یہ سلیقہ مندی موجود تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے کام سے بے خبر نہ ہوتی تھیں۔ شکنتلا کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ سنسکرت پڑھی جا رہی ہے، لباس کی تیاری ہو رہی ہے۔ سٹ کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ تھیٹر کے لیے لوگ اکٹھا کیے جا رہے ہیں۔ اداکاروں کی تلاش جاری ہے۔ قدسیا آپا بے حد تھکی ہوئی ہیں۔ میں کہتا ہوں "قدسیا آپا آرام کر لیجیے سب کام ہو جائے گا۔" ہاں بھائی آرام بھی کر لیں گے۔

یہ دیکھو کتنے کام کرنے ہیں۔ ذرا کناٹ پلیس تک چلیں ادھر دو ایک کام ہیں۔"

کار میں بیٹھ کر روانا ہو جاتی ہیں۔ یوں تو ابھی دن ڈوبنے میں بہت دیر ہے، لیکن سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ آج میں صرف ایک سویٹر پہنے ہوئے ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آج مجھے جلد اوکھلا جانا چاہیے۔ بس اسٹینڈ تک پہنچنے میں دیر لگے گی۔ ابھی اتنی سردی بھی نہیں ہے۔ میں بھی خاصا تھکا ہوا ہوں، لیکن قدسیا آپا سے باتیں کر رہا ہوں۔ اختر رائے پوری کے ترجمے پر بات ہو رہی ہے۔ دشینت کا ذکر ہے۔ شکنتلا کے چوتھے ایکٹ کے چوتھے سین کے چوتھے اشلوک کا تجزیہ ہو رہا ہے۔ قدسیا آپا نے شکنتلا کی روح کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ وہ شکنتلا کے اسٹیج کے مسائل پر باتیں کر رہی ہیں۔ ہندستانی تھیٹر کیسے بنے گا۔ حبیب تنویر کب انگلستان سے آکر ہاتھ بٹائیں گے۔ بڑی تیزی سے باتیں ہو رہی ہیں۔ مسائل کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ گاڑی کناٹ سرکس کی ایک دکان کے پاس آکر رک جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ قدسیا آپا نے ڈرائیور کو کہاں لے جانے کو اور کب کہا۔ ہم ایک شاندار ڈریپر کی دکان میں داخل ہوئے۔ طرح طرح کے گرم کوٹ دیکھے۔ مجھ سے بھی رائے لی۔ اور ذرا سی دیر کے بعد ہم کافی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ اب ہم کافی پی رہے تھے۔ قدسیا آپا شکنتلا کے بارے میں پھر باتیں کرنے لگیں۔ اچانک ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ سامنے میز پر چند لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ سے بولیں۔ پرویز! یہ لڑکی کیسی رہے گی؟

میں نے کہا۔ میری شادی ہو گئی ہے۔

کہنے لگیں۔ تم مردوں میں یہ عیب ہے کہ لڑکی کو صرف شادی کے نقطۂ نظر سے ہی دیکھتے ہو۔ ارے میاں یہ لڑکی شکنتلا بن کر کیسی رہے گی۔

میں نے کہا "آپ کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ یہ دلی یونیورسٹی کی لڑکیاں معلوم ہوتی ہیں۔"

ارے بھائی شکنتلا کے لیے لڑکی چاہیے۔ وہ کہیں کی بھی ہو۔ دلی کی، علی گڑھ کی، شانتی نکیتن کی۔

ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اٹھے۔ قدسیا آپا مختلف جگہوں پر گئیں۔ آخر میں بیگم پٹودی کے یہاں گئیں۔ نواب بھوپال آئے ہوئے تھے۔ قدسیا آپا میرا تعارف کرتے ہوئے بولیں۔ نواب صاحب! یہ آپ کے مرحوم دوست ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کے عزیز ہیں۔

نواب بھوپال حمید اللہ خان صاحب نے دوبارا بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا، اور بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں قدسیا آپا کوئی مزے کی بات کہہ دیتیں۔ انہوں نے "شکنتلا" کا ذکر کیا۔ کالی داس ان پر حاوی تھا۔ نواب صاحب پر ان کی ذہانت اور علمیت کا اثر ہو رہا ہے۔

ہم لوگ وہاں سے اٹھے، اور نہ جانے کس کس سے ملیں۔ کتنی باتیں کیں، کتنے کام کیے۔ ان کے سامنے وقت بھی بڑی تیزی سے گزرتا تھا، گھنٹے سکنڈوں میں تبدیل ہوتے تھے۔ اب رات شروع ہو گئی تھی۔ اکدم سے وہ اٹھیں۔ ارے دکانیں بند ہونے کا وقت ہے۔ مجھے کناٹ پلیس جانا ہے۔ ذرا سی دیر میں ہم پھر اسی ٹیلر کی دکان میں پہنچے۔ وہاں کوٹ تیار تھا۔ نوک پلک درست کر دی تھی۔ دکاندار مجھے پہنا کر دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ کوٹ جسے میں تھیٹر کا لباس سمجھ رہا تھا، میرے لیے تھا اور جب میں دکان سے باہر نکلا تو مجھے یہ خیال آیا کہ میں اس سردی میں پیدل چل سکتا ہوں۔

دو ایک روز بعد جب میں گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی لڑکی قدسیا آپا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ وہی کافی ہاوس والی لڑکی۔ میرا منھ کا کھلا رہ گیا۔ قدسیا آپا نے بتایا کہ یہ لڑکی شکنتلا میں کام کر رہی ہے۔ یہ خود بھی تیار ہے، اور اس کے گھر والوں کو بھی اعتراض نہیں ہے، اور یہ سب چٹکی بجاتے میں ہوا ہے۔ اسی ہفتے میں شکنتلا کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ یہ ہمارے ہندستانی تھیٹر کی پہلی پیشکش تھی۔ پھر تو ڈراما مختلف جگہوں اسٹیج ہوا۔ علی گڑھ میں بھی پیش کیا گیا۔ ان کی [illegible] اسٹیج پر آئی۔ دلی کے مسلمانوں کے تہذیبی حلقے انگشت بدنداں تھے۔ سید بشیر حسین زیدی نے یہ کیسے گوارا کیا۔ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، لیکن بیگم قدسیا زیدی نے اسٹیج کو وقار دیا تھا۔ عزت و آبرو بخشی تھی۔ ان کا احترام لوگوں کے دلوں میں بڑھ گیا۔ اس کے بعد قدسیا آپا کے کاموں کی رفتار بڑھ گئی۔ بہت تیز وہ ڈراموں کے ترجمے کر رہی تھیں، ان کو پروڈیوس کر رہی تھیں۔ اداکار آتے اور جاتے رہے۔ جس لڑکی کو انھوں نے شکنتلا بنا دیا تھا، اور اس پر اتنی محنت کی تھی، وہ فلم میں کام کرنے کے لیے بمبئی پہنچ گئی تھی، اور وہاں ہیروئن کے طور فلموں میں آ رہی تھی۔ گویا شکنتلا پر کی گئی یہ ساری محنت ختم ہو گئی تھی، لیکن قدسیا آپا کے ماتھے پر کوئی شکن نہ تھی۔ وہ پہلے کی طرح حوصلا مند اور جوان تھیں۔ دور دور سے اداکاروں اور کام کرنے والوں کو لا رہی تھیں۔ نمائش میں انہیں دفتر اور اسٹیج مل گیا تھا۔ وہاں بڑے زور و شور سے کام ہو رہا تھا۔ ارشاد پنجتن، نیاز حیدر، اور مونیکا مصرا، ان گنت لوگ اپنے کاموں میں معروف تھے۔

ایک چہل پہل تھی۔ پٹودی محل سے لے کر جامع مسجد تک ہر طرف شور تھا۔ ہندستانی تھیٹر زوروں پر کام کر رہا تھا، گویا ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ زیدی صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ قدسیا آپا نے دلی کی تہذیبی زندگی کے ہنگاموں کو دی لسی ہاوس کے پرسکون ماحول پر ترجیح دی۔ وہ بظاہر علی گڑھ آرام کرنے کے لیے آئیں، لیکن یہاں ان کی جگہ زیدی صاحب کا عالیشان ڈرائنگ روم نہ تھا۔ وہ تو ایک نرسنگی چھوٹے سے کمرے میں بیٹھیں۔ ایک سلائی مشین ان کے سامنے ہوتی، نوجوان ادیبوں اور شاعروں کا مجمع لگا ہوتا۔ ہم لوگ اس کمرے کو دیوانِ عام کہتے۔ یہیں سب اپنا رونا روتے، زمانے کے گلے شکوے کرتے، مسئلے مسائل حل کرتے، اور سب کچھ سلائی مشین کے ساز پہ ہوتا۔ وہ تھیٹر کے لیے کپڑے اور زیورات تیار کرتیں، ضرورت مندوں کے لیے ہاتھ سے سلائی کرتیں، اس طرح وہ دو تین روز رہتیں، اور ان کے [illegible] نے کے

بعد دی سی ہاؤس میں پھر وہی غرض مند لوگ - یونیورسٹی کے سیاست داں اور اکابرین - جو صبح شام اس کی قسمت کے فیصلے میں معروف رہتے - یہ کوٹھی ان کے مسائل کے لیے اجنبی نہ تھی - ان کے چہروں سے اس کے در و دیوار آشنا تھے، ان کی گفتگو یہاں کی فضا میں گونجتی تھی - اجنبی تو تھیں وہ آوازیں اور وہ چہرے جو قدسیا آپا کے دیوان عام میں گونجتی بھی تھیں اور دکھائی بھی دیتی تھیں، آوازیں ان کے جانے کے بعد خاموشی سے ان کو ڈھونڈتی بھی رہتی تھیں -

قدسیا آپا ذہین بھی تھیں اور سمجھدار بھی، وہ زندگی میں ناکام رہیں اس لیے کہ مصلحت اندیش نہ تھیں - انہوں نے لوگوں سے محبت بھی کی اور نفرت بھی کی - وہ لوگوں کے کام آتیں، لیکن اس لیے نہیں کہ وہ شکریہ ادا کریں یا کسی پر احسان کریں -

مجھے ایک کہانی حاصل کرنے کے لیے خاجا حسن نظامی صاحب سے ملنا تھا - اس سے پہلے میں نے خاجا صاحب کو دیکھا تو بہت تھا، لیکن ان سے کبھی ملا نہیں تھا - قدسیا آپا سے ذکر آیا - کہنے لگیں، چلو میں تم کو ملائے دیتی ہوں، تمہارا کام ہو جائے گا، لیکن اس روز قدسیا آپا بیحد مصروف تھیں - انہیں ایک لمحا بھی فرصت نہ تھی، اس لیے میں نے ان سے تعارفی خط لے لیا، میں نے جب وہ خط خاجا صاحب کو دکھایا تو وہ آرام سے کھڑے ہو گئے، بولے فرمائیے حکم دو کیا کام ہے - شرمندگی کے مارے میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا - کہنے لگے جانتے ہو، کس کا خط لائے ہو - یہ وہ لڑکی ہے جس کے باپ نے میری پھانسی کا پھندا اپنی انگلیوں سے کھولا تھا، جب ہارڈنگ بم کیس میں مجھے الجھایا گیا تھا - اس وقت قدسیا آپا کے باپ دلی کے سب سے بڑے پولیس افسر تھے، انہوں نے نہ جانے کس کس طرح میری پیروی کی اور میری گلو خلاصی ہوئی، اور یہ لڑکی جب بھی ملتی ہے یا مجھے خط لکھتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں نے ہی اس کے ساتھ کوئی احسان کیا ہے - اصل میں قدسیا آپا تو اپنے خاندانی احسان کو بھول گئیں، لیکن میں کیسے بھول سکتا ہوں -" ۔

خاجا صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اسی وقت مجھے ایک کہانی لکھ کر دی جس کا مسودا آج بھی میرے پاس محفوظ ہے -

کرشن چندر کی بیٹی بیمار تھیں - وہ ماسکو علاج کے لیے جانا چاہتے تھے، لیکن حکومت ان کو پاسپورٹ دینے کو تیار نہ تھی - میں شاہراہ کے دفتر میں گیا تو یوسف صاحب نے بڑی تکلیف کے ساتھ یہ بات بتائی - میری ملاقات کرشن چندر سے نہیں ہوئی - شام کو میں حسب معمول قدسیا آپا کے پاس گیا - دوران گفتگو کرشن چندر کے پاسپورٹ کی بات آئی - میں نے کہا، آپ کی حکومت عام انسانی معاملات میں بھی سیاست کو داخل کر لیتی ہے - کرشن چندر کے ترقی پسند ہونے کے یہ معنی تو نہیں کہ ان کی بیٹی کا علاج نہ ہو سکے -

پہلی بار قدسیا آپا لاجواب ہو گئیں، کہنے لگیں، کافی پیو گے یا چائے - ذرا سی دیر میں کولڈ کافی آ گئی، لیکن قدسیا آپا دوسرے کمرے میں ٹیلیفون کر رہی تھیں - بیحد غصے میں تھیں - انہوں نے اندرا گاندھی سے بات کی، محمد یونس خاں سے بات کی، پنڈت نہرو کے سکریٹری متھائی سے بات کی، اور وہی کرشن چندر کے پاسپورٹ والی - ان کی گفتگو سے غم و غصے کا اظہار ہو رہا تھا - ان کے دل کو ٹھیس لگی تھی -

اس کے بعد اگلے روز بارہ بجے تیس موورتی سے قدسیا آپا کا ٹیلی فون آیا - کرشن چندر کا پاسپورٹ تیار ہے - کرشن چندر کو اطلاع دو، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کرشن چندر کہاں رہتے ہیں - اب قدسیا آپا کرشن چندر کا گھر تلاش کر رہی تھیں - دو بجے معلوم ہوا کہ کرشن چندر شملا جا چکے ہیں، اور ایک ہفتا بعد واپس آئیں گے - اس کے بعد کرشن چندر جی کا پاسپورٹ مل گیا اور وہ ماسکو چلے گئے -

جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ کرشن چندر سے اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھیں -

الٰہ آباد سے اپیندر ناتھ آئے - وہ ہندی میں ڈرامے لکھ رہے تھے - مجھ سے کہا - میں بیگم زیدی سے ملنا چاہتا ہوں - میں نے کہا، ضرور - انہیں

بھی ڈراموں سے دلچسپی ہے -

میں نے قدسیا آپا سے ذکر کیا۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ چائے پر دعوت دی - شام کو میں اور اپندر ناتھ اشک قدسیا آپا کے یہاں پہنچے ڈرامے کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ تھیٹر کے بارے میں باتیں ہوئیں - تھیٹر کا ذکر آیا، نئے امکانات پر بحث ہوئی- اچھے سگرٹ کی کمی پر بات ہوئی- اشک جی نے اپنی کتابیں قدسیا آپا کو دکھائیں - جب چلنے لگے تو بل پیش کر دیا- قدسیا آپا نے روپیا ادا کیا - ذرا سی دیر کے لیے تو میں گھبرا گیا، لیکن مجھے اس واقعے پر حیرت نہ ہوئی، کیونکہ میں اشک جی کو برسوں سے جانتا ہوں - ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا تھا، تم نے مکتبا سے میری کتابیں چھپوائی ہیں- میں تم کو اس کا کمیشن دینا چاہتا ہوں -

میں نے کہا، اشک جی! میں کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں - آپ کا دوست ہوں -

کہنے لگے، مسلمانوں کی سی بات مت کرو- یہ کاروبار ہے - تم میری کتابیں چھپوا دو- پبلشر دلوا دو- میں اس کے عوض تم کو روپیا دوں گا-

اس بات کا قدسیا آپا سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اس واقعے کے بعد میں دو روز تک قدسیا آپا کا سامنا نہ کر سکا-

حبیب تنویر ڈرامیٹکس کے ایک اسکالرشپ پر انگلستان گئے ہوئے تھے - ان کا خط آیا کہ اچانک وزارت تعلیمات ہندستان نے ان کا اسکالرشپ کینسل کر دیا ہے - کچھ کرو - اس ملک میں قرض کی کوئی رسم نہیں ہے - میرے لیے قدسیا آپا، محض قدسیا آپا نہ تھیں - وہ طاق کی دوا تھیں، وہ مسبب الاسباب تھیں- وہ ہر مرض کی دوا تھیں- میں یہ خط لے کر ان کے پاس پہنچا - انہوں نے وزارت تعلیمات کے ایک افسر کا نام لے کر کہا کہ، یہ ان کی حرکت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ وہ ایک روز کسی محفل میں کہہ رہے تھے کہ، "حبیب تنویر بہت TALENTED ARTIST ہے، لیکن اس کا جینیس اسی وقت ابھر سکتا ہے جب وہ فاقے اور احتیاج کی زندگی گزارے- لندن کی زندگی اور دونوں وقت کا سکون ان کے فن کے لیے سم قاتل ہے" اس پر قدسیا آپا کو بہت غصا آیا انہوں نے کہا، حضور! ذرا اپنی ملازمت ترک کر کے اپنی جینیس کو بھی ابھرنے کا موقع دیجیے - فن، فاقے احتیاج کا نام نہیں ہے - اس کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے - لوگوں کے درد و غم کو اپنانے سے ہوتا ہے - طبیعت میں سوز و گداز پیدا کرنے سے ہوتا ہے، قدسیا آپا پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی-

اس کے بعد وہی ہوا جس کی ان سے توقع کی جاتی تھی - انہوں نے جواہر لال نہرو سے ملاقات کی- مولانا آزاد سے بات کی، اندرا گاندھی حبیب تنویر سے ذاتی طور پر واقف تھیں، اور ان کی ذہانت اور صلاحیت کی مداح تھیں - اب تو معاملا سنجیدا ہو گیا- جواہر لال نہرو کو اس بات پر غصا تھا کہ اسکالرشپ دینے کے بعد کیوں رد کیا گیا، لیکن اس دوڑ دھوپ کا نتیجا یہ ہوا کہ دو روز کے اندر اسکالرشپ بحال ہو گیا- متعلقا افسر سے کیفیت طلب کی گئی اور یہی نہیں ان کا تبادلا بھی دوسری وزارت میں ہو گیا-

چند روز بعد میں قدسیا آپا کے پاس بیٹھا ہوا تھا- ایک کار آکر رکی- وہی افسر داخل ہوئے- چہرے پر اداسی صاف ظاہر تھی - قدسیا آپا نے بیٹھنے کے لیے کہا اور کافی کی ایک پیالی سامنے کر دی - انہوں نے کہا- آپ نے جواہر لال نہرو کا ڈنڈا استعمال کیا- اچھی بات نہیں ہے -

قدسیا آپا کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا- وہ بڑے اطمینان سے بولیں- ارے بھائی جس کے پاس جو ڈنڈا ہوتا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہے، اگر آپ کے پاس ڈنڈا ہوتا تو کیا آپ چھوڑ دیتے -

اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے یہ وار خالی گیا اور انہوں نے ذرا موضوع سے ہٹ کر کہا- بیگم صاحبا! میں بڑا بدنصیب ہوں- دل کا برا نہیں- لیکن زبان اور مزاج کی وجہ سے جو منھ میں آتا ہے، کہہ دیتا ہوں - قدسیا آپا نے کہا، بھئی مجھے تو کوئی بدمزاج نظر نہیں آتا سوائے جواہر لال کے، جو مہاتما گاندھی کے سامنے بھی غصا کر بیٹھتے تھے۔

باقی جہاں تک آپ کا سوال ہے آپ تو اچھے خاصے خوش مزاج ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ آپ نے پنڈت نہرو یا مولانا آزاد سے کبھی بدمزاجی کی ہو، آپ بدمزاجی کرتے ہیں ماتحتوں سے، طالب علموں سے، اسکالرشپ طلب کرنے والوں سے، جن کو آپ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسل سکتے ہیں۔

بیگم زیدی بول رہی تھیں۔ بولے چلی جا رہی تھیں۔ محترم اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ مرگی اور ہسٹیریا کے مریضوں میں سے تم کو کس سے زیادہ ہمدردی ہے تو میں یہ کہوں گی کہ مرگی کے مریض سے۔ اس لیے کہ آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ ہسٹیریا کا مریض آگ میں گر پڑا۔ سڑک پر گر پڑا۔ وہ تو ہمیشا بستر پر گرتا ہے، گدا دیکھ کر گرتا ہے، لیکن مرگی کا مریض کہیں بھی گر پڑتا ہے۔ وہ آگ دیکھتا ہے نہ پانی۔ آپ ہسٹیریا کے مریض ہیں۔ آپ کو غصا بھی موقع محل دیکھ کر آتا ہے، بیگم زیدی بولے جا رہی تھیں۔ ایک آبشار تھا جو ابل رہا تھا۔

بیگم زیدی کی شخصیت بڑی رنگا رنگ تھی۔ ان میں نہ جانے کتنی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے یہاں آریوں کا جمال بھی تھا اور مغلوں کا جلال بھی۔ ان کو دیکھ کر میں یہ سوچا کرتا تھا کہ نورجہاں اور قدسیا محل کچھ ایسی ہی ہوں گی، کبھی ان کو دیکھ کر قرۃ العین طاہرا کا خیال آتا ہے۔ کبھی وہ امرتا شیرگل لگتیں۔ ان کی شخصیت میں ان تمام عظمتوں کی جھلک نظر آتی تھی۔

قدسیا آپا نے ان گنت کتابیں لکھیں۔ بچوں کے ادب میں ان کی حیثیت منفرد ہے۔ جان باز سپاہی، ان تھک جان، گاندھی بابا کی کہانی، ان کی اہم کتابیں ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بہترین اسٹیج ڈرامے لکھے۔ جیسے شیر کا دادا، رنگی لومڑی وغیرا۔ "شنکر زویکلی" نے شنکر پلے (مشہور کارٹونسٹ) کے ساتھ مل کر انہوں نے "بچوں کے بین اقوامی تصویری مقابلے" کو ایک سالانا فیچر بنا دیا۔ جب اس مقابلے کا کام شروع ہوتا تو قدسیا آپا دن رات اسی میں لگی رہتیں۔ کبھی تھیٹر کا کام کرتیں تو کبھی شنکر ویکلی کا۔ انہوں نے امتیاز علی تاج کے فانوس کو چچا چھکن کے کارنامے کا ڈرامائی روپ دیا۔ اس کے علاوا بہترین ڈراموں کے ترجمے کیے۔ گڑیا گھر، شکنتلا، خالہ کی خالا، مٹی کی گاڑی، آذر کا خواب، جان باز، یہ تمام ڈرامے چھپ چکے ہیں۔

بیگم قدسیا زیدی کے کارنامے یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے بڑی اہمیت رکھیں گے۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ ان پر تحقیقی کام کیا جائے۔ ان کے کاموں کا جائزا لیا جائے۔ وہ ترجما کیا کرتی تھیں۔ ریاضت اور عبادت کا ایک حسین امتزاج تھا۔ اس کا اندازا وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے ان کو اس عبادت اور ریاضت میں مصروف دیکھا ہے۔ ایک ڈرامے کو ہندستانی کا لباس پہنا رہی ہیں۔ اس میں چوسر کا کھیل دکھایا گیا ہے۔ چند روز بعد میں دیکھتے ہیں کہ قدسیا آپا کے مکان پر چوسر کے دو استاد موجود ہیں۔ وہ ان سے چوسر کھیل رہی ہیں۔ لوگوں نے کہا، اس کی کیا ضرورت ہے۔ ڈرامے میں تو صرف اشارا کیا جاتا ہے۔

لیکن قدسیا آپا بھلا کہاں ماننے والی تھیں۔ انہوں نے چوسر سیکھ کر چھوڑا۔ پھر بڑے اہتمام کے ساتھ ڈرامے کا ایک سین مکمل کیا گیا۔

چند روز بعد ذاکر صاحب آئے، انہوں نے سین سنا تو بے حد پسند کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ اگر چوسر کے بجائے شطرنج کھیلا جائے تو کیسا رہے گا۔ یہ رائے قدسیا آپا کے دل کو لگ گئی۔ اگلے روز جو میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شطرنج کی بازی جمی ہوئی ہے۔ قدسیا آپا شطرنج کھیل رہی ہیں، لیکن شطرنج میں ان کو مزا نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت ان کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ جیسے وہ کسی بڑے قرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کر رہی ہیں، کیونکہ چالیس چلنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ اصل میں وہ جزئیات پر نظر رکھتی تھیں۔ وہ جس ڈرامے کا ترجما کرتیں، اس کے اندر جذب ہو کر رہ جاتیں۔ ان کے کردار، ارد گرد گھومتے رہتے۔ وہ اس ماحول میں سانس لینے لگتیں۔ وہ ڈراما ان کی زندگی کا ایک حصا بن جاتا۔

قدسیا آپا ذہین بھی تھیں اور بذلہ سنج بھی۔ ان کی ہر بات سے، ہر عمل سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ ایک روز ہم لوگ لان میں بیٹھے ہوئے تھے، باتیں ہو رہی

تھیں ۔ ایک آدمی سامنے سڑک پر گزر رہا تھا، قدسیہ آپا نے کہا، تم لوگ بتاؤ یہ آدمی کیا کام کرتا ہے ۔
ہم سب نے کہا، ہم اس آدمی سے واقف نہیں ۔ کہنے لگیں، خدا کو دیکھا نہیں ۔ ذرا عقل استعمال کرو آپ معلوم ہو جائے گا ۔
ہم لوگ کشمکش و پیچ میں پڑ گئے ۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا، کہنے لگیں، اگر تم لوگ ہار مان لو تو میں بتا دیتی ہوں ۔ ہم سب نے ہار مان لی، کہنے لگیں، دھوبی ہے ۔ اس درمیان میں وہ آدمی بہت دور نکل گیا ۔ قدسیہ آپا نے ڈرائیور کو بھیجا ۔ اسے ڈھونڈ کر لاؤ ۔ ذرا سی دیر میں وہ آدمی کار سے لایا گیا ۔ اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ واقعی وہ دھوبی ہے ۔ سب نے کہا آپ اس کو پہلے سے جانتی ہوں گی ۔ قدسیہ آپا ہنسنے لگیں ۔ "ارے بھئی عقل سے پتہ چلایا ہے ۔ غور سے دیکھو اس کے دونوں پاؤں پر ایک ہی جگہ نشان ہے جو پانی میں کھڑے ہونے سے پڑا ہے ۔ قدسیہ آپا نے دھوبی کو پانچ روپے دیئے ۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے ۔
آج قدسیہ آپا کو ہم نے رخصت ہوئے بارہ سال ہو گئے ۔ لیکن ان کی صورت ان کے جاننے والوں کی آنکھوں سے کبھی نہیں مٹ سکتی ۔ وہ جب بھی تہذیب، شرافت، نیکی، حسن، سچائی، دردمندی اور انسان دوستی کو یاد کریں گے، قدسیہ آپا کی شکل آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی ۔ یہ تمام چیزیں علیحدہ علیحدہ مل جاتی ہیں، لیکن ان کا کسی ایک میں جمع ہو جانا، بڑی بات تھی ۔ ان کی موت نے بہنوں کو بے آسرا اور یتیم کر دیا ۔ ان کی یاد سے آج بھی تقویت ملتی ہے ۔ اگر کسی کی یاد ہی سہارا دیتی ہے تو اس کی بڑائی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے جب کوئی اچھا کام کرنے کا خیال آتا ہے، تو قدسیہ آپا بہت یاد آتی ہیں، جب کوئی بے دست و پا نظر آتا ہے تو قدسیہ آپا کے نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ اس معاشرے میں دوسروں کے کام آنے والے گنے چنے ہوتے ہیں اور اگر کوئی نظر بھی آتا ہے تو اس تک رسائی نہیں ہوتی ۔ میں اسی لیے انہیں قلندر کہتا ہوں کہ محلوں کی دیواریں ان کو محصور نہ کر سکیں ۔ آزاد روحیں ایسی ہی ہوتی ہیں ۔ کتنی عظیم تھیں، لیکن انہیں اپنی عظمت کا ذرا بھی احساس نہ تھا ۔ قدسیہ آپا نے اپنے فرائض بڑی اچھی طرح ادا کیے ۔ انہوں نے زندگی کو بڑے سلیقے سے برتا اب دیکھنا ہے کہ ہم کس حد تک ان کے حقوق کو اپنے فرائض میں تبدیل کرتے ہیں ۔ ہندستانی زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کو قدسیہ آپا کے سلسلے میں اپنی ذمے داری کو محسوس کرنا ہے ۔ قدسیہ آپا محض ایک فرد نہیں، ایک تہذیب بھی تھیں ۔ اگر ہم اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں تو اس تہذیب کی قدروں کو پہچان سکیں، کیونکہ قدروں کا احساس اور ان کی شناخت انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہیں ۔

ہارون الرشید (ڈھاکا)

سسکی

رات کی بے کراں خموشی میں
کس کی سسکی کی یہ صدا آئی
کس کے سینے کا درد جاگ اٹھا
کس کے زخموں نے لی ہے انگڑائی

آہ جاتی ہے کس کی سوئے فلک
کارواں راہ میں لٹا کس کا؟
یا پٹکتا ہے سر کوئی بے بس
آشیاں سامنے جلا کس کا؟

یا ہوا کی یہ نوحہ خوانی ہے؟
یا ابلتا ہے درد کا ساگر؟
یا سسکی ہے روح دھرتی کی؟
قلب انساں کی یا [illegible]!

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

باغ وبہار کا تنقیدی مطالعا

بعض ہندستانی ناقدوں کی اس رائے سے میں اتفاق نہیں کر سکتا کہ میرامن کے یہاں قافیا پیمائی نہیں ہے۔ میرامن عمداً کہیں سجع اور قافیا کا اہتمام کرتے ہیں مگر یہ بھی ہے کہ ان کے قافیوں میں تکلف کی بو نہیں آتی وہ بڑے سیدھے، فطری اور دلکش انداز سے عبارت میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں مقفیٰ جملوں کی بہتات نہیں ہے اور نہ وہ سجع تلاش کرتے ہیں۔ مگر جہاں آسانی سے وہ فطری طور پر کر سکتے ہیں وہ یہ موقع ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیتے۔ میں اپنی اس بات کو مدلل بنانے کے لیے یہاں اس طرح کے چند جملے نقل کرتا ہوں (۱) اب میں امیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچۂ دل مانند گل کے کھلے۔

(۲) ایسا حاکم تشریف لایا جس کے فیض سے ایک عالم نے آرام پایا۔ امیر خسرو یہ قصا ہمیشا کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔

بہر حال اس طرز کی سادا قافیہ پیمائی آورد سے پاک اور غالب کی قافیا پیمائی سے مشابہ ہے۔

زبان میں ایک روانی ہے ایسی روانی جو صبح سویرے دریا کی پرسکون فضا میں ہوتی ہے نہ کہ سیلاب کی روانی۔ ان کے اسلوب کی صفات اور انداز میں قاری ایک نشا کی کیفیت اور گم گشتگی محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک خاص آہنگ ایک استعجاب اور محویت سی تسکین ذوق کی لذت پاتا ہے۔ میرامن کے ہر ہر لفظ پر ان کے مخصوص مذاق فصاحت کی مہر ثبت نظر آتی ہے۔ یہ تمام صفات مل کر قاری کو اکتاہٹ سے بچاتی ہیں۔ ان کے یہاں عبارت کا لطف نغما کی لطیف کیفیت سے مشابہ ہے۔

ان کو تمہید لکھنے اور تعارف کرانے کا خاص سلیقا ہے۔ یہ کیفیت ان کے اس خط میں جو بطور عرضی کالج میں پیش کیا تھا۔ کتاب کے اس دیباچے میں جو انہوں نے لکھا ہے اور ہر قصے کی ابتدا میں واضح ہے۔ انہوں نے ایک مخصوص دلکش انداز سے تمہید میں لکھی ہیں اور قصوں کے شروع کو غیر معمولی دلچسپ اور حیرت انگیز بنا کر پیش کیا ہے۔ ابتدا ملاحظہ فرمایئے:

"اب آغاز قصے کا کرتا ہوں۔ ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو، سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیروان کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔"

میرامن ذرا الفاظ کی ترتیب بھی بے تکلفی کے خیال سے الٹ دیتے ہیں کہنا اس طرح چاہیے تھا کہ اب قصا کا آغاز کرتا ہوں۔ اسی طرح منصفی کرو۔ اور کہنے والے نے کہا زاید جملے ہیں، مگر عبارت کے حسن میں اضافا کرتے ہیں۔ اگر ان کو نکال دیا جائے تو مفہوم میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ یہاں پہاڑ بنانے کے لیے آگے کا لفظ بھی قابل لحاظ ہے۔

اب یہاں ایک نکتہ اور سامنے آتا ہے کہ میرامن تابع مہمل عوام کے عام انداز گفتگو کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ویسے مرادف الفاظ بھی لاتے ہیں جو دلکشی کا باعث بن سکیں۔ توابع مہمل اور مرادف دونوں طرح کے الفاظ کا بڑا ذخیرا اس کتاب میں مل سکتا ہے۔ تابع مہمل سے وہ بے تکلفی پیدا کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے گفتگو اور بول چال کی زبان لکھی ہے تو ان کا مقصد یہی ہے کہ انہوں نے زبان کے اس انداز کو ادبیت کے ساتھ نبھایا ہے جو عام استعمال میں ہوتا ہے۔ محاورے، روزمرہ اور توابع مہمل نمائندے ہیں عوامی زبان کا۔ اب میں یہاں ان کے چند توابع مہمل کو نمونتاً پیش کرتا ہوں تاکہ اہل نظر سمجھ سکیں کہ وہ کس طرح زبان کو جان دار اور عوامی گفتگو سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

(۱) فراشوں نے فرش بچھا کر چھت پردے چلونیں تکلف کی لگا دیں۔ (۲) غرض اس مرد خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو دھا کر صاف کیا۔ (۳) جس نے اسے (مال کو) ادنے پونے بیچ ڈالا اور روا دارو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ (۴) تاکید ہر کھانے کی کر رکھی ہے کہ خبردار بامزہ ہو اور آب و نمک بو باس درست رہے۔

تابع وہ اس لیے استعمال نہیں کرتے کہ ان کے پاس الفاظ کی کمی ہے حق یہ ہے کہ الفاظ پر ان کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ اس کا اندازا ان کے ہر جملے اور ہر طرز عبارت سے ہو سکتا ہے۔ الفاظ بھی جاندار اور بے جان ہوتے ہیں ان کے اندر بھی خشکی اور رسیلا پن ہوتا ہے میرامن کا فن یہ ہے کہ وہ جاندار، دلکش، رسیلے اور سریلے الفاظ چن لیتے ہیں وہ بھڑک اور چمک کے قایل نہیں وہ نگاہوں کو سرور کی طرح چکا چوند نہیں کرتے بلکہ روح کو گرماتے اور دل کو مدہوش کرتے ہیں۔ ان کی زبان دماغ کو نہیں دل کو اپیل کرتی ہے۔ ان کا مذاق سخن ستھرا اور نکھرا ہے۔ وہ دلوں کے نباض ہیں۔ وہ زبان اور الفاظ کے باہمی

ربط سے کما حقہ واقف ہیں۔ میرامن اگرچہ رعایت لفظی کے قایل نہیں مگر صفت و موصوف میں عالا درجے کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر دہ عبارت ملاحظا ہو جس میں فرماتے ہیں "اس بادشاہ کے وقت رعیت آباد، خزانے معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا، آسودا۔"

اس میں غریب غربا بڑا دلکش انداز ہے پھر ہر صفت کو موصوف سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

میرامن کے یہاں ایک حرف عطف "کہ" کے ذریعے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں ان کو دو جملوں میں "کہ" کے ذریعے عبارت کو متصل اور مختصر کرنے کا بڑا سلیقا ہے۔ اس "کہ" کا استعمال انہوں نے شروع سے آخر تک کتاب میں کیا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر چند جملے نقل کیے جاتے ہیں۔

سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیروان کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔"

جب تک تو اس جوان کو ساتھ لے کر آوے کہ سیری بہار نے میرا احوال خدمت میں بادشاہ بیگم کی "کہ" والدا ج ناپاک کی ہیں اعتراض کیا۔

ان مواقع پر ہم جو اور جس کا استعمال کرتے ہیں مگر میرامن اکثر جگہ "کہ" کے ذریعے اپنی عبارتوں کو لطیف و لطیف بناتے ہیں۔

اصل میں میرامن کا حسن زبان ان کے انداز تعبیر سے عبارت ہے وہ معمولی امر کو بھی اپنے انداز تعبیر سے حسن و تخیل کا مجسما بنا دیتے ہیں، دیکھیے ان کا کتنا ہے کہ سفر جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اسکو اس طرح کہتے ہیں کہ "اگر زندگی ہے تو سفر کی عمر کوتاہ ہوتی ہے جلد پھر آتا ہوں" انہوں نے اکثر اپنے ذہن کی تخلیقی صلاحیت سے نئے نئے انداز تعبیر پیش کیے ہیں اور اس زبان میں حسن و رعنائی پیدا کی ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی عبارت ملاحظا فرمایے۔

" دو تین فاقے کڑاکے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا لاچار بے حیائی کا برقع منھ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ

بہن کے پاس چلیے ۔"

اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی ہوئی مٹی کی نشانی ہے تیرے آنے سے کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا۔ وہ درمیان درمیان یا فقرا اللہ یا فقرا کے ذریعے بھی ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں، کبھی یا مرشد اللہ کہتے ہیں۔

میرامن کے یہاں زبان کا وہ لہجا مصور کر دیا گیا ہے جو بے تکلف زبان کی روح ہے۔ اسی بنا پر وہ وہیں کے بجائے وہیں کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کی وہ شکل لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو عوام کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ہمیشا جھوٹ کو جھوٹ لکھتے ہیں۔ میرامن وہ کو دو لکھتے ہیں۔ اور ماں باپ کو ما باپ اسی بنا پر لکھتے ہیں کہ زبان میں وہ کیفیت پیدا ہو سکے جو بے تکلفی کی زبان کا خاصا ہے۔ اس کی مزید تشریح میں کشتی کے ذکر میں کروں گا۔ اسی طرح وہ کبلی کو کمل لکھتے ہیں۔ اسی انداز سے زبان کو وہ جیبھ لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

" سارے ڈیل میں زبان حلال ہے حرف کرتا ہے جو کچھ کرے نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے۔"

" نمک دان سے نون نکال، چقمق سے آگ جھاڑ، بھون بھان کر کھا لیتے ۔"

" وہیں اٹھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور چلا جاتے تھے ایک باغ میں لے گیا ۔"

یہاں " وہیں " اسی وقت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی جو اس نے فرمائش کی میں نے وہیں لاکر حاضر کی ۔"

" فقیر دو نہیں سوار ہو کر اس کی دکان پر گیا۔"

اصل میں میرامن کا آرٹ عوامی بے تکلفی کا آرٹ ہے جس میں حسن ذوق کی مرصع کاری شامل ہے۔ وہ ایسے الفاظ کو منتخب کر لیتے ہیں جو باوجود عوامی ہونے کے تعبیر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایک لفظ " کلبلانا " ہے۔ اس کو اس طرح استعمال کرتے ہیں۔

" ایک معشوق خوبصورت، کالی سی مورت جو کہ دیکھنے سے ہوش جاتا رہے۔ گھاٹیلی لہو میں تر بہ تر آنکھیں بند کیے پڑی کلبلاتی ہے ۔"

میرامن نے شیریں الفاظ، حسن تعبیر اور معانی لہجہ سے اپنے فن کے تانے بانے تیار کیے ہیں۔ انہوں نے ہندی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور بعض الفاظ مخصوص انداز سے بار بار استعمال کر کے لطف پیدا کیا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرامن کے بارے میں ہمارے ناقدوں نے تعریف کے پل باندھ دیے ہیں، مگر واقعی بعض باتیں جو طبیعت و ذوق کو کھٹکتی ہیں، ان کا کسی نے نام تک نہیں لیا ہے۔ میں صاف لکھتا ہوں کہ میرامن سے بھی بعض غلطیاں سرزد ہوئی ہیں اور ہندستانی کی بعض معروف اصطلاحوں کو انہوں نے غلط استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ ایسی حرکت کی ہے جو ذوق و زبان کے لیے برداشت کرنا مشکل ہے۔ میں ان تمام امور کا اس مقالہ میں احاطہ کرنا ضروری تصور کرتا ہوں۔

میرامن " کرکے " کو ہر جگہ کو کر لکھتے ہیں جس سے طبیعت کو ثقل کا احساس ہوتا ہے اور بار بار اس کو دہراتے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

" جتنے چند پکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغا باز تھے سب کو نیست و نابود کر کر نام و نشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا ۔"

اسی طرح میرامن عورتوں کو رنڈیاں لکھتے ہیں مالک کو خاوند اور میاں لکھتے ہیں۔ ایسا کیوں کیا۔ خدا جانے رنڈی کا لفظ تو ہندستانی میں ہمیشا سے معروف ہے۔ میرامن کے دور میں یہ اصطلاح یقیناً طوائف کے معنی میں موجود تھی مگر انہوں نے معلوم نہیں کس مصلحت سے عورت کو رنڈی لکھا ہے۔ مثال ملاحظا ہو۔

" اتفاقاً وزیر زادی کو پیٹ رہا۔ جب ستوا سا ہوا اور ان گنا چھنا گنڈ کر پورے دن ہوئے پیر میں لگیں۔ دائی جنائی آئی تو سرا لڑکا پیٹ میں سے نکلا اس کا بس چیا کو چڑھا۔ وہ مر گئی میں مارے غم کے دیوانا ہو گیا کہ یہ کیا آفت ٹوٹی اس کے سرہانے بیٹھا روتا تھا۔ ایک بارگی رونے کی آواز سارے محل میں بلند ہوئی تھی جو آتی تھی ایک دو ہتھڑ میرے سر پر مارتی

اور اپنی کسس اور کوہان کو ننگا کر کے میرے مقابل کھڑی رہتی اور رونا شروع کرتی ۔ اتنی رنڈیاں اکٹھی ہوئیں کہ میں ان کے چوتڑوں میں دب گیا ۔ نزدیک تھا کہ جان نکل جائے ۔

اس میں جس طرح سے انہوں نے غیر مہذب انداز اختیار کیا ہے اس میں دلی کی ٹکسالی منجھی اور صاف ستھری تہذیب کا کہیں دور دور پتا نہیں ۔ یہی نہیں انہوں نے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ بچا پیدا ہوا یا کہیں حمل کا ذکر آ گیا تب بھی اسی طرح کھل کھیلنے کی کوشش کی ہے کتاب میں سارے توازن و احتیاط کے باوجود ان عبارتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

(۱) سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے ۔ اس پاجی کے لطیفے میں کچھ خلل ہوگا ۔

(۲) شہوت کے غلبے میں میرے رو یا رو اس بے حیا نے اس بندوڑ سے صحبت کی ۔

(۳) لیکن جیسی دل میں آرزو اس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی ویسی ہی جی میں بے کلی اس واردات عجیب کے معلوم کرنے کی تھی ۔

(۴) باوصف اس اشتیاق کے قصد مباشرت کا نہ کیا ۔ رات کو ساتھ سوتا ۔ دن کو یوں ہی اٹھ جاتا ۔

(۵) اگر وہ چاہے کہ دریا سے نکل جائے تو آنت اور خصیے اس کے بینے ہو جاتے ہیں ۔ ایسے کہ زمین گھسٹتے ہیں ۔

بیشک یہ ان کے بلندی معیار کے منافی عبارتیں ہیں مگر یہاں میں صرف ایک بات کہوں گا کہ یہ موضوع ان کی کمزوری ہے اور نفسیاتی کمزوری ۔ اس موضوع پر وہ لطف ہرگز نہیں لیتے اس کو اہمیت بھی نہیں دیتے بلکہ اس کی تحقیر کرتے ہیں اور اس سے رغبت نہیں بلکہ نفرت دلاتے ہیں ۔ یہی فرق ہے منٹو کے اظہار جنسیت اور میرامن کے انداز فکر میں ۔ منٹو جنس کا ذکر کر کے لذت پیدا کرتے ہیں مگر میرامن اگر بے محل کر ذکر کرتے ہیں مگر لذت کے بجائے نفرت پیدا کرتے ہیں جس سے ان کا گناہ ہلکا ہو جاتا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرامن کے یہاں

اس قسم کے مواقع بس دو تین جگہ ملیں گے ورنہ پوری کتاب میں جنسی محرکات، بیہودگی اور شہوانی خیالات کا نام نہیں ۔ موضوعا عشق ضرور ہے مگر عبارتیں کوثر و تسنیم سے دھلی مصفا اور منقح ہیں جس پر فصاحت و بلاغت نے سادگی کے لباس میں تابندگی پیدا کی ہے ۔ یہاں نامہذب عبارتوں کا سامنے لانا ضرور تھا اس لیے کہ برائی تھوڑی بھی گوارا نہیں ہوتی ۔ یہ عیب ان کے یہاں بلا شبہ ہے اور اس سے انکار ناممکن ہے، لیکن جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ۔ اس سے ان کی فنی عظمت پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا ۔

میرامن سجدہ کرنے کو "نک گھسنی" لکھتے ہیں ۔

اس میں شبہ نہیں کہ میرامن جنس کے بیان میں اکثر محتاط و متوازن ہیں ان چند جگہوں کو چھوڑ کر انہوں نے کہیں بھی حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا ہے ۔ خیال فرمایئے کہ داستانوں میں کتنی جنسی یاوہ گوئیاں ہوتی تھیں اور کس قدر فحش نگاری سے کام لیا جاتا تھا ۔ میرامن نے بڑے احتیاط اور اختصار سے ان منزلوں کو طے کیا ہے ان کو خوب معلوم ہے کہ جنس کے بارے میں تفصیلات سے رکاکت اور پستی پیدا ہوتی ہے ۔ اس لیے انہوں نے صرف چند جگہوں پر اور چند جملوں کے علاوہ کہیں اس موضوع سے تعرض نہیں ہے ۔ یہ اور ان کے دور کو ملحوظ رکھتے ہوئے چنداں قابل اعتراض نہیں ہو سکتے ۔

اب میں میرامن کی کردار نگاری کا جائزہ لینا چاہتا ہوں ۔ میرامن کردار نگاری میں سب سے زیادہ بڑے فنکار نظر آتے ہیں وہ نفسیاتی انداز سے کردار نگاری کا فرض انجام دیتے ہیں وہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ گفتگو میں کس قسم کے الفاظ موضوع اور محل سے مناسبت رکھتے ہیں ۔ وہ کردار کے لیے ایک فضا تیار کرتے ہیں ۔ جس سے وہ کھپ جاتا ہے ۔ وہ کرداروں کے تعارف کے لیے شروع ہی چند جملے ایسے لکھ دیتے ہیں جن پر آئندہ اس کردار کی بنیاد رکھتے ہیں وہ تعارف کا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ایک خاص سلیقہ

رکھتے ہیں۔ جس کا نتیجا یہ ہوتا ہے کہ قاری کا اشتیاق برابر بڑھتا ہی جاتا ہے ہیرو کے انجام کی جستجو میں قاری کا ذہن سرشار ہو جاتا ہے اور وہ لذت و اشتیاق کے عالم میں قصے کا مطالعا کرتا ہے باوجود کرداروں کی یکسانیت اور سشاہا نہ فضا کے ذرا بھی کہیں اکتاہٹ یا تھکاوٹ کا نام نہیں۔ میرامن محض زبان ہی کے جادوگر نہیں وہ کردار نگاری کے بھی راز داں ہیں۔ باغ و بہار کا قاری مجسم اشتیاق و انتظار بن جاتا ہے آیندا آنے والے واقعات کو وہ بڑی بے چینی سے معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیندا کیا ہوگا - میرامن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کی نفسیات کو بھی مطمئن کریں وہ اس کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف زندا ہے - بول رہا ہے اور واقعات اور کردار کے ارتقا میں وہی متوازن اور فطری انداز اختیار کرتے ہیں جو زندگی میں موجود ہے - ان کے یہاں عموماً اختصار ہے، لیکن اگر کہیں طوالت ہے تو موقع و محل کے اعتبار سے اور کردار کو واضح کرنے کے لیے وہ جو کردار پیش کرتے ہیں وہ ان کے ماحول و معاشرت کے ترجمان ہوتے ہیں وہ اپنے کردار کو ایک مخصوص تہذیب اور معاشرتی خصایص کے آئینے میں پیش کرتے ہیں جس میں ایک طرف ان کے دور کی اور دلی کی اجتماعی تہذیب ہے تو دوسری طرف خود میرامن کے ذاتی رجحانات کا ان پر ٹھپا بھی لگا ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کو کبھی نہیں چھوڑ سکے مگر وہ اجتماعی رجحان کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کے کردار ان کے دور کے معاشرتی ماحول کے مصور ہیں اور خود ان کے مزاج کے بھی۔ اصل میں کردار کی تعمیر میں مصنف کے سامنے ایک وسیع تخلیقی فضا ہے۔ چونکے میرامن مترجم ہیں پھر بھی وہ ترجما آزادی سے کرتے ہیں اور اس میں اپنے ذاتی اظہار خیال ترمیم و اضافے اور اس کو ایک نئی صورت گری کے ذریعے ایک نئی شکل عطا کرتے ہیں وہ ہر کردار سے متعلق جو گفتگو اور عمل ظاہر کرتے ہیں اس میں اس کی عمر، پیشا، مذہب، ذہن، ماحول اور نفسیات کا پورا لحاظ رکھتے

ہیں۔ ان کے یہاں کرداروں کے بارے میں پڑھتے وقت یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ جلدی میں ہیں اور بات کو جیسے تیسے ختم کرنا چاہتے ہیں وہ دل لگا کر اطمینان سے لکھتے ہیں اور کرداروں کے بارے میں بہت سی جزئیات میں سے معمولی جزئیات بھی پیش کرتے ہیں اگر ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان سے کردار کی تصویر زیادا واضح ہو سکے گی - غیر ضروری تفصیلات وہ ہمیشا نظر انداز کر دیتے ہیں - وہ جس طرح قصے کی ابتدا میں دلکشی کا اہتمام کرتے ہیں اسی طرح ان کے اختتام کو بھی دلچسپ بناتے ہیں اور آخر میں حیرت اور اشتیاق کا عالم کم نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے - وہ کردار نگاری میں لفظوں کے استعمال میں فن کا مظاہرا کرتے ہیں۔ ان کے بات کہنے کی رفتار دھیمی ہوتی ہے اور فطری بھی - قاری کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ جلدی میں ہیں۔

میرامن کے یہاں ہر کردار کا اپنا ایک خاص مزاج ہے - باتیں اسی کے مطابق کی گئی ہیں مثال کے طور پر پہلا درویش وفادار ہے۔ محبت میں مخلص ہے اس کا یہ کردار اس کی پوری کہانی میں قایم رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کے یہاں ایک مخصوص معاشرت کی ترجمانی بھی ہے جس کے بارے میں پہلے تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے۔ کرداروں کی زبان میں ان کے مخصوص طبقے اور حالات کے لحاظ سے ان کے جذبات اور نفسیات کا لحاظ رکھا گیا ہے - مثال کے طور پر کٹنی جو ایک ضمنی کردار ہے اس کا بیان ملاحظا ہو -

"ایک بڑھیا شیطان کی خالا - اس کا خدا کرے مونھ کالا، ہات میں تسبیح لٹکائے - برقع اوڑھے دروازا کھلا پاکر ندھڑک چلی آئی اور سامنے ملکا کے کھڑے ہو کر ہات اٹھا کر دعا دینے لگی کہ الہی! تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے اور کمادی کی پگڑی قایم رہے میں غریب رنڈیا فقرنی ہوں - ایک بیٹی میری ہے کہ دو جی سے پورے دنوں درد زہ میں مرتی ہے اور مجکو اتنی وسعت نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں اگر مر گئی تو گور کفن کیوں کر کروں گی؟ اگر جنی تو دایا [illegible]

چچا کو ستورا ' اچھودلی کہاں سے پلادوں گی ؟ آج دو دن ہوے کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے اے صاحب زادی! اپنا خیر کا ٹکڑا پار جا دلا تو اس کو پانی کا ادھار ہو۔"

اس عبارت میں محض کشتی کے کردار کی حقیقی تصویر ہی نہیں ملتی ' بلکہ میرا من کی زبان بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے اس میں سنفی زبان بھی ہے اور خاص طور سے وہ لہجا ہے جو بول چال کا ہے مثلاً وہ بھوکی کو عوام کی زبان کے مطابق بھوکھی لکھتے ہیں برہمن یا بامن لکھتے ہیں۔ سامنے کو سامنے وغیرا۔ اسی بنا پر اکثر وہ یہ کو یے اور ہندی کے لحاظ سے ان کو " ون " لکھتے ہیں۔ میرا من لہجا کے پابند ہیں نہ کہ عام ادبی زبان کے۔

میرا من کے کرداروں میں ایک مذہبی رجحان ملتا ہے وقار عظیم اس کو ان کا نقص شمار کرتے ہیں' مگر میں سمجھتا ہوں کہ نظریاتی نقطۂ نظر سے ان کا یہ فعل محمود ہے۔ ہمارے افسانے اور ناول لکھنے والوں کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے نظریے کو پیش کرتے ہوے کس طرح فن کے تقاضے کو پورا کر سکتے ہیں۔ میرامن کا یہ فنی کمال ہے کہ وہ بڑی چابک دستی سے اسلام کی عظمت کا نقش دلوں پر بٹھاتے ہیں' البتا صرف نماز پڑھتے دیکھ کر مسلمان ہو جانا ممکن تو ہے' مگر عملی زندگی میں اس کی مثالیں کم ہیں ان کو معاملات میں سچائی اور پاکیزا زندگی کے ذریعے یہ کوشش کرنی چاہیے تھی کہ اس سے متاثر ہو کر ہیروئین مسلمان ہو جاتی۔ انہوں نے اسلام لانے کے بارے میں جہاں بھی واقعات پیش کیے ہیں ان میں نماز کو بنیاد بنایا ہے۔ اس طرح تین عورتوں کے مسلمان ہونے کا ذکر آزاد بخت کی سرگذشت میں ہے' اگر باقی قصوں میں اس طرح کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ وقار عظیم کا یہ خیال بھی صحی نہیں کہ انہوں نے ہیروئین کو کلما اس بنا پر پڑھا دیا ہے کہ اس طرح عوام کو اور مسلمانوں کو وہ خوش کرنا چاہتے تھے۔ کیا آج مخصوص نظریات رکھنے والے فنکار اپنے نظریے کی تبلیغ سے باز رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی اور کائنات کے بارے میں بنیادی قدروں کی ترجمانی زندگی اور ادب کا ایک اہم عنصر ہے۔ میرا من کی عظمت میرے نزدیک اس حیثیت سے بڑھ جاتی

ہے کہ انہوں نے زندگی کے بارے میں ایک نظریاتی رنگ پیدا کیا ہے ان کے اکثر ہیرو نمازی ہیں۔ مصیبت میں خدا کے سامنے سجدا ریز ہوتے ہیں۔ گڑگڑاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں اور لقبول ان کے نک گھسن کرتے ہیں۔

میرا من کے یہاں اسلامی قدروں اور مسلم تہذیب کی ترجمانی کا ایک پہلو وہ ہے جو ہمارے اکثر ناقدوں کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔ وہ اصل میں اس کتاب میں اس مسلم معاشرہ کی ترجمانی کر سکتے ہیں جو اسلامی قدروں کا علمبردار ہے روزہ نماز کا پابند ہے مگر شراب وعیاشی میں مبتلا ہے۔ ان کے کسی کردار نے بلا نکاح یا متع کسی عورت سے تعلق پیدا نہیں کیا ہے۔ خاجا سگ پرست کلما پڑتا ہے نماز کا پابند ہے روزہ رکھتا ہے مگر شراب خود بھی پیتا ہے مست ہوتا ہے اور سوداگر بچے کو بھی پلاتا ہے۔ میرا من کے سارے کردار شرابی ہیں عاشق ہیں وفادار ہیں' مگر دیندار ہیں یہ۔ وہ تضاد ہے جو مسلم معاشرا میں عالا طبقے میں موجود تھا۔ مشہور ہے کہ رمضان میں نوابی دور میں لکھنؤ کے امرا اور نواب طبیبوں سے روزہ نہ رکھنے کا سرٹیفکٹ حاصل کر لیتے تھے یہ اس تضاد کی نشان دہی ہے جو اسلام کے اصل اصولوں اور مسلمانوں کے عمل کے درمیان میرا من کے دور کی سوسائٹی میں پیدا ہو گیا ہے۔ شراب کی یہ کثرت نظر آتی ہے کہ مہمان بھی آتا ہے تو اس کو پہلے شراب پیش کی جاتی ہے۔ باغ وبہار نے اپنے دور کے مسلم معاشرے کی اس حیثیت سے پوری ترجمانی کی ہے۔ ایک ہات میں سندان عشق ہے اور دوسرے ہات میں جام شریعت کا۔

وقار عظیم نے باغ وبہار کے نسوانی کرداروں کو خاص اہمیت دی ہے اور آج کل یہ دبا عام ہو گئی ہے کہ نسوانی کرداروں کو غیر ضروری اہمیت دی جانے لگی ہے اور ہمارے ناقدوں کے اعصاب پر بھی عورت سوار نظر آتی ہے۔ وقار صاحب کا خیال ہے کہ میرا من کے نسوانی کردار بہادری اور بڑے کارناموں کے ذمہ دار ہیں مصنف نے ان کی جانب خاص توجہ کی ہے۔ انہوں نے جس طرح فنکارانہ انداز سے ہیروئین کے کردار کو پیش کیا ہے اس سے مردوں کے کردار محروم ہیں۔ میں اس بات سے اختلاف رکھتا ہوں۔ عورت

اصل میں صرف ایک کہانی آزاد کی سرگذشت میں آیا ہے اور وہ صرف تین ہیں -
(۱) دمشق کی شاہ زادی (۲) وزیر زادی یا سوداگر بچہ (۳) زیر باد کی شہزادی، سراندیپ کی شہزادی -

ان کرداروں کے سہارے یہ نظریہ قایم کرنا کہ میرامن نے ان پر خاص توجہ صرف کی ہے صحیح نہیں یہ کردار داستان کے آٹھویں حصے سے بھی کم ہیں مرد کرداروں نے جتنے عالا نمونے پیش کیے ہیں ان کی مثال عورت کرداروں میں نہیں ملتی - دمشق کی شہزادی سے کہیں زیادہ اعدا کردار پہلے درویش کا ہے جو وفا داری اور محبت کی عالا مثال ہے - وہ اس کے پہلے عاشق کے بارے میں کہتا ہے کہ آدمی آدمی برابر نہیں پھر وہ مسلسل خدمت کرتا ہے اور اف نہیں کرتا حتا کہ شہزادی خدا عتراف کرتی ہے کہ تم نے خدمت ہی ایسی کی ہے کہ جو کچھ کہو ٹھیک ہے -

زیر باد کی شہزادی نے نہایت دلیری کا کام کیا - اس نے زندان سلیمان سے خاجا سگ پرست کو نکالا بیشک یہ بہادری کا کارنامہ ہے مگر کون ہے جو خاجا سگ پرست کے حسن سلوک اور انسانیت کو نظر انداز کرسکتا ہے اس نے بھائیوں کے لیے جو کچھ کیا ہے جو خطرات مول لیے جو قربانیاں دیں اس کی مثال کسی نسوانی کردار میں نہیں ملتی -

سراندیپ کی شہزادی جس کا ذکر زیر باد کی شہزادی کے بعد آتا ہے جس نے خاجا سگ پرست کو لیجا کر اس کی مرہم پٹی کی تھی وہ بھی بہادر ہے وہ اپنی دانشمندی سے اس کو بچاتی ہے اور ایسی ترکیبیں بتاتی ہے جن سے خاجا شاہ بندر سے شہزادی کو نجات دلاکر خدشاہ بندر بن جاتا ہے مگر عمل تو خاجا کا ہے - صرف دماغ شہزادی کا ہے -

پھر سب سے بڑھکر وزیر زادی کا کردار ہے جو ایسا کارنامہ کر دکھاتی ہے جو مردوں سے بھی ممکن نہیں - وہ اپنے باپ کو دوبارا وزیر اعظم بناتی ہے قید سے چھڑاتی ہے مردانہ بھیس میں ملکوں کا سفر کرتی ہے اور ثابت کر دیتی ہے کہ وہ ایک عظیم دل و دماغ کی عورت ہے اور صاحب عقل و عمل ہے - اسی کا ایک کردار ایسا ہے جو مرد کرداروں پر تفوق رکھتا ہے مگر دوسرے کردار اس لایق نہیں کہ ان کو مرد کرداروں پر ترجیح دی جاے -

مرد کرداروں میں شجاعت ہے، چنانچہ ملک صادق کی محبوبا کو تلاش کرنے میں تیسرا درویش غیر معمولی مشقتیں برداشت کرتا ہے - چوتھے اور تیسرے درویش کی کہانی میں چچا کے مظالم کی داستان ہے جس کو مرد کردار - بہادری سے سہتے ہیں - نوفل اور حاتم کے قصے میں بھی ایثار نفس کی عمدا مثال ہے - دوسرے درویش کی کہانی میں سخاوت کے موضوع پر نہایت عمدا نصیحت اور عملی مثال ملتی ہے - نسوانی کرداروں میں جو شجاعت سخاوت اور ذہانت ہے وہ قابل تعریف ہے - مثلاً دوسرا درویش سخی ہے، مگر بصرہ کی شہزادی اس سے زیادا سخی ہے - البتا حاتم اس سے زیادہ سخاوت کا ثبوت دیتا ہے اور اکثر درویش مصایب کو برداشت کرنے میں جواں مردی، شجاعت اور وفا داری کا عمدا نمونا پیش کرتے ہیں -

وقار عظیم نے لکھا ہے کہ میرامن نے اکثر مرد کرداروں کو نسوانی کرداروں کے حسن کی نمایش کا آئینا بنالیا ہے - یہ ایسی ہی بات ہے جیسے میں کہوں کہ میرامن نے نسوانی کرداروں کو مرد کرداروں کے عشق کا آئینا بنا کر پیش کیا ہے - یہ خیال صحیح نہیں مصنف نے دونوں کو یکساں درجا دیا ہے اور دونوں کی تصویر کشی میں دقت فن سے کام لیا ہے - ہاں ان کی یہ بات ضرور صحی ہے کہ مردوں کے کردار ایک سانچے میں ڈھلے معلوم ہوتے ہیں، مگر نسوانی کرداروں میں تنوع ہے - البتا فن کے نقوش اور زندگی کی عظمت سے مرد کردار بھی محروم نہیں ہاں بعض نسوانی کرداروں مثلاً وزیر زادی، شہزادی کے یہاں یہ کیفیت زیادا واضح ہے -

باغ و بہار میں منظر نگاری بڑے غضب کی ہے کہیں سنسان جنگل ہے کہیں لق و دق میدان کا ذکر ہے کہیں پرشور سمندر ہے اور کہیں دریا - بادشاہوں کے محلوں کے مناظر نہایت دلکشی سے مصور کیے گئے ہیں ان میں فطری مناظر اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ ان کا حسن دل پر عجیب اثر پیدا کرتا ہے - میں یہاں صرف

ایک مثال پہلے درویش کے قصے سے نقل کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اس خوجے نے نہایت تسلی دے کر ہات پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بٹھا کر کہا یہاں رہو میں اس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے ساون بھادوں کے اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا، لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گلبدن کا خیال آتا، جب چاند پر نظر پڑتی تب اس مہ رو کا مکھڑا یاد کرتا یہ سب بہار اس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔"

میں یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فطری منظر کشی کے ساتھ اصل میں کتاب سماجی منظر کشی کا عمدا نمونہ ہے اس میں محلوں کے نقشے باغوں کے نقشے درباروں اور دسترخانوں اور شاہی لوازمات کے مناظر بکثرت موجود ہیں۔ دمشق کی شاہزادی نے جو باغ اپنے محبوب یوسف سوداگر کے لیے خریدا تھا اس کی تعریف جس موثر انداز سے میرامن نے کی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر صاحب ذوق کا دل پھڑک اٹھتا ہے۔ اسی طرح آزاد بخت کی سرگذشت میں خواجہ سگ پرست نے سمندروں، شہروں اور میدانوں کے جو مختلف مناظر پیش کیے ہیں۔ ان میں بڑی فن کاری اور مصوری ہے۔ اس میں انسانی جذبات کی تصویریں بھی ہیں اور فطرت کی حسن کاری کے مرقع بھی۔

دمشق کی شہزادی یوسف سوداگر کے اس مکان کی تعریف کرتی ہے جو اس کے لیے خریدا گیا تھا وہ کہتی ہے کہ "دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سرسبز پتوں پر جو پڑے ہیں گویا زمرد کی پیڑیوں پر موتی جڑے ہیں اور سرخی اس ابر میں ایسی بھلی لگتی ہے۔ جیسے شام کو شفق پھولتی ہے اور نہریں لبالب مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔"

میرامن کے قارئین کو خوب معلوم ہے کہ وہ ایک زبردست نباض حیات ہیں وہ انسانی محبت کے زبردست ترجمان ہیں وہ جذبات نگاری میں غیر معمولی عظمت و مہارت رکھتے ہیں وہ قلم کے ذریعے دلوں کی دنیا کو نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں ان کو جذبات کی حقیقی کیفیات کو بیان کرنے میں غیر معمولی دستگاہ حاصل ہے۔ وہ محبت کے ترجمان ہیں اس موضوع پر ان کا قلم پھول برساتا ہے ان کے دل سے نغما و سرور کی ندیاں رواں ہوتی ہیں اور ان کی عبادت میں سوز و گداز اور لذت و الم کی شبنم اسی طرح سایہ کیے رہتی ہے کہ فکر و فن میں عجیب لطف محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خود ان کی اپنی واردات ہو اگرچہ وہ باتیں ماضی کی کرتے ہیں مگر پڑھنے والا اس میں حال کی لذت و کسک محسوس کرتا ہے۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ان منازل و مناظر سے گذر رہا ہے اس کو انسانی جذبات کے اتار چڑھاو نشیب و فراز اور لذت و اذیت کے ہچکولے محسوس ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرامن محبت کے جذبات کے رازداں ہیں۔ دل کی گھلاوٹ کا بیان اور سوز کی کیفیت ہجر کی مایوسیوں، ناکامیوں اذیتوں اور موہوم امیدوں کو مصور کرنے، عاشق کے دل کی سوزش و جلن کو سامنے لانے اور وصل میں دل کی سرخوشی، روح کا نشاط طبیعت کا فیضان اور مسرت کا عالم مصور کرنے میں ان کے قلم کو مہارت حاصل ہے اسی بنا پر وصل و ہجر سے متعلق عبارتیں نہایت باندار لکھے زعفران زار بن گئی ہیں۔

میرامن شیعا معلوم ہوتے ہیں اور اپنی شیعیت کو چھپاتے نہیں، ہندستانی ادبا و شعرا نے اپنی شیعیت کو اپنے ادب میں کھل کر نمایاں کیا ہے، چنانچے میرامن کئی جگہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ قصوں میں برقع پوش اصل میں مشکل کشا حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ موت کے قلعے میں درویش کو جب بند کر دیتے ہیں تو وہ ایک عورت کو مارنے کے بجائے اس سے متع کر لیتا ہے۔ کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں

" الہی جس طرح چاروں درویش پانچواں آزاد بخت اپنی مراد کو پہنچے اسی طرح ہر نامراد کا مقصد دلی اپنے کرم اور فضل سے برلا، بہ طفیل پنجتن پاک کے دوازدہ امام چہاردہ معصوم علیہم الصلوات والسلام کے آمین یا الہ العالمین"

"خاجا سنگ پرست اللہ ورسول کے ساتھ
بار اماموں کا ذکر بھی کرتا ہے۔"

میر امن کے یہاں زبان وبیان کی جن خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے انکے بارے میں کہیں کہیں مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں مگر اصل یہ ہے کہ ان کی ایک مجموعی خوبی کا ذکر ابھی باقی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زبان لطف سے پر ہے۔ یہ لطافت ان کے یہاں اس طرح موجزن ہے جیسے فوارے سے پانی - اس میں ایسا طبیعت کو اہتزاز محسوس ہوتا ہے جیسے بہار میں چمن کی خوشبودار ہواؤں سے دل کو حظ حاصل ہوتا ہے - اس کیفیت میں کہیں تشبیہ کی ندرت ولطافت ہے کہیں الفاظ کی کشش اور کہیں تحصیل کی رعنائی - میر امن اصل میں ہندستانی کے ان مقنع میں جو ترجموں میں تخلیق کی شان پیدا کرتے ہیں جن کے یہاں اسلوب کی لطافت آب زلال اور حلاوت عسل مصفا کے مانند ہے۔

شہاب سرمدی

غزل

اگر یقین کی اک سانس لی گئی ہوتی
تو کتنی دور تلک روشنی گئی ہوتی
لہو کی پیاس بجھائے نہ بجھ سکی ورنہ
زمین اتنے سمندر تو پی گئی ہوتی
نظر کی چھیڑ پہ گر ہم بھی کان دھر سکتے
لباس رنگ میں نکہت بسی گئی ہوتی
نزت میں کانپ رہی ہیں وہ انگلیاں جن سے
بھری بہار کی چولی کسی گئی ہوتی
تجلیات کا اترن جو آج بنتی ہے
وہ چاک دل کی جگہ ہونٹ سی گئی ہوتی
شہاب یاروں نے دل پر جو پھول توڑے ہیں
یہ چوٹ کاش کسی سے سہی گئی ہوتی

ڈاکٹر اجمل اجملی

غالب

غالب وہ برگزیدۂ ارباب افتخار
غالب وہ نازش چمنستان روزگار
غالب سخن شناس سخنور سخن شعار
وہ جس کے ایک شعر پر سو جنتیں نثار
جان نسیم صبح تھا روح گلاب تھا
تارے تھے ارد گرد وہ ایک ماہتاب تھا

اشعار کی زباں میں انساں کے تجربات
جملوں کے پیچ و خم میں نہاں شورش حیات
لمحے میں ماہ وسال تو قطرے میں کائنات
بیگانۂ قیود تھے ان کے تخیلات

اس آنکھ میں معلم اول کا نور تھا
اس کا شعور آدم نو کا شعور تھا

وہ طنز وہ خطاب وہ اشعار وہ سخن
سانسوں کی وہ شمیم وہ احساس کی جلن
اف وہ نگاہ فن سے نکلتی ہوئی کرن
اللہ رے وہ زور طبیعت وہ بانکپن

خوگر ہوا جو درد سے درماں بنادیا
جو مشکلیں پڑیں انہیں آساں بنادیا

اس طبع پاکباز پہ کیا کیا نہیں پڑی
کوئی خفا ہوا کبھی روٹھا کبھی کوئی
افلاس نارسائی و آشفتہ خاطری
یہ زندگی بھی کتنے مزے میں گذار دی

سرزد ملے تو ساغر جم سے غرض نہ تھی
اس کو کسی کے جاہ وحشم سے غرض نہ تھی

ہر چند کی مشاہدۂ حق کی گفتگو
لیکن نہ چھوٹا ہاتھ سے داماں تنگ لو
پائے بتاں پہ سر جھکا زاہد کے روبرو
پیش جناب شیخ ہوئی عربیت سبو

جام شراب اچھال کے تارا بنادیا
اردو کو اس نے انجمن آرا بنادیا

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی

روزنامچہ

۲۸ صفر سنہ ۱۳۵۰ھ آخری چہار شنبہ ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء دلی

عرفان کائنات

چاند کا گھٹنا بڑھنا سورج کا طلوع و غروب اور موسموں کی تبدیلیاں سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور شان کے عرفان کے لیے ہیں۔ انسانوں کی رنگتیں اور الگ الگ زبانیں بھی خدا کی یاد دلاتی ہیں۔

اب جو برسات کا موسم شروع ہوا ہے۔ اس میں بھی ایک بڑا عرفان قدرت الٰہی کا ہے، اس لیے انسان کو ہر وقت کائنات کے تغیرات اور تبدیلیوں پر غور و فکر کرنا چاہیے کہ اپنا عرفان اور کائنات کا عرفان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے عرفان کے دروازے تک پہنچا دیتا ہے۔

کشمیر کا قتل عام

دلی میں تیمور اور نادر کے قتل عام مشہور ہیں مگر سری نگر کشمیر کا قتل عام بھی مشہور ہونے کے قابل ہے بے گناہ مسلمان جیل خانے پر جمع ہو گئے تھے کہ ان کے پشاوری مسلمان بھائی کو ایک تقریر کرنے کی بنا پر کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ حکومت نے گولیوں کی بارش کر دی۔ سرکاری اطلاع کی بموجب دس مسلمان شہید ہوئے اور زخمی تو بے شمار ہوئے، مگر مسلمانوں کی اطلاع اس سے بہت زیادہ نقصان کا اظہار کرتی ہے۔

یہ مہاراجا کا انصاف ہے جو کہتے ہیں کہ میرا تو مذہب ہی انصاف ہے، اگر قرآن مجید کو گستاخی سے پھینک دینا مہاراجا کے قول کے موافق انفرادی عمل تھا اور اگر خطبے کو روک دینا کھیم چند کا ذاتی کام تھا تو رعایا پر گولیاں چلانا اور بیسیوں کو خاک و خون میں تڑپانا کس کے حکم سے ہوا۔

مہاراجا صاحب کو جواب دینا چاہیے کہ بندوقوں کا قصور تھا کہ وہ خود بخود چل گئیں حکومت کا اس میں کچھ گناہ نہیں ہے۔

مذہب انصاف بہت ہی دلچسپ مذہب مانا جائے گا جس کے مہاراجا سر ہری سنگھ بہادر پیرو ہیں جو بیچارے جان سے گئے، ان کے پس ماندوں کے لیے جناب مہارانی صاحبہ نے تین ہزار روپے بھی عنایت فرمائے ہیں۔ کیسے خوش نصیب ہیں مقتولوں کے ورثا کہ ان کو تین ہزار روپے مل گئے اور کشمیر کے ظلم و ستم سے نجات بھی حاصل ہو گئی، مگر افسوس اس کا ہے کہ مذہب انصاف کے پیرو سر ہری سنگھ سے ان کی جدائی ہو گئی۔ جیتے رہتے تو مذہب انصاف کے دیوتا کے فیض حکومت سے بہرہ مند ہوتے رہتے۔

شہیدوں کی زندگی ہمارا ایمان ہے وہ مرے نہیں زندہ ہیں اور ان کے ملک کی نجات ان کے خون سے ہوگی۔

تعطیل

اسکول میں اور سب دفتروں میں آخری چہار شنبہ کی تعطیل ہے علی گڑھ سے راحیل خاتون صاحبہ خواجہ باقر سے ملنے آئی ہیں یہ نواب سرور جنگ بہادر استاد سابق کے ایک صاحبزادے کی بیٹی ہیں۔ نہایت نیک اور تعلیم یافتہ خاتون [illegible]

علی گڑھ میں ایک زنانہ مدرسا بھی اپنے خرچ سے جاری کر رکھا ہے جس میں خدیجی تعلیم دیتی ہیں - آخری چہارشنبا کی نماز اور دوسرے وظایف کی نسبت مجھ سے گفتگو کی اور زنانا مسجد حسین خاں نے میں آخری چہارشنبا کے نفل ادا کیے -

دلی

برا والے شیخ داود کے ہمرا دلی گیا ، خاجا یک ڈلو میں شیخ داود کو بیعت کر کے واحدی صاحب کے ہاں آیا - اور بھیا فقیر عشقی صاحب سے بھی ملا - شام کو گھر میں واپس آ گیا - ابر چھایا ہوا ہے بورڈنگ کے سب بچے سید ابن عربی کے ساتھ اوکھلے گئے ہیں چاروں طرف بارش ہو رہی ہے ، مگر یہاں نہیں ہوئی آج پچھلی رات کو درگاہ میں حسب معمول دوسرا غسل بھی ہوا ، مگر اس میں آدمی کم آئے ہیں -

۱۹ر صفر ۱۳۵۰ھ پنج شنبا ۱۶ر جولائی ۱۹۳۱ء دلی

مشیت الہی کا روزنامچا

اجل

وہ موت جس سے انسان اور حیوان ڈرتا ہے . ڈرنے کی چیز نہیں ہے - موت نہ ہوتی تو سب جاندار اس سے اکتا جاتے جو شروع ہوا ہے اس کو ختم ہونا پڑیگا - وہی چیز ختم نہیں ہوتی وہ کبھی شروع نہ ہوئی ہو میں جس کی مشیت ہوں وہ نہ کبھی شروع ہوا اور نہ کبھی ختم ہوگا -

رسول اللہ کا روزنامچا

کھانے کی دعا

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہوتے تو دعا پڑھتے تھے - الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا و جعلنا مسلمین -

ترجما - خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں کھانا کھلایا اور پانی پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا -

خاجا نظام کا روزنامچا

روزہ کے آداب

پنجشنبا ۱۳ر جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ کو قدم بوسی حاصل ہوئی - خاجا نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سال میں تین مہینے کے روزے رکھتے تھے ، مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ تین مہینے کون سے تھے -

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ درویشی کے آداب یہ ہیں کہ سال میں چار مہینے روزے رکھے - دس محرم میں دس ذی الحجہ اور باقی دوسرے متبرک دنوں میں یا یوں کرے ہر ہفتے میں جمعرات اور پیر کو روزہ رکھا کرے اس کے بعد ارشاد ہوا کہ ہمیشا روزہ رکھنے سے عادت ہو جاتی ہے اور روزہ کا لطف نہیں آتا اس واسطے تمام سال مسلسل روزے رکھنے نہیں چاہئیں -

پیشوا کا رسول نمبر

رسالئہ پیشوا دلی نے اس سال بھی نہایت عمدا " رسول نمبر " شایع کیا ہے ، جس میں عکسی تصاویر بھی ہیں تمام ہندستان میں رسالے پیشوا کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کوشش کر کے غیر مسلم مضمون نگاروں کے مضامین جمع کرتا ہے اور مقامات مقدسا کی عکسی تصاویر بھی شایع کرتا ہے -

اس نمبر میں بعض مضامین نہایت ہی عمدا اور مفید ہیں ، مگر افسوس ہے کہ میں اس سال علالت اور کمزوری کی وجہ سے کسی پرچے کے لیے مضمون نہیں لکھ سکا -

پریم پرچارک کا نوٹ

رادھا سامی فرقے کے " آرگن " پریم پرچارک دیال باغ آگرا نے ۲ر جولائی کے پرچے میں میری نسبت حسب ذیل نوٹ شایع کیا ہے -

" ہمارے بعض ہندو بھائی خاجا صاحب کو ایک متعصب مسلمان خیال کرتے ہیں ، کیونکہ انہوں نے تبلیغ و تنظیم کی تحریک کی بنیاد ڈالی ، لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اگر محض اسی وجہ سے خاجا صاحب متعصب کہلاتے ہیں تو شدھی اور سنگٹھن کے بانیوں اور حامیوں کے لیے کون سا لفظ استعمال

ہونا چاہیے! ہمارا تو پختہ یقین ہے کہ خواجہ حسن نظامی صاحب ایک صادق خدا پرست اور فقیر دوست مسلمان ہیں وہ اپنی قوم کے سچے بہی خواہ ہیں، اور ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب و ملت کی ترقی و خوش حالی کے لیے اپنی جان تک نثار کردے ہم نہایت خوش ہیں کہ خواجہ صاحب دیال باغ تشریف لاکر ہندو مسلم اتحاد کی ایک عدیم المثال نظیر پیش کر گئے۔ "

جیون ادھار فنڈ

جناب صاحب جی مہاراج پیشوا رادھا سوامی جماعت اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں " اس وقت ہمارے ہاتھ میں تین نئی تجاویز ہیں سبھا کے پاس جیون ادھار فنڈ میں قریباً چار لاکھ روپے جمع ہوگیا ہے۔"

اس عبارت کے بعد صاحب جی مہاراج نے شوفیکٹری کی ترقی اور جوٹ مل قایم کرنے کی تجویزوں پر بحث کی ہے۔ میں یہاں صرف یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ رادھا سوامی فرقہ کوئی بہت بڑا فرقہ نہیں ہے، لیکن تنظیم کی برکت نے اس میں ایسی زندگی پیدا کردی ہے کہ دوسروں کو جدا تجویزوں میں امداد دینے کے علاوہ صرف زندگی کی ترقی و اصلاح کے فنڈ میں اس جماعت نے چار لاکھ روپے جمع کر لیا ہے، حالانکہ نظامیہ جماعت کی تعداد کے مقابلے میں رادھا سوامی فرقے کی تعداد کم ہے، اگر ستر ہزار نظامی میرے مرید اور دوسرے لاکھوں نظامی مل کر بیت المال کی تحریک کو مضبوط کرنا چاہیں تو ان کی زکات اور خیرات اور نذر نیاز کی رقموں سے تھوڑے ہی عرصے میں ایک کروڑ روپیا جمع ہو سکتا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ ایک نظامی بھائی ساٹھ لاکھ روپے سالانا اپنے تجارتی کاروبار کے محصول کا سرکار کو دیتے ہیں اور اتنی ہی رقم زکات کی خرچ کرتے ہیں، اگر اس قسم کے سب نظامی اپنی زکات اور نذر و نیاز اور خیرات بیت المال میں جمع کرنے لگیں تو ایک ہی سال میں ایک کروڑ روپیا ہو سکتا ہے۔

حضور خواجہ اجمیری کی تعریف

دیال باغ کے مذکورہ اخبار پریم پرچارک کے تازہ پرچے کے شروع میں نہایت جلی حرفوں میں حضرت خواجہ صاحب اجمیری کی تعریف کی ایک نظم شایع کی ہے، اور ہر ہفتہ حضرت مولانا روم کی مثنوی کے اشعار بھی مع ترجمے کے شایع ہوتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریم پرچارک صحیح معنوں میں پریم و محبت کی اشاعت کرنے والا اخبار ہے مسلمانوں کو بھی سید و فقرا اور پیشواؤں کی عزت و تعظیم میں حصہ لینا چاہیے تاکہ دونوں قوموں میں باہمی اخلاص پیدا ہو۔

نظامیوں کی خبریں

مولوی حکیم عبدالرب صاحب نظامی امروہا سے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کے بچوں کو چیچک کے صدمے سے بچا لیا اور آپ بھی محرم کے مہینے میں سلامت رہے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر نور حقیقی سیاہی میں جلوہ دکھاتا تو گنہگار تایب نہ ہوتے اور نہ پارسا کامل ہوتے۔

کلو محمد بڑے میاں نظامی تاجر چرم ظہیر آباد نے محمد قاسم صاحب کے انتقال کی خبر بھیجی ہے اللہ تعالی ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر دے۔

سعیدہ باز نظامی حیدر آباد دکن سے لکھتی ہیں کہ نظامیہ جلسے کے اخراجات کے لیے سب نظامی بھائی بہنوں کو مدد دینی چاہیے دو روپے میں بھی بھیجتی ہوں روزنامچہ گھر میں سب بچوں کو پڑھاتی ہوں اور صفی شاہ کے ذریعے مسجد میں پڑھاتی ہوں اور اسکول میں جہاں تعلیم دیتی ہوں وہاں لڑکیوں کو روزنامچہ پڑھنے کے لیے دیتی ہوں۔

بھائی غلام رسول نظامی نے احمد آباد سے خبر بھیجی ہے کہ اللہ تعالی نے ان کے لڑکے چاند میاں نظامی کو بیٹا عنایت فرمایا میری طرف سے اور سب بھائیوں کی طرف سے چاند میاں اور بھائی غلام رسول کو مبارک ہو۔

سید عبدالرحمن نظامی تکیے والا حیدر آباد دکن لکھتے ہیں کہ روزنامچہ کی ہمیشہ دوست احباب میں تبلیغ کرتا رہتا ہوں اور نظامیہ جلسے کے اخراجات کے لیے پانچ روپے بھیجتا ہوں۔

ایک عجیب سوال

حبیب اللہ خان صاحب نے بڈھلاڑا سے سوال بھیجا ہے کہ آپ اعلا ترین علما اور اراکین اسلام میں سے ہیں اس واسطے جواب دیجیے کہ اور مومن اور جہنم اور قاضی اور سامع اور فاعل اور کامل اور مکمل اور ولی اور ادنی اور موتی ان گیارہ فاعلوں کے علاوہ تین فاعل اور کون سے ہیں ؟

میں یہ سوال پڑھ کر حیران رہ گیا فاعل کے صیغے تو بیشمار ہیں خان صاحب نے یہ حد بندی کیوں کی ؟ اور اس سوال کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آیا، لیکن اگر ان تین فاعلوں کی تحقیقات منظور ہے تو میں کہتا ہوں کہ ایک فاعل مہاراجا سر ہری سنگھ کشمیر میں ہیں اور دوسرے حبیب اللہ خان بڈھلاڑا میں ہیں اور تیسرے فاعل چرچل لندن میں ہیں اور چوتھا فاعل ہر پاگل خانے کا داروغہ ہوتا ہے۔

ذاتی

صبح ۹ بجے کام ختم کرکے دلی گیا ڈاکٹر محمد نعیم انصاری اور ڈاکٹر مرزا صاحب کو لے کر رائے بہادر لالا پارس داس صاحب آنریری مجسٹریٹ دلی کے پاس گیا جو چھ مہینے سے سخت بیمار ہیں جب میں نے رائے بہادر صاحب سے کہا کہ ڈاکٹر محمد نعیم صاحب پیرزادا بھی ہیں تو رائے بہادر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انھوں نے کہا تب تو ضرور ان کے ہاتھوں میں شفا ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک گھنٹا تک رائے بہادر صاحب کا معائنہ کیا اور رائے دی کچھ اندیشہ نہیں ہے مرض خطرناک نہیں ہے۔ دو بجے کے بعد گھر واپس آیا اور اسی کثرت سے ملنے والے آئے کہ مغرب کے بعد تک کوئی کام نہ کر سکا اکثر ملاقاتی فضول کاموں کے لیے آئے تھے۔

آج رات کو بھی ابر رہا، مگر بارش نہیں ہوئی اطراف میں بارش ہو رہی ہے، یہاں نہیں ہوتی۔ برساتی کیڑے کروروں آ گئے ہیں رات کو روشنی کے قریب جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا برہمن کو اچھوت ہندو کے پاس جانا دشوار ہوتا ہے۔

مجھے تین دن سے بواسیر کا خون برابر آ رہا ہے لاہور کی دوا ختم ہو گئی ہے مجبوراً آم کھانے چھوڑ دیے گوشت بھی عرصے سے ترک کر رکھا ہے۔ پھر بھی یہ موذی بیماری نہیں جاتی یہ تو انسان کی جان کے ساتھ جاتی ہے۔

بہاروں کے قدم

رئیس نجمی امروہوی

مری عزیز سہیلی مری شریک راز
لکھا ہے تو نے کہ اس ماہ تری تنہائی
سمٹ رہی ہے، نئے گیت کی نئی لے میں
بجا رہا ہے تصور میں کوئی شہنائی
بہت لطیف خبر ہے سفر کی راہوں میں
ترے سفر کا شریک سفر مثالی ہے
تُو ہے نصیب کہ اس سنگ دل زمانے میں
تری تلاش نے اپنی مراد پالی ہے
دگرنہ آہ یہاں آرزو کا ہر دامن
روایتوں کی صلیبوں سے چاک ہوتا ہے
دلوں کی قید میں گھٹ کر وقار چاہت کا
رواج و رسم کے شعلوں میں خاک ہوتا ہے
تو خوش نصیب ہے میری نظر میں ماہ جبیں
ملی جو یوں تجھے تعبیر تیرے خوابوں کی
کھلیں گے پھول محبت کی شاہراہوں پر
تری حیات بنی سیج اب گلابوں کی
عروس نو کی بہاروں کا نور ہو یہ ملن
رفاقتوں کے اجالے ہوں دل کی قندیلیں
نثار شمع پہ پروانہ، پھول پر بھونرا
تمہارے پیار کو راس آئیں ایسی تمثیلیں
تری دعاؤں کی وسعت نے جو تجھے بخشی
وہ رنگ و نور کی نکہت تجھے مبارک ہو
مٹا کے فاصلے منزل کی جو ملی خوشبو
بعید خلوص وہ قربت تجھے مبارک ہو
رہ حیات میں ساتھی اگر ہو من چاہا
تو کوئی لمحہ مسرت سے کم نہیں ہوتا
دلوں کا پیار، محبت ہو جس کے ہاتھوں میں
وہ گھر مثال میں جنت سے کم نہیں ہوتا

محمد رضا شاہ پہلوی

(شہنشاہ ایران)

میری کہانی خد اپنی زبانی

یوں تو ساری دنیا میں باپ بیٹے کے کردار کو ڈھالنے میں مدد کرتا ہے، لیکن میرے معاملے میں میرے والد کا مجھ پر اثر کہیں زیادہ تھا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں قطعی اپنے والد کا عکس تھا۔ بہر حال میرے والد نے مجھے بہت سی حیثیتوں سے متاثر کیا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں اعتباروں سے، اس لیے میں اس باب کو ان کی کچھ خصوصیات کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔

ہر شخص یہاں تک کہ ان کے مخالف بھی اس بات پر متفق تھے کہ میرے والد ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل انسان تھے۔ وہ دنیا کے انتہائی خوش خلق اور دلچسپ ترین انسانوں میں شمار ہوتے تھے اور اس کے ساتھ وہ بے حد خوفناک اور بھیانک انسان بھی تھے۔ طاقتور سے طاقتور اور مضبوط سے مضبوط دل کا انسان بھی ان کے سامنے کانپنے لگتا تھا۔ انسانی فطرت کو سمجھنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خفیہ برقی شعاعوں کے مالک تھے جو فوراً انسان کی کمزوریوں اس کی اچھائیوں، اسکے کردار اور اس کی مزاجی کیفیات کا پتا لگا لیتی تھیں۔ اسی لیے تعجب کی بات نہیں تھی کہ لوگ ان کی نگاہوں میں تیکھے ہوئے خوف کھاتے تھے لیکن اس کے برخلاف میرے والد انتہائی مہربان اور رحمدل انسان بھی تھے اور خاص طور پر ان کا ایسا رویہ اپنے خاندان کے ساتھ تھا۔ جب وہ ہمارے درمیان ہوتے تھے تو ان کا تحکمانا اور درشت انداز محبت و پیار اور مہربانی میں بدل جاتا تھا خاص طور پر میرے ساتھ وہ بڑی خوش مزاجی سے پیش آتے تھے جب میرے ساتھ تنہا ہوتے تھے تو مجھے گاتے گا کر سنایا کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی [illegible] دوسروں کے سامنے بھی گایا ہو، مگر جب ہم دونوں [illegible] تو وہ ضرور گنگناتے تھے۔

خاص طور پر وہ اپنے ذاتی رہن سہن اور مذاق میں بہت سادہ طبیعت انسان تھے۔ وہ لوگ جو اپنی ذاتی زندگی شاندار بناتے ہیں وہ اپنی نمود و نمائش اور دولت سے دوسروں کو مرعوب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرقی شہنشاہ عام طور پر اپنی سادگی کے لیے مشہور نہیں ہیں، مگر میرے والد نے سابقہ شاہی شان و شوکت کو بالکل تیاگ دیا تھا، یہاں تک کہ جب وہ شہنشاہ ہو گئے اس وقت وہ روسی ڈھنگ پر سلی ہوئی فوجی وردی پہنتے تھے۔ ان کے گھر کے بنے ہوئے موزے اچھی کوالٹی کے نہیں ہوتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ وہ اپنے پرانے جوتے ہی پہنتے رہتے تھے جو اچھی حالت میں نہیں ہوتے تھے۔ ان کی جیب میں ایک رومال کے علاوہ [illegible] کا بنا ہوا

ایک سگریٹ کیس ہوتا تھا۔ وہ اپنی ذاتی صفائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ہاضمے کی خرابی کی وجہ سے ان کا کھانا بھی بڑا سادا ہوتا تھا۔ ناشتا میں وہ صرف چاے لیتے تھے۔ انڈا - پنیر - پھل وغیرا بھی جو ایرانیوں کا مرغوب ناشتا ہے نہیں کھاتے تھے۔ دونوں وقت کے کھانوں میں وہ چاول اور مرغ کھاتے تھے۔ وہ اپنے دفتر میں بھی صرف چاے ہی پیتے رہتے تھے۔ ان کے دفتر میں کار چوبی کی ایک خوبصورت میز تھی جو اب بھی میرے استعمال میں ہے۔ ایک کرسی ایک قالین - ایران کا ایک نقشا اور مہمانوں کے لیے ایک صوفا سیٹ ان کے کمرے کا یہ کل سامان تھا۔ وہ اپنے گھر میں ایک چٹائی پر سوتے تھے۔ انہوں نے کبھی پلنگ استعمال نہیں کیا۔ باوجود میرے محلوں کی سجاوٹ اور آرائش کے میری خواہش ہوتی ہے کہ کاش میں بھی اس چٹائی پر سو سکتا۔

میرے والد کے معمولات بڑے سادا تھے۔ وہ عام طور پر ۵ بجے بیدار ہو جاتے تھے۔ جلدی سے نہا دھو کر اور شیو بنا کر ناشتا پر بیٹھ جاتے (اگر اس کو ناشتا کا نام دیا جا سکے) اور یہیں پر وہ اخبار اور دوسری رپورٹوں کا مطالعا کرتے تھے ٹھیک ساڑھے سات بجے وہ اپنے دفتر پہنچ جاتے یہیں وہ لوگوں سے ملتے ساڑھے گیارا بجے تک وہ وزرا اور افسروں سے ملاقات کرتے رہتے اس کے بعد کھانا کھاتے۔

۲ بجے ان کا دوپہر کا پروگرام شروع ہوتا۔ وہ فوج کا معائنا کرتے اور دوسرے قومی اداروں کو دیکھنے جاتے۔ وزرا کی کانفرنس میں شامل ہوتے جو دوپہر کو ہی ہوتی تھی۔ ان کاموں کے بعد ۶ بجے سے ۸ بجے تک وہ پھر رپورٹوں کا مطالعا کرتے۔ ٹھیک آٹھ بجے رات کا کھانا کھاتے۔ اور دس بجے بستر پر چلے جاتے بستر پر بھی وہ کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے تھے اور منصوبوں اور پروگراموں کو ذہن میں لیے سو جاتے۔

میرے والد کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ ہر کام میں سلیقا اور نظم کو پسند کرتے تھے۔ جب میں دوسرے ملک میں تعلیم کے لیے بھیجا گیا تو مجھے ہدایت تھی کہ میں پابندی کے ساتھ اپنی تعلیمی ترقی کی رپورٹ بھیجتا رہوں - میرا ذاتی اتالیق ہر ہفتا یہ رپورٹ ان کے پاس بھیجتا تھا، اگر کسی ہفتا ناغا ہو جاتی تو والد صاحب پریشان ہو جاتے اور فوراً تار سے میرے اتالیق کو تنبیہ کرتے۔

سواے اپنے خاندان میں کچھ دلبستگی اور ہنسی مذاق کے میرے والد کوئی وقت بھی دوسری تفریحات میں نہیں لگاتے تھے۔ شاید وہ سال میں ایک یا دو مرتبا شکار کھیلنے کے لیے جاتے تھے چہل قدمی ان کی خاص کسرت تھی۔ میرے حافظے میں جیسے وہ ہمیشا ہی چلتے رہنے والے انسان تھے۔ یا تو وہ اپنے دفتر کے کمرے میں ٹہلتے رہتے۔ یا پیدل فوج اور دوسرے اداروں کا معائنا کرتے رہتے یا اپنے باغ میں تیزی سے چہل قدمی کرتے جو لوگ ان سے ملنے آتے ان کو بھی تیزی سے انکے ہمرا چلنا پڑتا تھا۔ وہ چلتے چلتے ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ رضا شاہ چلتے ہوے بھی غور و فکر میں ڈوبے رہتے۔

ان کی سادگی مذہبی معمولات میں بھی جھلکتی تھی، چونکہ وہ علما کو ہمیشا برا بھلا کہتے رہتے تھے اس لیے بہت سے لوگ ان کو لامذہب خیال کرتے تھے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے علما کو پس منظر میں دھکیل دیا تھا، کیونکہ وہ لوگ حکومت کے کاموں میں بیجا دخل دینا اور قومی ترقی میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے تھے اگر وہ ان کے ساتھ سختی سے پیش نہ آتے تو تجدید ملک کا پروگرام ایک مدت کے لیے ٹل جاتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مذہب یا مذہبی علما کا کوئی مصرف نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ترقی پسند اور روشن دماغ علما کی ہمیشا عزت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بیٹوں کے نام امام رضا پر رکھے وہ امام رضا کو حضرت علی کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے اس قدر عزت دیتے تھے وہ اکثر مشہد کی زیارت کے لیے جاتے رہتے تھے جہاں امام رضا مدفون ہیں۔

میرے والد کو اپنے وطن سے گہرا لگاو تھا۔ وہ انتہا پسند محب وطن تھے اور اپنے ملک سے اس قدر محبت و عقیدت رکھتے تھے کہ تمام غیر ایرانی تہذیبوں کو ایرانی تہذیب کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے

وہ اپنے ملک کو زیادہ سے زیادہ جدید بنانا چاہتے تھے، یہ بات ہمارے موجودہ کلچر میں ان کے لیے پناہ عقیدے کے برعکس معلوم ہوتی ہے، اگرچہ وہ ایسا خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ ایران کے عظیم ماضی کے مداح تھے، اور وہ اس طرز زندگی کو قایم رکھنا چاہتے تھے جو مغربی تہذیب سے لگا نہیں کھاتا تھا، مگر اس کے باوجود وہ خیال کرتے تھے کہ ایران کی قومی سالمیت اور لوگوں کی خوشحالی کے لیے ملک کو نئی راہوں پر آگے بڑھانا چاہیے، اگرچہ وہ بہت کم دوسرے ملکوں کے دورہ پر گئے ہیں، لیکن وہ اپنے ملک میں جدید فیکٹریوں۔ پاور پلانٹس۔ ڈیم، آبپاشی کے ذرایع۔ ریلوے۔ بڑے بڑے شہروں اور فوجوں کا ہمیشا خواب دیکھتے رہتے تھے۔

وہ بعض اوقات بغیر اطلاع کے کسی بھی دفتر میں پہنچ جاتے تھے، اور پھر ان لوگوں کی خیر نہیں تھی جو دیر سے دفتر میں پہنچنے کے عادی تھے۔ ایک موقع پر رضا شاہ وزارت مالیا میں ٹھیک دفتر کھلنے کے وقت پہنچ گئے۔ انہوں نے تمام دروازے بند کردینے کا حکم دیا۔ جو افسر اور چند وزرا دیر تک سوتے رہنے کے عادی ہیں وہ دفتر سے باہر ہی رہ گئے۔ ان سب کی فوراً چھٹی کردی گئی۔ اسی طرح کے حملے وہ کرتے رہتے تھے۔

ایرانی کہاوت کے مطابق کام چلانے کے لیے سزا اور انعام دونوں کا ہی سہارا لینا چاہیے۔ میرے والد انعام کے مقابلے میں سزا پر زیادا یقین رکھتے تھے، وہ کسی کی حوصلا افزائی بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی کے اچھے کام کی تعریف کرنے سے کوئی فایدا نہیں، کیونکے وہ اپنے فرض کو انجام دے رہا ہے، مگر جو شخص اپنے کام میں کوتاہی کر رہا ہے اس کو اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔

یہ چند خوبیاں تھیں میرے والد میں۔ یہی خوبیاں انہوں نے میرے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا سے ان کی شخصیت کا مجھ پر گہرا اثر رہا۔ اس لیے میرے بارے میں کچھ جاننے سے پہلے ان کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

میں تہران کے ایک پرانے قصبے میں ایک سادہ سے گھر میں ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوا تھا۔

اس زمانے میں تہران شہر چاروں طرف سے چہار دیواری اور خندق سے گھرا ہوا تھا۔ شہر میں داخلا صرف دروازوں کے ذریعے سے ہوتا تھا جن کو ڈاکوؤں اور رہزنوں کے ڈر سے رات میں بند کردیا جاتا تھا۔ بعد میں اس چہار دیواری کو میرے والد نے تڑوا دیا تھا۔ میں ابھی کم عمر ہی تھا کہ میرا خاندان یہاں سے منتقل ہوگیا، اور میرے ذہن میں اس جگہ کا اب کوئی خاص نقش نہیں ہے، مگر مجھے وہاں کے البرز پہاڑوں کی عظیم چوٹیاں اب بھی یاد ہیں اور اب جب بھی میں شمال مشرق کی طرف دیکھتا ہوں مجھے یہ پہاڑ یاد آجاتے ہیں۔ اس زمانے کی دوسری یاد میرے اپنے والد کی ہے جو اس زمانے میں وزیر جنگ تھے۔ وہ ہر روز شام کو کام سے تھکے ہوئے گاڑی میں بیٹھکر گھر لوٹتے تھے۔ الفاظ کے ساتھ کھیلتے ہوئے ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے جیسے میرے ذہن کو یہاں کے پہاڑوں نے ہلاکر رکھ دیا تھا۔ میرے والد جو اس وقت وزیر اعظم اور پھر شاہ بننے والے تھے۔ پہاڑوں کو جنبش دے رہے تھے۔

جب میں بچا تھا تو کچھ زیادا طاقتور نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن میں غسل خانے میں گر گیا اور میرا سر پھوٹ گیا۔ مجھے اپنی چوٹ پر تو زیادا حیرانی نہیں تھی۔ اس سے زیادا حیرانی مجھے اپنے اتالیق مسٹر ہاشم کے پریشان اور خوفزدا چہرے کو دیکھکر ہورہی تھی۔ وہ ہمیشا ایک وفادار ملازم رہے ان کی حال ہی وفات ہوئی ہے۔

میرے ذہن میں ایک اور نمایاں یاد وہ دوہری رسم ہے جب میرے والد کی تاجپوشی ہوئی اور مجھے وارث تخت بنادیا گیا۔ "تاجپوشی کی رسم گلستان محل کے ایک عظیم محل کے اس عظیم ہال میں ہوئی تھی جس میں تخت طاؤس رکھا ہوا تھا۔ یہ رسم بڑی شان وشوکت کے ساتھ ادا ہوئی تھی۔ میں چھ سال کا بچا تھا اور یہ سب کچھ میرے لیے ایک تماشے سے کم نہیں تھا۔ وارث تخت بننے سے پہلے میں اپنے بھائی بہنوں اور ماں کے ساتھ رہتا تھا کیونکے میرے والد کے کئی بیویاں تھیں اور ان سے میرے بہت

سوتیلے بھائی بہن بھی تھے) میری جانشینی کا اعلان ہونے کے بعد میں ان سے جدا ہو گیا، اور والد نے ہدایت جاری کی کہ اب مجھے تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ انہوں نے میرا داخلہ ایک ابتدائی فوجی اسکول میں کرا دیا۔ یہ اسکول میرے اور میرے سوتیلے بھائی بہنوں کے لیے ہی کھلوایا گیا تھا۔ میری کلاس میں منتخب شدہ (۲۱) طلباء تھے۔ اور میرے سوتیلے بھائی اور بہنیں دوسری کلاسوں میں تھے۔ میرے دوسرے کلاس فیلوز زیادہ تر سرکاری اور فوجی افسروں کے بیٹے تھے۔ ہماری ایک خاص اسکول کی وردی تھی اور نصاب بھی بڑا سخت تھا۔ اس نو عمری میں میری دنیا مطالعہ اور فوجی ڈرل تک محدود تھی۔ میرے والد نے فرانسیسی زبان سکھانے کے لیے ایک فرانسیسی خاتون بھی میرے لیے گھر پر مقرر کی تھی۔ یہ اسی خاتون کا احسان ہے کہ میں فرانسیسی زبان کو اپنی مادری زبان کی طرح بولنے اور سمجھنے لگا۔ اس کے علاوہ اس خاتون کی وجہ سے مجھ پر مغربی تہذیب کی کھڑکیاں بھی کھل گئیں۔ اس نے ہی مجھے فرانسیسی کھانوں سے متعارف کرایا۔ میں ہمیشہ میڈم عرفا کا ممنون رہوں گا۔ اس نے بعد میں ایک ایرانی سے شادی کر لی اور سنہ ۱۹۵۹ء میں پیرس میں اس کا انتقال ہوا۔

میں چاہے مضبوط نہ ہوں مگر میں بڑا پیارا بچہ تھا۔ میں مشکل سے ہی خاموشی سے کھڑا رہ سکتا تھا کودتا پھاندتا۔ پیڑوں پر چڑھتا مٹی سے کھیلتا اور وہ سب کچھ کرتا جو میرے عمر کے عام لڑکے کیا کرتے ہیں۔ مجھے کشتی لڑنے کا بھی شوق ہوا۔ کشتی اور پہلوانی میرے ملک کا خاص شوق ہے۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ مجھ پر ڈانٹ پڑی تھی میں نے کھانا کھانے کے بعد کشتی لڑ کر صحت کے ایک اصول کی خلاف ورزی کی تھی۔ سردی میں ہم برف پر لڑتے تھے۔

مجھے خاص طور پر چیزیں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ سعد آباد کے موسم گرما کے محل میں پانی کے خوبصورت اور دلکش چشمے بہتے تھے ان چشموں پر میں اور میرے ساتھی ننھے منے ڈیم بنایا کرتے تھے یہ ان ڈیموں کا ریہرسل تھے جو آج ہم ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بنا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھر بھی بناتے تھے۔

دوپہر اور صبح کی کلاسوں کے درمیان دو گھنٹے کا وقفہ ہوتا تھا، اگرچہ ایران میں ہر بڑا اور بچہ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر ضرور سوتا ہے، لیکن میں رات کے علاوہ قطعی سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوپہر بھر شور اور ہنگامے کرتا رہتا تھا اور اپنے بڑوں کے آرام میں خلل انداز ہوتا۔ مجھے "چور سپاہی" کا کھیل اب تک یاد ہے۔ ہم چور کا پتا لگانے کے لیے گھنٹوں محل کے پُر اسرار اور اندھیرے تہہ خانوں اور کوٹھریوں میں بھٹکتے رہتے تھے۔ میں جب بڑا ہوا تو اپنا زیادہ وقت گھوڑے کی پیٹھ پر شکار کھیلنے اور سواری کرنے میں گذارنے لگا میری جوانی کا ساتھی عموماً عطا بھائی ہوا کرتا تھا وہ آجکل شاہی اصطبل کا داروغہ ہے۔ اب میں نے فٹ بال اور بوکسنگ سیکھنا شروع کیا۔ میرا بوکسنگ کا استاد چشمہ لگاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مجھے بوکسنگ سکھا رہا تھا کہ اس کا چشمہ نیچے گر پڑا۔ میں نے چشمہ اٹھا کر اس کو دیا، اور پھر سے بوکسنگ شروع ہو گئی۔ اس پر دیکھنے والے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہم ایک دوسرا کھیل کھیلتے تھے جس کو بائیسکل پولو کہتے تھے۔ ایران میں اس کھیل کو کھیلنے والے ہم پہلے انسان تھے، اس طرح کے خطرناک کھیلوں میں ایک وارث تخت کو حصہ نہیں لینا چاہیے مگر میں اس زمانے میں کبھی تنہائی پسند نہیں رہا اور نہ میرے اندر کوئی شاہی گھمنڈ ہی تھا۔ میں اپنی وہ شہرت آج تک قایم رکھے ہوئے ہوں۔ میرا ایک خاص دوست حسین فردوس تھا اس کے والد فوجی لیفٹیننٹ تھے۔ بعد میں میں نے اور حسین نے سوئیزرلینڈ کے ایک اسکول میں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی۔ وہ بعد میں تہران کے ایک فوجی کالج میں معلم ہو گیا اور آجکل میرے شاہی گارڈ کے ساتھ وابستہ ہے۔

میرے کراؤن پرنس (ولیعہد) بننے کے بعد میرے والد میرے ساتھ ایک دو گھنٹے روزانہ گزارتے تھے۔ جب میں نو برس کا تھا تو میں ان کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں شریک ہوتا تھا۔ وہ مجھے ان تمام باتوں سے واقف کرانا چاہتے تھے جو اس وقت ہو رہی تھیں۔ میں وراثت

تحت ہونے کے اعلان کی رسم کے بعد ٹایفائیڈ میں مبتلا ہوگیا، اور ہفتوں موت اور زیست کے درمیان معلق رہا۔ میرے والدین کے لیے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ یہ بات اب تک کسی کو معلوم نہیں کہ اس بیماری کے دوران ہی میری مذہبی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس وقت میں نے حضرت علی کو خواب میں دیکھا جو ہمارے (شیعی) عقیدہ کے مطابق محمد صلعم کے سچے جانشین تھے (ایسے ہی جیسے عیسائی عقیدے کے مطابق سینٹ پال حضرت عیسیٰ کے خصوصی شاگرد تھے۔

حضرت علی حضرت محمد صلعم کی صاحبزادی کے شوہر تھے اور ان کے ایک بہادر پیروکار میرے خواب میں وہ اپنی دو دھاری تلوار لیے ہوئے تھے جو اکثر ان کی تصویروں میں دکھلائی جاتی ہے۔ وہ فرش پر ایک پیالا ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے جس میں ایک قسم کا شربت تھا۔ انہوں نے وہ شربت پینے کے لیے دیا اور میں نے پی لیا۔ اگلے دن میرا بخار ختم ہوگیا اور میں تیزی سے رو بصحت ہوگیا۔ میں اس وقت سات برس کا تھا، اور میں نے اپنے بچکانا طریقے پر سوچا کہ میری صحت یابی سے خواب کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مگر اسی سال دو واقعات اور ہوئے جنہوں نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

تفریحاً ہر موسم گرما میں میں اپنے خاندان کے ساتھ امام زادہ کے مقام پر پکنک منانے کے لیے جایا کرتا تھا۔ مقام تہران کی انتہائی پر فضا پہاڑیوں پر واقع ہے یہاں پر پہنچنے کے لیے پیدل یا گھوڑے پر ایک پر پیچ رستے سے سفر کرنا پڑتا ہے، چونکہ میں چھوٹا تھا اس لیے مجھے ایک رشتہ دار نے اپنے گھوڑے کی زین پر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ بیچ پلیلی پر جاکر گھوڑا پھسل گیا۔ میں سر کے بل پر ایک چٹان پر گرا، اور بے ہوش ہوگیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرے گرد کھڑے افراد اس بات پر حیران تھے کہ مجھے کوئی بھی چوٹ یا زخم نہیں لگا تھا۔ میں نے انہیں بتلایا کہ جوں ہی میں گرا میں نے اپنے بزرگوں میں سے حضرت عباس کو دیکھا میں نے محسوس کیا جیسے انہوں نے مجھے اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا اور آہستہ سے چٹان پر لٹا دیا۔

میرے والد موجود نہیں تھے۔ جب انہوں نے میری کہانی سنی تو میرا مذاق اڑایا۔ وہ بہت ضدی انسان تھے۔ اس لیے میں نے ان کے ساتھ بحث نہیں کی، مگر مجھے اس کے بارے میں ذرا برابر بھی شک نہیں کہ میں نے حضرت عباس کو دیکھا تھا۔

تیسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب میں اپنے ایک محافظ کے ساتھ شمران میں شاہی محل کے قریب چہل قدمی کر رہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے سامنے ایک شخص کو دیکھا۔ اس کے سر کے چاروں طرف سنہری ہالا بنا ہوا تھا۔ جب ہم ایک دوسرے کے قریب سے گزرے میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ ایک امام یا حضرت محمد کی اولاد میں سے ایک تھے جو ہمارے (شیعی) عقیدے کے مطابق اچانک غایب ہو گئے تھے، لیکن جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی نجات کے لیے دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ میں نے اپنے محافظ سے پوچھا "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے؟" اس نے حیرانی سے جواب دیا"

"کس کو؟ یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے۔ میں کیسے دیکھتا جب یہاں کوئی تھا ہی نہیں۔"

میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے بارے میں اس قدر یقین تھا کہ مجھے اپنے محافظ کے جواب سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ مغربی ملکوں کے میرے قارئین اس کو واہمہ سے تعبیر کریں گے اور اس کی کوئی نفسیاتی تعبیر بتلائیں گے، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غیر مادی چیزوں میں عقیدہ رکھنا ہم مشرق میں رہنے والوں کا خاص امتیاز ہے۔

اب سے پہلے اس تیسرے واقعہ کے بارے میں ذکر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، میں اس واقعے کے بارے میں کوئی سستی شہرت نہیں بٹورنا چاہتا۔ بہت کم لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہے میں نے اپنے والدین تک کو یہ واقعہ نہیں بتلایا۔

چھ سات برس کی عمر سے میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ایک نامعلوم طاقت میری رہنمائی کر رہی ہے۔ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ بعض اوقات میں خود سے سوال کرتا ہوں۔ کیا میں اپنے ارادوں میں آزاد ہوں!

یا مجھے کوئی دوسری طاقت دھکیلے لئے جا رہی ہے ؟ اس کے پیچھے کوئی سبب ضرور ہونا چاہیے -

بچپن کی یہ خواب جیسی زندگی گذر جانے کے بعد چار واقعات اور پیش آئے جنہوں نے بچپن کے عقیدے کو میرے ذہن میں اور زیادہ راسخ کر دیا۔

پہلا واقعہ ۱۹۶۵ء میں ہوا جب میں اصفہان کے قریب ایک مقام کہرانگ گیا - یہاں مجھے آبپاشی کے لیے بنائے جانے والے ایک ڈیم کی جگہ کا معائنہ کرنا تھا میں واپسی کے لیے تیار ہوا اور ہوائی جہاز میں بیٹھا - میرے ساتھ جہاز میں اس علاقے کا جنرل تھا - میں خود جہاز کو چلا رہا تھا - میرے پاس جہاز رانی کا لائسنس ہے، اور میں کسی بھی جہاز کو چلا سکتا ہوں، چونکہ یہ ہوائی اڈا بہت چھوٹا تھا - اس لیے ہم صرف ایک انجن کے جہاز میں آئے تھے ہماری اڑان کے دس منٹ بعد انجن بالکل سرد ہو گیا، میرا جہاز سیدھا نیچے ایک چٹانی علاقے میں گرنے لگا - انجن خراب ہو جانے کی وجہ سے جہاز پر میرا کوئی قابو نہیں رہا - جہاز کے نیچے گرنے کے علاوہ کوئی چارا نہیں تھا - میں نے ایک لکڑی کی مدد سے جہاز کی ناک کو سیدھا رکھا تاکہ وہ چٹان سے سیدھے جا کر نہ ٹکرائے جہاز کا پہیہ اس چٹان کی چوٹی سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا - اس ٹکرانے سے ایک فایدا ہوا جہاز کی رفتار کم ہو گئی - اب جہاز الٹ پلٹ ہوتا ہوا میدان میں گرا - ہم اپنی سیٹ بیلٹ سے بندھے ہوے کوک پٹ میں لٹکے ہوے تھے - ہم دونوں کو ایک خراش تک نہیں آئی - مجھے یاد ہے میں اس منظر سے بڑا محظوظ ہوا تھا - میں نے ایک زوردار قہقہہ فضا میں بلند کیا - بہرحال میرا ساتھی اس کو ایک مذاق نہیں سمجھ رہا تھا - کیا یہ بال بال بچنا محض ایک اتفاق تھا یا کسی اور کا کرشمہ ؟ شاید میرے قارئین بہتر فیصلا کر سکتے ہیں - اتنا اور کہہ دوں کہ آج اس جگہ ڈیم بن کر تیار ہو چکا ہے اور اردگرد کی زمینوں کو سیراب کر رہا ہے -

دوسرا واقعہ ہمارے دولت مند صوبے آذربائیجان کو غیر ملکی قبضے سے نکالنے سے متعلق ہے - میں ایرانی جب

وطن اور خدائی امداد کی یہ کہانی بعد میں بتلاؤں گا -

تیسرا واقعہ فروری ۱۹۶۹ء میں پیش آیا -

تہران یونیورسٹی کا سالانہ تاسیسی پروگرام ہو رہا تھا میں اس میں شامل ہونے جا رہا تھا - میں اپنی فوجی وردی میں جیوس فیکلٹی آفس کی عمارت میں جہاں یہ تقریب ہونے والی تھی داخل ہوا - اچانک گولیوں کے چلنے کی آواز آئی - کچھ گولیاں میری طرف آئیں - بات حیرتناک معلوم ہوگی کہ تین گولیاں میری ٹوپی میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئیں میرے سر کو انہوں نے چھوا تک نہیں، لیکن حملہ آور کی چوتھی گولی میرے گال کی ہڈی کو توڑتی ہوئی میری ناک کے قریب سے گذر گئی -

میرا قاتل جو ایک فوٹوگرافر کے بھیس میں تھا مجھ سے صرف چھ فٹ کے فاصلے پر تھا اب وہ اپنا نشانا میرے دل کی طرف لگا رہا تھا - میرے اور اس کے درمیان کوئی شے بھی نہیں تھا اور اس کو موقع تھا کہ وہ ٹھیک نشانا لگائے ایسے بھی نشانے سے وہ کس طرح چوک گیا ؟ اس وقت کا مجھے اپنا ردعمل اچھی طرح یاد ہے - میں نے سوچا مجھے کیا کرنا چاہیے ؟ کیا میں اس پر جھپٹ پڑوں، مگر اگر میں اس کی طرف بڑھوں گا تو وہ زیادہ اچھی طرح مجھے اپنا نشانا بنا لیگا کیا میں بھاگ جاتا ؟ تب بھی وہ میری پشت پر فایر کرتا - اس لیے میں نے اچانک ناچنا شروع کر دیا اور مدہوش ہونے لگا اس نے پھر فایر کیا اور اس بار میرا شانہ زخمی کر دیا اس کا آخری فایر پستول میں ہی اٹک کر رہ گیا - میں بڑا عجیب سا مگر خوشگوار احساس رکھتا تھا کہ بہرحال میں اب بھی زندہ ہوں -

اس وقت اس نے اپنا ریوالور پھینک دیا اور فرار کی کوشش کرنے لگا اس ہیجان میں میرے ایک افسر نے اس کو قتل کر دیا -

وہ بڑا دلچسپ شخص ہوگا، ہمیں معلوم ہوا وہ بہت سے رجعت پسند اور کٹر ملاؤں کا دوست تھا اس کے فلیٹ کی تلاشی پر کمیونسٹ پارٹی کا بہت سا لٹریچر بھی برآمد ہوا - اس کی دوشتا تہران میں برطانوی سفارت خانے کے ایک مالی کی لڑکی تھی -

میرے جسم سے بری طرح خون بہہ رہا تھا جیسے

کسی بیل کو ذبح کر دیا گیا ہو۔ مجھے یاد ہے میں اس وقت بھی اس تقریب میں شریک ہونا چاہتا تھا مگر میرے ساتھیوں نے مجھے زبردستی ہسپتال پہنچا دیا۔ میری خون سے آلودہ وردی نمایش کے لیے تہران آفیسرس کلب میں رکھ دی گئی جہاں وہ آج بھی رکھی ہوئی ہے۔ جو تھا ... کا تفصیلی ذکر میں بعد میں کرونگا نجات خدا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ یہ واقعہ مصدق سے متعلق ہے۔ ہم نے ایران کو اس کے ہاتھوں سے بچا لیا ڈاکٹر مصدق ایک عظیم سیاسی رہنما تھے مگر بعد میں وہ اپنے مداحوں اور غیر ملکی طاقت کے غلام ہو گئے تھے۔ میں ہر شخص کو جواب دینے کے لیے تیار ہوں جو یہ کہتا ہے کہ مصدق کی سرکار کا خاتمہ عوام کا کارنامہ نہیں تھا۔ خدا حق کے دلوں میں نور الٰہی کی شمع روشن

کالیداس گپتا رضا

چھترپتی شواجی مہاراج

جے مہادیو، جے بھوانی کی
میں شواجی، شواجی چھترپتی

میں مہاراجہ، راجوں کا ادھیراج
اکھنڈ، جن شکتی
... ام کی رکھشا
... روپ ... نر ... ناری
جرم عصیاں ستم مرے دشمن
شدھ جن آتما، مری بھگتی
پریم اور ایکتا کا اجیالا
ہے یہی ہے یہی "شوا سرشٹی"
مجھ کو نفرت نہیں مسلماں سے
محض رکھشک نہیں میں ہندو کا
جا کے لیتا ہوں اس سے ٹکر میں
جس کو غرہ ہو زور بازو کا
جس کا تکیہ ہو جبر و طاقت پہ
جو ہو اپنے وقار کا بھوکا
غسم، غلو، قزق، میل جیسا ہیں ہم
مجھ سے کیا میل ایسے بدخو کا
مجھ کو نفرت نہیں مسلماں سے
محض رکھشک نہیں میں ہندو کا
میں مہاراجہ، راجوں، ادھیراج
ڈھال، تلوار، اکھنڈ، جن شکتی
جے مہادیو، جے بھوانی کی
میں شواجی، شواجی چھترپتی

گھٹائیں اٹھ رہی ہوں جبکہ دریا کے کنارے سے
مسلسل ہوں ملاقاتیں وہاں اس حسن پارے سے
برابر شکباری کر رہی ہوں دوست کی زلفیں
معطر سب فضائیں ہوں ہواؤں کے فوارے سے
شرارت سے بہم پانی اچھالیں ہم نہانے میں
غموں کو دل سے دھو ڈالیں محبت کے اشارے سے
کہے وہ درد کا درماں مری آشفتہ حالی میں
کہوں سب حال دل اپنا میں آہوں کے سہارے سے
شب تاریک آپہنچی اندھیرا چھا گیا دل پر
بکھیرے چاندنی کہدے کوئی اس ماہپارے سے
نرالی آرزوئیں ہیں نرالی ہیں تمنائیں
لے کشتی حسرت کس طرح دیکھیں کنارے سے
ملایا خاک میں اس نے خاک جلا کر خرمن ارماں
شکایت کیا جفاؤں کی کریں اس برق پارے سے
ہمارے دل کی دنیا روز بنتی ہے بگڑتی ہے
تمہارے اک تبسم سے تمہارے اک اشارے سے
مزہ جب ہے پرستاں میں مکاں میرا بنے ماجد
نہیں بیزار ہے ماجد میرا حسینوں کے نظارے سے

آذر - دے - بہمن سنہ ۱۳۸۶ف ہندستانی ادب اکتوبر - نومبر - دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء

مرزا محمود علی بیگ

غالب اور دلی

حضرت غالب شادی کے دو تین سال بعد تقریباً سولا سال کی عمر میں دلی آئے، اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ گو خود وہ اس واقعے کا بیان اس طرح ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"تیرا برس حوالات میں رہنے کے بعد تا حیات قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ بیوی کی شکل میں بیڑیاں پہنائی گئیں۔ دلی کو جائے قید قرار دیا گیا، اور شعر و سخن کی خدمت مشقت تجویز ہوئی۔"

دلی میں رہ کر انہوں نے شعر و سخن کی دنیا کو اس طرح مالا مال کیا کہ آج تک استادان سخن میں ہی نہیں، بلکہ "تاجداران سخن میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ عمر کے (۵۶) برس جو انہوں نے دلی میں گزارے ان میں مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر بادشاہ کی ملازمت اور پھر استادی کی۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب دیکھا۔ عزیزوں کی موت کے رنج اٹھائے۔ دوستوں کی پھانسیوں کے چرکے کھائے، اور زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے تیر ان پر چلائے، مگر اس کے باوجود ان کا دل ایک ایسا جام جہاں نما ہے، جس میں ایک ہی نقش ہمیشہ نظر نہیں آتا، بلکہ اس میں فطرت کے عام نقوش باری باری نمایاں ہیں۔ اس ساز میں بے شمار نغمے ہیں اور ہر نغمہ دل آویز ہے۔ ان کے کلام میں سب کچھ ہے۔ اگر آپ دل لگی اور شوخی اور ظرافت کا سامان چاہتے ہیں تو یہاں خیال آفرینی اور شوخ نگاری کی پھلجھڑیاں ہیں، اگر آپ شباب کی رنگین داستان اور حسن و عشق کے افسانے سننا چاہتے ہیں تو یہاں وہ سوز و گداز اور نشہ اور مستی کی باتیں ہوں گی جن سے مردہ دلوں میں بھی جان پڑ جائے، اور اگر آپ زندگی کے رازہائے پنہاں کی پردہ کشائی چاہتے ہیں تو غالب کی پختہ کار ہستی آپ کو ایک سر بہ فلک بلندی پر پہنچا کر اس کارگاہ ہستی کی سیر کرائے گی، جہاں سے اس عالم کون و مکان کی ایک ایک چیز صاف نظر آئے گی۔

اور باوجود اس کے کہ دلی میں ایک مکان میں سکون سے رہنا نصیب نہیں ہوا تھا، آگرا سے آ کر کچھ دنوں شروع میں گلی قاسم جان میں اپنی سسرال محل سرا نواب الٰہی بخش میں رہے، جہاں اب شفا خانے کو جائے ملیا ہے۔ اس کے بعد اسی گلی میں ایک مکان خریدا، مگر اسے کلکتہ جانے سے پہلے فروخت کر دیا، کہ انہیں روپے کی ضرورت تھی۔ کلکتہ سے واپس آ کر وہ کھاری باؤلی میں حویلی نواب عبدالرحمان میں رہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد جامع مسجد کے پیچھے میں اور وہاں سے اٹھے تو پھاٹک حبش خاں میں حویلی مرزا شعبان بیگ میں رہے۔ یہیں سے شاید ان کو قید میں رہنا پڑا۔ قید سے چھوٹے تو احاطہ کالے صاحب میں رہے۔ وہاں سے اٹھے تو بلی ماران میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں آئے، جہاں ۱۸۵۷ء میں رہے۔ ان کا مکان زیر مرمت تھا کہ شریف منزل بلی ماران میں حکیم محمود خاں کے مکان میں عارضی طور پر آئے، اور پھر واپس حکیم محمد حسن خاں والے مکان میں آئے۔ اس کے بعد اس کے پاس ہی میر خیراتی کے مکان میں آ گئے۔ ۱۸۶۶ء میں رامپور کے دوسرے سفر سے واپس

بعد مرزا نا جمعے کے لیے وہ مکان لیا جو بلی ماران سے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی الٹے ہات کو پڑتا ہے، اور سرے کی مسجد کے برابر ہے۔ اسی مکان میں ان کا انتقال ہوا۔

مکان کی مصیبت کے باوجود دلی کے سخن سنج احباب اور استادان سخن کی صحبت اور خدا داد طبیعت کی روانی نے کلام کو ترقی دی۔ مالی پریشانیوں نے دلی کالج کی ملازمت پر مجبور کیا، مگر خود داری پر ملازمت کو قربان کر دیا۔ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے، وسلت پاتے، درباروں میں شرکت کرتے تھے۔ قصیدے پڑھتے تھے۔ خلعت پاتے تھے، تسلیم، مگر اس کے باوجود صوبے کے سب سے اعلا حاکم سے ملاقات اور کالج کی ملازمت سے انکار۔ یہ استعفا مرزا صاحب کی خود داری کا ثبوت ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

۱۸۵۷ء سے پہلے دلی میں امن چین تھا۔ ادب ترقی پر تھا، اور ادیبوں کی محفلوں سے دلی ایک مسلسل محفل مشاعرا بن گئی تھی۔ میاں کالے خان کی حویلی میں ایک دن مرزا غالب، نواب شیفتہ، نواب ضیاء الدین خاں، حکیم احسن اللہ خان، مولانا نصیر الدین جمع تھے، اور حکیم مومن خان مومن کے انتقال پر سب افسوس کر رہے تھے، کسی نے مومن کا ایک شعر پڑھا ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مرزا غالب نے اس شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا "مومن اہل دل اور اہل نظر تھا۔ مومن کے مر جانے سے زندگی کا لطف آدھا رہ گیا، اور میرے بعد" اتنا کہہ کر رک گئے، چونکہ اسی ردیف میں ان کی ایک غزل بھی تھی۔ احباب نے اصرار کیا تو غالب نے چند شعر سنائے ؎

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

مگر سیلاب بلا نے غالب کے بعد کا انتظار نہیں کیا، اور تھوڑے عرصے بعد کسی ایک کے گھر پر نہیں بلکہ ساری دلی شہر پر ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ کی بادشاہت گئی، امیروں کی امیری خاک میں ملی، دلی لٹی، اس کی اینٹ سے اینٹ بجی، جان و مال اور ناموس، مکان اور مکین، آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔

غالب اس دلی کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں "وہ دلی نہیں، جس میں سات برس کے سن سے آنا جانا تھا۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم تھا۔ بڑے بڑے نامی بازار۔ خاص بازار۔ اردو بازار اور خانم کا بازار، کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبا تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے۔"

اپنے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی ہے، اور اس محلے کا نام بلی ماران کا محلا ہے، لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ وہی بالا خانا ہے، اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نگاہ کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔"

دہلی کی اس بربادی کو ایک قطعے میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مگر اس شمع نے رنج و اندوہ کی آندھیوں میں بجھنا نہیں سیکھا تھا، خود بھی روشن رہی، اور اپنے گرد ماحول کا اندھیرا نہ ہونے دیا۔ ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت چند گورے کو چاندنی کی دیواریں پھاند کر بلی ماروں کے محلے میں گھس آئے۔ مہاراجا پٹیالا کے سپاہیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی، لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ گوروں نے لوگوں کے مال و اسباب کو ہاتھ نہ لگایا، لیکن مرزا صاحب اور ان کے ہمسایوں میں چند آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے، اور کرنل براون کے سامنے پیش کر دیا۔

کرنل براون نے ایک سے پوچھا "ول تم کون ہو" اس نے جواب دیا۔ "مسلمان" دوسرے سے پوچھا۔ "ول تم کون ہو" اس نے جواب دیا "مسلمان" غالب سے پوچھا "ول تم کون ہو" غالب نے جواب دیا "حضور، مسلمان، مگر آدھا، شراب پیتا ہوں، اور سور نہیں کھاتا، اس لیے آدھا مسلمان" بات ہنسی میں ٹل گئی، اور سب رہا ہو گئے ع

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

اور بھی بلائیں آئیں اور گذر گئیں۔ سال گذرتے گئے، اور مرزا صاحب کچھ عمر کی وجہ سے، کچھ پریشانیوں کی وجہ سے اور کچھ بیماریوں کی وجہ سے کمزور اور بوڑھے ہوتے گئے۔ نہ آزاد تھے نہ مقید۔ نہ رنجور نہ تندرست۔ نہ خوش تھے نہ ناخوش۔ اس حالت کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ان مشکلوں کو اپنے اوپر آسان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ زنان خانے میں چلے گئے۔ بیوی کو ان کی عبادت گزاری کی وجہ سے موسا کی بہن کہا اور کبھی کہا کہ ان کی نمازوں نے گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا۔ کبھی عارف کے بیٹے مرزا باقر علی خان کی بیوی۔ چنے کی اور خدا کی کہانی سنا کر ہر چیز میں چنے کی دال ڈالنے کی وجہ بتائی، کبھی حسین علی کو مجبور کیا، مگر ایک وقت آیا کہ زندگی سے مایوس ہو گئے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا ہوں، حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر کیوں جیتا ہوں، روح اب میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے، جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی مجمع پسند نہیں آتا۔ کتاب سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت جو کچھ لکھا ہے بلا مبالغہ بیان واقع ہے۔" ع

"خرم آں روز کزیں منزل ویراں گذرم"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"آگے میں لیٹے لیٹے لکھ لیتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتوں میں رعشہ، آنکھوں میں ضعف بصر، ناتوانی زوروں پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا، گرانی و گرانی جانی، رکاب میں پاؤں ہے باگ پر ہاتھ ہے، اپنا مصرع چپکے چپکے دہراتا ہوں۔"

ع "اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"

اب مرگ ناگہاں کہاں رہی، اسباب و آثار جمع ہیں، ہائے الٰہی بخش معروف کا کیا مصرع ہے۔

ع "آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں۔"

یہ ارمان بھی ایک دن پورا ہو گیا۔ ۱۵ر فروری سنہ ۱۸۶۹ء دوپہر ڈھلے اس باکمال کا انتقال ہو گیا۔ دلی دروازے کے باہر نماز جنازہ ہوئی۔ سلطان جی چونسٹھ کھمبے کے متصل خاندان لوہارو کے قبرستان میں دفن ہوئے، اور دلی نے جس پر اتنے عرصے فخر کیا اسے ابدالآباد تک اپنے سینے سے لگا لیا۔

انور مصطفٰی آبادی

قطعہ

فن بے بہا کے خزینے میں تم ہو
سفینے میں تم ہو قرینے میں تم ہو
سخن آبرا شگفتہ ہی ہے زباں کی
چمکتے ہوئے نگینے میں تم ہو

لوک مانیا تلک

شواجی — ایک قومی ہیرو

شواجی نے ایک ایسے دور میں جنم لیا، جبکہ پوری قوم افراتفری اور بدنظمی سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی، چنانچہ شواجی نے اپنے جذبۂ ایثار اور ہمت اور جرات سے کام لے کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ہندستان وہ ملک نہیں کہ جس سے خدا نے اپنی نظر کرم پھیر لی ہو۔

ایک مطمئن اور آسودہ حال بزرگ خاتون ان خوشیوں اور جشن کی تقریبات سے بے حد خوش تھی، جو اس کے ارد گرد منائی جا رہی تھیں، لیکن یہ ایک طویل اور جدوجہد سے پر سفر تھا۔ اس خاتون نے جس سفر کا عزم کیا تھا وہ خواب کو حقیقت میں بدلنے سے کم نہ تھا، اور اس موقع پر یہ خواب اس کے دیئے یا طن پر روشن ہو رہے تھے۔ پورا ماحول، بے پناہ جوش و خروش اور مسرت کا آئینہ دار بنا ہوا تھا، لیکن حاضرین نے اس خاتون کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو وہ بے حد متحیر ہوئے، کیونکہ یہ ایسا وقت نہ تھا کہ آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو جائیں۔

یہ بزرگ خاتون اس بات پر شاداں و فرحاں تھی کہ اس نے جس کام کو سرانجام دینے کا بیڑا اٹھایا تھا وہ مکمل ہو چکا تھا، اور اسے اپنے مقصد میں کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا غم بھی تھا کہ اس کا شریک حیات آج دنیا میں موجود نہ تھا جو اس مسرت ناک [illegible] اور [illegible] سکتا تھا۔

ان تمام خوشیوں، تقریبوں اور جشن کا مرکز تھے ہندستان کے عظیم سپوت شواجی، اور یہ بزرگ خاتون تھیں جیجا بائی اور یہ موقع شواجی کی رسم تاجپوشی کا تھا جو پونا سے (۳۰) کلومیٹر کے فاصلے پر رائے گڑھ کے قلعے میں تین سو سال پہلے ۶ر جون ۱۶۷۴ء کو ادا کی گئی تھی۔

شواجی کا بچپن

شواجی کی پیدائش ۱۶۳۰ء میں پونا سے تقریباً (۹۰) کلومیٹر دور ایک پہاڑی قلعے شونیری میں ہوئی۔ ان کی والدہ کا نام جیجا بائی تھا جو مذہبی خیالات میں ڈوبی رہتی تھیں۔ وہ ایک مضبوط قوت ارادی کی مالک تھیں، جن دو اہم شخصیتوں نے شواجی کے کردار کی تشکیل کی ان میں سے ایک ان کی والدہ ہیں، اور دوسرے ان کے گرو شری دادو جی کونڈ دیو ہیں جو انتہائی سادگی پسند اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ ان دونوں شخصیتوں نے شواجی کے اخلاق کردار کی مضبوط بنیاد دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے گرو نے اس بات کا خیال رکھا کہ اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون حرب سے متعلق ان کی صلاحیتیں بھی بروئے کار آتی جائیں۔ یہ تربیت ان کے بہت کام آئی اور انہوں نے (۱۶) برس کی عمر میں ہی بیجاپور کے کمانڈر کو شکست دیکر تورنا کا قلعہ فتح کر لیا۔ اس وقت سے فوجی سالار آپس میں ایک

دوسرے سے لڑتے رہتے تھے، اور کسان طبقے کو لوٹتے رہتے تھے۔

شواجی ایک ایماندار اور غیر جانبدار ثالث کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ ان میں انصاف کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا، اور وہ بے نواؤں اور کمزوروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ان کی اس دردمندی نے انہیں عوام میں مقبول بنا دیا۔

مہمات سے پر زندگی

شواجی کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ ان کی زندگی خطرناک مہموں سے پر رہی ہے، اور انہیں دشوار ترین صورت حالات سے گذرنا پڑا ہے۔ ۱۶۵۹ء افضل خان کے ساتھ ان واقعات ۱۶۶۰ء میں سدی جوہر کا قلعہ پنہالا کا محاصرہ ۱۶۶۰ء سے ۱۶۶۳ء کے درمیان شایستہ خان کا پونا پر قبضہ ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب کے احکامات کے تحت شواجی کے خلاف جے سنگھ کی مہم اور ۱۶۶۶ء میں آگرا کے قلعے شاہی میں شواجی کا پہنچنا، اور حیرت انگیز طور پر وہاں سے بچ نکلنا۔ یہ ایسے حیرتناک واقعات ہیں جو شواجی کی اعلا خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان واقعات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک لایق مدبر، چھاپا مار طریقے جنگ کے ماہر اور بے مثل جرات اور ہمت کے مالک تھے۔

بحری اڈوں کا قیام

ہندستان کے ساحل کی حفاظت کے لیے شواجی نے بحری اڈے بنانے کے لیے جو کوششیں کیں، ان سے ان کی ذہانت اور سیاستدانی کا اندازا ہوتا ہے۔ ۱۶۵۵ء میں ہی شواجی نے کلیان اور بھونڈی کے قریب اپنے جہاز بنانے شروع کر دیے تھے۔ انہوں نے صرف جنگی بحریہ ہی تیار نہیں کیا، بلکے تجارتی بیڑا بھی تیار کیا، اور اس سے اپنے اسٹیٹ کی آمدنی بڑھائی۔ غیر ملکی تجارت کو فروغ دے کر انہوں نے اپنے عوام کی آمدنیوں میں اضافا کیا۔ وجے درگ، سورن درگ، سندھو درگ اور طوان جیسے بحری اڈے ان کی کوششوں کی چند نمایاں مثالیں ہیں۔

شواجی کی رسم تاجپوشی

شری جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "شواجی محض ایک ایسے بلند حوصلا فرماں رواں نہ تھے جو صرف اپنے لیے ایک سلطنت کے قیام کے خواہشمند ہوں، بلکے وہ ایک محب وطن بھی تھے۔ انہوں نے قدیم فلسفیوں کی تعلیمات سے جو روشنی اور سیاسی نظریات حاصل کیے ان سے انہیں تحریک عمل حاصل ہوئی"۔[۱]

شواجی نے ایک بادشاہ کی حیثیت سے رسم تاجپوشی کو ضروری سمجھا، کیونکے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اپنے مخالفین کی نظر میں وہ محض ایک فوجی سردار ہی تصور کیے جاتے۔

شواجی نے نہایت سرگرم اور جوکھم کی زندگی گذارنے کے بعد ۱۶۸۰ء میں وفات پائی۔ انہوں نے اس عرصے میں جو علاقے فتح کیے، اس میں (۲۰۰) سے زیادا قلعے تھے، جس میں سے (۵۰) فیصد قلعے وہ تھے جو ان کے اپنے تعمیر کرائے ہوئے تھے۔ آٹھ وزیروں پر مشتمل ان کی ایک صلاح کار کونسل تھی جسے اشٹ پردھان کا نام دیا گیا تھا۔

نظریات کی ہمہ گیری

شواجی کی مذہبی پالیسی بہت فراخدلانا تھی۔ وہ تمام مذاہب اور عقاید کا احترام کرتے تھے، انہوں نے مقدس مقامات کی دیکھ بھال کے لیے بہت سے اوقاف قایم کیے تھے۔

سنت رام داس ان کے روحانی گورو تھے۔ ایک قصا یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شواجی نے اپنے گورو کے پیروں پر ایک دستاویز رکھی جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ انہوں نے اپنا تمام سلطنت ان کے نام ہبا کر دی ہے۔ اس پر ان کے گورو نے یہ ہبانامہ لوٹا دیا، اور انہیں حکم دیا کہ وہ سنیاس نہ لیں، بلکے عوام کے خادم بن کر حکومت کریں۔ اس واقعے سے شواجی کے مذہبی رجحان کا پتا چلتا ہے۔ شواجی کو ہر شخص کے کردار کو پرکھنے میں کمال حاصل تھا۔ رجھ

پہلی ہی نظر میں بھانپ لیتے تھے، اور اس طرح ہر آدمی کو صلاحیت کے مطابق کام تفویض کرتے تھے۔ ان کے نامبین نے جس کامیابی سے ان کے احکامات پر عمل درآمد کرایا وہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آدمی کی پرکھ میں کس درجہ کمال رکھتے تھے۔

شواجی عالا اخلاق کے مالک تھے، ان کے نظریات بلند تھے۔ ان میں تنظیم کی زبردست صلاحیت تھی۔ وہ اپنی اندرونی بصیرت سے اندازا کر لیتے تھے کہ کون سی باتیں قابل عمل ہیں اور فیصلے کی یہی صورت ان کی کامیابی کا راز تھی۔ ان کی شخصیت فکر و عمل کے ایک نادر امتزاج کا نمونہ ہے۔ وہ کسی مخصوص علاقے کے ہیرو نہیں ہیں، بلکہ وہ پوری قوم کے ہیرو ہیں۔

غزل

جابر ایازی

غم نے یہ اہتمام کیا ہے کبھی کبھی
چپ رہ کے بھی کلام کیا ہے کبھی کبھی
توبہ کو غرقِ جام کیا ہے کبھی کبھی
فطرت کا احترام کیا ہے کبھی کبھی
دنیائے عقل و ہوش کی سرگرمیوں میں بھی
اہلِ جنوں نے نام کیا ہے کبھی کبھی
وہ آئیں گے وہ آتے ہیں اور لو وہ آ گئے
یہ بھی خیال خام کیا ہے کبھی کبھی
اظہار بندگی کے ہیں انداز سیکڑوں
نظروں سے بھی سلام کیا ہے کبھی کبھی
تارِ نفس بھی توڑ دوں پھندوں کے ساتھ ساتھ
یہ قصد زیرِ دام کیا ہے کبھی کبھی
اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گئے
قصہ یونہی تمام کیا ہے کبھی کبھی
پھرتا رہا ہے آنکھ میں ہنگام صبح شوق
یوں انتظار شام کیا ہے کبھی کبھی

افسوس گاہ گاہ انہیں بھی ہوا تو ہے
ناکامیوں نے کام کیا ہے کبھی کبھی
اے جرمِ عرض حال کے انداز دیکھئے
آنکھوں نے بھی کلام کیا ہے کبھی کبھی

محبوب راہی

قدم بڑھاؤ ساتھیو

قدم بڑھاؤ ساتھیو، قدم بڑھاؤ ساتھیو
وطن کی عظمتوں کے آج گیت گاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

بڑھے گا جس قدر دلوں میں پیار اپنے دیس کا
بڑھے گا اس قدر ہی پھر وقار اپنے دیس کا
دلوں میں سب کے پیار دیس کا جگاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

زمانہ جانتا ہے ہمیں وطن سے کتنا پیار ہے
وطن کے واسطے ہماری جان بھی نثار ہے
وطن کی راہ میں یہ زندگی لٹاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

وطن کی زندگی میں ہم ہیں وطن کی جان ہیں
وطن کی شان ہم ہیں وطن کی آن بان ہیں
کبھی یہ بات اپنے دل سے مت بھلاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

بتاؤ کیا ہے فائدہ وطن کا اتحاد میں
کہ سب کا ہے مفاد اپنے دیس کی مفاد میں
سبھی کو اتحاد کا سبق سکھاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

محبت اور پیار سے زمانہ بھر کو جیت لو
دلوں پہ سب کے اک وفاؤں کا تہ نقش ہو
سبھی کو اک خلوص سے گلے لگاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

وسیم بانو قدوائی

موتی کی پہچان

روبینا نے جب سے ہوش سنبھالا ہر ایک کی زبان پر اپنی بدصورتی کے چرچے ہی سنے ہمیشہ یہی آواز اس کے کان میں پڑی کہ یہ تو تہمینا اور زرینا کی بہن لگتی نہیں - کئی من چلوں نے تو اس کی امی سے یہ بھی پوچھ لیا "کیا درحقیقت یہ آپ ہی کی لڑکی ہے؟" اکثر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنی اور تہمینا زرینا کی صورتوں کا موازنہ کرتی اور اپنا عکس دیکھ کر کڑھ جاتی - سچ مچ وہ دونوں اس کے مقابلے میں چاند کا ٹکڑا لگتی تھیں، اور وہ خود کالی کلوٹی - گھونگھریالے موٹے موٹے بال سر پر منڈھے ہوئے پیوند لگا اسی کھال ہڈیوں پر چپٹی ہوئی - وہ جھجک کر آئینے کے سامنے سے ہٹ جاتی کہ کہیں کوئی دیکھ کر اس کا مذاق نہ اڑانے لگے - یوں بھی وہ ہمیشہ اپنے چچا پھوپی کے لڑکے لڑکیوں اور خود اپنی بہنوں کے مذاق کا نشانہ بنی رہتی تھی جنہوں نے چن چن کر اس کے نام رکھ چھوڑے تھے، نتیجا یہ ہوا کہ جیسے جیسے اس کا شعور بڑھتا گیا وہ زیادہ احساس ہوتی گئی - اس میں احساس کمتری کا مادہ پیدا ہوتا گیا - اس احساس کمتری نے اس کے اور گھر کے افراد کے درمیان فاصلے پیدا کر دیے - وہ سب سے دور رہنے لگی اور تو اور اپنی امی کے رویہ میں بھی اس کو وہ گرم جوشی محسوس نہ ہوئی جو اس کے خیال میں وہ تہمینا اور زرینا کے ساتھ روا رکھتی تھیں - اسے لگتا جیسے امی کی نظروں میں اس کا وجود کھٹکتا ہو، جیسے وہ کسی کے سامنے اسے اپنی بیٹی کہتے ہچکچاتی ہوں -

اس کا اندازا اسے اس طرح ہوا کہ امی کہیں جاتی تو تہمینا اور زرینا کو ساتھ لے جاتیں اور اگر کبھی اس نے جانے کی ضد کی تو نتیجا میں جھڑکی یا مار ملی - اس کی بہنیں اور چچا پھوپی کے بچے انگلش اسکولوں میں تعلیم پا رہے تھے - جب کہ امی نے اسے پاس کے میونسپل اسکول میں داخل کرا دیا تھا - جیسے وہ انگلش اسکول جانے کے لائق نہ ہو - اس قسم کی تفریق اور احساس کمتری کے جذبے نے روبینا کے دل میں نفرت کی آگ سی بھر دی - وہ گھر میں سب سے نفرت کرنے لگی - نتیجے میں اس کی زبان بے حد تلخ اور تیکھی ہوتی گئی - کسی نے اسے چھیڑا یا بات کی اور اس نے ٹکڑا سا توڑ کر ہاتھ پر رکھا - اپنی کڑوی زبان کے سہارے وہ اپنی بدصورتی کا انتقام سب سے لینے پر تل گئی - بات ایسی کرتی کہ سیدھی دل میں جا کر چبھ جائے - اس سے بات کرتے سب گھبرانے لگے تھے - کون اس ننھے بھڑ کے چھتے سے ٹکراتا؟ خاندان کے بڑے لوگ بھی اس کے منھ نہ لگتے - اس خودسر لڑکی کو سب نے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا -

گھر میں کسی سے دلچسپی نہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے کمرے میں گھسی دن بھر کتابوں سے الجھی رہتی قدرت نے صورت کی کمی اس کو ذہانت بخش کر پوری کر دی تھی - اس پر اس کا ہر وقت مطالعہ میں غرق رہنا سونے پر سہاگا ہوا - گھر میں کسی کو پروا نہ تھی کہ وہ کس کلاس میں پڑھ رہی ہے اور کلاس میں کیسی چل رہی ہے - اس کے امی ابو نے نہ کبھی جاننے کی کوشش کی نہ اس نے بتایا، حالانکہ اپنی ذہانت کے باعث وہ ڈبل پرموشن

پاتی رہی اور آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ اپنی بہنوں کو پیچھے چھوڑ گئی۔ گھر میں اس کا پرسان حال اگر کوئی تھا تو اس کی دادی امی تھیں جو اس کے کھانے پینے۔ کپڑے لتے کا خیال رکھتیں ضرورت پڑنے پر پیسہ دھیلا بھی دیتیں اور کسی کی بے جا بات پر اس کی طرف داری میں ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتیں۔ ساتھ ہی اس کو اچھی اچھی نصیحتیں بھی کرتیں۔ رو بینا کو بھی دادی امی سے بہت لگاؤ تھا ان کا ہر کام اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ بغیر ان کے کہے بڑی ذمے داری اور دل چسپی سے انہیں انجام دیتی تھی۔ ان کے آرام تکلیف کا اسے ہر وقت خیال رہتا، حالانکہ گھر کے اور کسی کام سے وہ کوئی مطلب نہ رکھتی تھی۔ دادی امی کی ٹریننگ میں وہ سلائی کڑھائی میں وہ ماہر ہو چکی تھی۔ بعض اوقات تو دادی اماں اس کا کام دیکھ کر حیران رہ جاتیں، مگر وہ ہر کام چھپ کر کرتی۔ گھر میں کسی کو پتا نہ چلتا۔ اس نے دادی امی کو بھی منع کر دیا تھا کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ وہ بری تھی اس لیے بری ہی بنی رہنا چاہتی تھی۔

میٹرک کا فارم بھرتے وقت اس کے ابو کو پتا چلا کہ ان کی وہ بیٹی جس کی پڑھائی لکھائی سے وہ ہمیشہ غافل رہے جس کی بد صورتی اور زبان درازی سے وہ اور سارا خاندان نالاں رہتا ہے۔ اتنی کم عمری میں سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس کی بڑی بہنیں اور چچا زاد بہنیں صفیا رضیا جو عمر میں اس سے کئی سال بڑی تھیں، ساتویں آٹھویں میں پڑھ رہی تھیں۔ اس کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر (جن سے ابو پہلی بار ملے تھے) نے روبی کی بیحد تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "رو بینا ہمارے اسکول سب سے کمسن اور ذہین طالبہ ہے، جس پر سارے اسکول کو فخر ہے۔ اس نے ہر طرح ہمارے اسکول کا نام روشن کیا ہے۔ انہوں نے وہ میڈل، کپ اور سرٹیفکٹ دکھائے جو اسکول کے مقابلوں میں روبی نے جیتے تھے۔ ٹیپ کی ہوئی انگلش کی وہ تقریر سنائی جس کی بنا پر فرسٹ پرائز بڑی سی شیلڈ کی صورت میں ملا تھا۔ ابو حیرت زدہ سے سب کچھ سنتے رہے اب تک جس کی برائیاں سنتے سنتے ان کے کان پک گئے تھے، اس کی اتنی تعریفیں سن کر وہ اچنبھے میں رہ گئے تھے، ان کا سینا فخر سے پھول اٹھا۔ بیٹی کی تقریر سن کر حیرت سے ان کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کس روانی سے بول رہی تھی! اپنے خیالات کا اظہار

کس خوبی سے کر رہی تھی! وہ لڑکی جس نے کبھی ماسٹر سے نہ پڑھا گھر میں کسی سے مدد نہ لی، جسے گھر والے بڑے برے ناموں سے یاد کرتے ہیں اس کی تعریف میں ہیڈ ماسٹر اور سارا اسٹاف رطب اللسان ہے جب کہ گھر میں ہر گھڑی اس پر لعنت کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ صبح کا واقعہ ان کی نظروں میں گھوم گیا۔ ناشتے کی میز پر گھر کے سارے افراد موجود تھے رو بینا جو ناشتا کھانا ہمیشہ کچن میں کرتی تھی، تیار ہو کر اسکول جانے کو اپنے کمرے سے نکلی اور سیدھی ابو کے پاس آکر بولی "ابو مجھے تیس روپے چاہئیں۔"

"روبینا کی امی فوراً تیز آواز میں بولیں! "تیس روپے کس لیے؟" رو بینا نے رکھائی سے کہا "امتحان کی فیس دینا ہے۔ آج آخری تاریخ ہے۔" ان کے بڑے بھائی کے لڑکے نعمان جو انجینئرنگ کالج میں پڑھ رہے تھے اور روبینا کے طرح طرح کے نام رکھتے رہتے تھے، تعجب سے بولے "کیا! میونسپل اسکول میں امتحان کی فیس تیس روپے؟ بھئی۔ تو نہیں کھا گئیں؟ ارے دس پیسے منگوائے ہوں گے؟" روبی برا مان کر تڑ سے بولی "میاں جی معلوم ہوتا ہے خود بھنگ کھاتے رہتے ہیں۔ جب ہی تو چچی جان کے سامنے روز روپیوں کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا جیسا سمجھتے ہیں۔"

اس کی امی نے زور سے جھڑکا "چپ رہ کم بخت زبان روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے! بڑوں کے منھ لگتی ہے! اب جھوٹ بولنا بھی شروع کر دیا ہے! پھر ابو سے بولیں۔ "یہ تو بہت پر پرزے نکال رہی ہے۔ آپ اس کے اسکول جا کر تو معلوم کیجیے کہ اتنے روپے کس لیے منگوائے ہیں۔" زرینا جس سے روبی کا ایک نہ بنتی تھی نعمان کو مخاطب کر کے بولی "اب مزہ آئے گا نومی بھیا، جب ابو کے جانے پر قلعی کھلے گی۔ ہونہہ ہمارے اسکول میں تو امتحان کی فیس زیادہ سے زیادہ پانچ روپے جاتی ہے اور ان کے بھکمنچو اسکول میں تیس روپے! جھوٹ کی بھی حد نہیں۔" اس پر سب نے قہقہے لگائے۔ روبی لال پیلی ہو کر غرائی۔ "میری قلعی کیا کھلے گی۔ اگر کہو تو تم سب کی قلعی کھول دوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم لوگوں کی حرکتیں معلوم نہیں ہونہہ مجھے بھی اپنا جیسا کچھ رکھا ہے کیا جو بھی کرتی ہوں سب کے سامنے۔ جو کہتی ہوں پیٹھ پیچھے نہیں کہتی نہ امی کو اسکول کے فنکشن کا جھانسا دے کر پکچر دیکھنے جاتی ہوں، جیسا تم لوگوں نے پرسوں کیا تم سب نے فلم میں گھوم رہی تھیں نا؟ ابو آپ اسکول ضرور آئیے تاکہ آپ کو سچ پتا

پتا چلے۔ روپے لے کر آیے گا۔ وہ غصے سے بھناتی، پرنم آنکھوں کے ساتھ اسکول چلی آئی تھی۔ کچھ تو بیگم اور اپنی بھابی کے کہنے پر اور کچھ روبی کی صداقت کا امتحان لینے کی غرض سے وہ اسکول آ گئے تھے۔ یہاں غیر متوقع حالات سے دو چار ہونے پر انہیں پہلی بار روبی کی اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ انہیں بے حد پیاری لگی۔ وہ اپنے بے پروائی کے رویا پر شرمندا تھے۔ گھر جا کر جب انہوں نے سب کے سامنے ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ کے تاثرات بیان کیے اور اس کے شاندار کارنامے بیان کرتے ہوئے بتایا کہ روبی کا میٹرک کا فارم بھرا گیا ہے، اور وہ اسی طرح فیس کے روپے دے کر آئے ہیں۔ تو ان کی طرح سب حیرت زدہ رہ گئے۔ دادی امی کا چہرا مسرت سے چمک اٹھا، لیکن باقی لوگوں کے دل پر اوس پڑ گئی۔ سب لڑکے لڑکیاں سحر زدہ سے بیٹھے رہ گئے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ روبی جیسی حقیر لڑکی ان کو یوں نیچا دکھائے گی۔

وقت گزرتا رہا۔ روبی نے اپنی محنت اور لگن سے میٹرک انٹر اور بی۔اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اسکالرشپ حاصل کیے۔ اب وہ انگلش میں ایم اے کر رہی تھی۔ اس دوران تہمینہ، زرینا اور چچی جان کی لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ دسویں سے آگے نہ بڑھ سکی تھیں۔ ان دنوں چچی جان بڑے زور شور سے اپنے بیٹے نعمان کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ نومی انجینیر بن چکے تھے اور بڑی اچھی سروس پر لگ گئے تھے۔ کئی لڑکیاں نومی کو دکھائی گئیں، مگر کچھ نہ کچھ نقص نکال کر انکار کرتے رہے۔

وقت کے ساتھ روبی میں خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی۔ اس کے دل پر سے احساس کمتری اور جلن کڑھن کی جو کیفیت رہتی تھی، اب غایب ہو چکی تھی۔ اب کچھ سوچنے کو وقت ہی نہ بچتا تھا گھر کی بہت سی ذمے داریاں وہ اپنے سر لے چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی سے کوئی خاص مطلب نہ رکھتی تھی۔ کم گو ہمیشا سے تھی۔ اس کا سارا کنبا شروع سے ایک ہی گھر میں رہتا آیا تھا۔ اس کے ابو دو بھائی اور ایک بہن تھے۔ وہ سب اور ان کے بچے اسی گھر میں پروان چڑھے سب میل محبت سے رہتے۔ بس گھر میں کوئی خار تھا وہ روبی۔ حالانکہ اب وہ گھر والوں کے طنز اور چھیڑ چھاڑ کو زیادا تر نظر انداز کر دیتی تھی۔ پھر بھی کسی غلط بات پر اس کا چڑچڑاپن لوٹ آتا تھا اور اس کی زبان زہر اگلنے بغیر نہ رہتی تھی۔ اس کی امی اب اس کی شادی کے لیے فکر مند رہتی تھیں۔ مگر اب تک کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہ آیا تھا وہ جھنجلائی سی رہتیں، کیونکہ دو چار عورتیں اس کو دیکھنے آئیں بھی تو اس کا سانولا رنگ دیکھ کر بغیر بات کیے واپس چلی گئیں۔ اس دن نعمان کے کچھ کہنے پر روبی غصے میں ان سے الجھ پڑی اس پر اس کی امی جل کر بولیں "ایک تو صورت ماشاءاللہ اس پر زبان کی یہ تیزی طراری۔ اگر شادی ہوئی تو دولہا دوسرے ہی دن واپس آ جائے گا۔ دیکھ لینا۔"

سامنے بیٹھی چچی جان مسکرا دیں۔ نومی نے مسخرے پن سے منھ بنا کر اس پر فقرا چست کیا "دیکھیں کس کی شامت نے گھیرا ہے چچی امی جو اس بھڑ کے چھتے کو ڈولے میں بٹھانے کی ہمت کرے گا۔"

روبی جھلس کر بولی "یہاں ارمان کس کو ہے ڈولے میں بیٹھنے کا؟ یہ سب چونچلے آپ لوگوں کو ہی مبارک۔ میرا دو کو کھلا کر کھا سکتی ہوں۔ میاں جی۔ میری فکر میں دبلے نہ ہوں۔" یہ کہہ کر وہ غصے سے بڑبڑاتی وہاں سے چلی گئی۔ نومی مسکرا دیے۔ اس کی امی غصے سے بل کھا کر رہ گئیں۔

ان ہی دنوں ایک ایسا واقعہ جس نے روبی کے دل میں تہلکا مچا دیا۔ وہ اس انقلاب پر حیران رہ گئیں۔ اس دن وہ یونیورسٹی سے واپس آئی تو گھر میں ہنگاما سا تھا۔ کسی کی دعوت کے سلسلے میں بھاگ دوڑ اور تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ حسب دستور بے نیازی سے کچن میں چلی گئی اور چاے بنا کر پینے لگی۔ ماما قیما پیستے ہوئے غصے سے بڑبڑاتی جا رہی تھی اس سے روبی نے اندازا لگایا کہ کسی مجسٹریٹ کی بیگم اور صاحب زادی مدعو ہیں۔ غرض اس کی کچھ میں آ چکی تھی۔ میاں جی کو دکھانے کی غرض سے چچی جان نے ان کو بلایا ہے۔ اس پر جھنجلاہٹ سی سوار ہو گئی۔ امتحان کے زمانے میں یہ ہڑبونگ اسے قطعی پسند نہ تھی۔ اس نے بے زاری سے کتابیں اٹھائیں اور باغ کے اس تنہا گوشے میں جا بیٹھی جہاں وہ سکون سے اسٹڈی کر سکتی تھی۔ اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ آہٹ پر اس نے کتاب پر سے نظر اٹھائی۔ سامنے نومی کھڑے تھے۔ روبی کھردرے لہجے میں ایک دم پوچھ بیٹھی۔ یہاں کیسے؟ سنا آپ نے! آج پھر کسی پری چہرا کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے کو مدعو کیا ہے۔"

نعمان تمسخرانہ انداز سے بولا "میں کیوں مدعو کرتا۔ تو مجھے کسی کو دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ تمہارا چہرا لوگوں کو اپنی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔ امی کا شوق ہے پورا کرتی رہیں۔ اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔"

روبی کے ہونٹوں پر بڑا کڑوا تبسم پھیل گیا اس نے طنز سے "کوئی لڑکی عرش سے اترے گی آپ کے لیے؟ اب ایسے حسین بھی نہیں ہیں آپ!"

نعمان نے سادگی سے جواب دیا "حسین ہونے کا دعوا میں نے کب کیا، روبی۔ یہ ہی پسند کی لڑکی تو عرش سے کب کی اتر چکی۔ امی دفعتاً کو نظر نہ آئے تو دوسری بات ہے، تم دیکھوگی تو مان جاؤگی کہ میری پسند کتنی اعلا ہے۔ ارے! کیا تم رنگ کھانے لگیں! ورنہ تمہارے بال اور اتنے خوب صورت!"

روبی غصے سے کھول گئی۔ "اوہ بس بس جانے دیجیے۔ میرے پاس فضول باتوں کا وقت نہیں مہمان آ گئے ہوں گے آپ کے۔ ان کی تعریف کیجیے تو بات بھی بنے۔"

نعمان ایک لمحے روبی کو دیکھتے رہے، پھر بڑبڑاتے ہوے وہاں سے چل دیے۔ "بات تو کب کی بن چکی منتہٰی البتہ آج ہوگا۔"

روبی ہکا بکا سوچتی رہ گئی ایسی بات کہنے سے میاں جی کا مقصد کیا تھا آخر؟ اس نے غصے سے سر جھٹکا "ارے، مجھے کیا، وہ کچھ بھی بکواس کرتے رہیں۔ میں کیوں اپنا دماغ خراب کروں۔"

اس رات روبی اپنے کمرے سے باہر امی کے لیے دودھ لینے کچن جا رہی تھی۔ چچی جان کے کمرے سے دادی ٹھٹھکی۔ اندر سے چچی جان اور نعمان کے تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں چچی جان بہت غصے میں کہہ رہی تھیں "تم ہوش میں تو ہو نوی۔ مجسٹریٹ کی اتنی اچھی لڑکی کو نظر انداز کر کے اس پر روبی کو ترجیح دے رہے ہو بھلا روبی کا اور تمہارا کیا جوڑ؟ کیا سوچ کر تم نے ایسی بات کہی؟ تم روبی کو جانتے نہیں ہو کیا؟ جب میں نے تہمینا کا رشتا تم سے طے کرنا چاہا تھا تو اس وقت تم کو یہ عذر تھا کہ خاندان میں رشتا نہیں کروں گا حالانکہ تہمینا کتنی پیاری لڑکی تھی وہ مجھے ہمیشہ سے پسند تھی۔ ذرا سی تھی جب ہی میں نے عرفان اور ان کی دلہن سے کہہ دیا تھا کہ اسے اپنی نوی کی دلہن بناؤں گی۔" پھر اس لیے نعمان کی آواز سنی جو کہہ رہے تھے "تہمینا آپ کو پسند تھی۔ مجھے تو نہیں۔ ہاں بہن کی حیثیت سے وہ اچھی لگتی ہے، لیکن روبی کی تو بات ہی الگ ہے۔ میں اس سے رشتا کرنا چاہتا ہوں۔ پھر وہ تہمینا کی بہن ہی تو ہے۔ کیا آپ کو اس سے رشتا کرنے پر اس لیے صرف اعتراض ہے کہ اس کا رنگ گورا نہیں۔ امی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے گورے رنگ سے چڑ ہے مجھے سانولا رنگ پسند ہے اور پھر دیکھا جائے تو روبی جیسی ذہین، سمجھ دار، ہمدرد اور سلیقہ مند لڑکی اپنے خاندان میں ایک بھی نہیں، جب سے اس نے گھر کی ذمے داری سنبھالی ہے، گھر کا حلیہ ہی بدل گیا ہے، آپ کو کیا معلوم کہ اس گھر سے باہر وہ کتنی ہر دل عزیز ہے۔ کوئی تو خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔" روبی سن سی کھڑی رہ گئی۔ میاں جی بول رہے ہیں؟ وہی میاں جی بات بات پر اس سے الجھا کرتے ہیں؟ طرح طرح کے نام رکھ کر عیب گنوا کر جنھیں ان کو سکون ملتا ہے؟ اس نے سوچا مجھے نیچا دکھانے میرا مذاق اڑانے کا پلان ہے۔ یہ بھی ان کا۔ میں اب ایسی بدھو بھی نہیں کہ ان کے جھانسے میں آ جاؤں" اس کا دل چاہا کہ اسی وقت اندر جا کر ان کو کھری کھری سنا دے۔ اس نے غصے سے کانپ کر قدم بڑھایا ہی تھا کہ چچی جان کی طنز بھری آواز سن کر رک گئی۔

"بڑی تعریفیں گنوا رہے ہو اس وقت تو ورنہ تم ہی تو ہمیشہ اس میں ہزاروں کیڑے نکالتے رہے ہو صورت شکل زبان پر، طور طریقوں پر سب پر تم نے نکتے چیں کیے ہیں۔ اب وہ سب برائیاں اچھائیوں میں کیسے بدل گئیں؟ یہ انقلاب کیسے آ گیا تمہارے تمہارے خیالات میں؟"

نعمان جھنجھلا کر بولے "غلط اندازا ہے آپ کا میں نے کبھی اس میں کیڑے نہیں ڈالے کبھی پیٹھ پیچھے اس کو برا نہیں کہا، جو کچھ کہا اس کے منھ پر، صرف اس کو چھیڑنے کے لیے اس کو غصہ دلانے کی خاطر کہا، کیونکہ اس کا غصیلا انداز مجھے اچھا لگتا ہے۔ جب وہ غصے میں باتیں سناتی ہے تو مجھے بڑا مزا آتا ہے۔ صاف

بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے ہمیشہ سے پسند ہے اور پسند رہے گی۔"

چچی جان بپھر کر بولیں۔ "میرا کیا ہے! اگر تم اس جہنم میں کودنے پر آمادہ ہو تو شوق سے کود دو، مگر کان کھول کر سن لو نومی، وہ تم کو کبھی خاطر میں نہ لائے گی وہ ایک بد مزاج لڑکی ہے۔ ابھی تو جذبات کی رو میں نہ تم کو اپنی اور اس کی عمر کا فرق نظر آرہا ہے، نہ صورت شکل کا، نہ اس کا مزاج برا لگ رہا ہے۔ مگر جب سابقہ پڑے گا تو احساس ہوگا۔ تمام زندگی جھیلو گے۔ تم مٹھائی کے تھال میں لات مار کر زہر ہلاہل کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہو پچھتاؤ گے۔"

نعمان نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "اس کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اس لیے اس میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوگئی ہے اور پھر جہاں تک عمر کے فرق کا سوال ہے تو میں ردولی سے دس سال ہی بڑا ہوں۔ یہ ایسا فرق نہیں جو نظر انداز نہ کیا جاسکے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شادی کے بعد ردولی کا مزاج بھی بدل جائیگا میں اسے اتنا پیار دوں گا کہ اس کا غصہ اور تیکھا پن بھاپ کر اڑ جائے گا۔ آپ لوگ ردولی کو سمجھیں نہیں ہیں بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہرحال دھیان سے سن لیجیے۔ اگر میں شادی کروں گا تو صرف ردولی سے، اور میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

ردولی اس سے زیادہ نہ سن سکی۔ دانتوں میں انگلی دبائے ڈگمگاتے قدموں سے کمرے میں آئی۔ نعمان کا یہ روپ اس کی سمجھ سے باہر تھا وہ تذبذب کے عالم میں سوچتی رہی۔ یہ مذاق ہے یا حقیقت؟ نہیں یہ مذاق نہیں ہوسکتا۔ ورنہ چچی جان اتنی چراغ پا کیوں ہوتیں؟ تو کیا حقیقت میں میاں جی مجھے اچھا سمجھتے ہیں؟ میری خاطر وہ گھر چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ اس کے دل میں مسرت کی لہر سی جاگ اٹھی۔ وہ ساری جان سے کانپ گئی اور بستر پر اوندھے منہ جا گری میں بھی کتنی نادان ہوں۔ میں صحیح اور غلط میں تفریق نہ کر سکی۔ میاں جی میری نفسیات سمجھ گئے کہ میری اس تلخی کا سبب پیار کی پیاس ہے۔ انہوں نے یہ بھی سچ کہا کہ جب بھی ان کے چھیڑنے پر میں نے غصے میں ان کو باتیں سنائیں تو مسکراتے ہی رہے مجھے ان کی وہ ہنسی اور مسکراہٹ زہر لگتی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ان کی محبت کا نیا انداز ہے۔

خیالات کے تانے بانے میں الجھی ہوئی وہ تمام رات نہ سو سکی۔

دوسری صبح روبینا یونیورسٹی کی جانب سے ایک ہفتے کے لیے ٹور پر نکل گئی۔ کہنے کو تو وہ ایک ہفتے کے لیے گئی تھی مگر پروگرام کی تبدیلی کی وجہ وہ ایک ہفتہ زیادہ لیٹ ہوگئی تھی جس کی اطلاع اس نے گھر پر کر دی تھی۔ جب وہ واپس آئی تو گھر میں خاصی چہل پہل تھی سب شادی شدہ بہنیں اپنے شوہر والوں اور بچوں کے ساتھ گھر میں موجود تھیں۔ گھر شادی کا گھر لگ رہا تھا۔ سب نے اسے ہاتوں ہات لے لیا۔ ان لوگوں کے اس انوکھے رویے سے وہ حیران سی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تھی کہ دادی امی کا بلاوا آگیا۔ انہوں نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد معنی خیز انداز سے بولیں "تم کو پتا ہے روا کہ اپنے سارے پوتوں پوتیوں میں تم اور نومی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔ نومی بے حد لائق لڑکا ہے۔ اس نے خوبصورت سے خوبصورت لڑکیوں کو ٹھکرا کر تم کو اپنانے کی ضد کی اور اپنی ضد منوا کر چھوڑی۔ تم کو راضی کرنے کی ذمہ داری اس نے مجھ پر چھوڑ دی اس لیے تمہاری طرف سے میں نے رضامندی دے دی کیونکہ مجھے تم پر پورا اعتماد تھا کہ تم میری بات نہ ٹالوگی۔ ٹھیک کیا نا میں نے بس آج تمہاری منگنی ہے۔ نومی نے اسی خوشی میں سب کو جمع کر لیا ہے۔"

دادی ماں کی بات سن کر ردولی کے دل میں مسرت کی جھنکار سی جاگ اٹھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دادی کو دیکھا۔ پھر شرما کر نظر جھکا لی۔ یہی اس کا اقرار تھا اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ ابھر آئی۔ دادی امی اسے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ کیا یہ وہی ہے جسے سب بدصورت کہتے ہیں اس کے چہرے پر کتنا نور ہے! کتنی دلکشی ہے! ایسا نور تو دلہن کر تہمینا اور نور ینا کے چہرے پر بھی نہ تھا۔ نومی کا انتخاب کتنا عالی ہے۔

روبی دادی امی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی - دادی پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھیں - اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا - اس کی کائنات بھری زندگی میں ایک نئی صبح جنم لے رہی تھی - سہانی پرنور صبح -

عزیز احمد جلیلی عزیز

غزل

کس قدر میں ہوں بے آرام تمہیں کیا معلوم
کیسے کٹتی ہے مری شام تمہیں کیا معلوم

تم نہیں ہو تو نہیں کوئی مزہ پینے کا
لب تک آتے نہیں اب جام تمہیں کیا معلوم

جب پکارا میں تمہیں دل سے جواب آیا ہے
کام آیا دل ناکام تمہیں کیا معلوم

زخم ہی زخم نظر آتے ہیں اب تو دل میں
یہ وفاؤں کا ہے انعام تمہیں کیا معلوم

بال الجھے ہوئے ویران نظر حال تباہ
لوگ دینے لگے الزام تمہیں کیا معلوم

آنکھیں بھر آتی ہیں جب ذکر تمہارا آیا
میری الفت کا یہ انجام تمہیں کیا معلوم

مسکایا جو میں فریاد زباں سے نکلی
کس پہ آتا ہے یہ الزام تمہیں کیا معلوم

دیکھو بھولے سے بھی لینا نہ کہیں نام عزیز
وہ ہے اک شاعر بدنام تمہیں کیا معلوم

انجم باروی (مٹیابرج)

فکر و عمل

ہمارے باغباں ہنس کر یہی ارشاد کرتے ہیں
چلے جاؤ گلستاں سے تمہیں آزاد کرتے ہیں

شکایت کیا کروں ان کی نوشتہ ہے قسمت کا
نہیں وہ بھول بیٹھے ہیں جنہیں ہم یاد کرتے ہیں

لبوں کی مہر الفت نے بنایا رازداں ہم کو
زباں رکھتے ہوئے بھی ہم کہاں فریاد کرتے ہیں

وفاؤں کا صلہ ہم کو ملا ہے اہل گلشن سے
کبھی تو قید کرتے ہیں کبھی آزاد کرتے ہیں

زمانہ کوہکن کا نام تک بھی تو نہیں لیتا
وہ اک ہم ہیں کہ ذکر تیشہ و فرہاد کرتے ہیں

بہت آرام سے محلوں میں رہتے ہیں خدا والے
قناعت کا سبق دے کر ہمیں برباد کرتے ہیں

کبھی وہ کامراں دنیا میں ہو سکتے نہیں انجم
جو اپنی قوت فکر و عمل برباد کرتے ہیں

بڑے آدمیوں کے خطوط ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے نام

امرداد ۱۳۵۰ف مطابق جون ۱۹۴۱ء میں ہم نے "ہندستانی ادب" کا پہلا نمبر شایع کیا تھا۔ اس رسالے کے پہلے نمبر کی اشاعت سے پہلے ہم نے غیر منقسم ہندستان کے مشاہیر کے نام خطوط لکھے تھے کہ وہ اس رسالے کے پہلے نمبر کے لیے اپنے پیامات روانہ فرمائیں۔ ان میں سے صرف چند ایک حضرات نے اپنے پیامات روانہ فرمائے، تھے جو آگے چل کر شایع کیے جائیں گے۔ ان خطوط سے پہلے ہم نواب میر عثمان علی خان کا دعوت نامہ شایع کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۳ء مسلسل چھ سال تک ہم رکن بلدیا، یا میونسپل کونسلر تھے۔ اس زمانے میں ارکان بلدیا کے نام تمام سرکاری تقاریب کے دعوت نامے آیا کرتے تھے، اور ہر سال حضور عثمان علی خان کی سالگرہ کا دعوت نامہ بھی ارکان بلدیا کے نام آیا کرتا تھا، جن پر ان کا نام نہیں ہوتا تھا، چنانچہ نیچے کے دعوت نامے میں بھی ان کا نام نہیں ہے۔ یہ دعوت نامہ نواب مکرم جاہ بہادر کی بسم اللہ کے سلسلے میں تھا، حالانکہ یہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے نام کوئی خط نہیں ہے، مگر عوام کی معلومات کی غرض سے کہ حضور نظام کے دعوت ناموں کا کیا رنگ ڈھنگ ہوتا تھا، نیچے سب سے پہلے یہ دعوت نامہ پیش کیا جا رہا ہے، جو یقیناً عوام کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوگا۔

دعوت نامہ نواب میر عثمان علی خان حضور نظام

بتقریب تسمیہ خوانی

نواب مکرم جاہ بہادر طول عمرہٗ

طعام منلائی و پیشکشی نذر عید الاضحیٰ

تاریخ ۱۴ ذی الحجۃ الحرام ۱۳۵۶ھ یوم شنبہ وقت مغرب ۔ مقام جوبلی ہال باغ عامہ (منلائی ڈریس)

لفٹنٹ سید مظفر الدین صاحب مرحوم، سابق مہتمم پولیس پائیگاہ آسمان جاہ حیدرآباد

حضور نظام کے اوپر کے دعوت نامے کے بعد ہمیں اصولاً چاہیے تو یہ تھا کہ ہم سب سے پہلے وہ پیامات پیش کرتے جو رسالے کے سلسلے میں آئے تھے، لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ ہم ان اہم پیامات سے پہلے اپنے محترم اور قابل قدر چچا لفٹنٹ سید مظفر الدین صاحب کے وہ (۱۰) خطوط پیش کر رہے ہیں، جو ہمارے لیے سرمایۂ حیات کے برابر ہیں۔ لفٹنٹ صاحب ہمارے والد محترم رازدار خان صاحب بوزئی کے نہایت ہی پر خلوص اور گہرے دوست تھے۔ ان کا ذکر ہم نے "رازدار خان بوزئی نمبر" میں "رازدار خان بوزئی کے نورتن" میں کیا ہے۔ ہمارے والد محترم کے انتقال کا مظفر الدین صاحب پر بہت گہرا اثر ہوا تھا، اور تادم زیست انہوں نے اس غم کو بھلایا نہیں تھا

ہم سب بھائی انہیں چچا کہتے تھے، اور ہمارے سب سے چھوٹے بھائی سلیم خان صاحب مرحوم چچا صاحب کے گھر اکثر جایا کرتے تھے۔ چچا صاحب پہلے نظام کی فوج میں لفٹنٹ تھے۔ وظیفے کے بعد پائیگاہ آسمان جاہ میں مہتمم پولیس ہو گئے تھے، چنانچہ چچا مظفر الدین صاحب ہی کی کوششوں سے پائیگاہ آسمان جاہی سے سلیم خان صاحب کے نام کئی ایکڑ زمین پٹا دی گئی تھی، اور اس زمین پر سلیم خان صاحب مرحوم کا بڑا باغ اور بنگلا ہے، جس کا نام "سعادت ولا" ہے اور آجکل "ہندستانی ادب" کا دفتر اسی "سعادت ولا" میں ہے۔ اسی زمین پر سلیم نگر کالونی تعمیر (ام) کی ہے۔

چچا مظفر الدین صاحب کا تعلق اثنا عشری یا شیعہ فرقے سے تھا، اور ہمارے والد محترم راز دار خان صاحب یزدانی کا تعلق فرقۂ مہدویہ سے تھا، مگر ان دونوں کے بے لوث تعلقات نے فرقہ واریت کی خلیج پاٹ دی تھی، اور وہ دونوں "من تو شدم تو من شدی" کے مصداق ہو کر رہ گئے تھے جس کا ثبوت دونوں نے آخر وقت تک دیا، اور والد راز دار خان صاحب کے مرنے کے بعد ہمارے عزیز ترین چچا مظفر الدین صاحب نے اپنے بھتیجوں کو ہرگز ہرگز نہیں بھلایا، چنانچہ نیچے دیے گئے (۱۰) خطوط کے ہر ہر لفظ سے تو ہی محبت اور شفقت ٹپکتی ہے۔

چچا مظفر الدین صاحب پائیگاہ میں مہتمم پولیس تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے ماتحت کیا راسب انسپکٹروں کے سالانہ چندے منی آرڈر کے ذریعے بھجوائے۔ ہم نے خود چندے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور یہ لکھا کہ چچا صاحب! گستاخی معاف! یہ خریدار آپ کے ماتحت ہیں، اس لیے انہوں نے آپ کو خوش کرنے کے لیے خریداری منظور کی ہے، اور یہ ان کی راضی خوشی اور اپنی خوشی کی خریداری نہیں ہے، اس لیے ہمیں ان گیارہ چندوں کی رقم قبول کرنے میں تامل ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے پدرانہ شفقت اور بزرگانہ خلوص و محبت سے ہمیں لکھا تھا ہی، اور اپنے دیرینہ تجربوں کی بنا پر مشورہ بھی دیا کہ تم کیا جانو کہ یہ چندے ان کی خوشی سے نہیں آئے ہیں، اور تجارتی نقطۂ نظر سے رسالہ جاری کرنے کے بعد چندوں کی رقم کو ٹھکرا دینا سراسر عقلمندی کے خلاف ہے، اس لیے میں تمہاری بھلائی بہتری کی خاطر تمہیں یہ مفید مشورہ دیتا ہوں کہ تم میرے بھجوائے گئے تمام چندوں کی رقم کو قبول کر لو، اور تمہارے رسالے کو پروان چڑھانے کے لیے میں اور بھی خریدار بناؤں گا، چنانچہ ہم نے اپنے باپ جیسے محترم چچا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، اور وہ چندے قبول کر لیے، اور ہمارے چچا صاحب رسالے کی توسیع اشاعت میں ہر وقت کوشاں رہے!

لطیف النساء، ام۔ اے (عثمانیا) ہمارے چچا لفٹنٹ سید مظفر الدین صاحب کی لڑکی تھیں۔ وہ ایک اچھی مضمون نگار بھی تھیں۔ ہمارے چچا صاحب ہی کی ہدایت پر انہوں نے "ہندستانی ادب" میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس رسالے کے ابتدائی نمبروں میں ان کے کئی ایک مضامین چھپے تھے۔ "ہندستانی ادب" کے ان مضمون میں، ہمارے چچا لفٹنٹ سید مظفر الدین صاحب کو یہ "**خصوصی اعزاز**" دے کر ہم نے حقیقی معنی میں مرحوم کے بھتیجے ہونے کا ثبوت دیا ہے!

خط نمبر ۱ ۔ بشیرآباد ۔ ۱۱ اسفندار ۱۳۵۰ف ۔ عزیزم ۔ خدا سے امید ہے کہ تم مع والدہ و برادران بخیر و عافیت ہوں گے۔ تمہارا محبت نامہ پہنچا اور مکرر تم سے نہ ملنے کی مایوسی کے درد کو تازہ کیا۔ مجھے خود بھی تم سے ملنے اور دیکھنے کا اشتیاق ہے کیونکہ جب میں تمکو دیکھا تھا تمہارے بچپنے کا زمانہ تھا اب ماشاءاللہ تم جوان ہونے کے علاوہ ایک قابل و لائق سپوت ہو گئے ہو جو ملک و ملت کے لیے قابل فخر ہے۔ کاش تم مع بھی سید محمد اشرف صاحب دو چار روز کے لیے یہاں آ جاتے اور میری آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتے۔ آجکل البتہ تمہارا آنا مناسب نہیں کیونکہ یہاں طاعون کی گرم بازاری ہے اور میں بیرون آبادی ڈیرے میں مقیم ہوں۔ تمہاری والدہ کی خدمت میں میرا سلام و مزاج پرسی۔ تمہارے بھائیوں کو سلام و دعا پہنچا دو۔ بھی سید محمد اشرف صاحب کو سلام رسان اور مزاج پرساں ہوں۔ خدا حافظ۔ تمہارا ابھی خواہ ۔ سید مظفر الدین ۔

خط نمبر (۲) بشیر اباد ۱۲ر فروردی سنہ ۱۳۸۲ ف - عزیزم - تمہارا خط پہنچا شکر و مسرور کیا مسرت اس لیے کہ تمہاری توجہ ایک مفید کام کی طرف منعطف ہوئی ہے - جب رسالا جاری ہو جائے تو پہلا پرچا دینی کے ذریعہ ایک سال کے چندے کے مطابیے کے ساتھ میرے نام روانا کردو - آجکل لطیف النسا مجالس کی وجہ سے بید معروف ہے - ربیع الاول میں وہ فارغ ہو گی اور غالباً اس مہینے میں میں بلدا آؤنگا اور بالمشافا اس سے کہونگا - بیشک وہ تمہاری بہن ہے اور اس کا فرض ہوگا کہ حتی الوسع اس پرچے کو کامیاب بنانے میں تمہارا ہات بٹھائے اور ہر گونا امداد سے دریغ نہ کرے - مجھ سے بھی جہاں تک ممکن ہو از دیاد خریداری میں کوشش کرونگا - اس پرچے میں ایک بات کو ضرور مدنظر رکھو - افسانے حتی الوسع کم ہوں اور جو ہوں معیاری افسانا نویسی پر پورے اترتے ہوں - رطب و یابس سے اگر بھر دیا جائے تو کامیابی مشکل ہوگی - جہاں تک ممکن ہو ٹھوس اور مفید مضامین درج ہوا کریں - ہمشیرا عزیز اکو سلام پہنچا دینا اور مزاج پوچھنا تمہارے بھائیوں کو بھی سلام رسان اور مزاج رساں ہوں خدا حافظ - سید مظفر الدین -

خط نمبر (۳) - بشیر اباد - ۲۳ر فروردی سنہ ۱۳۵۰ ف - عزیزم ابھی تمہارا خط پہنچا - میں نے تو تم سے وعدا کیا ہے کہ تمہاری امداد میں کوئی کوتاہی نہ کیجائے گی - لطیف النسا نے نوجوان لڑکیوں کا ایک جتھا قایم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جہاں مجلس ہو اور امداد طلب کیجائے تو وہاں جاکر انتظام کیا جائے - وہ رات کے دس گیارا بجے تک معروف رہتی ہے اور اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مکان ٹولی چوکی سے وہ عارضی طور پر میرے مرحوم داماد سید علی رضا کے مکان میں نہایت مختصر سامان کے ساتھ جاکر مقیم ہوئی ہے - میں بلدا حال میں آیا تھا یعنے ایک ہفتا قبل اور میں نے اس کو آنے کی تاریخ سے اطلاع بھی دی تھی، لیکن اس کو اس قدر فرصت نہیں ہوئی کہ وہ آکر مجھ سے ملتی - اپنی معروفیتوں کا عذر کر کے معافی کی خواستگار ہوئی تھی - باوجود اسکے میں اس کو پرزور الفاظ میں ابھی لکھتا ہوں جو جواب آیگا اس سے اطلاع دونگا - میری مضمون نگاری کی نسبت تم میرے خطوط سے اندازا کر سکتے ہو کہ میری اردو اس قابل نہیں ہے جو پبلک اور قابل لوگوں کے ملاحظے میں پیش ہوسکے - اس کی وجہ یہ ہے کہ میری تعلیم بمبئی میں ہوئی اور (۲۰) برس کی عمر میں میں حیدراباد آیا - اس وقت میں زبان اردو سے بلکل نابلد تھا اور جو کچھ اردو آتی ہے وہ مضحکا خیز ہے جس پر لوگ خندا زن ہوتے ہیں - جو کچھ اس وقت اردو مجھے آتی ہے وہ محض مطالعا کا نتیجا ہے میں نے اردو کسی سے نہیں پڑھی البتا میں تم کو خریداروں کی افزایش میں مدد دے سکتا ہوں - میری تو یہ رائے ہے کہ جب تک تم تین مہینے کے لیے کافی مواد فراہم نہ کرو پرچے کی اجرائی کو ملتوی رکھو - جب مصمم ارادا کیا ہے تو پھر اس میں دفعتا ہونا چاہیے اس کی عمر چند روزا ہو کر تما ہوتا افسوسناک ہوگا - مجھ سے تم جس طرح کی مدد چاہو ہرگز اسکے اظہار میں پس و پیش نہ کرو - تمہارے اس عزم کو استقلال ہونا چاہیے بیدل اور مایوس نہو جاو - خدا اپنے فضل و کرم سے تمہاری امداد کریگا - اب میں لطیف کو خط لکھتا ہوں - خدا حافظ - بھائی کو سلام و مزاج پرسی پہنچا دو اور ان سے عرض کرو کہ میری عمر میں مرحوم ہی مجھے ایک سچے دوست ملے تھے - انکے احسانات و نوازشات محبت و ہمدردی کو فراموش کرنا سخت احسان فراموشی ہوگی - تمہارے بھائیوں کو سلام - سید محمد اشرف صاحب کو سلام رساں اور مزاج پرساں ہوں - سید مظفر الدین -

خط نمبر (۴) - کیمپ نہنلی - ۱۷ر تیر سنہ ۱۳۵۰ ف - عزیزم - تمہارا ایک خط بیس پچیس روز قبل وصول ہوا میں نے اس خط میں ملفوف کر کے لطیف کے پاس روانا کیا - اب تک لطیف نے میرے خط کا جواب نہیں دیا ہے - مجھے اسی کے انتظار میں تمہارے خط کے جواب میں تعویق ہوگئی - کل تمہارا پوسٹ کارڈ وصول ہوا اب میں پھر لطیف کو خط لکھتا ہوں - میری رائے ہے کہ تم ایک مرتبا اسکے نانا پوسف علی سے جاکر انکے مکان پر جو ٹولی چوکی میں واقع ہے ملو - تم کو انکی سرپرستی کے لحاظ سے ان پر کچھ حق بھی ہے وہ ضرور تمہارا

لحاظ کریں گے ۔ مجھے اجازت اجرائی پرچے کی خبر سے بحد مسرت ہوئی اور مبارکباد دینے میں لطیف کے خط کے انتظار کے باعث تعویق ہوئی ۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تم کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے اور اس پرچے کی اشاعت سے تمکو کامیابی نصیب ہو ۔ محمد اشرف صاحب کو سلام رساں ہوں، اور ان سے کہد یجیے کہ جو دوا میں نے آپ کو منگوا کر استعمال کرنے کی رائے دی تھی اس کا نام اور پتا حسب ذیل ہے ۔ اب بھی میری رائے ہے کہ ضرور اس کو منگوا کر آپ آنکھ کی موتیا بند کے لیے استعمال کیجیے ۔ بڑے بڑے لوگ اس کی تعریف کیے ہیں ۔

پرل کلوریم آئی ڈراپ لاہور —— پتا منیجر پرل اینڈ کمپنی ۔ کوٹھی نمبر ۹ ایبٹ روڈ ۔

قیمت اسپیشل پوٹنسی نمبر ۲ ۔ نارمل پوٹنسی بڑی ۱۲ ۔ چھوٹی شیشی ۸

تمہاری والدا محترما معظما کو میرے طرف سے سلام اور مزاج پرسی ۔ خدا حافظ ۔ مجھے تاریخ اشاعت پرچے کی اطلاع نہیں ہے ۔ ضرور معلوم کراو ۔ سید مظفر الدین

خط نمبر (۵) بشیر اباد ۔ ۲۸ ر تیر ۱۳۵۰ف ۔ عزیزم ۔ لطیف کا جواب آیا جو ملفوف ہے ۔ اس سے تم خد اندازا کر سکتے ہو کہ اس کی کس قدر مصروفیت ہے ۔ اس پر بھی وہ تمہارے امداد کے لیے مستعد ہے ۔ میرا سابقا خط اس کو نہیں پہنچا ۔ اب تم خد اس سے راست مراسلت کیا کرو ۔ خدا کرے تمہارا پرچا مقبول ہو جاے اور تمکو کامیابی نصیب ہو ۔ میں تمکو چند خریدار دینے کی کوشش کرونگا ۔ میں نے ہر ایک کو لکھ رہا ہوں کہ جب یہ پرچا وی پی آے تو اس کو وصول کر لیں ۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نفی میں جواب نہیں دیگا ۔ خدا سے امید ہے کہ تم مع ہمشیرا محترما ہمیشے تمہاری والدا بخیر و عافیت ہوں گے ۔ میں الحمد اللہ اچھا ہوں ۔ خدا حافظ ۔ سید محمد اشرف صاحب کو سلام پہنچا کر میرے طرف سے آنکھ کی درستی کی مبارک باد دیجیے ۔ خدا کا شکر ہے ۔ بحد مسرت ہوئی ۔ فی الحال ان لوگوں کے نام آپ وی پی پیلا پرچا بھیجد یجے ۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی واپس نہیں کریگا ۔ میں نے انکو وصول کرنے لکھدیا ہے ۔ لکھدیا ہے کہ پوسٹ کارڈ لکھکر اسمیں لکھد یجے کہ حسب ہدایت پرچا روانا کیا گیا ہے ۔

(۱) جناب سید ولی اللہ حسینی صاحب اول تعلقدار ۔ معین اباد ۔ پائیگاہ عالیجناب نواب معین الدولا بہادر
(۲) عبد الکریم صاحب منتظم کوتوالی
(۳) محمد مہتاب خان صاحب " گندل ضلع گلبرگہ یا معین آباد پائیگاہ
(۴) محمد ابراہیم صاحب " کریم اباد عرف ڈبل گنڈی " "
(۵) قادر حسین صاحب " بشیر اباد پائیگاہ
(۶) محمد اسماعیل صاحب ہیڈ کوارٹر انسپکٹر " " "
(۷) غلام مصطفا صاحب منتظم کوتوالی ظہیر اباد ۔ "
(۸) سید محی الدین صاحب کورٹ انسپکٹر ۔ بشیر اباد
(۹) مولوی فیض الدین صاحب تحصیلدار بشیر اباد
(۱۰) نواب غلام قادر خان صاحب تحصیلدار چیتاپور ۔ پائیگاہ
(۱۱) آغا شیخ باور علی صاحب ناظم عطیات ۔ باور منزل ۔ خیریت اباد ۔ حیدر اباد ۔
(۱۲) سید محمد ہادی صاحب ناظم فزیکل کلچر ۔ سوماجی گوڑا ۔ "

خط نمبر (۶) بشیر اباد ۔ ۹ ر امرداد ۱۳۵۰ف ۔ عزیزم ۔ ابھی "ہندستانی ادب" وصول ہوا ۔ ابھی تک میں اسکو پڑھا نہیں ہے البتا تمہارا ابتدائی مضمون کو دیکھا، اور سر ورق پر جو تم نے میری رائے کا استدعا کی ضرور بعد مطالعا اظہار کرونگا ۔ مجھے تمہارے خط پر تعجب ہوا ۔ جیسے تم چاہتے ہو کہ ہر شخص بلا کسی اثر یا اصرار کے خریدار ہو جاے ۔ میں نے مانا کہ پرچا بے نظیر ہو گا، لیکن بے ذوق اور شوق کی کمی کو کیا کرو گے ۔ مجھے تمہارے اس رائے سے سخت اختلاف ہے ۔ تم اگر پرچا کامیاب بنانا چاہتے ہو (اقتصادی نقطۂ نظر سے) تو تم کو

ضرور اپنے احباب و عزیزوں کے اثر و محبت سے فایدا اٹھانا چاہیے - یہ ایک گونا ہمدردی ہے اور اس لیے قابل قبول۔ آجکل کاغذ و دیگر ضروریات کی گرانی کے باعث مالکان پرچے و اخبارات کے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔ رہبر دکن (اگرچہ) مدراس کا ایک خط میرے نام آیا ہے کہ بوجہ گرانی اخبار کے چندے میں ایک روپیا اضافا کیا جاتا ہے، اور اسکے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے دس ہزار کی رقم کی ضرورت ہے لہذا آپ بھی کچھ امداد کیجیے، تاکہ یہ قومی اخبار بند نہ ہو جاے۔ دیگر پرچے بھی اپنے چندے میں اضافا کیا اور کر رہے ہیں - ایسے زمانے میں تمہارا یہ غیور و استغنا کام نہیں دیگا - میں نے اس خصوص میں اپنے خیالات کا صاف طور پر تمہارے سامنے پیش کیا ہوں پھر تمہاری مرضی - تم نے لطیف النسا کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ استنباط کیا کہ وہ اپنی معروفیت کا اظہار کر کے تمہاری امداد سے پہلو تہی کرنا چاہتی ہے جو کچھ نہیں ہے۔ وہ غریب تو اس روز کی کیفیت اور تھکن کا اظہار کئی ہے - اس بیچاری نے تو لکھا ہے کہ تم اس سے راست خط و کتابت کریں - اس نے تو مجھ سے وعدا کیا ہے کہ اگر اسکا بھی نام حصا قرار دیا جاے تو اس حصے کی وہ نگرانی کرے گی - سو تم اس سے مدد لینے میں کیوں تامل کر رہے ہو - تم ایک پرچا اس کو بھیجکر لکھدو کہ آیندا وہ اپنے مضامین اسکے لیے روانا کیا کرے یقیناً وہ خوشی سے تمہاری مدد کرے گی اور پرچا کامیاب بنانے میں وافر حصا لیگی - خدا سے امید ہے کہ تم مع الخیر ہو۔ ہمشیرا محترما کو سلام اور تمہارے بھائیوں کو بھی سلام پہنچا دو - خدا حافظ - تمہارا دلی بہی خواہ - سید مظفر الدین -

خط نمبر ۷ بشیر اباد - ۳۱ امرداد ۱۳۵۰ف عزیزم - خدا سے امید ہے کہ تم سب خیریت سے ہونگے۔ میں الحمد اللہ اچھا ہوں - اس سے قبل میں نے ایک خط لکھا تھا مگر اب تک جواب وصول نہ ہونے سے تردد ہونے سے دوسرا خط لکھ رہا ہوں - میں نے سابقا خط میں لکھا تھا کہ پرچے کی مالی کامیابی میں تم کو غیور و مستغنی نہ ہونا چاہیے - دوست احباب و خریدار پیدا کریں اس سے انکار کرنا مناسب نہیں - اگر تم اس طرح استغنا سے کام لوگے تو میں پرچے کی کامیابی کو دشوار سمجھتا ہوں - میں سمجھتا ہوں کہ آج تک کسی ایڈیٹر نے محض اس خیال سے کہ خریدار کسی اثر کے بنا پر شریک ہوے ہیں انکار کیا ہو؟ پس تم کو اس قدر غیور و مستغنی ہونا مناسب نہیں - یہ ایک غلط خیال ہے کہ اگر پرچا اچھا ہو تو خریدار پیدا کر لیتا ہے - بہترین پرچے مثلاً "معارف" محمد سلیم کی ایڈیٹری میں شایع ہوتا تھا۔ "ادیب" الا باد وغیرا چل نہ سکے - ابھی ذوق سلیم اس قدر ترقی نہیں کیا ہے، چنانچہ یہ مثال کافی ہے کہ معمولی پرچوں کے خریدار بمقابلے عالا علمی پرچوں کے زیادا ہیں - مثلاً "مست قلندر" لاہور کو لیجیے - اس وقت نو ہزار سے زاید خریدار ہیں اسکے مقابلے میں "معارف" اعظم گڈھ کے خریدار اسکے نصف بھی نہیں ہیں، حالانکہ علمی نقطۂ نظر سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے - غرض یہ ہے کہ

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم - تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال -

تم نے لطیف النسا سے مدد لینے سے کیوں انکار کیا - وہ غریب تو ہر طرح تم کو امداد دینے رضامند دیتا رہے، وہ میرے خیال میں ادبی نقطۂ نظر سے وہ بہت کچھ تمہاری امداد کر سکتی ہے - میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اس کی اچھی قابلیت ہے اور ادبی ذوق بھی بہت اچھا ہے - اسنے مجھ سے وعدا کیا ہے کہ ہر طرح تم کو مدد کریگی پس تم اس کی امداد سے اعراض نہ کرو - تمہاری والدا صاحبا کو سلام و مزاج پرسی - سید محمد اشرف صاحب کو بھی سلام پہنچا کر مزاج پرسی کرنا - خدا حافظ - تمہارا دلی بہی خواہ - سید مظفر الدین -

خط نمبر ۸ چیتا پور - ۱۷ آبان ۱۳۵۰ف عزیزم - تمہارے دو پوسٹ کارڈ وصول ہوے - شکر ہے کہ نہایت اچھا پرچا نکلا ہے اور اسی طرح تمہاری توجہ رہی تو یقیناً یہ پرچا خدا کی مہربانی سے ضرور کامیاب ہوگا - مجھ سے لطیف نے کہا تھا کہ آذر کے پرچے کے لیے وہ ایک مضمون لکھ رہی ہے معلوم نہیں اب تک تمہارے پاس بھیجی یا نہیں - اگر نہیں بھیجی ہے تو میرے اس خط کے حوالے سے اس سے تقاضا کرو - میں نے جتنے نام تمہارے پاس خریداروں میں شریک کرنے پر بھیجنے کے لیے روانا کیے تھے اگر تم اسکے مطابق عمل کرتے تو مجھے

پڑتا ہے۔ چند صاحبین نے تو مجھے لکھا تھا کہ اب تک پرچا وصول نہیں ہوا۔ میں اپنے حلقے احباب و شناساؤں میں اس کی توسیع کی کوشش کرتا جاؤں گا۔ ہمشیرا محترما کو میرے طرف سے سلام پہنچا دینا۔ سید محمد اشرف صاحب اور تمہارے بھائیوں کو سلام رساں ہوں۔ خدا حافظ تم سب کا۔ سید مظفر الدین۔

خط نمبر ٩ بشیر اباد۔ ١٧ اردے سنہ ١٣٥١ ف۔ عزیزم۔ خدا سے امید ہے کہ تم سب خیر و عافیت سے ہونگے۔ میں الحمد اللہ اچھا ہوں۔ تمہارے پوسٹ کارڈ وصول ہوے، چونکہ میرا خیال تھا کہ حیدر اباد آؤں اس لیے جواب روانہ نہیں کیا، چونکہ اب ارادا کیا ہوں کہ آخر ہفتے دیقعدہ میں وہاں پہنچوں اسکا لیے جواب ادا کر رہا ہوں، تاکہ تم کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ میں بہت کچھ ارادا کرتا ہوں کہ "ہندستانی ادب" کے لیے کچھ لکھوں، لیکن ایسے ناگزیر واقعات پیش آتے ہیں کہ مجبور ہوتا ہوں۔ ایک مضمون قریب ختم ہے، لیکن اختتام کی نوبت نہیں آئی۔ بہر حال کوشش کروں گا۔ سب کو سلام و دعا پہنچے۔ تمہارا دل بھی خواہ۔ سید مظفر الدین۔

خط نمبر ١٠ ۔ بشیر اباد۔ یکم اسفندار سنہ ١٣٥١ ف۔ عزیزم۔ خدا سے امید ہے کہ تم سب خیریت سے ہونگے۔ میں الحمد اللہ اچھا ہوں۔ کل تمہارا خط وصول ہوا۔ شادی میں نہ آنے کا عذر بالکل معقول تھا، ایسی کوئی بات نہیں جس سے مجھے گلا ہو، البتہ تمہارا آنے سے ایک گونہ خاص مسرت ہوئی تھی۔ مجھے اب تک نہ دے کا پرچا وصول ہوا اور نہ بہمن کا اور تمہارے خط سے تو پرچوں کا بھیجنا ظاہر ہوتا ہے۔ بعض دیگر خریداروں کو بھی یہی شکایت ہے کہ بعض پرچے وصول نہیں ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں تمہارے دفتر کی غفلت ہے، ورنہ بشیر اباد میں تو میرا کوئی پرچہ غایب نہیں ہوتا ہے، مگر پھر بھی میں دفتر سے آج منشی صاحب ڈاک خانہ بشیر اباد کو مراسلا لکھ کر گشتی اطلاعات شبا کو دونگا۔ اب تمہارے پرچے کے خریداروں کی تعداد کیا ہے؟ خدا حافظ۔ سید مظفر الدین۔

عبد الرحمان خان صاحب (مرحوم) سابق پرنسپل عثمانیا یونیورسٹی کالج حیدر اباد

ہم عبد الرحمان خان صاحب کے راست شاگرد نہیں تھے، بلکہ بالواسطہ شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے۔ عبد الرحمان خان صاحب عثمانیا یونیورسٹی کالج کے کئی سال تک پرنسپل تھے۔ سنہ ١٩٢٣ء سے سنہ ١٩٣٤ء تک ہمیں ان کے دور صدارت میں مجلہ عثمانیا کے منیجنگ ایڈیٹر اور صدر انجمن اتحاد طلبا ے جامعہ عثمانیا ہونے کا دوہرا فخر حاصل رہا ہے۔ ان دونوں حیثیتوں میں ہم ہزاروں طلبا ے جامعہ عثمانیا کے واحد نمائندا تھے۔ اس لحاظ سے کئی سال تک صدر صاحب مرحوم سے قریب تر رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہم نے اپنا علمی ادبی ماہوار رسالا " ہندستانی ادب " جاری کیا تو صاحب موصوف سے مضامین کی درخواست کی تھی جس کے خطوط اسی سلسلے کی کڑی ہیں، جو اس وقت تبرک کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

خط نمبر ١ ۔ ٣ بیگم پیٹ۔ دکن۔ ١٠ اردی بہشت سنہ ١٣٥٠ ف۔ عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم۔ آپ کا مفصل بیان در بارۂ پالیسی و اغراض اجرائی " ہندستانی ادب " بغور پڑھا گیا۔ ایسے کام بہت اور ریاضت سے بیشک چلائے جا سکتے ہیں، لیکن پہلے سب امور سوچ لیے جانے چاہییں۔ مضمون نویس بہت ہیں، لیکن مضمون مانگنے والوں کی تعداد ان سے بھی زیادا ہے۔ معہذا جس قسم کے COMMON (عام فہم) مضامین آپ چاہتے ہیں اپنے مصنف و مولف نوجوان طالب علموں کے طبقے سے زیادا فراہم ہو سکتے ہیں۔ مجھ جیسے شخص سے جو اپنی عمر کا آخری دور انتہائی اہم اور سخت مشکل کاموں کی تکمیل کے لیے وقف کر رہا ہے مضامین کی توقع مناسب نہیں۔ اگر آپ کو بیگم پیٹ تک آنے میں دشوار نہ ہو تو جمعہ کے روز کوشش ملاقات کی ... صاحب سے مل کر شام کا کوئی وقت مقرر کریں اور مجھکو اطلاع دیجئے میں کانفرنس کے روز میں آ جاؤنگا اور آپ سے گفتگو کروں گا۔ فقط۔ محمد عبد الرحمان خان۔

خط نمبر ۲

بیگم پیٹ - دکن - ۱۰ ار اردی بہشت ۱۳۵۱ ف

عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ -

آپ کا خط مورخہ ۶ ار اردی بہشت پہنچکر عرصا ہوا - جواب اسلیے نہ دے سکا کہ اندنوں طرح طرح کے کام پریشان کر رہے ہیں - امتحانات کی فیس، فوراً ادا کرنی ہے - پٹرول نہ ملنے سے کرایے کی گاڑیاں بھی مفقود ہو گئیں - اخراجات ایسے بڑھ گئے ہیں کہ سوا ضروری چیزوں کے دوسروں کی طرف دیکھنا بھی ناممکن ہو گیا ہے - ایسی حالت میں اپنے معاشی صدارتی خطبے کے ساتھ تصویر پر تیس روپے خرچ کرنا میرے لیے نامناسب معلوم ہوتا ہے - امید کہ مجھکو معاف فرمایا جائے گا - اس سے قبل آپ نے اپنے رسالے میں میری ایک تصویر شایع کی ہے وہی بس ہے - بار بار تصویر چھاپنا اچھا نہیں معلوم ہوتا فقط

مخلص

محمد عبد الرحمان خان

خط نمبر ۳

بیگم پیٹ - دکن - (بتوسط ڈاکخانہ خیریت آباد) ۱۴ ار فروری ۱۹۴۱ء

عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ -

آپ کا خط محرم الحرام کی تعطیل میں وصول ہوا - خدا آپ کو آپ کے ادبی ماہوار مجلے کی اجرائی میں ہر طرح کامیابی عطا فرمائے - شاید نام کے متعلق "ہندستانی ادب" کچھ چہ می گوئیاں ہونگی - خصوصاً جبکہ ادارہ ادبیات اردو بڑے عزم سے ایک عرصے سے کام کر رہا ہے - خیر ان معاملات کے متعلق آپ بہتر معلومات رکھتے ہونگے - آپ نے مجھ سے کچھ مضمون بھیجنے کی خواہش کی ہے - میں بڑی خوشی سے بھیجتا، لیکن ٹھوس سائنٹیفک کاموں سے بہت کم فرصت ملرہی "Muslim Contribution to Science and culture" اور علم ہیئت پر تحقیقات، مشاہداتی کام اجازت نہیں دیتے کہ کوئی نئے کام اپنے ذمے لوں - بریں ہمہ کبھی خفیف سی فرصت مل جائے گی کچھ علمی باتیں آپکے مجلے کے لیے بھیج سکوں گا -

سردست چند فارسی اشعار (بشکل مناجات بلحاظ حالات حاضرا)، جو حال ہی میں میں نے کہے تھے اس کے ساتھ بھیجتا ہوں - امید کہ ان کو پڑھکر کم از کم اسلامی دنیا سیدھے رستے پر پھر سے چلنے لگے گی فقط

محمد عبد الرحمان خان

خط نمبر ۴   بیگم پیٹ - دکن - ۱۹ ار خرداد ۱۳۵۲ ف

بخدمت جناب جی - ام - خان صاحب ام - اے (عثمانیہ)

ایڈیٹر ہندستانی ادب - اعظم پورا حیدرآباد دکن -

جناب من -

"ہندستانی ادب" جلد (۳) نمبر (۷) اپریل ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں آپ نے میرا وہ تقریری مضمون شایع کیا ہے جو میں نے مسٹر سیوا چندرا لیس سی کے ہمراہ آپ کے پاس اس صراحت کے ساتھ بھیجا تھا کہ آپ عنوان "سیاروں پر زندگی امکانات" کے تحت لکھیں گے کہ یہ تقریر نشرگاہ حیدرآباد سے تاریخ ۴ ربہمن ۱۳۵۲ ف (مطابق ۸ ر دسمبر ۱۹۴۲ء) شایع کی گئی، لیکن افسوس ہے کہ آپ نے ایسا نہیں کیا - از روئے معاہدہ مابین مقرر و نشرگاہ ایسا کرنا ضروری ہے - میں امید کرتا ہوں کہ آپ کسی مقامی اخبار (روزانہ) میں اس امر کا علم سے جلد اعلان فرمادیجئے سے ضابطے کی تکمیل ہو جائے گا اور مجکو غیر ضروری مراسلت کا بار نہ اٹھانا پڑے فقط محمد عبد الرحمان خان

خط نمبر ۵ بیگم پیٹ ۔ حیدر آباد دکن ۔ ۲ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ

عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ اسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

فدیعۂ ہذا ایک ریڈیو کی تقریر مرسل ہے ۔ براہ کرم طباعت میں اس امر کا اظہار درج فرمایا جائے کہ یہ تقریر فلاں تاریخ کو نشر کی گئی، اور اب با جازت محکمے نشر لاسلکی شایع اور طبع کی جارہی ہے ۔ براہ کرم اس کی دس کاپیاں علحدہ بھی ارسال کی جائیں ان کی قیمت ادا کر دی جائے گی ۔ امید کہ آپ مع الخیر ہیں فقط مسودا واپس فرمایا جائے، اور پروف بھی بتا دیا جائے ۔

محمد عبد الرحمان خان

خط نمبر ۶ بیگم پیٹ ۔ ۲۷ رمضان مبارک

بخدمت جناب جی ۔ ام ۔ خان صاحب ایڈیٹر "ہندستانی ادب"

ترقیم ہے کہ چار مرتبا آدمی بھیجنے پر کاپیاں آئیں مگر نامکمل صفحے ۲۰ کا کاپیوں میں پتا نہیں چلا ۔ اسی طرح ۲۱ اور ۲۴ بھی ۔ براہ کرم مکمل کر کے بھیجیے ۔ پہلے کی طرح اب بھی مضمون کے عنوان کے نیچے نہیں لکھا گیا کہ یہ تقریر با جازت نشر گاہ سرکار عالی شایع کی جارہی ہے ۔ تاریخ نشر ۲۴ فروری ۱۹۴۳ء ہے ۔ اسکو بھی تحریر فرمایا جائے میں ممنون ہونگا اگر کاپیاں جلد مکمل حالت میں ارسال ہونگی، اور مسودا واپس کیا جایگا فقط

محمد عبد الرحمان خان

جانکی پرشاد صاحب صدر اردو مجلس اردو ہال ۔ حمایت نگر ۔ حیدرآباد ۔ آندھرا پردیش

بخدمت شریف جناب اڈیٹر صاحب "ہندستانی ادب" اعظم پورہ شرقی حیدر آباد ۔ ۲ ۔ ۸ ر مئی ۱۹۶۴ء ۔ مکرمی تسلیم ۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے "پریت کے گیت" جو دراصل ایک مقصدی مشاعرا میں پڑھی گئیں غزلوں کا مجموعا ہے، آپکی خدمت میں روانا کیا جارہا ہے ۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ۱۳ اپریل ۱۹۶۴ء کو مہاراجا سر کشن پرشاد بہادر کی صد سالا سالگرہ کے موقع پر حیدر آباد میں ایک "مقصدی مشاعرہ" منعقد کیا گیا تھا، اور اس مشاعرا کا مقصد "قومی یکجہتی" کا پرچار کرنا تھا ۔ مہاراجا سر کشن پرشاد خود، قومی یکجہتی کے نظریے کے علمبردار تھے ۔ چنانچہ اس مشاعرے کے لیے خود مہاراجا سر کشن پرشاد بہادر کے اس شعر کو قرار دیا گیا ۔ میں ہوں ہندو، میں ہوں مسلمان ۔ ہر مذہب ہے میرا ایمان ۔ اس طرح پر حیدرآباد کے ممتاز شعرا نے غزلیں کہ جواب اس "گلدستے" کی زینت بنی ہوئی ہیں ۔ مشاعرہ کا انتظام حیدرآباد کے ممتاز سماجی مصلح مسٹر وی ۔ کے ۔ ڈھینگے نے کیا تھا، اور ان ہی کی کوششوں کے باعث یہ مشاعرا کامیاب ہوا ۔ موجودا حالات میں "قومی یکجہتی" کے نظریے کو فروغ دینے کی جو ضرورت محسوس کی جارہی ہے اس کا اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، اور "پریت کے گیت" کی غزلیں اس اہم ضرورت کی تکمیل کرتی ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس مجموعے کی تخلیقات کو بے حد پسند فرمائیں گے ۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس مختصر سے مجموعے پر اپنے اخبار میں گرانقدر تبصرا فرمائیں اور اس طرح ہم نے "قومی یکجہتی" کو فروغ دینے کے لیے جو کوشش کی ہے اس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالیں ۔

مجھے امید ہے کہ آپ اپنے اخبار کی کسی اشاعت میں اس مجموعے پر تبصرا فرمائیں گے ۔ مزید زحمت تو ہوگا اگر آپ براہ کرم اپنے اخبار کی وہ کاپی بھی روانہ فرمائیں جس میں یہ تبصرا شایع ہوگا ۔ اس کے لیے میں ممنون ہوں گا

نیازمند

جانکی پرشاد

REGD. NO. H. 16.

HINDUSTANI-ADAB,

SADATH VILLA, 16-11-17, SALEEM NAGAR
COLONY-1, MALAKPET,

HYDERABAD-36, (A.P.),
INDIA.

EDITOR,

G. M. KHAN,

M.A. (OSMAN.)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اقبال کے

ہندی ستارے

سعادت ولا - 17-1-16 سلیم نگر کالونی - 1 - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ - آندھرا پردیش - انڈیا

ایڈیٹر
جی - ام - خان
ام - اے (عثمانیہ)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوزی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۶) جلد (۳۵) نمبر (۴-۵-۶)

اسفندار - فروردی - اردی بہشت ۱۳۸۴ ف جنوری - فروری - مارچ ۱۹۷۵ء

چندہ سالانہ سولہ روپے

ہندستانی ادب

سعادت ولا - ۶-۱۱-۱۷۱ - سلیم نگر کالونی - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ - آندھرا پردیش - انڈیا

ایڈیٹر

جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

جی - ام - خان نے دائرا پریس - چھتہ بازار - حیدرآباد ۲ میں چھپوا کر سعادت ولا، ۱۶-۱۱-۱۷ اسلیم نگر کالونی - ا - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ سے شایع کیا۔

بہتر آں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں   حافظ

ہمارے خیالات

"ہندستانی ادب" اور آوازی اصول!

۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۷۴ء کے روزنامہ اخبار "سیاست" حیدرآباد میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "املانامہ" پر حسن الدین احمد کی تنقید چھپی ہے اور وہ پوری پوری تنقید ہم نیچے نقل کیے دیتے ہیں، اس کے بعد اس سلسلے میں ہم اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔

"انجمن ترقی اردو نے اس وقت جبکہ انجمن کا دفتر اورنگ آباد میں تھا، رسم خط میں اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا اور پھر جب انجمن کا دفتر دلی کو منتقل ہوا تو ایک کمیٹی اصلاح رسم خط بنائی گئی۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے ابتدائی تجاویز پیش کیں، جن پر کمیٹی نے ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء کو غور کیا، اور اپنی سفارشات کو رسالے "ہماری زبان" مورخہ ۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء میں شایع کیا۔ یہ سفارشات ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی مرتبہ تھیں۔ اس کے بعد کل ہند اردو کانفرنس، ناگپور، جنوری سنہ ۱۹۴۴ء میں بھی ان سفارشات ترمیم و اضافے کے ساتھ منظور کیا گیا۔

ریاست حیدرآباد کے مدرسوں میں انجمن ترقی اردو کی مرتبہ کتابیں بطور نصابی کتب منظور کی گئی تھیں۔ ان درسی کتابوں کی طباعت میں پہلے ہی سے انجمن کی متذکرہ سفارشات کا لحاظ رکھا جاتا تھا، اور ان کی ابتدا میں ان تبدیلیوں اور اصلاحات کے بارے میں ایک وضاحتی نوٹ بھی اساتذہ کے استفادے کی غرض سے شامل ہوتا تھا۔

اردو املا میں اصلاح کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اولین خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ موصوف مضامین، تبصروں اور خطوط کے ذریعے اردو زبان میں صحیح املا لکھنے کا پرچار کرتے تھے۔ بلاشبہ ان کی خدمات کو بنیادی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک طویل عرصے کی خاموشی کو ترقی اردو بورڈ نے توڑا۔ اس اہم کام کی جانب توجہ کی، اور املا کمیٹی کی تشکیل کی جس کے صدر ڈاکٹر عابد حسین اور اراکین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں تھے۔ اردو املا پر رشید حسن خاں نے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، جو ترقی اردو بورڈ نے شایع کی ہے۔ املا کمیٹی کی سفارشات کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے زیر نظر کتاب کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب گذشتہ کم و بیش چالیس سال سے اس سلسلے میں جو کام ہوئے ہیں، اور جو تجاویز مختلف گوشوں سے آئی ہیں ان کا نچوڑ ہے۔

یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ اردو میں اصلاح رسم خط کی انفرادی کوشش بھی ہوئی ہیں، مثلاً حیدرآباد کے صحافی جی۔ ام۔ خان نے اپنے ماہانہ رسالے "ہندستانی ادب" کے ذریعے اس کوشش کو کہ اردو رسم خط میں صوتیاتی اصول پر اصلاح کی جائے۔

اس طرح ڈاکٹر جعفر حسن نے بھی اسی انداز پر تجاویز پیش کیں، اور اپنے نام کو جافر ہسن لکھنا شروع کیا۔ ان انفرادی کوششوں کے مقابلے میں ترقی اردو بورڈ کی سفارشات میں باضابطگی پائی جاتی ہے، اور مختلف مشوروں کی بنیاد پر ان سفارشات کو مرتب کیا گیا ہے۔ جو طریقہ حرفوں کے لکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے وہ رسم خط کہلاتا ہے۔ رسم خط کے مطابق صحت کے لکھنے کا نام املا ہے یعنی املا لفظوں میں حرفوں کے استعمال کا نام ہے۔ انجمن ترقی اردو نے جس کام کو اصلاح رسم خط کا نام دیا تھا اسی کو ترقی اردو بورڈ نے املا کی اصلاح کے نام سے آگے بڑھایا ہے، اور نام کی یہ تبدیلی بہت مناسب اور درست ہے کیونکہ جو کام پیش نظر ہے وہ املا کی اصلاح ہے نہ کہ رسم خط کی، اور واقعہ تو یہ ہے کہ رسم خط میں اگر کوئی اصلاح ہو تو وہ دراصل اس کی تبدیلی ہے۔ اصلاح رسم خط سے غلط فہمی پیدا ہونے کا بھی امکان ہے، کیونکہ اردو والے رسم خط میں کسی قسم کی تبدیلی پسند نہیں کرتے۔ اصلاح رسم خط سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ رسم خط کو بدلا جارہا ہے، حالانکہ اصل مقصد

اصلاح املا ہے - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ املا میں اصلاح کیوں کی جائے؟ اس کتاب میں اصلاح کے مقاصد یہ ظاہر کیے گئے ہیں کہ لکھنے میں آسانی فراہم کی جائے - کوئی غلطی راہ پا گئی ہے تو اس کو دور کر کے مسلّما انداز کو واپس لایا جائے، اور یکسانی پیدا کی جائے - یقیناً متذکرا تینوں مقاصد واجبیت رکھتے ہیں، اور اردو املا میں ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اصلاح کرنے کی ضرورت مسلّم ہے، لیکن اصل دشواری عمل آوری کی ہوتی ہے - اس نوعیت کے کاموں میں ضروری ہے کہ ایسے اصولوں کی سفارش کی جائے جو چلن میں آسکیں - انگریزی املا میں اصلاح کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ریاستہائے متحدۂ امریکا میں جزوی اصلاحات نافذ بھی ہوگئیں، لیکن مزید اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی - انگلستان میں جارج برنارڈ شا انفرادی کوششیں نہ صرف رائیگاں گئیں، بلکہ اس مقصد کے ان کے قایم کردا ٹرسٹ کو بھی عدالت سے ناممکن عمل قرار دیا گیا - انگریزی زبان اب اس حد کو پار کر چکی ہے کہ جس کے بعد اصلاحی تجاویز پر عمل آوری مشکل ہے -

ایسا لگتا ہے کہ اردو بھی ان حدود کے آگے نکل چکی ہے - اس کے یہ معنی ہیں کہ اردو میں اصلاح املا کا کام کوئی آسان کام نہیں، لیکن اصلاح تو ضروری ہے - زبان کبھی جامد نہیں رہ سکتی - زندگی کی طرح زبان بھی پیہم رواں اور جواں رہتی ہے - اس میں تبدیلی سے انکار ایک اٹل حقیقت سے انکار ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کے چاہے کسی شعبے میں سہی، محض مشوروں سے تبدیلیاں لانا آسان نہیں جتنا آسان مشورہ دینا ہے - سفارشات پیش کرتے ہوئے عمل آوری کے امکانات کو ذہن میں رکھنا، زبان کے مزاج کو سمجھنا اور سفارشات کو قابل قبول بنانا ضروری ہے - اگر ان پر توجہ کیے بغیر سفارشات کی جائیں تو سعی بیجا، اور محنت رائیگاں جانا ضروری اور ناگزیر ہے - یہ بات موجب طمانیت ہے کہ املا کمیٹی نے اس اہم پہلو کو بھی بطور خاص پیش نظر رکھا ہے، اور اپنی سفارشات کو بڑی حد تک قابل عمل بنایا ہے - ساتھ ہی ساتھ کمیٹی نے املا کے اصولوں کا تعین کرتے ہوئے اردو زبان کی مخصوص لسانی تشکیل کو بھی پیش نظر رکھا ہے، جس کی وجہ سے امید کی جا سکتی ہے کہ یہ اصول بڑی حد تک رائج ہو سکینگے - چند سفارشات البتہ ایسی ہیں کہ جن کو قبول کرنے میں تامل کیا جا سکتا ہے، مثلاً طوطا کے مقابلے میں توتا، غلطاں کے مقابلے میں غلتاں، طمانچا کے مقابلے میں تمانچا اور تھالی کے مقابلے میں تھالی کی سفارش کی گئی ہے، جس کو بڑی حد تک ایک طرفا فیصلا قرار دیا جا سکتا ہے - اسی طرح اعلیٰ - ادنیٰ - حتیٰ - وسطیٰ اور علیحدا کے مقابلے میں اعلا - ادنا - دعوا - حتا کہ - وسطا اور علاحدا کی سفارش کی گئی ہے تو ادنیٰ کو ادنا کیوں لکھا جائے؟ جبکہ ایسا لکھنا غلط بھی نہیں ہے، اور یکسانیت بھی پیدا نہیں ہو رہی ہے - بہرحال ایسے الفاظ پانچ فیصد سے زیادا نہیں ہیں - ان کو چھوڑ کر بعض سفارشات ایسی ہیں جن کو قبول کرنے میں نہ کوئی امر مانع نہیں ہے، بلکہ جلد سے جلد قبول اور رائج کرنا ازبس ضروری ہے -

ڈاکٹر نارنگ نے "ہماری زبان" مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۴ء میں شایع شدا تبصرے پر رائے دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ بعض امور پر اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں غور کیا جائے گا - اگر اس کتاب پر نظر ثانی پیش نظر ہو تو یہ کتاب مختلف اسکالرس کے سامنے رکھ کر ان کے مشورے سے مکمل کر دینا چاہیے، کیونکہ کسی نہ کسی نوبت پر ایسی سفارشات پر "اجماع" لازم ہے، اور ان کو قطعیت دینا ازبس ضروری ہے -

ڈاکٹر نارنگ نے املا کمیٹی کی سفارشات کو نہایت سلیقے اور جامعیت کے ساتھ مرتب کیا ہے - تفصیلی سفارشات کا نہایت خوبی سے احاطا کیا ہے، اور بحیثیت مرتب اپنے فرائض کی تکمیل احسن طریقے پر کی ہے - ایک طرف قدیم روایات اور پچھلے چالیس سال کے کام کو انہوں نے پیش نظر رکھا ہے تو دوسری طرف جدید علم لسانیات سے واقفیت کی بنا پر صوتیاتی تجزیہ سائنٹفک طریقے پر کیا ہے - اس طرح اپنی سفارشات کو آنے والی صدی کے لیے قابل قبول بنایا ہے - انہوں نے ان سفارشات کو اہل اردو کے سامنے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان پر غور کرنا اور ان کو معرض عمل لانا آسان ہو گیا ہے - ڈاکٹر نارنگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کو اس کام سے جسے زبان کی ترقی کے راستے میں ایک سنگ میل کہا جا سکتا ہے وابستہ ہونے کا موقع ملا، اور انہوں نے صلاحیت اور متوازن ذہن کے ساتھ اس اہم کام کی تکمیل کر کے اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے -"

[illegible] سے ظاہر ہے کہ زبان کے بے ڈھنگے پن کو تسلیم کر لیا گیا ہے، اور اس کی اصلاح کے سلسلے

مختلف تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، چنانچہ ہندستانی زبان کے اس بے ڈھنگے پن کو ہم نے آج سے ۴۳ سال پہلے محسوس کیا تھا، اور اس کا واحد حل آوازی یا صوتی اصول یا فونیٹک سسٹم PHONETIC SYSTEM تلاش کر کے پا لیا تھا، چنانچہ اسی وقت سے "ہندستانی ادب" کی لکھائی زبان کے آواز کا اصول پر ہوتی ہے۔ ہمارے اسی زبان کے سائنٹفک آوازی اصول کی طرف اوپر کے تبصرے میں حسن الدین احمد نے اشارا کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں -

"یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ اردو میں اصلاح رسم خط کی انفرادی کوششیں بھی ہوئی ہیں مثلاً حیدر اباد کے صحافی جی۔ ام۔ خان نے اپنے ماہانہ رسالے "ہندستانی ادب" کے ذریعے اس کی کوشش کی کہ اردو رسم خط میں صوتیاتی اصول پر اصلاح کی جائے۔"

پہلے تو حسن الدین کا یہ دعوا غلط ہے کہ اردو کا اپنا کوئی رسم خط ہے۔ اردو یعنی ہندستانی زبان کا رسم خط اصل میں فارسی سے لیا گیا ہے، اور اس کو فارسی رسم خط کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح ہند کا اپنا کوئی رسم خط نہیں ہے، بلکے اس کا رسم خط فارسی سے لیا گیا ہے، اور اس کو ناگری رسم خط کہا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ "ہندستانی ادب" فارسی رسم خط میں چھپتا ہے جس کی لکھائی آوازی اصول پر ہوتی ہے، اور یہ سو فی صد سچ ہے کہ "ہندستانی ادب" ساری دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالا ہے، جس کی لکھائی آوازی اصول پر ہے۔ زبان کے آوازی اصول کی منزل "ہندستانی ادب" نے نہایت آسانی سے طے کر لی ہے اور اردو والے اس کٹھن اور دشوار منزل میں بری طرح سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں، چنانچہ گوپی چند نارنگ کی تازہ تصنیف "املا نامہ" پر تبصرا کرتے ہوئے حسن الدین نے لکھا ہے کہ "اس کے معنی یہ ہیں کہ اردو میں اصلاح املا کا کوئی آسان کام نہیں، لیکن اصلاح تو ضروری ہے۔ زبان کبھی بھی جامد نہیں رہ سکتی۔ زندگی کی طرح زبان بھی پیہم رواں اور ہردم جواں رہتی ہے، اس میں تبدیلی سے انکار ایک اٹل حقیقت سے انکار ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کو چاہے کسی شعبے میں سہی، محض مشوروں سے تبدیلیاں لانا اتنا آسان نہیں جتنا آسان مشورے دینا ہے۔ سفارشات پیش کرتے ہوئے عمل آوری کے امکانات کو ذہن میں رکھیں، زبان کے مزاج کو سمجھنا، اور سفارشات کو قابل قبول بنانا ضروری ہے۔"

چنانچہ تبصرا نگار کی رائے میں املا نامے کی کمیٹی نے ان اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا، اور اسی طرح ٹھوکر پر ٹھوکر کھا رہی ہے، جس کے نتیجے کے طور پر کمیٹی نے اپنی قصابیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں حسن الدین احمد نے لکھا ہے کہ "چند سفارشات ایسی ہیں کہ جن کو قبول کرنے میں تامل کیا جا سکتا ہے، مثلاً طوطا کے مقابلے میں توتا، غلطاں کے مقابلے میں غلتاں، طمانچا کے مقابلے میں تمانچا، اور قصائی کے مقابلے میں قسائی کی سفارش کی گئی ہے۔"

دیکھ لیا آپ نے، ہم نے املا نامہ کمیٹی کی اس قصابیت کی طرف اشارا کیا ہے۔ ذرا آپ خود ہی غور فرمایے کہ املائی اصلاح دینے کی بجائے کمیٹی نے اصل لفظ قصائی کو بدل کر قسائی کر دیا، بھلا اس زحمت بے جا کی ضرورت ہی کیا تھی، اور طوطی کو توتا لکھ کر کمیٹی نے اپنے ہات کے طوطے اڑا دیے، اور غلطاں کو غلتاں بنا کر مذہبی کمیٹی کے جاہل مطلق ارکان ہمیشا ہمیشا کے لیے اپنی جہالت اور نادانی کے بحر ذلت میں غلطاں ہو [illegible]

آگے چل کر تبصرا نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس طرح اعلیٰ - ادنیٰ - دعویٰ - حتیٰ کہ - وسطیٰ اور علیٰحدہ کے مقابلے میں اعلا - ادنا - دعوا - حتا کہ - وسطا، اور علاحدا کی سفارش کی گئی ہے [illegible]

[illegible]

عمل، ٹھیٹ آوازی اصول پر صرف "ہندستانی ادب" نے پیش کیا ہے، یعنی کسی بھی لفظ کے ادا کرتے وقت منھ سے جب آواز نکلتی ہے، بلکل اسی طرح اس کو لکھنا بھی چاہیے، چنانچے اعلیٰ کی آواز اعلا نکلتی ہے، اور ادنیٰ کی ادنا، دعویٰ کی آواز دعوا، حتیٰ کہ کی آواز حتا کہ، اور علاحدہ کی علحدا، اور وسطیٰ کی وسطا نکلتی ہے، اس لیے ان الفاظ کو آوازی اصول پر ہر وقت اور ہمیشا اسی طرح لکھنا چاہیے - زمانہ - عرصہ - عثمانیہ - تحتانیہ - وسطانیہ - فوقانیہ - وغیرہ وغیرہ جیسے سینکڑوں ہی ہاے مختفی سے لکھے جانے والے تمام الفاظ کو الف (ا) کے ساتھ لکھا جانا چاہیے، اس لیے کہ ان الفاظ کے ادا کرتے ہی ہمارے منھ سے قطری طور پر الف (ا) کی آواز نکلتی ہے، مثلاً زمانا - عرصا - عثمانیا - تحتانیا - وسطانیا - فوقانیا وغیرا وغیرا - آپ ہزار کوشش کریں ان الفاظ کی آواز کبھی ہی (ہ) کے ساتھ نہیں نکلتی، جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ان شبدوں یا الفاظ کی آواز الف (ا) کے ساتھ نکلتی ہے تو پھر ان لفظوں کو بلا وجہ اور غیر ضروری طور پر (ہ) یا ہاے مختفی کے ساتھ کیوں لکھا جانا چاہیے؟ اردو والوں کی یہ نری ہٹ دھرمی اور سو فیصد غیر ضروری طریقے پر ضد ہے کہ وہ یہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کی آواز (ہ) کے ساتھ نہیں، بلکے الف (ا) کے ساتھ نکلتی ہے، لیکن اس علم کے باوجود وہ ان الفاظ کو ہر وقت غلط طریقے پر لکھتے ہیں، نہ صرف خود لکھتے ہیں، بلکے اردو کے اساتذہ ابتدائی مدرسوں میں بچوں کو اس غلط طریقے پر سبق دیتے اور لکھاتے بھی ہیں، اور اگر کوئی بچا انجانے طور پر آوازی اصول پر لکھ بیٹھے تو اس کی درگت بنائی جاتی ہے کہ تو نے یہ لفظ غلط کیوں لکھا؟ حالانکے اتفاقی طور پر اس نے یہ لفظ صحیح لکھا ہے - اسی لفظ صحیح کو لیجیے کہ یہ لفظ صحیح لکھا جاتا ہے، اور صحی بولا جاتا ہے - آپ ایک ہزار مرتبا کوشش کریں، مگر اس کی آواز صحی - حی - ی - ی - ی - ح کبھی نہیں نکلتی، بلکے ص، ہ سے حلقی اور یا (ی) پر آکر ختم ہو جاتی ہے - اس علم کے باوجود اس کو بلکل ہی غلط طریقے پر لکھا جاتا ہے، اور یہ بھی اردو والوں کی ایک دوسری مضحکا خیز ہٹ دھرمی اور ضد ہے - ان کو چاہیے کہ اس لفظ کو ہمیشا صحی طریقے پر صحی لکھنا چاہیے - اردو کے پرستار لکھتے تو خود ہیں، اور بولتے خد ہیں - خود فارسی زبان میں اس فولادی ٹوپی کو کہتے ہیں جو فوجی لوگ جنگ کے دوران اپنے سر کے بچاو کے لیے پہنا کرتے تھے، اس لیے اس لفظ کو انہیں معنی کی حد تک رہنے دیا جاے، اور خدا اپنے کے معنی میں ہمیشا خد - د کے ساتھ بغیر واو کے لکھا جاے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس لفظ کی آواز بھی اس طرح نکلتی ہے یعنی خد - ایک اور لفظ کے سلسلے میں ہم عقل کے اندھے اردو پریمیوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی مضحکا خیز مثال پیش کیے دیتے ہیں، یعنی یہ ضدی اور ہٹ دھرم لوگ اس لفظ کو لکھتے تو بالکل اور بولتے بلکل ہیں، یعنی وہ بال کل لکھتے اور بولتے بل کل ہیں - اس سلسلے میں ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، اور جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کو اردو کے عقل کے اندھے پر بھی، حق و صداقت اور عقل و تمیز، اور شعور و سلیقے کی عینک لگا کر دیکھیں تو انہیں پتا چلے گا کہ وہ لوگ نری ہٹ دھرمی اور ضد پر تلے ہوے ہیں، مثلاً یہی کہ وہ لکھتے تو کچھ ہیں، اور بولتے کچ، اس لیے کہ آواز چ پر رک جاتی ہے، ھ کی آواز ہرگز ہرگز نہیں نکلتی اس لیے انہیں چاہیے کہ ہمیشا ہی اس شبد کو صحی طریقے پر پڑھ کے کچ لکھا کریں - " الا نانا " کے مبصر حسن الدین احمد کو بھی چاہیے کہ وہ ہمارے ان دچاروں پر خوب خوب ہی دھیان دیں تو انہیں پتا چلے کہ " ہندستانی ادب " کی لکھائی زبان کے سائنٹفک طریقے یا آوازی یا صوتی یا فونیٹک سسٹم یا اصول پر ہوتی ہے - اس زریں اور سنہرے اصول پر کسی بھی اخبار یا رسالے کی لکھائی نہیں - یہ فخر صرف اور صرف علمی ادبی ماہوار رسالے " ہندستانی ادب " ہی کو حاصل ہے، اس لیے اس رسالے کے ہر نمبر کے پہلے یعنی فہرست کے صفحے کی پیشانی پر سب سے پہلے ہمارا فخریا جملا فقرا یہ

سالانا چندے میں اضافا

جنوری ۱۹۷۵ء سے "ہندستانی ادب" کا سالانا چندا سولا روپے کر دیا گیا ہے۔ سالانا چندے میں چار روپے کے اضافے پر ہم بلکل ہی مجبور ہوگئے تھے، اس لیے اس تبرا اس نئے اضافے کا اعلان کرنا پڑا۔

آج سے تقریباً دس سال پہلے اس رسالے کا سالانا چندا آٹھ روپے تھا۔ اس وقت بھی کاغذ کی قیمت بڑھ گئی تھی، اس لیے ہم آٹھ کی بجائے سالانا چندا بارا روپے کر دیا تھا۔ بارا روپے چندے کے ساتھ جوں توں کر کے رسالے کو چلائے جا رہے تھے کہ پچھلے دو چار سال کے اندر کاغذ کی قیمتیں بھیانک طریقے پر بڑھ گئی تھیں۔ ہر اخبار اور ہر ہفتا وار اور ہر ماہوار رسالے نے اپنا اپنا سالانا چندا بڑھا دیا، مگر "ہندستانی ادب" نے اس طرف کوئی اقدام نہیں کیا تھا، جس کا نتیجا یہ رہا اس رسالے کا ہر نمبر نقصان کے ساتھ شایع ہو رہا تھا۔ اس خصوص میں یعنی سالانا چندے کے اضافے کی طرف ہمارے کئی ایک ہمدردوں نے ہمیں توجہ دلائی تو ہم نے بات سنی ان سنی کر دی، مگر اس رسالے کے اور ہمارے ایک حقیقی ہمدرد سید حسن صاحب بی۔اے (کلکتا) ام۔ال۔اے، اور ممبر اڈوائیزری بورڈ میونسپل کارپوریشن، اور ممبر عثمانیا یونیورسٹی، حیدرآباد وغیرا نے سالانا چندے کے اضافے پر بلکل ہی مجبور کر دیا۔

واقعا اصل میں یہ ہے کہ اپریل ۱۹۷۵ء سے مارچ ۱۹۷۶ء آیندا سال کے لیے رسالے کی منظوری کے سلسلے میں ایک درخاست انگریزی میں ٹائیپ کروا کرلے کر گئے اور ان کے ہات میں تھما دی، اور ہم نے کہا کہ سید بھائی (ہم انھیں خلوص اور محبت سے سید بھائی کے نام سے پکارتے ہیں) آپ ہی نے اس رسالے کو ختم ہونے سے بچا لیا تھا، اس لیے کرپا کر کے آیندا سال کے لیے بھی منظوری دلوایئے۔ سید بھائی نے ہماری درخاست پڑھ کر دیکھی، اور اس کو ہماری طرف لوٹاتے ہوئے مخلصانا انداز میں فرمایا، یہ درخاست واپس لے جاو، یہ درخاست میں نہیں لوں گا۔ میں بہتر طریقے پر جانتا ہوں کہ کاغذ کی قیمتیں بہت زیادا حد تک بڑھ جانے کی وجہ سے "ہندستانی ادب" کا ہر نمبر نقصان کے ساتھ شایع ہو رہا ہے، اس لیے سالانا چندے میں اضافا ضروری اور لازمی ہے۔ درخاست اپنے ہات میں لیتے ہوئے ہم نے کہا کہ سید بھائی خد آپ ہی فرمایئے کہ کتنا اضافا کیا جائے۔ یہ سن کر ہمارے کرم فرما نے ارشاد فرمایا، کاغذ کی موجودا بڑھیا قیمتوں کے پیش نظر موجودا چندے میں چار روپے کا اضافا کر کے "ہندستانی ادب" کا سالانا چندا سولا روپے کر دیا جائے، اور اس اضافے چندے کے ساتھ نئی درخاست ٹائیپ کروا کر مجھ کو لا کر دیجیے۔ ہم نے ان کا شکریا ادا کیا، اور جو حکم سید بھائی کہتے ہوئے واپس چلا گئے۔ پھر سے ایک دوسری درخاست سولا روپے چندے کے ساتھ ٹائیپ کروائی، اور سید بھائی کے حوالے کر دی۔ ہماری نئی درخاست ابھی منظوری کے مراحل طے کر رہی ہے — دیکھنا کیا ہو؟

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ عالیجناب سید حسن صاحب، ام۔ال۔اے نے پچھلے سال اس رسالے کو ختم ہونے سے بچا لیا تھا، اور یہ بلکل سو فیصد حقیقت پر مبنی واقعا ہے۔ واقعا اصل میں یہ ہے کہ پچھلے سال اسپیشل افسر بلدیا میونسپل کارپوریشن، حیدرآباد نے صرف ڈیڑھ سو (۱۵۰) کاپی کی خریدی کی منظوری دی تھی، اور یہ کمی بے ساتھ یہ آرڈر ہمیں مل چکا تھا۔ اتنا خوفناک اور ڈراونے آرڈر کو دیکھ کر ہمارے ہوش جاتے رہے، اس لیے کہ دو سو کی خریدی کی شکل رسالا نقصان کے ساتھ چلایا جا رہا تھا تو پچاس کاپی کی کمی کے بعد ڈیڑھ سو پرچوں کی گھٹیا قیمت کی آمدنی کی شکل میں رسالا کیسے اور کیونکر چلایا جا سکتا تھا، اور بند کرنے کے سوائے اور کوئی صورت نہ تھی، اس لیے ہم دوڑے دوڑے اپنے عزیز سید بھائی کے گھر گئے، اور حد درجا پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے ہم نے سارا ماجرا سید بھائی سے کہہ سنایا،

[illegible]

سے سفارش کرکے حسب سابق دوسو کاپی کی منظوری دلا دیجیے یہ سن کر سید بھائی نے ہمیں ڈھارس دلائی اور ہم سے آمرانہ انداز میں یہ کہا یہ رسالا ہرگز ہرگز بند نہیں ہو سکتا، جو رسالا (۳۴) سال سے جاری ہے وہ کیسے بند ہو سکتا ہے؟ میں اسپیشل افسر صاحب سے مل کر انہیں مجبور کروں گا کہ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی دوسو کاپی کی منظوری دی جائے، تاکہ رسالا ختم ہونے سے بچ رہے۔ ہم سچ کہتے ہیں کہ ہمارے محترم سید بھائی کی زبان میں جادو کا سا اثر ہے، چنانچہ ٹیلیفون پر اسپیشل افسر سے بہت دیر تک بات چیت کرکے انہیں قایل کر دیا کہ ایک (۳۴) سالا قدیم اور پرانے علمی ادبی ماہوار رسالے "ہندستانی ادب" کا باقی رہنا نہایت ضروری ہے، اس لیے اپنی سابقہ تجویز پر نظر ثانی کرتے ہوے اپریل ۱۹۷۴ء سے مارچ ۱۹۷۵ء تک ایک سال کی منظوری دیجیے، چنانچہ سحر سامری کی طرح "سحر سید حسن" سے متاثر ہو کر اسپیشل افسر نے دوبارا ہمیں دوسو پچاس کی منظوری کا نیا آرڈر دیا تھا، جس کی وجہ "ہندستانی ادب" کو اپنے وجود کے (۳۵) ویں سال میں قدم رکھنے کا موقع ملا، اور آشا ہے کہ اپنی ساحرانا کوششوں سے موجودا اسپیشل افسر صاحب کو مجبور کرکے آیندا سال کی سال کی منظوری دلاتے ہوے سید بھائی اس رسالے کو (۳۶) ویں سال میں بھی قدم رکھنے کا موقع عطا فرمائینگے؟

ہم، سید حسن صاحب، ام-ال-اے کے اس احسان عظیم کو ہرگز ہرگز بھلا نہیں سکتے کہ انہوں نے اپنی ساحرانا کوششوں سے "ہندستانی ادب" کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا۔ عالیجناب سید حسن صاحب، ام-ال-اے کا یہ احسان صرف ہم پر یا "ہندستانی ادب" پر ہی نہیں ہے، بلکہ روزانا پچاسوں ہی اہل غرض ان کے دولت کدے "دز علی لاج" پر آیا کرتے ہیں۔ ام-ال-اے کی حیثیت میں، اور ممبر اڈوائزری بورڈ میونسپل کارپوریشن اور ممبر سینٹ عثمانیا یونیورسٹی اور خدا نیز اولوالعزم شخصیت کی حیثیت میں روزانا پچاسوں ہی حاجتمندوں اور اہل غرض کی سفارش کرکے ان کے کام بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ہم نے کبھی بھی کسی سے انکار کرتے نہیں دیکھا۔ ایک بڑے آدمی کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ ہر اہل غرض کی درخواست کو قابل اعتنا سمجھتے ہوے اس کو قبول بھی کرنا اور اس کی سفارش کرکے کام بنانے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔

سید حسن صاحب، ام-ال-اے کی سی ہمہ جہتی خوبیوں کے آدمی ہم نے کم دیکھے ہیں، اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی خدمات بلکل بے لوث اور مفاد پرستی سے مبرا ہیں!

اوپر گنائی گئی ہمہ جہتی خوبیوں اور خصوصیات کے سبب سید حسن صاحب کے مکان پر روزانا شام میں ان کے عزیز اقربا، دوست احباب اور اہل غرض بھی آیا کرتے ہیں۔ ہم خود بھی کبھی کبھار سید بھائی کے دربار میں حاضری دے لیا کرتے ہیں۔ ان کا یہ دربار بہت ہی بھلا لگتا ہے، اس لیے ہم نے اس دربار کو "دربار دُر بار" کا موزوں ترین نام دیا ہے، جہاں سے ہر اہل غرض اپنے مقاصد کو کامیابی کے ساتھ "دُرر مقاصد" کی شکل میں اپنی جھولی بھر لے جاتا ہے۔ ہم نے سید بھائی کے اس شبینا دربار کو یہ موزوں اور مناسب نام اس لیے دیا ہے کہ صدق جائسی مرحوم نے نواب معظم جاہ بہادر کے شبینا دربار کو "دربار دُر بار" کا موزوں نام دیا تھا، چنانچہ صدق جائسی نے اس نام پر ایک کتاب "دربار دُر بار" بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب واقعی بے حد دلچسپ اور معلومات آفریں بھی ہے، چنانچہ اس مناسبت سے ہم نے اپنے سید بھائی کے شبینا دربار کو "دربار دُر بار" کا موزوں ترین نام دیا ہے۔ معظم جاہ کے دربار میں صرف ان کے منظور نظر شاعر اور خشامدی برآمدی ان کی اجازت سے حاضری دیا کرتے ہیں، ان میں سے کئی ایک تو ان کے دربار کے ملازم ہیں جنہیں باقاعدا ماہوار تنخواہ ملا کرتی ہے، لیکن سید حسن صاحب، ام-ال-اے کے دربار میں

پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین ایس - گوریکر
ایم - اے - پی، ایچ، ڈی

مرزا غالب کی فارسی دانی

انیسویں صدی ہندستان کی تاریخ میں ایک یادگار زمانا ہے جب ہمارا ملک ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہوا - یہ انقلاب نہ صرف سیاسی بلکے ایک حد تک لسانیاتی بھی تھا - آشوب وقت نے طبیعتیں آشفتا کردی تھیں - فارسی کا چراغ آخر مرحلے پر پہنچ کر اس انتظار میں تھا کہ اس کا شعلا آخری اس طرح بھرپور جست لگا کر ختم ہو جائے جس طرح کسی طوفان کے آنے سے پہلے ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے اور ایک خلا محسوس ہونے لگتا ہے - اس صدی کے آغاز میں اگرچے ہر طرف فارسی زبان و ادب کا بول بالا تھا، دربار و دفاتر میں اسی زبان کا سکا چلتا تھا اور شعرا و ادبا کی محفلوں میں اسی زبان کے چرچے تھے، مگر فارسی کے ماحول میں بلکل وہی کیفیت تھی کہیں کہیں سرسراہٹ ہوتی، مگر رقیب زبان کے نغموں میں ڈوب جاتی - دوسرے لفظوں میں زبان ہندستانی کا طنطنا بلند ہو رہا تھا اور ان دنوں جن اصحاب ذوق نے طبع آزمائی کی انھوں نے ہندستانی کو مقدم سمجھا اور فارسی کو ثانوی بلکے تفریحی گردانا - اس اعتبار سے فارسی اساتذا اور شعرا نے اس لسانی اور ادبی انقلاب میں مدد دی - شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے آخری ایام میں شاہ سعد اللہ گلشن نے اپنے شاگرد ولی کو مشورا دیا کہ وہ ہندستانی زبان میں فارسی شعرا کے طرز پر لکھیں " این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ بکار بر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت -"

مرزا اسد اللہ خان غالب جو ابتدا میں اسد تخلص کرتے تھے اس وقت منصۂ شہود پر آئے جب مغلیا سلطنت دم توڑ رہی تھی اور حکومت برطانیا اپنا اقتدار جما رہی تھی - مشرقی تمدن اور بالخصوص مغلیا ثقافت اپنی چار صد سالا تابانی کے بعد ماند پڑ چکی تھی اور مغربی تہذیب برسر پیکار تھی - بالفاظ دیگر غالب کا عہد ایک سیاسی رد عمل کا عہد تھا، ایک انقلاب کا زمانا تھا، ایک عبوری عصر تھا - غالب نے ایک تمدن کو اجڑتے اور دوسرے کو ابھرتے دیکھا ہے اگرچے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم سے قدریں بدلیں اور ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوئی تاہم غالب نے حقایق زندگی کو نگاہ سے اوجھل ہونے نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ہنگامی دوائر میں نہ گھٹا بلکے آزادی کیفیت پا گیا - غالب دنیا کے ان مشاہیر فن کاروں میں سے ایک ہیں جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کی ذات میں بیک وقت نہ صرف کئی صفات کا اجتماع نظر آتا ہے بلکے جن کی ہر صفت ایک امتیازی شان کا مظہر ہوتی ہے - بقول غالب ؎

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

مقام آگرا پیدا ہوئے - اپنی ولادت کے بارے میں ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

غالب چو ز نا سازی فرجام نصیب
ہم بیم عدو دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس
ہم شورش شوق، و ہم لفظ "غریب"
۱۲۱۲ھ ۱۲۱۲ھ

اور ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ عیسوی میں انتقال کیا اگرچہ مرنے سے بیس سال پہلے تاریخ وفات کا مادہ ہاتھ آیا جو انہیں بہت پسند آیا اور جس کو انہوں نے اس طرح موزوں کیا تھا ؎

من کہ باشم کہ جاوداں باشم
چوں نظیری نماند و طالب مرد
(۱۲۷۷ھ)

غالب تورانی النسل تھے - ان کے آبا و اجداد ترک قوم کے ایک قبیلا سے تعلق رکھتے تھے سمرقند میں کاشتکاری و سپاہ گری کیا کرتے تھے اور اپنا سلسلۂ نسب افراسیاب سے ملاتے تھے ؎

غالب از خاک پاک تورانیم
لاجرم در نسب افراسیابیم
ترک نژادیم و در نژاد ہمی
بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبادی من کشاورزیست
مرزبان زادۂ سمرقندیم

آقای بزرگ شیرازی وفا کو اپنے ایک مکتوب اپنے نسب کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں ؎

گرفتم کہ از تخم افراسیابم
گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم

اسی طرح سراج احمد کو بھی لکھتے ہیں : "ترک نژادم و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد و نیاکانم از آنجا کہ باسلجوقیان پیوند ہم گوہری داشتند" اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تدریس کے سلسلے

نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا - اس کے بعد لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق، فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہوگیا -

اگرچہ غالب شروع سے انگریزوں کے وظیفہ خوار اور انگریزی عملداری کے تابع زندگی بسر کرتے تھے تاہم ان میں پرانی ثقافت، تہذیب اور بوے ریاست کی کشش اب بھی باقی تھی ؎

دیدہ در سلطان سراج الدین بہادر شاہ ظفر
آں ظفر بینید کہ پنہاں در رگ سنگ من است

اسی دیدا دری کے صدقے میں جولائی ۱۸۵۰ء میں شاہی ملازمت مل گئی اور مشاہرا پچاس روپے ماہانا مقرر ہوا جو اپریل ۱۸۵۷ء تک ملتا رہا - خدمت یہ سپرد ہوئی کہ شاہی طبیب خاص حکیم احسن اللہ خاں تاریخی واقعات کا انتخاب کریں اور وہ (غالب) ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیں - دوسرے لفظوں میں حکیم موصوف کی زیر نگرانی غالب نے ۱۸۵۴ء میں پہلا حصا "مہر نیم روز" کے نام سے لکھ کر دیا - اور تاریخ نویسی کی خدمت میں مامور ہوے اور "مہر نیم روز" کے دیباچے کے مطابق بہادر شاہ ظفر نے "غالب سخن سرائی را نجم الدولا دبیر الملک بہادر نظام جنگ خواند"

اپنے استاد خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوق کی ۱۲۷۱ھ میں وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب کو اپنے اشعار کی اصلاح کی خدمت پر مامور کیا - اس سلسلے میں والیٔ رام پور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "پیوند تعلق با بہادر شاہ جز آں نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ تحریر تاریخ سلاطین تیموریا و از دو سال با صلاح شعر شہریاری پرداختم" اس کے علاوا شہزادوں کے زیر اہتمام قلعۂ معلا میں جو مشاعرے ہوا کرتے تھے غالب بھی شرکت کرتے اور فارسی اور کبھی اردو غزل پڑھتے . بادشاہ کی تعریف میں تین قطعے ، ایک مثنوی، سولا قصیدے اور چند قصیدے اور چند غزلیں ہیں - بادشاہ کی صحت یابی، شہزادوں کی پیدائش، شادی اور موت

خاندان تیموریا کی تاریخ لکھنے کا کام غالب نے جولائی ۱۸۵۰ء میں شروع کیا جس کا نام پرستان تجویز ہوا تھا - پہلے حصے میں ابتدا سے ہمایوں کے انتقال تک کے حالات درج ہیں اور یہ حصا مہر نیم روز کے نام سے موسوم ہوا اور ۱۸۵۳ء میں مکمل ہو کر ۱۸۵۴ء میں شایع ہوا لیکن دوسرا حصا جس کا نام ماہ نیم ماہ جس میں اکبر کے عہد حکومت سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے واقعات کو رقم کرنا تجویز ہوا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں افراتفری شروع ہو چکی تھی - اس ضمن میں غالب لکھتے ہیں - "ماہ نیم ماہ می خوانند آں قدر اسمی است کہ مسمیٰ ندارد - ہر گاہ یک نیمہ از پرستان انجامید و مہر نیم روز نام یافت -"

اپنی فارسی تصنیف دستنبو میں غالب نے مئی ۱۸۵۷ء سے جولائی ۱۸۵۸ء تک غدر کے حالات پر تبصرا کیا ہے - بالفاظ دیگر اس تالیف میں پندرا مہینے کی روداد ہے جو تباہی شہر اور مصنف کی سرگذشت پر روشنی ڈالتی ہے - اس کے مطالعے سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کے نزدیک غدر کسی قومی تحریک کا نتیجا یا جنگ آزادی کا مظہر نہ تھا - اس میں ملکا وکٹوریا کی شان میں ایک قصیدا اور ایک قطعا بھی ہے جو قطعۂ چراغاں کے نام سے مشہور ہے -

غالب کی ایک اور تالیف پنج آہنگ کے نام سے موسوم ہے جس میں پانچ باب ہیں - پہلے باب میں فارسی انشا پردازی پر اظہار خیالات کیا ہے، دوسرے میں فارسی مصادر، محاورات اور الفاظ کی فرہنگ ہے، تیسرے میں شاعر کا انتخاب کلام، چوتھے میں تقریظیں، خطبے اور مضامین اور پانچویں میں متفرق خطوط ہیں - یہ ایک عمدا تصنیف ہے -

سبد چین میں غالب نے وہ قطعے، قصیدے، غزلیں، مثنویاں اور رباعیاں شامل کی ہیں جو ان کے کلیات نظم فارسی میں شامل نہیں ہیں - سبد چین ساڑھے چھے سو شعروں کا مجموعا ہے - اس کے بارے میں غالب اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں - "ہر آئینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد در اوراق جداگانہ

سبد چین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ غالب نے حبسیات کو اس میں شامل کیا ہے اور اس میں ایک طویل ترکیب بند ہے جس میں غالب نے اپنی قید کی باشقت زندگی کو بہت ہی دلدوز اور پر اثر انداز میں پیش کیا ہے اور جس کو وہ اپنا شہکار تصور کرتے ہیں -

در خرابی بجہان میکدہ بنیاد نہم
در اسیری بہ سخن دعویٰ اعجاز کنم
بی مشقت نبود قید تقید بشعر آویزم
روز کی چند رسن تابیٔ آوازکنم
بہ صریر قلم خویش بود مستیٔ من
اندراں بند گراں بین [illegible] من

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۷ء میں نکلا اور نولکشور پریس لکھنؤ نے ۱۹۲۵ء میں اور مکتبے جامعہ دلی نے اسے ۱۹۳۸ء میں شایع کیا -

کلیات نظم فارسی جس کا نام بقول قاضی عبدالودود میخانۂ آرزو سرانجام تھا ۱۲۵۱ھ اور ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان مرتب ہو چکا تھا - اس میں غالب کے قصاید، قطعات، مثنویات، غزلیات، رباعیات اور مخمسات کے علاوا ترکیب بند و ترجیع بند شامل ہیں - غالب کے ایک عزیز نواب ضیاالدین احمد خان نے غدر کے بعد اسے بڑی محنت سے جمع کیا اور ان کے صاحب زادے شہاب الدین احمد خان نے ۱۸۶۱ء میں منشی نولکشور کے پاس بھیجا جنہوں نے ۱۸۶۳ء میں شایع کیا، اگر چہ اس سے قبل ایک ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاالدین احمد خان کی زیر نگرانی مطبع دارالسلام دلی سے چھپا تھا، لیکن وہ مع دیگر قلمی نسخوں کے غدر میں ضایع ہو گیا - نولکشور ایڈیشن کی تقریظ غالب نے لکھی اور اس سلسلے میں سید بدرالدین احمد کو لکھتے ہیں "منشی نولکشور نے شہاب الدین احمد خان کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاالدین احمد خان نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا - وہ پچاس جز ہیں یعنی کوئی [illegible] اس سے خالی نہیں" بقول غالب کلیات میں دس ہزار چار سو چوبیس

...د و ترجیع بند ہے ہیں۔ غزل کے اشعار چار ہزار سے
...اید اور مثنوی کے لگ بھگ دو ہزار، قطعات کے
...ریب آٹھ سو اور باقی دیگر اصناف نظم کے اشعار ہیں۔
غزلوں کی تعداد تین سو اٹھائیس ہے، قطعے باسٹھ
ہیں جو اکثر ہنگامی حالات سے متعلق ہیں۔ ان میں تو ے
بھی شامل ہیں۔ مثنویاں گیارہ ہیں جو موضوعات کے
اعتبار سے صوفیانہ، بیانیہ، اخلاقی، واقعاتی،
مذہبی اور مدحیہ ہیں جن میں سرمۂ بینش (بہادر شاہ
ظفر کی مدح میں)، چراغ دیر (بنارس کی تعریف
میں)، باد مخالف (کلکتہ کے ہنگامے سے متعلق)
تبرکات اور ابر گہر بار (جو مسلسلے استماع نظیر ختم
المرسلین اور غزوات نبوی کے تذکروں کا منظوم
مقدمہ ہیں) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ باقی دو ایک
قصے، تہنیت نامے اور تقریظیں ہیں۔ مثنوی۔
ابر گہر بار سب سے بڑی مگر نا تمام ہے اور یقیناً ایران
کی مثنویوں کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم نہیں۔
دعا الصباح بھی ایک مثنوی ہے جس کو غالب نے
اپنے بھانجے کے اصرار پر لکھا تھا اصل میں یہ عربی
دعا الصباح کا منظوم ترجمہ ہے جو حضرت علی سے
منسوب ہے۔ اس کو منشی نولکشور نے غالب کی زندگی
ہی میں شایع کیا۔ یہ سچ ہے کہ غالب نے اپنے فارسی
کلام کو اپنا بہترین سرمایہ تصور کیا ہے جس کو انہوں
نے اپنی عمر کی اڑتالیسویں سال میں ترتیب دیا۔

گل رعنا میں غالب کے فارسی اور ہندستانی
شعر ہیں جس کو مولوی سراج الدین احمد نے آئینۂ
سکندری کی ایما پر ترتیب دیا اور پانچ دو در کو سبد چین
کی اشاعت کے بعد غالب نے اپنی نگرانی نے مرتب کیا۔
اس میں صرف ایک سو چھیالیس اشعار سبد چین کے
مقابلے میں زیادہ ہیں۔ باقی اشعار وہی ہیں جو سبد چین
میں موجود ہیں۔ یہ تقریباً سنہ ۱۸۶۷ء میں غالب
کی وفات کے بعد شایع ہوئی۔ علاوہ ازیں نکات و
رقعات میں فارسی گرامر کی ہندستانی میں مختصر صراحت
ہے اور چند فارسی خطوط ضمیمے کے طور پر ہیں۔ ہندستانی
میں غالب کا دیوان ان کی عظمت کا نشان ہے اور
۵۰ کے خطوط کے مجموعے بنام اردوئے معلا اور
عود ہندی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر
سید مسعود حسن رضوی نے متفرقات غالب کے نام سے
ایک مجموعہ ایک نادر قلمی بیاض کی مدد سے تیار کیا ہے۔
اس میں فارسی خطوط ہیں جو غالب نے کلکتے کے احباب
کے نام لکھے ہیں۔ مثنوی باد مخالف کے ساتھ ایک
اور مثنوی ہے جو غالب نے سنہ ۱۸۵۳ء میں بہادر شاہ
ظفر کی طرف سے تشیع سے برات کے لیے لکھی تھی، اس
میں کچھ نظمیں بھی ہیں سنہ ۱۹۴۷ء میں اسے ہندستان
پریس رامپور نے چھاپا۔

غالب کے معاصرین کے مطابق انہوں نے اپنے
کلام کا خود ہی انتخاب کیا تھا۔ کسی کی فہمایش یا فرمایش
پر نہیں، بلکہ اپنے ذوق سلیم کی بنا پر ترتیب دیا۔ غالب
نے اپنے متداول دیوان کے دیباچوں اور کئی خطوں
میں اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ انہوں نے ہی اپنے کلام
کا انتخاب کیا ہے۔ نسخہ بھوپال اور نسخۂ شیروانی
کے پیش نظر اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ انتخاب
سوائے غالب کے کوئی اور ترتیب دے ہی نہیں سکتا
تھا کیوں کہ انتخاب کے بعض اشعار کی اصلاح کی گئی
ہے یا انتخاب میں اصلاح بار بار کی گئی ہے۔

درحقیقت غالب کو فارسی سے ذہنی مناسبت
تھی اور اس میں ان کا مطالعہ نہ صرف گہرا تھا، بلکہ انہیں
اس زبان پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ سچ مچ غالب
کی فارسی شاعری میں قدیم سرمایہ کا نچوڑ ہے اور
حال و مستقبل کے لیے دلبستگی کا پورا سامان موجود ہے۔
یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ جب غالب کی فارسی
شاعری کے عروج کا دور تھا اس وقت فارسی زبان
جو تقریباً آٹھ سو سال تک ہندستان میں بحیثیت درباری
و ثقافتی زبان کے براجمان تھی، تیزی سے تنزل کی طرف
مائل تھی اور سبک ہندی، یعنی ہندستانی زبان ترقی کے
منازل طے کر رہی تھی۔ غالب کو اس سے مفر نہیں تھا پچیس
سال کی عمر تک ہندستانی میں مشق سخن کرتے رہے اور
اس طرح ہندستانی شاعری کو معراج کمال پر پہنچایا اس
کے بعد فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور پچیس برس
تک یہ سلسلہ پورے انہماک کے ساتھ جاری رہا، مگر
سنہ ۱۸۵۰ء میں قلعۂ دلی سے تعلق قائم ہوا اور بادشاہ

بادشاہ زادوں کے ہندستانی کلام پر اصلاح دینے کی خدمت سپرد ہوئی اور چار و نا چار ہندستانی کی طرف بھی توجہ کرنا پڑی۔ غالب کہتے ہیں۔ "ہرچند از دیر باز بہ گفتن ریختہ نمی گرایم و بہ پارسی زبان سخن می سرایم لیکن چوں رضا جوئی خاطر حضرت ظل الٰہی در آنست کہ ایں گونہ گفتار بدان حضرت فلک رفعت ارمغاں می بردہ باشم۔ ناچار گاہ گاہ ریختہ ہمی گویم۔"

اس میں شک نہیں کہ غالب کی فارسی دانی کا زعم ایک افسانوی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ غالب خود کو بالواسطہ فارسی کے اہل زبان میں شمار کرتے تھے اور یہ واسطہ ملا عبدالصمد کی متنازعا فیہ شاگردی تھی اگرچہ تحقیق سے ثابت ہے کہ ملا عبدالصمد غالب کا زائیدۂ طبع، اور فرضی نام ہے جس کا کوئی خارجی وجود نہیں، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے میں عبدالصمد غیر معمولی قابلیت و استعداد کا مالک تھا اور سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز اس پر کھل چکا تھا۔ عربی کا بھی اسے گہرا علم تھا اور دو سال کی صحبت میں غالب کی ذکاوت طبع نے اس قدر حاصل کیا کہ مدت العمر کافی رہا۔

اس سلسلے میں غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "میری طبیعت کو فارسی زبان سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر فارسی سے ایک بزرگ اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور اس سے حقایق و دقایق زبان پارسی معلوم کیے اب مجھ کو اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ دعوا اجتہاد نہیں" غالب نے ہرمزد کو ملا عبدالصمد بتلایا ہے جس سے فارسی زبان کے اسرار و رموز ان پر منکشف ہوئے اور درفش کاویانی میں اس طرح وہ رقمطراز ہیں۔ "مولانا ہرمزد عبدالصمد ایں راز با من گفت۔" اسی کے پیش نظر غالب فرماتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بدانی کاندریں اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگ من است

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ غالب کی فارسی دانی کے زعم نے ایک طرف کلکتہ کے مناقشے کو جنم دیا۔ تو دوسری جانب قاطع برہان کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ کلکتہ کے کسی ایک جلسے میں غالب نے ایک فارسی غزل پڑھی اس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا اور اعتراض کے جواب میں مرزا قتیل کا قول بطور سند پیش کیا۔ غالب چونکہ ہندستان کے فارسی شاعروں میں امیر خسرو اور کسی حد تک شیخ فیضی کو قابل سند تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا قتیل کی سند کی پروا نہ کرتے ہوئے فرمایا ؎

من کہ طی کردہ ایں مراقف را
چہ شناسم قتیل و واقف را

اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ "فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی، سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو ہم اسے مانیں۔ ہندیوں کو کیوں مسلم الثبوت جانیں۔" جلسے میں اکثر قتیل کے شاگرد اور ہمنوا تھے اور ایک جوش و خروش پیدا ہوا۔ غالب کی موقع شناسی نے انہیں مصالحت پر آمادہ کیا اور سلامت روی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی باد مخالف کے نام سے لکھی جس میں معرکہ کا سارا ماجرا نظم کیا ہے اور داد سخنوری دی ہے۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا اور اپنی طرف سے انکا مناسب کے ساتھ معذرت کا حق ادا کیا، لیکن جب یہ مثنوی حریفوں کی محفل میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ ان کے کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا عذر پیش کرتے، ان میں سے ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا، باد مخالف! دوسرے نے گلستان کا فقرا پڑھا، یکی از صلحا را باد مخالف در شکم پیچید" اور سب نے ہنس دیا۔ علی ہذا جب غالب نے قاطع برہان فارسی میں لکھی جس پر قاطع کے مصنف محمد حسین دکنی جیسی مشہور فارسی لغت پر انہوں نے حاشیے لکھے اور غلطیاں بتلائیں جب یہ کتاب ۱۸۶۲ء میں شایع ہوئی تو مخالفین کا ایک سیلاب امڈ آیا اور ہر طرف سے جواب لکھے گئے ۱۸۶۵ء عیسوی میں نظر ثانی کر کے دوسری مرتبہ شایع کیا اور

علم و دانش کا دریا بہا رکھا - اس کی اشاعت سے علمی دنیا میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا - چونکہ غالب کا لب و لہجہ درشت اسلوب سخت تھا اس لیے پرانی طرز کے لوگ بہت چراغ پا ہوئے اور غالب کے خلاف کئی رسایل مثال کے طور پر ساطع برہان، قاطع القاطع، محرق قاطع، موید برہان اور شمشیر تیز تر اور مختلف خطوط شایع ہوئے - غالب نے بھی ان کے جواب ہندستانی میں لکھے یا لکھوائے جن میں تیغ تیز، لطایف غیبی، دافع ہذیان، نامۂ غالب اور سوالات عبدالکریم قابل ذکر ہیں - اس ضمن میں یہ امر قابل غور ہے کہ جب مخالفین نے غالب پر سب و شتم شروع کیا - حتیٰ کہ گالی گلوچ سے بھی کام لیا تو غالب نے غیض میں آکر اپنے مخالفین میں پٹیالا اسکول کے ایک مدرس امین الدین پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوا دائر کر دیا، لیکن موقع شناس غالب نے اپنے دائر کردہ مقدمے کو راضی نامے داخل کر کے ختم کر دیا، لیکن اپنی شکست کو نہیں مانا - ایک مرتبا اور اسی قبیل کا ایک واقعا پیش آیا اور وہ اختلاف استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق سے بروئے کار آیا جب کہ شہزادا جواں بخت کے سہرے کے مقطع میں غالب نے چیلنج کیا ع

دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

بہادر شاہ ظفر یہ سمجھ کر کہ میرے استاد پر تعریض ہے ناگواری محسوس کی، لیکن غالب کی موقع شناسی نے فوراً گذارش احوال واقعی، لکھ کر معذرت پیش کی جو یقیناً خلوص پر مبنی تھی - بادشاہ نے اس کو منظور کیا - اس زمانے کے اخبارات نے بھی غالب کی صلح پسندی اور صاف گوئی کو بہت پسند کیا اور سراہا -

اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غالب نے مشق سخن پہلے ہندستانی میں شروع کی اور بعد میں فارسی میں شعر کہنے لگے اور چونکے مرزا عبدالقادر بیدل کی وفات اور مرزا غالب کی مشق سخن میں بمشکل ایک سو سال کا وقفا تھا اس لیے غالب کی شاعری پر بیدل کا اثر انداز ہونا لازمی تھا اور یہ اثر غالب کے ابتدائی کلام میں نمایاں ہے جس کا انہوں نے اکثر و

بیشتر اعتراف کیا ہے ؎

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

اسی طرح غالب نے خدائے سخن میر تقی میر کے صاحب کمال ہونے پر نہ صرف ایمان لائے، بلکے ان کے ہر رنگ کو اپنانے کی ہر امکانی کوشش کی ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

اس ضمن میں یہ لکھنا نا مناسب نہ ہوگا کہ نواب حسام الدین حیدر خان نے غالب کے کلام کو اپنے استاد میر تقی میر کو دکھایا - میر نے فوراً کہا کہ اگر اس لڑکے کو استاد کامل مل گیا اور اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنا مہمل بکنے لگے گا۔

اپنے معاصرین کے معاملے میں غالب بڑے وسیع المشرب تھے اور بیشتر شعرائے فارسی میں ظہوری، صائب، بیدل، حزیں، نظیری اور عرفی کے کلام سے عقیدت تھی اور ان کے محاسن کلام کا اعتراف اور اظہار کرنے میں پیش پیش رہے ہیں ؎

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

بہ نظم و نثر ظہوری زندہ ام غالب
رگ جاں کردہ ام شیرازۂ اوراق کتابش را

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں
با ظہوری و صائب محو ہم زبانی ہاست

ہم چناں آں محیط بی ساحل
قلزم فیض میرزا بیدل

غالب مذاق ما نتواں یافتن ز ما
رو شیوۂ نظیری و طرز حزیں شناس

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب
جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

گفت بہ حکم حسرتی غالب خستہ ایں غزل
شاد بہ ہیچ کی شود طبع دفا سرشت ما
غالب بہ تتبع گفتگو ناز بہ ایں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

حتا کہ وہ فارسی اور ہندستانی کے معاصر شعرا جن سے غالب کی یک گونہ حریفانہ چشمک کا احتمال ہو سکتا ہے اور جن میں سے بعض ان سے نسبت خوردی و شاگردی رکھتے تھے، غالب نے واضح طور پر تحسین و آفریں کا اظہار کیا ہے جس سے ان کی عالی ظرفی اور قدر شناسی کا قایل ہونا پڑتا ہے ؎

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوت شان مشک فشاں از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی آنگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شان

افسوس کا مقام ہے کہ غالب کے زمانے میں ان کے فارسی کلام کو شعرائے فارس نے صحیح مقام نہیں دیا اور ان کی شاعری کی قدر نہیں کی گر اس سے انکار نہیں کہ امیر خسرو دہلوی کے بعد اگر کوئی ہند نژاد فارسی شاعر ایران کے مشاہیر شعرا کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ مرزا غالب ہیں۔ غالب کو بجا طور پر اہل ایران سے شکایت رہی کہ انہوں نے اپنے اہل زبان ہونے کے زعم میں غالب کے فارسی کلام کی عظمت و اہمیت کی قدر نہیں کی اگرچہ انہوں نے اپنے لب و لہجے کو اہل فارس سے ہم آہنگ کیا ہے ؎

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون
با ظہوری و صائب محو ہم زبانی ہاست

انہیں اس بات کا بھی ملال تھا کہ وہ ہندستان میں پیدا ہوئے اور ایران جانے کی خواہش آخری دم تک رہی ؎

بود غالب عندلیبی از گلستان عجم
من ز غفلت طوطیٔ ہندوستان نامیدمش

اگرچہ ایران کے مشہور شاعر مرزا صائب تبریزی ہندستان کی علم دوستی اور فارسی نوازی سے متاثر ہو کر فرماتے تھے ؎

نیست در ایران زمیں سامان تحصیل کمال
تا نیامد سوی ہندوستان حنا رنگیں نشد

لیکن غالب کے نزدیک ہندستان میں کوئی سخن سنج نہیں تھا، کوئی سخن فہم نہیں تھا اور جو تھے انہیں اتنا بھی شعور نہ تھا کہ وہ پتھر کو گہر سے اور ہتھ نالک کو کرامت سے الگ کر سکتے ؎

غالب سخن از ہند بروں بر کہ کس ازیں جا
سنگ از گہر و شعبدہ از اعجاز ندانست

فن شعر میں غالب تقلید کے شدت سے منکر ہیں انہوں نے جا بجا اس امر کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی ہم فن پیشرو کے خوشہ چیں نہیں ہیں۔ وہ اپنے تئیں اقلیم سخن میں منفرد تصور کرتے ہیں اور سرقہ، فکر و شعر کے سخت مخالف ہیں۔ وہ فارسی کی تکمیل اور اس میں عبور حاصل کرنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ طبیعت کی مناسبت کے ساتھ کلام اہل زبان کا تتبع از حد ضروری و لازمی ہے اور اسی کے پیش نظر ایک قصیدا میں اپنے اس نظریے کی صراحت کرتے ہیں ؎

ہر چہ در مبدا فیاض بود آں منست
گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں منست
جادۂ عرفی در فتار ستفائی دارم
دہلی و آگرہ شیراز و صفاہاں منست

اور یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی شاعرانہ صلاحیت کا از حد احساس ہے ؎

شد آں کہ ہم قدمان را ز من غباری بود
ز رفتگان بگذشتم بہ تیز رفتاری
چہ ننگ اگر بہ سخن ہم فن است چوں بہ سخن
زدودہ ام ز ورق داغ ننگ ہم کاری
رفتہ در حسرت نقش قدمی عمر بسر
جادۂ راہ کہ بہ سر منزل ما می آید

اور کبھی اپنی شاعری کے اعجاز سے اس قدر متاثر ہے کہ وہ اسے خدا کی دین تصور کرتے ہیں ؎

غالب ظلمت پرہ وہ کشای دم عیسیٰ ست
چوں بہ روش طرز خدا داد بخشید

غالب کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ ان کی طبع

اور قوت تخیل نے الفاظ کی تہہ میں معانی کے ذخائر فراہم کیے ہیں تاکہ لوگ ان سے فیضیاب ہوں ؎

در تہِ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ
تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

مگر جس آشوب پرور اور رستخیز عنوان زمانے میں غالب نے مشق سخن شروع کی اس کے پیش نظر انہیں اس بات کی توقع نہ تھی کہ ان کے کلام کو قبولیت عام کی سند ملے گی تاہم یہ ان کا ایمان تھا کہ ان کے کلام کی شہرت ان کے بعد ہوگی جیسا کہ وہ فرماتے ہیں ؎

کوکبم در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور اس کا ثبوت ان کا صد سالا جشن جو ہندستان اور بیرونی ممالک میں سنہ ۱۹۶۹ء میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔

یہاں یہ لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ نواب مصطفی خان شیفتہ جو فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے، غالب کو ظہوری اور عرفی کا ہم پایا کہا کرتے تھے اور صائب اور کلیم سے بمراتب بالا و برتر سمجھتے تھے اور نواب ضیا الدین احمد خان ان کی فارسی سے متاثر ہو کر بیانگ دہل کہا کرتے تھے کہ ہندستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین یعنی امیر خسرو سے ہوئی اور اس کا خاتمہ ایک ترک ایبک یعنی مرزا غالب پر ہوا۔

غالب کی جدت پسند طبیعت سرورش فیضی کے مشابا تھی۔ وہ اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے اور ابتدا میں وہ اپنی خود ساختہ راہوں پر چلے مگر جلد ہی ان کو محسوس ہوا کہ قدیم اساتذہ کے فن سے قطع تعلق کرکے وہ منزل مقصود سے دور جا پڑیں گے لہذا انہوں نے مشاہیر شعرائے فارسی کے کلام کا مطالعا کیا، لیکن کسی کی کورانا تقلید نہیں کی۔ اگر کسی کی کوئی بات پسند آئی تو اپنی جدت کے کرشمے بھی دکھاتے رہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ غالب نے اپنی شاعری کو جلا دینے اور فن شعر کو تقویت دینے کی غرض سے شعرائے فارسی کے کلام کا مطالعا کیا جس کا اعتراف وہ اس طرح کرتے ہیں۔ "در شیخ علی حزیں بخندہ زیر لبی بیراہ

روی ہای مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آن ہرزہ جنبشہای ناروا در پای راہ پیمای من بسوخت، ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس حرزی ببازو و توشۂ بہ کمر بست، و نظیری لاابالی خرام بہ ہنجار خاصہ خودم بجنبش آورد، اکنون بہ یمن ذرہ پرورش آموختگی این گروہ کلک رقاص من بخرامش تدرو است و در رامش موسیقار، بجلوۂ طاوس است و بہ پرواز عنقا۔"

غالب کی سلیم الطبعی اور صحیح الخیالی نے فنی اعتبار سے اپنے کلام کو ان تمام بھول بھلیاں سے نکال دیا جس میں متاخرین شعرائے عہد مغلیا کی شعریت گم ہو گئی تھی اور بالفعل انہوں نے وہ رنگ اختیار کیا جو ان کی شخصیت کا پرتو ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک طرف بیدل کا فلسفا ہے تو دوسری طرف عرفی کا اپچ ہے، ایک جانب فیضی کا زور بیان ہے تو دوسری جانب نظیری کا تغزل ہے۔ بالفاظ دیگر غالب نے غزل میں نظیری اور ظہوری کی روش اختیار کی اور قصیدا میں عرفی اور انوری کا تتبع کیا ہے، لیکن غزل میں سب سے زیادا متاثر نظیری سے ہیں اور قصیدا میں عرفی سے۔

غالب میں احساس برتری کا مادا شدت سے پایا جاتا ہے اور وہ اپنے معاصرین کو اپنا حریف گردانتے تھے اور کسی سے کم نہیں سمجھتے تھے ع

نہ کمترم ز حریفان بہ فن شعر و سخن

اور یہ گمان کہ ع

فیض حق را کمینہ شاگردیم

اور اسی بنا پر وہ اپنے قول کو لسان الغیب کا زمزمہ، اور اپنے کلام کو وحی الہی کا مترادف گردانتے تھے ؎

گر ذوق سخن بدہر آئین بودی
دیوان مرا شہرت پروین بودی
غالب اگر این فن سخن دین بودی
آن دین را ایزدی کتاب این بودی

اس ضمن میں غالب کے احساس برتری سے متعلق مولانا عبدالباری آسی نے اپنے ایک مضمون، بعنوان غالب کی شوخیاں، میں ایک واقعا کی طرف اشارا کیا ہے۔ غالب غالب ترش فہمی میں مبتلا نظر نہیں آتے ہیں بلکہ واقعت

وہ اپنے تئیں دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھتے اور اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ غالب کسی کتب فروش کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ایرانی نوجوان نے دکان دار سے دریافت کیا۔ دیوان غالب داری؟ دکان دار نے کہا۔ دیوان غالب ندارم، دیوان ظہوری دارم، دیوان نظیری دارم۔ ایرانی نے کہا۔ ایں ہمہ مطلوب نیست۔ دیوان غالب داری؟ آں قدم ساقی خوب می گوید۔ دکان دار نے آخرش کہا۔ دیوان غالب ندارم، غالب دارم۔ جب اس نے سنا کہ غالب دارم اور غالب کو دیکھا تو بہت شرمندہ ہوا۔ غالب نے ہنس کر گلے لگایا اور کہا کہ واللہ ساری عمر میں سچی داد آج ملی ہے، اگرچہ اس واقعہ کی حقیقت ایک لطیفہ سے زیادہ نہیں تاہم غالب کے اشعار ان کے اس احساس کے گواہ ناطق ہیں کہ وہ خود کو عدیم المثال بلکہ یکتائے زمانہ تصور کرتے تھے۔

دانی کہ در سخن بہ کہ نام زمن مپرس
ایں دعوی محال کجا کرد روزگار
آنم کہ بہر صیت صفات کمال من
ایجاد و حرف وصوت وصدا کرد روزگار
من خود عدیل خویشتم و نبود عدیل من
چوں خود مرا بنفسہ فنا کرد روزگار

مہدی پرتاب گڑھی

غزل

دیوانوں کا بھیس بنائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
اپنی متاع فکر بچائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
اپنی وفا کی لاش اٹھائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
خود سے اپنا درد چھپائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
آئے ہیں تہذیب جنوں سمجھانے انہیں کو فرزانے
وہ جو خرد کا علم اٹھائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
یہ بھی کیسے لوگ ہیں جو احساس کی بھیک کے ہیں طالب
ذہنوں کے کشکول اٹھائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
کتنے قاتل انسانوں کے دشمن تہذیب ہستی
معصوموں کا بھیس بنائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
آج حیات کا ایک ایک لمحہ روز حساب سے کم تو نہیں
لوگ اعمال کی فرد اٹھائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
آؤ! ہم سے حاصل کر لو تنویر آداب حیات
ہم جو فکر کی شمع جلائے شہروں شہروں پھرتے ہیں
موت کے سائے میں بھی ہم پیغام امن عالم
اپنے عمل سے باز نہ آئے شہروں شہروں پھرتے ہیں
دنیا والے درد ہمارا سمجھیں بھی تو کیا سمجھیں
ہم زخموں کے پھول کھلائے شہروں شہروں پھرتے ہیں

لوگ غم و آلام جہاں لوٹ چکے ہیں اے مہدی
اب تو اپنی لاش اٹھائے شہروں شہروں پھرتے ہیں

غزل

اک یاد سو گئی اسی نازک گلاب میں
ہم جس کو رکھ کے بھول گئے تھے کتاب میں
آنکھوں کی پیاس تشنہ لبی سے بھی بڑھ گئی
دریا دکھائی دینے لگے ہیں سراب میں
بڑھ جاتی ہیں کچھ اور مرے دل کی دھڑکنیں
آنسو ملا کے پیتا ہوں جب میں شراب میں
یہ خط میں لکھ کے پوچھا تھا کیسا مزاج ہے؟
اک پھول اس نے بھیج دیا ہے جواب میں

وہ آنکھیں جاگتی ہیں مجھے ڈھونڈتی نہ ہوں
کچھ کہنا چاہتی ہیں تمنا جو خواب میں

[illegible]

شیخ حبیب اللہ

چاند سلطانا

سبز و تر و تازا پھولوں اور ڈالیوں سے گھرے ہوئے مینار شگفتہ کلیوں کی طرح دلکش معلوم ہو رہے تھے، سفید کبوتر، ننھی منی چڑیاں، بھونرے اور رنگ برنگ کی تیتریاں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں اور پرسکوت فضا کی بہار کی دلفریبی کو دوبالا کر رہی تھیں۔ اسی جگہ پھولوں کی خوشبوؤں میں چاند سلطانا تلاوت کلام پاک میں غرق تھی۔ اس کی سادگی، سنجیدگی اور اعضا کے تناسب کا حسن۔ اس کے شباب رفتا کی دل ربائی کو آفتاب کی شعاعوں کی زر فشانی چار چاند لگا رہی تھی۔

ایک خفیف کھانسی کی آواز نے اس کے استغراق کو منتشر کر دیا۔ اس کے سامنے ایک درباری افسر کھڑا آداب بجا لا رہا تھا سلطانا اسے دیکھتے ہی نقاب پوش ہو گئی اور سلام کا جواب دیتے ہوئے گویا ہوئی۔

"کیوں تمہیں کون سی ضرورت یہاں لے آئی!"

"میری محبت مجھے لائی ہے۔ اور کیا شے ہو سکتی ہے پیاری سلطانا!"

"کیا دماغ خراب ہو گیا ہے محمد خان! میری محبت تو میرے مرحوم شوہر کے ساتھ لحد میں خوابیدہ ہے۔"

محمد خان۔ تم بیوقوف ہو سلطانا۔ زندگی کو پرلطف و پرکیف بناؤ۔

سلطانا۔ یہ پرلطف و پرکیف ہے ہی۔ میری زندگی میرے ملک کے لیے اس وقت تک وقف ہے کہ موت اپنی آغوش میں لیکر مجھے میری محبت کے پاس پہنچا دے۔

محمد خان۔ ملک کی خدمت تم میرے ساتھ شادی کرکے اور زیادہ کر سکتی ہو اور اس وقت تمہاری حیثیت ملکۂ احمد نگر کی ہوگی۔ چہ جائے کہ تم اس وقت صرف نگراں ہو۔

سلطانا۔ کیا تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟

محمد خان۔ میں اپنی زندگی میں اتنا سنجیدہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

سلطانا۔ اف یہ ہے تمہاری اصلیت۔ احمد نگر کی شہنشاہی کا خواب دیکھ رہے ہو۔ (گرج کر)

محمد خان۔ خدارا اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرو

سلطانا۔ خاموش! (سلطانا نے تحکمانہ انداز میں) تم غدار ہو۔

سلطانا خشم آلود و غضب ناک ہو گئی۔
بیا مرز از جملہ غارت گری ہا کا سماں دیکھ کر محمد خان کی چوکڑی گم ہو گئی۔

سلطانا نے کہا۔ میں نے تمہاری سازشوں پر آنکھیں بند کر لی تھیں، لیکن یاد رکھو کہ آئینہ تمہیں اپنے کرتوت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

سانپ سے بڑھ کر ہے دنیا میں منافق کا وجود

قریب کے میناروں سے اللہ اکبر کی صدا گونجنے لگی۔

سلطانا۔ مغرب کی اذان۔ جاؤ، دور ہو۔ مجھے میرے خدا کے حضور تنہا چھوڑ دو۔

شیطانی مسکراہٹ محمد خان کے لبوں پر رقص کرنے لگی اور وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے روانہ ہوا، "تیری قسمت خفتہ ہے سلطانا۔"

اکبر چاند سلطانہ پر کامیابی حاصل کرنے سے قاصر تھا - اسے محمد خان کا خفیہ خط موصول ہوتا ہے -

" اگر احمد نگر پر آپ کی طرف سے چڑھائی کی جائے تو کوئی مزاحمت نہیں ہوگی - محمد خان - "

احمد نگر میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے - اکبر دلی سے آچکا تھا اور احمد نگر پر پے بہ پے حملے کر رہا تھا - چاند سلطانہ کے سپاہی آٹے میں نمک کے برابر تھے - مٹھی بھر سپاہی ایک لشکر جرار کا کیوں کر مقابلہ کر سکتے تھے - احمد نگر کی نگاہیں عرش معلیٰ کی جانب لگی ہوئی تھیں اور خدائے لم یزل سے اپنے دشمنوں سے نجات کی دعائیں مانگ رہی تھیں -

زرہ بکتر میں ملبوس ہو کر سلطانہ نے اپنے خوبصورت بالوں پر دستار شجاعت باندھی اور چہرے پر نقاب ڈال کر گھوڑے پر سوار ہو گئی اور سپاہ کی صفوں میں جا کر اپنے شیر دل سپاہیوں کا دل بڑھانے لگی -

" مجھے تمہاری حب الوطنی، شجاعت اور جاں بازی اور نمک حلالی پر پورا وثوق ہے - "

اس آشوب و ہنگامے میں بھی اس کی درد بھری آواز گونج پیدا کر رہی تھی -

مغرور مغل ! ہماری دلیری، جوش عمل، سرور حب الوطنی اور بے مثل نظم و تنظیم جو متعدد بار منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، دشمنوں کو سرنگوں کر کے چھوڑیں گی -

اپنی شمشیر براں کو جس کی چمک آفتاب کی شعاعوں کو شرمندہ کر رہی تھی، اٹھا کر گویا ہوئی -

" کیا میری باتوں کو قبول کرتے ہو ؟ کیا تم قربانی کے لیے تیار ہو ! فتح و جاہ سے شکست حسین و جمیل احمد نگر کو بچانے کے لیے ! "

جوش سے بھرے ہوئے نعرے سلطانہ کے سوالات کے جواب دینے لگے - ہر ایک متاثر تھا اور مرنے کو تیار - بگل کی آواز سے فضا میں گونج پیدا ہو گئی - یہ قلعے سے نمودار ہو رہی تھی - یہ خطرے کی آواز تھی - چاند بی بی اس مقام پر بجلی کی طرح پہنچی - ایک سنتری جان توڑ رہا تھا -

" دشمن قلعہ پر حملہ کر رہے ہیں " سنتری نے یہ جملہ ادا کرتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا - مردہ سنتری کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چاند سلطانہ نے کہا -

" بہشت بریں میں تمہارے مقام سے بڑھ کر افضل اور کوئی مقام نہیں - "

سلطانہ نے اپنے سپاہی سمیٹ لیے اور مدافعت شروع کر دی - دشمن قلعے کو آتش فشاں کر رہے تھے اور اس کا علم کسی کو نہ ہو سکا - یکایک قلعہ کا ایک ٹکڑا پتنگ کی طرح اڑ گیا اور ریزہ ریزہ ہو کر صدہا سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا -

چاند بی بی کی آنکھیں جھک گئیں اور آنسو جاری ہو گئے مگر فوراً آنسوؤں کو پونچھ ڈالا - کیونکہ دشمن مسمار شدہ راہ سے داخل ہو رہے تھے - سلطانہ کے سپاہی بھی اپنی بندوق کی گولیوں سے دشمنوں کا ناطقہ بند کر رہے تھے شام ہو گئی اور جنگ آئندہ روز کے لیے ملتوی ہو گئی -

دشمنوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی کون سی بات تھی ! قلعہ صحیح و سالم کھڑا تھا ! ایک نئی دیوار مسمار شدہ دیوار کی جگہ لے چکی تھی اور خود چاند بی بی اس کی سنتری تھی - زرہ بکتر میں ملبوس تھی، چہرا نقاب پوش تھا اور اس کی شمشیر آبدار نظروں کو خیرہ کر رہی تھی -

اکبر کے دل میں سلطانہ کا حب الوطنی کی توقیر پیدا پیدا ہو گئی وہ اسے انتہائی حیرت سے دیکھ رہا تھا -

اکبر نے بے دلی سے حملہ کیا - چاند سلطانہ کی سپاہ نے بھی گولہ باری شروع کر دی - دشمنوں کی طرف سے ترکی بہ ترکی جواب دیا جانے لگا - مٹھی بھر سپاہی اور مٹھی بھر ننھی منی سلطنت کے ایک تمک لشکر جرار کے مقابلے کی تاب لا سکتے تھے - گولے ختم ہو گئے سلطانہ کی فراست نے اس کی رہبری کی اور اس نے لوہے کے ٹکڑے کیل کانٹے وغیرہ لانے کا حکم دیا اور اسی طرح دشمنوں پر حملہ جاری رہا لیکن یہ ذخیرہ بھی ختم ہو گیا - سلطانہ نے خزانہ کھول دینے کا حکم دیا اور تمام روپے پیسے بھی توپ کے منہ میں جا کر دشمنوں کے سینوں میں پیوست ہو گئے، مگر یہ بھی ختم ہو گئے تو پھر چاند بی بی نے ہیرے جواہرات بھی توپ کی نذر کر دیے -

یہ منظر دیکھ کر اکبر تصویر حیرت بن گیا - اکبر اکبر ! ایسی بے مثال شجاعت کی مثال کب [illegible] گر لیاں چاند سلطانہ کے ارد گرد [illegible]

گویاں چلا رہے تھے۔ سلطانہ کو معلوم ہو گیا کہ اب قلعہ بند لڑائی سے کام نہ چلے گا۔ اس نے قلعے کے دروازے کھول دیے اور اپنے سپاہیوں کو لے کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑی۔ مغل خونخوار بھیڑیوں کی طرح مقابلے کے لیے بڑھے، مگر اکبر کی گرجدار آواز "ٹھہرو" نے اسے ساکت کر دیا۔ اکبر کی تلوار زمین سے پیشانی کی طرف سلطانہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اٹھی۔ سلطانہ کے سپاہی رک گئے۔ اور وہ گھوڑے سے اتر کر سرنگوں ہو گئی اور شہنشاہ کے سلام کا جواب دیا۔ صلح کا جھنڈا لہرانے لگا۔

چاند بی بی محل میں داخل ہو گئی۔ تلوار کو بوسا دیکر آویزاں کر دیا۔ زرا بکتر اتار کر آب معطر سے غسل کیا اور اپنی نسوانی پوشاک زیب تن کر لی۔ سر سے لیکر پیر تک سفید ملبوس۔

"حضور حور معلوم ہوتی ہیں" سلطانہ کی دایا نے کہا۔ گالوں پر انگلیاں مار کر۔ سفید لباس کی یہی خوبی ہے۔ میں اپنے شوہر سے بہشت میں اسی لباس میں ملنا چاہتی ہوں۔ کل کا دن احمد نگر کے حق میں بہترین اور مسعود ترین دن ہوگا۔ اکبر اعظم کی حمایت و سرپرستی میں ہمارا وطن دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گا۔

جمائی لیتے ہوئے اب مجھے سو جانا چاہیے۔

یکایک ایک افسر دوڑتا ہوا آیا "بھاگیے حضور بھاگیے!" "کیوں کیا ہوا؟"

محمد خان نے نابالغ بادشاہ اور شاہی امرا کو آپ کے خلاف ورغلا دیا ہے کہ آپ نے اکبر اعظم سے صلح کرکے ملک کو غلام بنا دیا ہے۔ محمد خان آپ کے خون کا پیاسا ہے۔ دیر کرنے کا موقع نہیں ہے۔ بھاگیے۔ آپ کے لیے صبا رفتار سواری تیار ہے۔"

"مت ڈرو! میں ان کا مقابلہ کروں گی اور انہیں نیچا دکھاؤں گی۔ دیکھیں ایک غدار کی شیطنت و کینہ پروری کامیاب ہوتی ہے یا ایک راست بازی سچائی۔"

اسی درمیان محمد خان نمودار ہوتا ہے۔ اس کے پہلے کہ سلطانہ کچھ کہے، اس نے برق رفتاری سے خنجر بھونک دیا اور چاند سلطانہ زمین پر گر پڑی۔

[illegible] کا معمہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

اکبر خیمے میں شرائط صلح پر غور کر رہا تھا کہ ایک افسر دوڑتا ہوا آیا اور کہا۔

"چاند سلطانہ قتل کر دی گئیں۔"

اکبر آپے سے باہر ہو گیا۔ دنیا نظروں میں تاریک ہو گئی اور سکتے کے عالم میں افسر کو دیکھنے لگا۔ پورا قصہ سننے کے بعد اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

"ایسا شیطانی جرم! مجرم کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ ہم اس کا بدلا لیں گے۔"

مغل سپاہی احمد نگر پر ٹوٹ پڑے۔ گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ غداروں کو چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ محمد خان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے اور اس طرح ۱۶۰۰ء اور ۱۷۰۰ء صدی کے اوائل میں احمد نگر اکبر کے ہاتھ میں آ گیا۔ دوسرے دن صلح کا جھنڈا لہرانے لگا اور مغل سپاہی زرق برق وردیوں میں قطار اندر قطار کھڑے تھے اور یہ تمام اہتمام شیر دل خاتون چاند سلطانہ کی روح کو خوش کرنے اور گنہائے تحسین و آفرین پیش کرنے کو کیا گیا تھا۔ مغل سپاہ اکبر کی سرکردگی میں چاند سلطانہ کی لاش کو دفن کرنے لیجا رہی تھی۔

آخرکار احمد نگر کی سعید ترین بیٹی سپرد خاک کر دی گئی۔ اکبر اعظم، اس کے افسر اور سپاہیوں نے سلطانہ کے مزار پر عقیدت کی انتہا کی اور پھر اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دگر است

غزل

کرکے بیداد جفا بھول گئے
لیتے احسان کیا بھول گئے

یاد بس آتا رہا بھول گئے
ہائے کیا یاد تھا کیا بھول گئے

ہر جفا اہل وفا بھول گئے
جو بھی ہونا تھا ہوا بھول گئے

رنج سہتے شب فرقت نے دیے
آپ نے یاد کیا بھول گئے

ہم وہ درویش صفت ہیں صاحب
جبر جو ہم پہ ہوا بھول گئے

[illegible]

عطیا پروین

چچی چمن کا مشورا اندرا گاندھی کو

چچی چمن نے ایک زور کا چٹخارا بھرا ۔

" اللہ سلامت رکھے بی بی تم کو ۔ دہی کی پھلکی بنا رہی ہو ؟ "

" ہاں چچی ۔ آیئے آپ بھی کھایئے ! "

میں نے دہی میں مصالحا ملاتے ہوئے کہا اور چچی کا چہرا چمک اٹھا ۔ دیوار سے ٹکا ہوا لکڑی کا پیڑا چولہے کے سامنے بچھا کر بیٹھتے ہوئے ہات پھیلا کر آگ تاپتے ہوئے بولیں ۔

" ضرور کھاؤں گی وہ کیا کہتے ہیں چشم روشن دل میرا شاد "

" واہ " بھیا نے ایک گرما گرم پھلکی سوس میں رکھتے ہوئے حق ہے والے انداز میں نعرا لگایا ۔ چچی نے تیکھی نظر سے ان کو دیکھا ۔

" کاہے کی واہ واہی ہوئی بھیا گیا ۔ مصرا بن کر دیا میں نے ۔ تو اور سنو آتے دیر نہیں چٹیا گھسیٹتے دیر نہیں "

" ارے نہیں واللہ ! چچی میں آپ کو تھوڑے کہہ رہا تھا ۔ بھیا نے جلدی سے صفائی پیش کی ۔ میں تو پھلکی کی تعریف کر رہا تھا واہ ! کیا عمدا پھلکی ہے جیسے ۔ " چچی نے پرجوش انداز میں ان کی بات کاٹ لی ۔

" ہاں بیٹے جیسے جنت کے انگور ۔ "

پھلکی اور انگور کی مناسبت کیا خوب تھی لیکن چچی کی بات کی تردید کرنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے میں نے ہوا کا رخ دیکھ کر ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور کڑاہی سے نکالی پھلکیاں پلیٹ میں رکھ کر ان کی طرف بڑھا دیں ۔ چچی نے پلیٹ ہات سے لے کر ایک پھلکی اٹھاتے ہوئے منھ بنا کر کہا ۔ " اے بیٹی تمہاری خاطر دو چار کھا لوں گی ۔ داڑھ میں کل سے ٹیسوں کا درد ہے رات بھر تڑپی ہوں ۔ "

" ہل رہی ہوگی داڑھ ۔ خالا جان نے کہا اور ان کو چڑانے کے لیے ٹکڑا لگا دیا ۔ اے بی اب سن بھی ہے داڑھ گرنے کا اسی کا درد ہے ! "

چچی نے پوری پھلکی غڑاک سے نگل لی اور تڑپ کر بولیں ۔ " اوئی میری اندھیر ہے ۔ کون سا سن ہے میرا داڑھیں گرنے کا ؟ ارے نہ ہوئیں مرحوما اللہ ان کو بہشت نصیب کرے ممانی جان ۔ انگلیوں پہ حساب لگا کے بتا دیتیں کی کتنا سن ہے میرا ۔ پریشانیوں اور دکھوں نے توڑ کے رکھ دیا مجھے نہیں تو کون سا سن نکل گیا ہے ۔ ڈالڈے نے موئے بال سفید کر دیے نزلے نے دانت ہلا دیے تو سب سمجھتے ہیں سو برس کی بڑھیا ہوں میں ۔ " اللہ کی شان ایک اور پھلکی منھ میں رکھ لی بولنے کی کوشش کی مگر جب پھولے ہوئے گلوں نے اجازت نہ دی تب مجبوراً پھلکی کو جلدی جلدی چبانے میں مصروف ہو گئیں ۔ خالا جان نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا ۔

" اے ہاں غلطی ہوئی بی ۔ سن تو میرا ہے دانت گرنے اور سٹھیانے کا اسی لیے تمہارا سن کا نقلے سے اتر گیا ارے اگر میرے بھائی ہوتے تو ابھی تمہاری گود کے بھرنے کے دن تھے ۔ "

وہ زور کی ہنسی آئی مجھے کہ ضبط کرنا دشوار ہو گیا اور بھیا پر کھانسی کا دورا پڑا اپنی ہنسی چھپانے لگے

بچی ایسا ایسا شرمائی ہیں کہ کیا بتاؤں اللہ جیسے نئی نویلی دلہن!

"ارے ہشو بھابھی تم بھی بچوں کے سامنے مزاخ کرتی ہو۔" ایک پھلکی اور منہ میں گئی۔

"مزاخ" "کیا صحیح بات کر رہی ہوں" بہو کے ساتھ ساتھ تم بھی زچا خانے میں بیٹھ کر ستھورا اچھوانی کھاتیں!"

چچی زور سے چیخیں۔ "دیکھو بھابی تمہیں شکل کث کی قسم ہمار گالی سنا لو مجھے مگر بہو کے ساتھ میل نہ ملایا کرو۔ مردیاں ردیاں سلگ جاتا ہے میرا۔ ارے وہ بہو ہے۔ راہ چلتے ناشادنے ہاتھ پکڑ کے مسہری پر بٹھا لیا تو وہ بہو ہو گئی جھلسا لگا دوں قطاما کے منہ میں۔"

"اب کچھ سمجھ لی دنیا اسے تمہاری بہو ہی کہے گی۔" خالا جان نے مایوسی سے کہا۔

"آگ لگا دوں اس دنیا کو۔ چچی پلیٹ پٹک کر چلائیں۔ ذرا کوئی مییا کا لال میرے سامنے آ کے تو کہے بہو پھلکی کی طرح سینے نہ اکھاڑ لوں تو چونڈا مونڈ لینا میرا۔"

"مگر ان لوگوں نے باقاعدہ سول میرج کی ہے چچی!" بھیا بولے۔ چچی ان کی طرف پلٹ پڑیں اس طرح گھورا کہ تو ان ہی نے سول میرج کروائی ہو۔

"کیا کہا؟ سلو میراج کی ہے۔ کیسی سلو مراج۔"

"سول میرج۔ یعنی قانونی شادی۔ عدالت میں رجسٹر پر دستخط کر کے کہ ہم میاں بیوی ہیں۔ بھیا نے کہا تو چچی اور بھپریں۔

"جھاڑو پھرے رجسٹر پر اور آگ لگے سلو میراج پر۔ لو اور سنو۔ مشک پر۔ دستخ کر دیے کہ ہم میاں بیوی ہیں۔ میں اور میاں بی بی سمجوں ان کو؟ ارے کوئی گلا کاٹ لے میرا ہی کیوں لگی سلو میراج گئی بھاڑ میں کھلی کھلی حرام کاری ہے۔"

"لاحول۔" بھیا نے کانوں پر ہات رکھے۔

لاحول ہی بھیجو اس قاعدے پر۔ چچی شعلے جوالا بنی ہوئی تھیں۔ ارے میں کیا اللہ کہے گا عاقبت میں منہ کالا ہو گا۔ لو اور سنو رجسٹر پر دستخ کر دیے اسی عدالت سے بڑھ کے وہ عدالت ہے جب وہاں کھولا جائے گا رجسٹر تب پتا چلے گا اللہ کی شان رجسٹر کی شادی۔ نہ نکاح نہ [illegible] اور ہو گئے میاں بی بی! کبھی جا رہی ہے میری بہو۔ ڈھائی گھڑی کی موت آئے قبر سے دھواں اٹھے۔"

"وہ بہو ہے۔ خالا جان کو ترس آ گیا۔ ایسے نہ کوسو جوان جہان کو۔"

"کیوں نہ کوسوں؟ کس کا اجارا ہے کون زبان بند کرے گا میری۔ چچی اور زور سے چلائیں۔ لو اور سنو ایسے نہ کوسو۔ ارے میرے کلیجے میں آگ لگی ہے اور میں آہ نہ کروں بتاؤ بھلا۔"

"نہیں نہیں چچی۔ ضرور کوسئے گود پھیلا پھیلا کر کوسیے" بھیا نے چچی کے زخموں پر مرہم رکھا تھوڑا بہت نہیں لرزا پھر۔ واہ خالا جان واہ آپ نے بھی خوب کہی سچ چچی کے دل میں آگ لگی ہو گی یہ دیکھیے آہوں کے ساتھ ساتھ دھواں نکل رہا ہے۔" بھیا نے چچی کی ٹھوڑی میں انگلی چبھلائی تو چچی بڑے زور سے اچھلیں بھیا کو گھور کر بولیں۔

اے بس الگ رہنا۔ اوئی مجھے ہول آتا ہے لو اور سنو ٹھوڑی چھو رہے ہیں ارے میاں ذرا تو پاس لحاظ کرو شرم نہ کرو نہ سہی بڑوں کی ٹھوڑی میں اس طرح ہات نہیں لگایا جاتا ہے اللہ کی شان آج ٹھوڑی چھوئی کل چوٹی پکڑ لینا۔!"

"ارے توبا! توبا! معاذاللہ! توبا توبا! بھیا نے آنکھیں میچ کر تڑاتڑ دونوں گلوں پر طمانچے مارے (اپنے اور کسی کے نہیں) ارے میں اور آپ کی چوٹی پکڑوں توبا توبا! پھر جلدی سے بھیا نے پھلکی کی پلیٹ اٹھا کر ان کے سامنے تھام لی۔ یہ لیجیے چچی پھلکی کھائیے۔ ارے پروین چار چھے گرم گرم پھلکی لاؤ چچی کے لیے ذرا سی پیاز اور ہری مرچ اور کتر دو اور ہاں چٹنی کہاں ہے۔ ارے واہ واہ چٹنی نہیں دی چچی کو کمال ہو گیا بھئی چٹنی چھپائے بیٹھی ہو۔ چچی کا موڈ آن واحد میں بدل گیا چہک کر بولیں۔

"اے ہاں لو اسلم میاں نہ بتاتے تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا چٹنی اور پھلکی تو وہ کیا کہتے ہیں میرے ابا۔ اللہ اللہ کر جنت کی ہوا کھلائے کہا کرتے تھے چٹنی اور پھلکی تو لازم اور ملظوم ہیں۔

"لازم اور ملظوم۔ بھیا نے اپنا سر کھجاتے ہوئے بھابی سے کہا۔ چچی آپ شاید بھول رہی ہیں۔ لازم و ملزوم کہتے ہوں گے آپ کے ابا۔

"نہیں بھیا۔ چچی نے بے شفقت سے کہا۔ لازم

مظلوم کہتے تھے اب میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی ہے۔
لا دو بی بی ایک انگلی بھر چٹنی دے دو۔ میں نے ایک چمچا چٹنی ان کی پلیٹ میں رکھ دی۔

" اوئی بیوی تم نے تو اللہ قسم حاتم طائی کی قبر میں لات مار دی۔ لو دیکھو ذرا چٹنی دی ہے مردی جیسے ندیدے کی نظر۔" میں نے شرمندہ ہو کر ڈھیر سی چٹنی ان کی پلیٹ میں رکھ دی۔ چچی نے ایک پھلکی میں چٹنی لگا کر منھ میں رکھ لی جلدی جلدی چبا کر حلق کے نیچے اتار کر بولیں۔

" جیتی رہو بی اللہ دولھا میاں کو تھانیدار بنا دے۔ جی خوش کر دیا۔ بہت دنوں سے جی چاہ رہا تھا اسی طرح کی پھلکی کھانے کا مگر بی بی پکاتی تو سمجھو تین چار روپے کا نقصان ہوتا۔ بازار سے بھی یاد پھر بیسن یاد پھر تیل مرچ زیرا نمک لہسن کالی مرچ۔"

" تین چار روپے نہیں کم سے کم آٹھ روپے چچی!" بھیا نے کہا۔ چچی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، اظہار تاسف کے طور پر ایک پھلکی اور بھاگی چٹنی چاٹ پھر بولیں۔

" ہاں میاں ٹھیک کہتے ہو۔ ارے آج کل زہر بھی تو مرنے بھر کا نہیں مل پاتا وہ اور زمانا تھا جب چار پیسے کی سنکھیا بڑے بڑے کرئیل جوانوں کے لیے بہت ہوتی تھی۔

" اگر میں خودکشی کرنا چاہوں تو کتنے کی سنکھیا لاؤں چچی؟" بھیا نے بڑی معصومیت سے پوچھا خالا جان کی۔

" اے توبہ اللہ نہ کرے" کی فریاد کے ساتھ ہی چچی چلائیں۔ " ارے دور پار دشمنوں برا چاہنے والوں کے کان بہرے ہوں۔ لو اور سنو کتنے کی سنکھیا۔ ہائے میا ہوتی، کلیجا تھام کے رہ جاتی۔ ساتھ ہی انہوں نے کنکھیوں سے خالا جان کی طرف دیکھا۔ ارے مثل کہتے ہیں بی جو ماں سے زیادہ چاہے۔ پھا پھا کٹنی۔ میاں سے کون زیادہ چاہے گا اے ہے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا نا میاں ایسی بدفالی نہ نکالا کرو منھ سے تم نے سنا نہیں کہ دن رات میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے اللہ میاں سے جو خواہش کرو پوری ہو جاتی ہے وہ کیا کہتے ہیں دعا قبول ہوتی ہے۔" یعنی ... ؟؟؟" بھیا نے چکرا جانے والے انداز میں مجھے دیکھا " حد ہے مستجاب۔" میں نے چپکے سے ان کا مشکل حل کر دی۔ چچی جن کی اس چھیڑ کا خالا جان [illegible] ہیں۔

" میرے منے میاں نے اگر سول میرج کر لی تو میں بی خدا کی قسم میں پوری عزت اور خوشی کے ساتھ اپنی بہو کو خوش آمدید کہوں گی۔"

چچی کے تلووں سے لگی سر میں بجھی پلیٹ ہاتھ سے پٹک کر دوپٹا کے پلو سے ناک پونچھتی ہوئی بولیں۔

" ہاں ہاں بھابی شاباش تمہارے جگرے کو ارے تمہاری ایسی ماؤں نے بچوں کو برباد کیا ہے خودسر کیا ہے لڑکوں لڑکیوں کا قصور نہیں ہے ماں باپ کا ہے یہ آج کل کی آزادی ان ہی لوگوں کی ڈھیل کا نتیجا ہے۔ غضب خدا کا ان کا لڑکا سول میرج کرے گا اور یہ اس ہوتی سوتی کو بہو بنا کے کلیجا ٹھنڈا کریں گی اس کی! لو اور سنو ایک وہ زمانا تھا کہ بہوئیں ساسوں کی خوشامد کرتی تھیں ایک اب یہ زمانا آیا ہے اللہ اس پر جھاڑو پھیرے سا سیں خوشامدیں کریں گی۔ پاؤں دھو دھو کے پئیں گی کہ بی بی میرا بڑا نصیبا میرا اتم میں گرجے بادل کی طرح میرے گھر پر برس پڑیں۔ اللہ نوج یوں دیدے چاتی کیسے جا رہے اولادوں کے۔ تم پھر بسم اللہ! اسلم میاں جاؤ نکھٹو کسی راہ چلتی کو پکڑ لو عدالت میں رجسٹر پر دستخط کرو اور بغل میں ہاتھ ڈال کے ابا میاں کے سامنے لا کھڑا کر دو کہ ابا آداب یہ لیجیے آپ کی بہو آئی ہے۔

" اور آپ سے کیا کہوں گا چچی آ بھیا بے حد سعادت مندی سے بولے۔

چچی نے آنکھیں پھاڑیں ان کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر غرائیں۔

" میں کیا کہوں گی۔ بیٹا برا نہ مانو تو بتاؤں کچی بات بڑی کڑوی لگتی ہے پھر نا چھے نہ لگنا۔ میں اپنی جوتی اتار دوں گی اور دکھا دوں گی۔ بی! میرے گھر سے نکلو تو سیدھی طرح ورنا حشر برپا کر دوں گی۔"

" یہ قدر کریں گی آپ میری بیوی کی! بھیا نے منھ بسورا۔ چچی آپ سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔

" ہاں ہاں برا مانو تو میری جوتی سے خفا ہو تو میرے ٹھینگے سے میں اس کو سر پر نہ بٹھا دوں گا صدقے واری یہ تمہاری خالا جان ہوں گی۔ انہیں کو لا کے سلام کرانا۔ اللہ کی شان اب یہ زمانا آ گیا ہے ابھی تک میں لڑکوں لڑکیوں کی حیا شرم کو رو تی تھی اب دیکھوں [illegible]
[illegible]

ذرا چکھ کیسا ہے بتایئے گا ! میں نے بھر پیالا دہی چچی کے سامنے رکھ دیا۔ چچی نے پہلے مجھے پھر دہی کے پیالے کو دیکھا برا سا موتھ بنایا۔

"اے ہے بیٹی کل سے حلق میں خراش ہو گئی ہے نزلا معلوم ہوتا ہے دہی کہیں نقصان نہ کرے۔ خیر لاؤ دو گھونٹ پی کے دیکھوں نمک ٹھیک ہے کی نہیں ایک گھونٹ بھر کر۔ بڑا عمدا دہی جیسے ملائی۔ نمک بھی ٹھیک ہے۔ دوسرا گھونٹ لے کر۔ کون کونسا مصالحا لایا ہے بی بی بڑا لذت دار ہے۔ تیسرا گھونٹ۔ ارے ایسا ہی دہی میں بناتی تھی۔ میری ساس جنت نصیب ہات چوم چوم لیتی تھیں میرے۔ چوتھا گھونٹ۔ فقرے کہتی پھرتی تھیں۔ میری بہو کی ایسی دہی کی پھلکی کوئی بنا نہیں سکتا۔ تمہارے چچا اللہ ان کو جنت کی حوروں کے ہات کی پھلکیاں جی بھر بھر کے کھلائے۔ بڑے بڑے ڈپٹی، تحصیلداروں کے لیے بنوا بنوا کے لے جاتے تھے۔ پانچواں گھونٹ۔ اور اب بی بی میری پھلکی تو پھلکی ہو گئیں۔ پورا پیالا ختم۔ ایک زوردار ڈکار۔ اللہ تیرا شکر ہے بس اب رات کے کھانے سے بھی زحمت ہوئی۔ دوسری ڈکار۔ پھر پچھلے پہر بھوک لگی تو ایک پیالی چائے بنا کے چار روٹی کھا لوں گی اور اللہ کا شکر ادا کروں گی۔ اے بی آجکل لوگ حلق تک ٹھونس ٹھونس کے بھی اللہ کا شکر نہیں کرتے ایک وقت کا کھانا آج کل سمجھو ایک جہاد ہے جس کو مل جائے غنیمت ہے آے ہاں لو اور سنو فلمی گانے کمبخت مارے ایک ایک کے موتھ سن لو اور پوچھو کیا یاد ہے تو آگے پیچھے تاکنے لگیں گے۔ ارے ہوش اڑ جاتے ہیں خدا یاد آتا ہے۔ قیامت کے خوف سے کلیجا تھرانے لگتا ہے کیا ہوگا اس دنیا کا حشر۔ آج کل وہ موا ایک نیا گانا چلا ہے۔

چچی کو پھر ڈکار آئی میں نے دہی کی پتیلی پر ڈھکن رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون سا گانا چچی ؟"

اے بیٹی وہی جو کل ریڈوا پر آ رہا تھا۔ ارے شرم کے مارے میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ کٹو کٹو ہو گئی لاج میری۔ اور سنا آج ابھی جب میں یہاں آ رہی تھی ایک موئی اِلّی سی۔ (ہات سے اشارا کر کے) بالشت بھر کی چھوکری گوری گوری سی پیاری پیاری صورت [illegible] سڑک پر الاپتی چلی جا رہی تھی اے ہے ہم تم کمرے میں بند ہوں۔ ارے موتھ پیٹ ڈالا میں نے۔ یہ ننھی سی جان اور یہ کرم تو بھلا اب اگر وہ انگلی برابر لونڈیا اپنے ابا اماں سے پوچھے کی اس کا مطلب کیا ہوا تو ؟

"ہاں واقعی یہ تو ہے صحی بات۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں" بھیا نے کہا اور چچی نے ترچھی چتون سے ان کو دیکھا۔

"اے میاں اللہ نہ کرے پیٹ میں مروڑ نہیں اٹھے گی ذرا دیر یہ مردی انگریزی نہ بول۔ لو اور سنو تفاق کرتا ہوں۔"

"چچی یہ انگریزی نہیں ہے۔"

"اے بس بس رہنے دو اپنی صفائی چچی نے بھیا کی بات کاٹ لی۔ جس نے سنی نہ ہو انگریزی اس کو تھو لیا بنا دے۔ اللہ کی شان اب ہم اتنے جاہل آدمی ہو گئے۔ ارے میرے ابا کے لیے انگریز مولوی رکھے گئے تھے۔ وہ پڑھاتے تھے ان کو انگریزی میں بالشت بھر کی تھی ۱۲ گز کا دوپٹا اوڑھے ان کے پاس بیٹھی سنا کرتی تھی۔"

"یہ انگریزی مولوی بھی خوب رہی۔" بھیا بڑبڑائے

"کیسا تھا وہ انگریز مولوی چھمن بہن ؟ خالا جان نے ہنسی روک کر پوچھا۔

"نہ پوچھو بھابی جیسے وہ کیا کہتے ہیں قوہ قاف کا پری زاد۔ گورا گورا بھبھوکا بلی کی ایسی آنکھیں خون کبوتر ایسے ہونٹ تاڑ کی طرح لمبا موسل ایسے ہات جیکی کے پاٹ ایسا سینا۔ برسیں گذر گئیں مگر اب بھی اس کی صورت یاد ہے۔

"بس بی بس۔ خالا جان نے بات پکڑ لی اور دل کو نصیحت خد کو نصیحت۔ آج کل کے بے غیرت لڑکوں لڑکیوں کو تو کہتے بیٹھتی ہو اور اپنے آپ غیر مرد کا سراپا اس طرح بیان کر رہی ہو۔

"ہائے ہوے منے بھائی سنتے ذرا بیگم صاحب کیسی تصویر کھینچ رہی ہیں۔"

چچی بے خیالی میں پکڑ لی گئی تھیں۔ چند لمحوں تک سر کھجاتی رہ گئیں مگر بھلا ہار مانتے والی کب کی۔ جھٹ پینترا بدلا اور چمک کر بولیں۔

"ہوش کی دوا کرو بھابی۔ آج تک کسی نے تنکا اٹھا [illegible] میرے اوپر اللہ کے فضل سے تم بھلا ہو پوری جھانا

مارنے کے لیے - ارے وہ میرے باپ کے برابر تھے میں انہیں کرسٹان چچا کہا کرتی تھی اتی محبت کرتے تھے - مجھ سے ماں سگی بیٹی لو اور سنو جب باپ کی طرح خیال کیا تو غیر کہاں سے ہوئے ارے سو اشرافوں کے ایک اشراف تھے کیا مجال جو نظر اونچی کرلیں ذرا اونچی بولی بول لیں - ذرا زور سے ہنس لیں بہو بیٹی کی ایسی شرم کرتے تھے۔"

"انگریز تھے ؟" بھیا نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

"ہاں ہاں انگریز تھے سیدھے وہ کیا کہتے ہیں لندھن سے آئے تھے - چچی پر زور لہجے میں کہنے لگیں - ارے شرافت کوئی تمہاری میراث ہو کے تھوڑے رہ گئی ہے - سب فگہ موجود ہے مگر وہی مثل ہے نا کی ایک مچھلی سارے تال کو گندا کرتی ہے - انہوں میں دیکھ لو کہاں کی حیا کہاں کی شرم بم بم اور وہ اڑ گئے فنٹیا اور وہ بندوق کے غلاف پہنے سب کی سب کولے مٹکاتے پھرتے ہیں۔ اے ہے لو اب ایک اور نیا نام سنتا ہے - " چچی دم لینے کو رکیں تو میں نے اشتیاق سے پوچھا -

"کون سا نام چچی ؟"

"کیا کہتے ہیں اس کو ؟ چچی ذرا کی ذرا رکیں ماتھے پر ہات مارا پھر چہکیں - کل نرگس اپنی ماں کے پنڈ پڑی تھی کپڑا منگوا دو پی اے بناؤں گی - "

"پی آئی اے" میں نے کہا۔

"اے ہاں یہی - چچی نے بے زاری سے کہا پھر آنکھیں نچاکر بولیں - اے میں سمجھی کوئی عنقا چیز ہو گی جس کے لیے یہ لونڈیا دم دیئے دے رہی ہے، ایک پاجامہ وہ اپنی کسی گوئیاں سے اپنی اماں کو دکھانے کے لیے لائی تھی میں نے کہا بی ذرا مجھے بھی دکھاؤ موا پی اے - وہ لائی تو ارے ہے وہی مثل ہے کی کھودا پہاڑ نکلا انگل بھر کا چوہا - تنگ موری کا پاجامہ، پاجامہ نہیں گھٹنا علیگڑھ کاٹ کا ہزاروں ہزار سی ڈالے میں نے میرے میاں مرحوم جنت نصیب یہی گھٹنے پہنتے تھے میں نے کہا، اوئی موی اسی کے لیے فیل مچاتے ہو یہ مردانا گھٹنا پہن کے جو نگا بنو گی بی بی - مگر وہ آفت کی پرکالا کنکالا بحث پر اتر آئی وہ دو ٹکریں جھاڑیں کی کیا کہوں - چچی آپ کیا جانیں آج کل یہی فیشن ہے کفایت کی کفایت ہے اس میں کپڑا کم خرچ ہوتا ہے - سینے میں محنت کم پڑتی ہے - یہ اور وہ مار دریا بہا دیا

وہ کیا کہتے ہیں فضیحت غلاظت کا۔"

"فضیحت غلاظت" ؟ میں، بھیا اور خالہ جان یک زبان ہو کر چیخ سے اٹھے۔

اب جو بھیا نے پچھاڑ کھائی ہے تو مت پوچھو۔ بچ گئے ورنا چولے کے اندر برا حال ہو جاتے۔ خالا جان کو اتنی زور کی ہنسی آئی کہ موتھ کی چھالیا حلق میں پھنس گئی کھانستی جاتیں گلا مسلتی جاتیں اور ہنستی جاتیں - ہنسی مجھے بھی آرہی تھی مگر میں اپنے اوپر جبر کیے پیالیوں میں چاے بھی ڈالے جارہی تھی - خدا کا شکر یہ ہوا کہ چچی کو غصا نہیں آیا شاید اس لیے کہ من پسند چیز دہی کی پھلکی کھا چکی تھیں ساتھ میں لے جانے کی بھی امید تھی اور سب سے زیادا پتے کیا چیز بن رہی تھی - اس لیے ذرا تیوری چڑھا کر اے ہوگا! کہا اور بیان جاری کر دیا -

"مگر اس بیان سے پہلے یہ بتا دوں کہ چچی نے فصاحت بلاغت کو ذبح کر کے فضیحت غلاظت کا روپ عطا کر دیا تھا

اے ہاں بی تو بول مار میرا جی الٹ گیا - بات جوڑے بی بی معاف کرو - اب اگر کوئی نصیحت کروں تو جو چور کی سزا وہ میری کتے کے ٹھیکرے میں کھلانا مجھے توبہ میری جو تی کرے نصیحت بھاڑ میں جاے کمبخت مردار آج کل کسی کو نصیحت کر کے نکو بننا ہے مگر کیا کروں یہ جھاڑو پھری زبان نہیں مانتی - لو بتاؤ بھلا یہ گھٹنا کمبخت مارا ہمارے زمانے میں مچھلی والیاں سودے والیاں بہن پہن کے آیا کرتی تھیں یا پھر مرد پہنتے تھے - بی بیاں یا تو فرشی پاجامے پہنتیں، یا دس دس گز کے غرارے لڑکیاں لمبی چوڑی کے پاجامے پہنتی تھیں ان پر گھٹنوں تک کرتے - کیا مجال جو ہات پاؤں اور موتھ کے علاوا کوئی حصا دکھائی دے جاے اور آج کل بی چاے کا چسکا لے کر ہر چیز میں اڑ گیا فیشن گھسا ہے چوڑی دار پاجامے پھر لوٹے تو ان کی صورت ہی بدل ڈالی گئی کرتے بھی پہنے جاتے ہیں پالش پالش بھر کے پھر پھر اڑتے ہوے طباق سے سینے کھلے ہیں دوپٹا گلے میں گلوبند کی طرح لپٹا ہے سر پہ بالوں کا جھوجھا میں کوئی چڑیا تو گھس جاے گھونسلا بنا سکے۔"

اتنا کہہ کر اللہ اچھا رکھے چچی کو قہقہا مار کر ہنسیں ان کے ساتھ ہم سب ہنسنے لگے - چچی نے ہنسنے کے بعد دو گھونٹ چاے کے پیے پھر بولیں - "صبح اخبار میں ایک

تصویریں بنی [illegible] کرتی تو نڈیا تھی انگل انگل بھر کے پٹے وہ بھی سلجے سنورے نہیں یوں الجھے ہوئے جیسے کسی نے جھونٹے پکڑ پکڑ کے نوچے ہوں سنا یہی فیشن ہے اسی طرح بال سنوارے جاتے ہیں اب وہ دن گئے جب ڈھیروں تیل اور پانی لگا کے گھنٹوں پٹیاں اور گیسو بنائے جاتے تھے بہت سی بی بیاں تو گوند کے بال جماتی تھیں۔"

"گوند لگا کے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیٹی گوند لگا کے۔" چچی نے چائے ختم کر کے پیالی پرچ پر اوندھا کے ایک طرف کھسکا دی اور جیب سے بٹوا نکال کر کھولنے لگیں اے گوند اس لیے لگاتی تھیں کی بال موئے منہ پر نہ آ جائے جلدی بگڑیں نہ چھج چھج مذر بال الگ نہ ہوتا اور آج کل ٹھنڈی سانس بھر کر۔ کایا پلٹ گئی ہے اب بال خاص کر کے الجھائے جاتے ہیں یہ موٹی موٹی لٹیں ہاتھی کے سونڈوں کی طرح ماتھے لدوا کانوں پر لٹکائی جاتی ہیں اللہ کی مار اس فیشن پر۔"

"ہاں تو اس لڑکی کی تصویریں اور کیا تھا چچی؟" بھیا نے بیتابی سے پوچھا تو چچی مسکرائیں۔

"بڑی بے قراری ہے بھیا ٹھہرو بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر چچی چھالیا پھانکنے لگیں اور میرے قہقہے پر بھیا شرما کے ساتھ دست پنجے سے لگن کے اوپر ایک نئی دھن بجانے میں مصروف ہو گئے۔

کتھا چونا چاٹ کر چچی بولیں۔

"جوان دھاکڑ لونڈیا کی تصویر تھی بڑی پیاری صورت تھی، مگر دیکھ بگاڑے ہوئے تھی۔ سیدھی کنگھی چوٹی ہوتی پاجامہ جمپر پہنے ہوتی دوپٹا سر پر نہ ہوتا آگ لگے وہ سینے پر تو ہوتا۔ دیکھنے والی صورت بھولی اس کی مگر۔" ماتھے پر ہتھیلی رکھ کر افسوس کے اظہار میں سر ہلاتے ہوئے، "مگر اس کا پہناوا دیکھ کے ہوش اڑ گئے بی۔ چھل چھل پسینہ بہہ نکلا۔ مشکل کشا قسم کوئی پلٹی رکھ دیتا تو چھلک جاتی اس پسینے سے ارے توبہ اسے پہنے نہ بنیم نہ فتیلیا نہ چوڑی دار تنگ"

"پھر کیا ننگی تھی؟" خالہ جان کی کھانسی اللہ اللہ کر کے رکی تھی۔

"اے بھابھی ننگی ہی سمجھو اللہ توبہ! اللہ توبہ!" چچی اپنے گال پیٹ کے بولیں۔ "ارے ایک بلوس وہ بھی بلا آستینوں کا آگے خندق پیچھے خندق اور اس کے نیچے ایک ایک بالشت کا گھیرا۔ کمبخت کی قسم بس ایک بالشت کا ٹخنوں سے کہیں اونچا ارے جھکتی ہوگی تو پیچھے سب ارے میرے مولا بس اب عورتوں کی عزت آبرو تیرے حوالے ہے بتا دیں یہ کرسٹانوں کا پہناوا پہن کے کون سی ترقی کر رہی ہیں لڑکیاں ارے ڈوب مرو چلو بھر پانی میں اندرا گاندھی سے سبق لو بڑی ہزاروں مردوں میں رہنے والی عورت اتی شرم اتی حیا اتا رکھ رکھاؤ جس تصویر میں دیکھو پلو سر پر ٹخنوں تک ساڑھی سے چھپی ہوئی کیا مجال جو سینا پر سے آنچل سرک جائے اس کو کہتے ہیں عورت کی شان اور آن مجھے ملیں اندرا ایشیا تو میں کہوں بی بی دوسری تقریریں کرتی رہنا پہلے یہ تکبیر کرو کی عورتیں ننگی بیٹھیں۔ شرم و حیا کو گھول کے نہ پیئیں کرسٹانوں کی نقل نہ کریں مسٹک کے وہ کیا کہتے ہیں نظارے کی دعوت دیتی نہ چلیں اپنا ایک ایک فوٹو بھی بانٹ دیں اور قانون بنا دیں کی ہر عورت کو اس فوٹو کو تعویز کی طرح پہننا ضروری ہے اور اسی طرح پہننا ضروری ہے ورنہ وہ کیا کہتے ہیں کورٹ مارشل کر دی جائیں گی۔"

"خوب! خوب! بہت اچھے۔" بھیا نے تالی بجائی۔

"کورٹ مارشل۔ واہ ری میری چچی زندہ باد۔" میں نے کہا۔

چچی مستقل بول رہی تھیں۔

"اے ہاں آدمی کو چھوڑ ساری کو بھاگے نہ آدمی ملے نہ ساری یاد رہے۔ نقل کریں گی دوسروں کی پوچھ اسی ملک میں پیدا ہوتی ہیں۔"

ڈاکٹر ایس۔ پی۔ تفتہ

رباعی

کیا جانئے کس بات پہ رونا آیا
منہ اپنا اشکوں سے دھونا آیا
الفت تو مقدس جذبہ ہے تفتہ
کیوں جان کی دولت کو کھونا آیا

اسفندار - فروردی - اردی بہشت ۱۳۸۴ف ہندستانی ادب جنوری - فروری - مارچ ۲۰۰۵ء

گنپت سہائے سری واستو ام۔ اے

این۔ بی۔ سین ناشاد۔ دہلوی

قطعہ

این - بی - سین کی طبیعت نے
گل کھلائے ہیں کیا ظرافت کے
طبع افسردہ جن سے کھل جائے
اور کھل جائیں باب فرحت کے
طنز بھی ہے مزاح بھی اس میں
جن میں نکتے نہاں ہیں حکمت کے
سب کو پرتو دیا تبسم کا
جتنے مضمون تھے رنج وراحت کے
دم ناشاد بھی غنیمت ہے
کم ہیں انسان اس طبیعت کے

تلوک چند محروم

ناشاد دہلوی ایک خالص طنز و مزاح نگار شاعر ہیں سنجیدہ اگر شاعر ایک ڈھونڈھو ہزار ملتے ہیں مگر طنز و مزاح نگار شاعر خال خال نظر آتے ہیں۔

ناشاد بلا شبہ عصر طنز و مزاح کے ایک دلاور شہسوار ہیں۔ ظرافت کے جس دشوار گذار میدان میں شعرا کے پائے فکر میں لغزش آجاتی ہے وہاں وہ اپنے اسپ شاعری کو بے لگام سرپٹ دوڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ملک میں مغربیت کی کورانہ تقلید اور نئی تہذیب کے دیوانوں کا ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ ناقد کی نظر سے گہرا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر ان کے معائب و نقائص کا پردہ فاش کرنے کے لیے ان پر طنز کی ایسی چوٹ کرتے ہیں کہ چوٹ کھانے والے تلملا اٹھیں۔ ان کی آنکھوں سے بے خیالی اور غفلت کا پردہ ہٹ جائے اور وہ اصلاح کردار کے لیے آمادہ ہو جائیں ان میں ایسی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ کسی کردار کی خامیوں اور معایب کے پیش کرنے میں بڑی سے بڑی ہستیوں کو بھی نشانہ بنانے میں نتیجہ کی ذرا بھر پروا نہیں کرتے۔ ان کے مزاحیہ اشعار کو پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آتی ہے مگر ان کے طنز و مزاح کا مقصد پس پردہ سماج اور قوم کی برائیوں کا خاتمہ کرنا اور لوگوں کے کردار پر گندا کیچڑ اچھالنا نہیں ہے ان کا مقصد ایک ماہر سول سرجن کی طرح سماج کے کردار کے زہریلے پھوڑوں کا آپریشن کر کے اس کے جسم سے گندے خون کو صحت مند زندگی کے لیے نکال پھینکنا ہے وہ اپنے لطیف طنز کے ذریعے گمراہ قوم کے جذبۂ اصلاح پر تازیانہ لگاتے ہیں۔ ان کے مزاحیہ اشعار سبق آموز ہوتے ہیں اور اپنے دامن میں سنجیدہ اور معنی خیز خیالات چھپائے ہوتے ہیں۔

ناشاد کا سارا کلام طنز و ظرافت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جسے پڑھ کر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء) ہندستان میں طنز و مزاح کے اولین اور اپنے وقت کے سب سے بڑے شاعر ہوئے ہیں ان کی نظر میں شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا۔ انہوں نے انگریزوں کی اندھی تقلید اور انگریزی تعلیم کے زہریلے اثرات کا

اپنے اشعار میں خوب مذاق اڑایا ہے۔ سرسید نے نثر میں اپنے اخلاقی مضامین اور اکبر نے اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعے قومی اصلاح کی جدو جہد کی مگر زمانے کے انقلاب کو دیکھ کر اکبر یہ بالکل صحیح اندازہ لگا چکے تھے کہ تغیرات کا یہ طوفان کسی کے روکے رک نہیں سکتا، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

ایک دوسرے شعر میں یوں فرماتے ہیں۔

اس انقلاب کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں
زمانہ کہتا ہے دیکھا کرو ابھی کیا ہے

اکبر الہ آبادی مرحوم اپنی مختصر زندگی میں ناخوشگوار تغیرات کے طوفان کو روکنے میں جب کامیاب نہیں ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بے چین روح حضرت ناشاد دہلوی کے قالب میں پھر عود کر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ناشاد دہلوی طنز و ظرافت کے میدان میں اکبر الہ آبادی کو پیچھے چھوڑ کر کوسوں آگے بڑھ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے سارے کلام میں طنز و مزاح کا پیرایہ بیان اختیار کر کے قوم کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کے معایب پر وہ لطیف چوٹیں لگائی ہیں کہ دل سے واہ بھی نکلتی ہے اور آہ بھی۔ لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے اور آنکھوں میں اشک ندامت بھی۔

ناشاد کا کلام بلاشبہ طنز و ظرافت کا چھلکتا ہوا جام ہے یہ ان کا انتہائی عجز و انکسار ہے جو انہوں نے اکبر الہ آبادی کے سامنے اپنے کو ذرا کہا ہے۔

طنز و مزاح لطف ظرافت ہے جس پہ ختم
ناشاد ذرہ ہے اسی اکبر کے سامنے

حضرت ناشاد خصوصاً انگریزی ادب کے مصنف اور مولف ہیں۔ چنانچہ انگریزی میں انہوں نے مشاہیر کے سوانح حیات اور اقوال و نظریے کے متعلق تقریباً ۳۴ ضخیم اور گرانقدر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جب انگریزی کتابیں لکھنے یا پڑھنے سے دل اکتا جاتا ہے تو تفریح طبع کے لیے وہ ہندستانی میں مزاحیہ شاعری کرنے لگتے ہیں۔

سوانح حیات

جناب ناشاد ۱۹۰۹ء میں بمقام پشاور پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم پشاور اور لاہور میں حاصل کی۔ بی۔ اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۹ء میں لی۔ آپ کی زندگی کا خاص شغلا ملازمت نہیں، بلکہ ادبی خدمت بنی رہی ہے آپ کی ذات دنیائے علم و ادب میں غنیمت ہے۔

آخری عمر میں دلی کے علاوہ حضرت ناشاد کو ابتدائی عمر میں لکھنؤ اور ایام شباب میں کئی سال لاہور میں رہنے کا بھی موقع ملا تھا ان تینوں مقامات کی ادبی محفلوں میں شرکت کرنے سے شعر و شاعری کا ذوق بڑھتا گیا اور پھر سماج کے ناخوشگوار حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۴۷ء سے مزاحیہ و طنزیہ اشعار کہنا شروع کر دیے۔ ناشاد نے چار اساتذہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔ اول دس برس تک منشی تلوک چند محروم رہنمائی فرماتے رہے بعد ازاں منشی پرشاد منور۔ آیرا حسنی گنوری اور حضرت سحر عشق آبادی نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا مگر یہ چاروں اساتذہ سنجیدہ گو شاعر ہیں ان کی طبیعت کو طنز و مزاح سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

ناشاد کے طنزیہ و مزاحیہ دلآویز کلام کے مندرجہ ذیل تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔

(۱) کلام بے لگام۔ بار اول ۱۹۶۱ء بار دوم ۱۹۶۲ء نمبر صفحات ۳۵۲) (۲) کلام بے نیام اکتوبر ۱۹۶۴ء (۳) دیوان ناشاد (یعنی مجموعے کلام ناشاد) ۱۹۶۶ء تعداد صفحات (طبع تختی) ۲۴۰ تعداد قطعات و تضامین ۱۳۴۴ - پہلے دو شعری مجموعے کئی بار طبع ہو کر ہندستان اور پاکستان میں اہل ذوق حضرات سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں دیوان ناشاد میں کلام بے لگام اور کلام بے نیام کے اشعار کے علاوہ ایک سو نئی نظمیں اور قطعات ہیں۔

حضرت ناشاد کی تیز نگاہیں سماج کی عام نظروں سے پوشیدہ معاشرتی و معاشی برائیوں کو بھانپ لیتی ہیں اور

پھر وہ انہیں بے لاگ طنز و ظرافت کے پیرایے میں پیش کر کے بے نقاب کر دیتے ہیں، چنانچہ فیشن زدہ مغلس بیویوں کے کردار کا پردا یوں فاش کرتے ہیں ؎

شب کو جو گھر سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
"پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے"
ٹیکسی میں بیٹھ کے جاتی ہے جو ہوٹل کی طرف
اپنے شوہر پہ وہ رستے میں نظر رکھتی ہے

اسی قماش کا ایک قطعہ اور ملاحظہ ہو ؎

آغوش میں ہے غیر کی کیوں بیوی آپ کی
حیرت سے دیکھتا ہوں میں غیرت جناب کی
کہنے لگے کہ دن ہیں ترقی کے آج کل
افسر کی نظر میں بدلیں گی کیسے عتاب کی

دوست کی بیوی غریب کی جورو اور نقاب پوش وغیرہ کئی قطعات میں ناشاد نے سماج کی ایسی عبرتناک تصویریں پیش کی ہیں - ایک مرحوم دوست کی بیوہ کو ایک ہوٹل میں کچھ لوفروں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے جو نظم لکھی ہے اس کے آخری تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

شب کو میں غوطے کھاتا رہا بحر رنج میں
روح آ گئی میرے دوست کی اور مجھ سے یہ کہا
شادی تو میں نے کی تھی فقط حسن دیکھ کر
معلوم یہ نہ تھا کہ وہ نکلے گی فاجرا
اللہ ہر اک مرد کو بیوی تو دے ضرور
خوش رنگ باوفا ہو مگر ہو نہ بے حیا

قطعۂ نقاب پوش میں بے حیا خواتین کا یوں پردا فاش کرتے ہیں ؎

نقاب رخ پہ ہے پاؤں اشارہ دیتے ہیں
جو اہل فن ہیں وہ فوراً یہ بھانپ لیتے ہیں
کدھر سے آئے ہیں اور حال چال کیسا ہے
حیا کو بیچ کر اب پاس کتنا پیسہ ہے

قطعہ - غریب کی جورو میں یوں طنزیہ چوٹ کرتے ہیں ؎

تر دھن کی زن سب کی بھابی
پھر اتنی ہے کیوں بے تابی
پہلے دھن سے اس کو بھر لے
بعد میں جو چاہے سو کر لے

بعض بعض قطعات حضرت ناشاد کی غیر معمولی ذہانت ذکاوت اور جودت طبع کی غمازی کرتے ہیں ان میں چند ملاحظہ ہوں ؎

شرم تو کر اب

حسرت سے دیکھتا ہوں میں ان کی طرف کہ جب
کہتے ہیں مسکرا کے ذرا شرم تو کر اب
دل ہے ترا سیاہ تو سر پر سفید بال
پیچھی تمام اڑ گئے پھیلا یا کیوں ہے جال
کی عرض مجھ کو بھیجا ہے اللہ نے یہ تار
جنت کی آرزو ہے تو بندوں سے کرے پیار
بندہ خدا کا وہ ہے کہ چہرے پہ نور ہو
ہر اک کے کام آئے۔ تکبر سے دور ہو

قطعہ - ایک ٹوکری میں سب انڈے - میں ایک لڑکی کے اس سوال پر کہ آج کل ہر شام کو کیوں نہیں حضرت ناشاد اس سے یہ کہتے ہیں کہ میرے تو بہت سے دلربا ہیں سب سے ایک ساتھ کیسے ملوں ... سی لڑکیوں کو دل دینے کی دلیل یوں پیش کرتے ہیں

ایک لڑکی جب بھی ملتی ہے مجھے
پوچھتی ہے ہو گیا ہے کیا تجھے
آج کل ملتے نہیں ہر شام کو
یاد کیا کرتے ہو اپنے رام کو
عرض کی میری بہت ہیں دلربا
اس لیے میں جاؤں کیسے ایک جا
عاقلوں سے میں نے سیکھا ہے یہ گر
ٹوکری اک کرنا سب انڈوں سے پر
ایک ٹھوکر سے ہی سب جائیں گے ٹوٹ
چھوکرے گلیوں کے لے جائیں گے لوٹ
اسلئے دل ایک جا کیسے میں دوں
دل وہ ٹھکرا دے تو میں پھر کیا کروں
سارا زر اک بینک ہی میں ہو اگر
فیل تو ہو وہ پھر دوں میں در بدر
دل کی دولت بانٹنے کا ہے ہنر
رات کو سوتا ہوں چادر تان کر

قطعہ - "گلے کا ہار"

ناشاد صاحب ایک مرتبہ اپنے افسر کے پاس شکایت...

[illegible] ڈالی سے کر گئے تو اس نے ہاں بھی ہوئی اپنی بیوی اور سالی کے لیے دو بار مانگے - اس واقعے کو انہوں نے جس ظرافت کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور جس خوش اسلوبی سے مرتشی افسر کی مانگ کو رد کیا ہے اس سے ان کی غیر معمولی طباعی و ذہانت کی داد زبان سے بے ساختہ نکل جاتی ہے ملاحظہ ہو ؎

دولت کی تمنا میں دہ افسر کر جو ڈالی
کہنے لگا " یہ بیوی ہے اور دوسری سالی"
کٹھنکہ جو ہے لینا تو منگا دو انہیں دو بار
عورت کا تو تحفوں ہی سے بڑھتا ہے بہت پیار
کی عرض یہ میں نے کہ نہیں مجھکو کوئی عار
جب آہ جبیں مانگیں تو کیسے کروں انکار
تعطیل مگر آج ہے اور بند ہے بازار
یہ چاہیں تو جا جاؤں گے کا میں ہی خود ہار

آج کل کے نوجوان جو کر دار پر برا اثر ڈالنے والی فلمیں دیکھ کر اور عشق و محبت کے رومانی ڈرامے پڑھ کر دوشیزگان کو آئے دن چھیڑتے اور پٹتے رہتے ہیں ان کے لیے ناشاد کا قطعہ بعنوان - عالم باعمل درس عبرت کا کام کرتا ہے - ملاحظہ ہو ؎

میں نے ڈرامہ شیکسپیر میں جب یہ پڑھا
عورت کی " نا " کے معنی یہی ہیں کہ ہاں تو آ
کوچے کو ان کے چل دیا پڑھ کر یہ فلسفہ
انکار ان کے کرتے ہی فوراً لپٹ گیا
اک لمحہ کے لیے تو مری ہوگئی تھی عید
ہوتے مگر دماغ پر استے ہوئے رسید
جتنا پڑھا تھا فلسفہ کافور ہوگیا
عالم میں باعمل یوں ہی مشہور ہوگیا

ماڈرن مجنوں اور لیلا ایک نہایت پر کیف قطعہ ہے اس میں فارسی کے مشہور شعر کی بہترین تضمین کر کے حضرت ناشاد نے اچھے شاعرانہ کمال کی ایک مثال قایم کر دی ہے ملاحظہ ہو ؎

یہ مجنوں نے جاکر سوال اک کیا
سر کوں کہتے بوسہ ذرا یہ بتا
تو لیلیٰ خوشی سے لگی جھومنے
دیا بوسہ مجنوں کو اور یہ کہا

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

مزاحیہ نظموں میں ایکٹرس کی ٹوئنز، ایک عورت سودائی، شکیلا بازو بھوپالی سے خطاب - شکیلا کا جواب - شکیلا سے عشق، شکیلا سے طلاق اور رومانی قطعات میں مغل گارڈن میں ملاقات اور حسن کا نشہ - دلآویز نظمیں اور قطعات ہیں بخوف طوالت ان کا انتخاب یہاں نہیں پیش کیا جا سکا ۔

عوام میں ارزاں ناموری اور سرکار سے انعام پانے کی غرض سے کچھ منفی شاعر بزم مشاعرہ میں ایک غدار شاعر کا نہیں بلکہ ایک بے غد قوال کا پارٹ ادا کرتے ہیں اس مضمون پر ناشاد کا ایک طنزیہ قطعہ بعنوان " قوال شاعر" ملاحظہ ہو ؎

ہے تیسرے پلان میں اک بات یہ نئی
بھارت میں گھومتے جو ہیں شاعر میاں سبھی
ہر شعر پر ملے گی انہیں ایک اشرفی
وہ تاکہ خود خرید سکیں بیڑی پان ہی
شعروں میں واہ واہ مگر کانگرس کی ہو
لیکن یہ لازمی نہیں کچھ ان میں رس بھی ہو
اسٹیج پر وہ گا کے سنائیں کچھ اس طرح
بے خود سے ہو کے گاتے ہیں قوال جس طرح

آپ نے ایک نظم بعنوان " تین قسم کے شاعر" میں شاعروں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے وہ ہیں مرد - زن اور ہیجڑے - ہیجڑے ان گو یے شاعروں کو قرار دیا ہے جو عمر بھر میں کل چار چھ شعر ہی لکھ کر شاعر کا سوانگ بھرتے ہیں اور ہر بزم مشاعرے میں شریک ہونے کے لیے بیقرار رہتے ہیں - بہت پر لطف نظم ہے صرف چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شاعروں کی تین ہی اقسام ہیں
مرد و زن کم ہیں تو ہیجڑے عام ہیں
مرد پیدا کرتا ہے افکار کو
زن سناتی شعر ہے اغیار کو
ہیجڑے بیچارے بہت حیران ہیں
پھر بھی ہر محفل کی وہ ہی جان ہیں
عمر بھر میں کل لکھے اشعار چار
داد کی خاطر ہیں بے قرار

دن تو کاٹیں اردو کے بازار میں
رات کو پھرتے رہیں گلزار میں
کام کرنے سے مگر معذور ہیں
خادم اردو ہیں۔ کیا مزدور ہیں

آج کل کے شاعر کی بیکسی خستہ حالی کی تصویریاں کی نظم چرخے کی مال میں ملاحظہ ہو ؎

نکتہ نہ ہو جس میں وہ بھلا نظم ہے کہیں
شاعر نہ ہو تو بزم کوئی بزم ہی نہیں
شاعر ہو نکتہ سنج ہو صاحب کمال ہو
سیسے پہ چوٹ کھائے ہوئے پائمال ہو
دنیا کے کاروبار سے وہ بے نیاز ہو
بس شاعری ہی اسکے لئے ایک ساز ہو
تارے گنے وہ رات کو دن کو لکھے کلام
گالی بھی دے کوئی تو وہ بھیجے اسے سلام
ہر دم خیال یار میں دیوانہ سا رہے
پروانہ ہی وہ جلتی ہوئی شمع کا رہے
تنہا کنار آب بنائے وہ اپنا گھر
موجوں سے کھیلتا رہے دنیا سے بے خبر
گر شاعروں میں ایسا بشر بے مثال ہے
پیسہ نہ ہو جو پاس تو چرخے کی مال ہے

"بت بے پیر" ایک دلچسپ طنزیا نظم ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

سر محفل جو زلفوں کو ہلا کر نخرے کرتا ہو
پڑھے پھر مانگ کر غزلیں اسے سب میر کہتے ہیں
بہادر جنگ ہیں وہ جو نہ معنی جنگ کے جانیں
جو بھاگے ان سے ڈر کر ہم اسے دل بیر کہتے ہیں
ترنم کا عام شیوہ ہے بدل لیتے ہیں وہ آنکھیں
اسی باعث انہیں شاعر بت بے پیر کہتے ہیں

ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہے صورت بھی دلکش ادائیں بھی پیاری
مگر میں تو حسن وفا چاہتا ہوں
بنی نرس وہ تو بنا میں بھی روگی
فقط درد دل کی دوا چاہتا ہوں
میں شاعر ہوں بس واہ واہ چاہتا ہوں
"مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں"

ایک دوسری غزل کے چند مزاحیا شعر ملاحظہ ہوں ؎

بلانے نرس کو پہنچا تو بولا ڈاکٹر کھل کر
اگر ہے نرس سے ملنا تو تم بیمار ہو جاؤ
اگر کوئی حسینہ آئے قابو میں نہ دولت سے
گراؤ تنگ تم غنڈوں سے خود مخواہ ہو جاؤ
مبارک میرے بڈھے دوست یہ شادی تمہیں تم کو
مگر اب دوستوں سے تم ذرا ہوشیار ہو جاؤ
شیریں کا فرہاد درازئ عمر کا نسخہ
ستھرا کے پیڑے۔ ذرا ہوشیار ہو جاؤ

سلطانہ ناشاد سے خطاب۔ باربار دیکھو وغیرا لطف مزاح نظمیں ہیں۔

سیاسی گولہ باری (طنزیا نظمیں) لال قلعہ پر لال بہادر نہرو سے ملاقات۔ آندھی کی تمنا۔ نوکری کی تلاش ہی نہیں معنی وغیرا دلآویز نظمیں ہیں مگر بخوف طوالت یہاں پیش نہیں کیے جا سکے۔ شائقین دیوان ناشاد ملاحظہ فرمائیں چند سبق آموز قطعات ملاحظہ ہوں۔

ہمایوں کا مقبرہ ؎

جب مقبرہ ہمایوں میں جا کر چھپے ظفر
کی چپکے سے فرنگی کو اپنوں ہی نے خبر
مشکل میں دشمنوں سے تو بچنا نہیں مشکل
اپنوں سے بچکے کوئی بھلا جائے کا کدھر

نیکی سے گریز ؎

لوگ بدی سے گھبراتے ہیں
میں نیکی سے شرماتا ہوں
کی تھی کسی کے ساتھ جو نیکی
اب میں اس کی سزا پاتا ہوں
تنگ آ کر تجھ سے دعا ہے یارب
مجھ کو بچاؤ نیکی سے یارب
تاکہ میں جیون میں سکھ پاؤں
اور ترے ہر دم گن گاؤں

مزدور کی دنیا ؎

مزدور تو دنیا میں سدا روتا رہے گا
دنیا کا ستم اس پہ سدا ہوتا رہے گا
ظالم کی جفا سہتے کا جو ہو گیا خوگر
بخت اس کا زمانے میں سدا سوتا رہے گا

اس قطعے میں مزدور کی غیرت اور غفلت کو کوڑے لگا کر اس کو بیدار اور ہوشیار کیا ہے اور یہ اشارا کیا ہے کہ ظالموں کے جور و ستم کو سہنا چھوڑ کر ان کے مقابلے پر آ جا اگر ایسا نہ کیا تو تیرا مقدر کبھی جاگ نہیں سکتا۔

لیڈری کا شوق ؎

لیڈری کا شوق جب مجھکو ہوا
قرض لے کر اک الیکشن لڑ گیا
پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں قرض خواہ
"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟"

"مس کی کس" یہ قطعہ نہایت دلچسپ ہے ملاحظہ ہو ؎

کل شام نئی دلی میں جو مل گئی اک مس
کہنے لگی مدت ہی سے تجھکو ہے کیا مس
کی عرض کہ تیرے تو طلبگار بہت ہیں
گالوں ہی سے ظاہر ہے کہ کس کس نے کیا کس

یاد خدا - یہ بھی ایک نہایت پر اثر قطعہ ہے - اس قطعے میں غم کے ماروں کی بیکسی اور فرداری کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

خالق نے ہمکو اتنے دیئے غم جہاں میں
باقی رہی نہ یاد خدا اپنے دھیان میں
باہر تو گل کھلے ہیں چمن میں بہار ہے
بیٹھے ہیں غمزدہ سے ہم اپنے مکان میں

دیگر ؎

بلڈنگ اگرچہ تیری بڑی پائدار ہے
دم دے نہ جائے ہستی ناپائدار دیکھ

نوٹ - دیوان ناشاد پر علاماً ابر احسنی کا مزاحیا تبصرا پڑھنے سے یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ حضرت ناشاد ایک باکمال مزاحیا اور طنزیا شاعر ہوتے ہوئے کبھی ایک حسن پرست اور اوباش قسم کے انسان ہیں مگر انہوں نے ڈرامے کے کردار کی طرح مختلف اقسام کے انسانوں کے کردار کا پارٹ ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے قطعات اور مزاحیا نظموں میں خود کو مرکز طعن و تشنیع بنا کر اصل میں سماج کے مختلف معایب اور نقایص میں گرفتار دوسرے لوگوں کے پول کھولے ہیں اور انکے کردار پر بغرض اصلاح گہری چوٹیں کی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب ناشاد ایک بڑے مصلح قوم ہیں۔

چنانچہ ان کا یہ فرمانا بہت درست ہے ؎

وہ تو صوفی بھی ہے زاہد بھی ہے دیندار بھی ہے
پھر بھی ناشاد کو بدنام ہر اک کرتا ہے

ارمان شام نگری

غزل

میں نے افسانۂ ہستی کو نیا موڑ دیا
سنگ کو شیشے سے شیشے کی طرح جوڑ دیا

آئینہ تیمتی ہے مجھ کو سزاوار کبھو
اپنا چہرہ نظر آیا تو اسے موڑ دیا

وقت نیرنگ کی جب دھاندلی دیکھی نہ گئی
اپنی آنکھوں کو سر بزم ہنر چھوڑ دیا

وسعت غم کو نہ سینے میں سمویا اس نے
میں نے جھنجھلا کے جو رتی کا سرا توڑ دیا

تم نہ خواہش کی روانی کو کبھی روک سکے
موڑنے والے نے طوفان کا رخ موڑ دیا

میں نے مجرم سے بھی مجرم کو نہ مجرم سمجھا
نکتۂ جرم کو سمجھا کے فقط چھوڑ دیا

زیب دیتا نہیں ہونٹوں کو تبسم کا فریب
تو نے کیوں رشتۂ اخلاص کا دل توڑ دیا

سرد لاشوں کو میسر ہوئی گرمئ بدن
میں نے سوئے ہوئے احساس کو جب جھوڑ دیا

سر چھپایا جو کہیں پاؤں نہیں پھیلایا
میں نے حق جاں کے ہر فرد کا حق چھوڑ دیا

دامن خار پہ فنکار کو سوتے دیکھا
چادر فکر بچھا کر جو اسے موڑ دیا

دل فسانے کے اسی دائرے میں گھومتا ہے
کوئی توڑا کبھی اس کو تو کوئی جوڑ دیا

تاکہ شاداب رہیں راہوں کے خار و خس بھی
آبلہ پا نظر آیا تو اسے پھوڑ دیا

تجھ کو اپنایا جو میں نے یہ خطا مجھ سے ہوئی
جرم اک اور کیا یہ کہ تجھے چھوڑ دیا

انور صدیقی

خواجہ حسن نظامی کا ادبی مقام

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے انیسویں عرس کے موقع پر ۱۳ار جنوری ۱۹۷۴ء کو غالب اکادمی بستی حضرت نظام نئی دلی میں ایک بزم مقالات اور محفل مشاعرہ منعقد ہوئی تھی، پیش نظر مضمون اسی موقع پر پڑھا گیا تھا۔ ایڈیٹر

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے کوئی ستائیس اٹھائیس سال پہلے میرے ایک بزرگ تھے جو چندا وصول کرنے کے فن کے ماہر تھے اور جنہوں نے چندے کی وصولی کا ایک انوکھا طریقہ اختیار کر رکھا تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ الہ آباد کے تھے اور صرف الہ آبادیوں سے چندے حاصل کرتے تھے اور وہ بھی ایسے الہ آبادیوں سے جو الہ آباد سے باہر کسی جگہ پر مقیم ہوں۔ اب عمر کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد ان کی یہ حکمت عملی بہت بڑا نفسیاتی اور علاقائی حربا معلوم ہوتی ہے ان کے اور کارگر حربوں میں ایک حربا اور بھی تھا اور وہ تھا اکبر الہ آبادی کے اشعار سنانا اور بے تکان سنانا۔ یوں کہیے کہ وہ کلام اکبر کے حافظ تھے اور حافظا ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ اکبر الہ آبادی کے کلام کے ادبی نکتوں اور اس کے طنزیاتی تیکھے پن کو وہ سمجھتے تھے یا نہیں اس کا تو مجھے اندازا نہیں ہوا اندازا ہوا تو صرف اتنا وہ اکبر کو خالص الہ آبادی شاعر بناکر پیش کرتے تھے اور علاقائی یا ضلعی برتری کا جذبا جگاکر لوگوں سے چندے کے طالب ہوتے۔ بہرحال ان کے انداز کار میں انفرادیت اور انوکھا پن ضرور تھا، انہوں نے اپنی ایک ایسی ہی مہم کے سلسلے کی بزم میں اکبر کا ایک شعر سنایا تھا جو نہ جانے مجھے کیوں یاد آگیا اور وہ شعر یہ تھا ؂

خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی
حضرت ابو ہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی

خواجا صاحب کے نام سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ پھر بہت دنوں کے بعد ایک درسی کتاب میں ان کا ایک مضمون "کلا تمہارا اکیر ہمارا" نظر سے گزرا جو زبان و بیان اور انداز نظر کی انفرادیت کی وجہ سے کچھ اتنا پسند آیا کہ میں نے اسے بار بار پڑھا اور اس میں ایک نیا لطف محسوس ہوا۔ مضمون نگار کا نام پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی نام ہے جس کا ذکر اکبر کے شعر میں بہت عرصے پہلے سن چکا تھا۔ حافظے میں جب اکبر کا وہ شعر پھر گونجا جسے میں ابھی آپ کو سنا چکا ہوں، تو دل نے کچھ ایسا انبساط محسوس کیا جس کے بیان پر نہ تو اس وقت قدرت تھی اور نہ ہی اب اعتماد ہے کہ بیان کر سکوں گا۔ بہرحال، یہ خواجا صاحب کے کلام سے میرا پہلا تعارف تھا، مگر اس تاثر کی خوبی یہ تھی کہ اس نے خواجا صاحب کی تحریروں سے ایک طرح کی دلچسپی پیدا کر دی اور اس طرح اولیں تاثر میں جو دھندلا پن تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور وہ روشنی حرارت، جس کے خود خواجا صاحب علمبردار تھے، بتدریج بڑھتی گئی۔ خواجا صاحب اور اکبر الہ آبادی کا تعلق ان خطوط سے بھی ظاہر ہوا جو انہوں نے خواجا صاحب کے نام لکھے تھے اور جو شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اب دونوں کے ذہنی اور جذباتی رشتے جو میرے لیے مبہم تھے واضح محسوس ہونے لگے۔ خواجا صاحب کی تحریروں میں جو طرز

دھار ہے اور مزاح کی جو جمال آفریں شادابی ہے وہ بڑی حد تک تخلیق ہوتے ہوئے بھی اکبر کی دین معلوم ہوتی ہے۔ خاجا صاحب کی طنز یاتی حس کی تہذیب میں اکبر سے تعلق کا یقیناً بہت بڑا حصا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا خاجا صاحب تو یہاں تک کہا کرتے تھے کہ مجھ میں شرافت اور شائستگی کی جو بھی جھلک ہے وہ اکبر صاحب سے مستعار ہے اور اسے انہیں کی دین سمجھنا چاہیے۔ اس بیان میں عقیدت اور ارادت کا جو رنگ ہے اس نے قدرے مبالغا آمیز بنا دیا ہے، مگر یہ بات تو تسلیم ہی کرنی چاہیے کہ خاجا صاحب کے اسلوب میں جو شگفتگی ہے اور طنز و مزاح کی جو زیریں لہریں ہیں وہ ان کی نثر کو اکبر کی شاعری سے قریب کر دیتی ہیں۔ دونوں کے ذہنی اور فکری رویوں میں بھی ایک طرح کا اشتراک ہے۔ اس اشتراک کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ مشرق اور مغرب کی جس تہذیبی کشمکش نے اکبر کو جنم دیا تھا وہ خاجا صاحب کی زندگی میں ختم نہیں ہوئی تھی۔ سارے جذباتی اور فکری مضمرات کے ساتھ وہی کشمکش خاجا صاحب نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور اس کی ہوشربائی کو اپنے باطن میں پوری طرح محسوس کیا تھا۔ ان کے تجربے اور حافظے کی حدود میں وہ سارے واقعات تھے جنہوں نے ایک تہذیبی بساط کو پامال کر دیا تھا۔ مسلم مغل تہذیب کے زوال اور پامالی کی ساری داستان انہوں نے اثر پذیری کی عمر میں اپنی والدہ سے سنی تھی اور طالب علمی کے زمانے میں مغل شہزادوں کے ساتھ تعلیم پانے کے دوران انہوں نے اپنی آنکھوں سے انحطاط اور زوال کے سارے نقوش دیکھے تھے اور ان سے متاثر ہوئے تھے، اور اتنے معنی خیز طور پر متاثر ہوئے تھے کہ ان کی دور اول کی تحریروں میں مغل شہزادوں اور بیگمات کے المیا کے بیان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ایک مٹتی اور غروب ہوتی ہوئی تہذیب کی، انتہائی پرسوز اور المیا لے میں مرثیا خوانی خاجا صاحب کی تقدیر کا حصا بن گئی تھی۔ ان کی ابتدائی مقبولیت میں اس ماتم گساری کا بڑا ہات ہے۔ اس موضوع پر ان کی تحریروں میں جو اثرانگیزی ہے اور ان میں جس طرح مغل تہذیب کی بازآفرینی کی گئی ہے اور جیسی ادبیت ان میں بروئے کار آئی ہے وہ مغربی ادب میں صرف میلوری کی نثری کتاب

مورتے دی آرتھر میں دیکھی جا سکتی ہے جو کم و بیش ایک ایسے ہی موضوع پر لکھی گئی ہے اور اس کی زبان میں بھی وہی اور ویسا ہی لطف ہے جو خاجا صاحب کی زبان میں ہے، شہنشاہ آرتھر نے جس جاگیردارانا تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی اور جس طرح اس تہذیب کا شیرازہ بکھرا تھا میلوری نے اس کی ماتم سرائی کی ہے۔ اس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی نثر میں جو تاثیر ہے وہی تاثیر مجھے خاجا صاحب کی اس موضوع پر تحریروں میں نظر آتی ہے۔ دونوں کی اتفاقی مماثلت کا ذکر یوں کر رہا ہوں کہ مجھے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کی تہذیبی ابتری اور انتشار کے متعلق خاجا صاحب کی تحریروں کو پڑھ کر میلوری یاد آیا ہے اور بار بار یاد آیا ہے اور یاد آنے کے عمل میں مجھے ادبی مواد کی آفاقیت کا احساس ہی نہیں یقین بھی ہوا ہے۔

طنز نگار خواہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے ان کی سرشت میں ماضی سے ایک طرح کی جذباتی وابستگی اور حال سے برہمی و بیزاری کا عنصر ضرور ہوتا ہے۔ یہی خصوصیت رومانی ادیبوں کے جذباتی اور فکری رویوں میں بھی ہوتی ہے۔ خاجا صاحب جہاں ایک طرف طنز و مزاح کے حربے سے اس تصادم یا کشمکش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ہمارے دوسرے رومانی نثر نگاروں کی طرح عقل کے مقابلے میں وجدان جمود کے مقابلے میں تخیل پر بھی زور دیتے ہیں۔ اگر آپ خاجا صاحب کو کسی ادبی روایت کا حصا سمجھ کر دیکھیں تو آپ کو ان کی ادبی قدر و قیمت کا بہتر طور پر اندازا ہو سکے گا۔ آپ انہیں سرسید اور حالی کی فکری اور ادبی روایت سے وابستا یوں نہیں کر سکتے کہ وہ انیسویں صدی کی اس بے رحم عقلیت کو کسی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے جسے سرسید فروغ دینا چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے سرسید کی تحریک کے بعض پہلوؤں کی کبھی کبھی حمایت بھی کی تھی وہ ذہنی اور جذباتی طور پر شبلی اور شرر سے زیادا قریب تھے۔ جن کے اثر سے ہندستان میں رومانی نثر کا فروغ ہوا۔ اگر یہ نکتا سامنے رہے تو آپ کو خاجا صاحب کا اکبر سے قرب بھی سمجھ میں آ سکتا ہے اور ان کی افتادِ طبع بھی، مگر یہ سمجھنا کہ وہ اکبر کے قرب کی وجہ سے سرسید کی عقلیت سے قریب نہ ہو سکے، صحیح نہیں ہے تصوف کی وساطت سے زندگی اور زمانے کو سمجھنے کی

بصیرت خاجا صاحب کو ورثے میں ملی تھی اس سے وہ کسی حال میں بھی دست بردار نہیں ہو سکتے تھے ۔ غیر جذباتی عقلیت کے قبول کر لینے کے بعد وہ فکر و احساس کی اس فضا سے یکسر دور ہو جاتے جس میں وسعت ، شادابی اور شمولیت کی بے پناہ صلاحیت تھی اور جس کی تخلیق ان کے مضامین کرتے ہیں ۔ وہ اس نئی مشرقیت کے علمبردار تھے جو یک رنگ نہیں ، ہمہ رنگ ہے ۔ یہ ہمہ رنگی انہیں تصوف سے ملی ہے جس میں عجمیت بھی ہے اور حجازیت بھی ۔ عجم کا حسن طبیعت بھی ہے اور عرب کا سوز دروں بھی ۔ خاجا صاحب کے مضامین کے موضوعات کے تنوع پر غور کیجیے تو آپ کو حیرت ہوگی ۔ یہ تنوع آپ کو ان کی تحریروں میں ہرگز نظر نہ آتا اگر وہ اسلام کی شرعی اور فقیہانہ تعبیر کو تسلیم کر لیتے ۔ یہی صورت اس وقت بھی پیدا ہوتی اگر وہ سرسید کی پیش کردہ عقلی توجیہہ کو قبول کر لیتے ۔ ان دونوں رویوں کو اپنا کر ممکن ہے کہ وہ دانشوری کی کوئی نئی روایت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے مگر اس سے ایک ایسا ادبی زیاں یا نقصان ہوتا جس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے ۔ ان کی تحریروں میں جو کائنات سانس لیتی ہے اس کے ہر ذرے میں جان ہے ۔ اس میں ابد کی وسعت ہے ، احساس اور تخیل کے ابر اس پر ہر لمحہ سایا کیے رہتے ہیں ، جذبوں کے تمام رنگ پر بکھیرے رہتے ہیں ۔ اس کائنات میں ادنیٰ اور اعلا کا کوئی امتیاز نہیں ہے ، کوئی بھی غیر اہم چیز غیر اہم نہیں ہے ایسی حسی مساوات ان کے معاصرین میں کسی کے یہاں نہیں ملتی ۔ میرے اس دعوے کی تصدیق ہر وہ شخص کرے گا جس نے ان کے مضامین کا مجموعہ "سیپارۂ دل" پڑھا ہے ۔ ایسے موضوعات جن کو غیر اہم اور غیر ادبی سمجھ کر ہمارے انشا پردازوں نے نظر انداز کر دیا تھا وہ ان کے مضامین کا موضوع بنتے ہیں اور کچھ اس طرح بنتے ہیں جیسے انہوں نے خاجا صاحب سے ان کے حجرے میں جا کر شکایت کی ہو کہ حضور ذات پات کے ماننے والوں نے ادب میں بھی برہمنیت کے رویے کو اپنا رکھا ہے ، وہ تو اونچی ذات کے موضوعات کو اپناتے ہیں ، ہم جو حقیر فقیر ہیں ، انہیں ٹھکراتے ہیں ۔" ایسا لگتا ہے کہ خاجا صاحب نے ادبی عدم مساوات کے ان ستائے ہوئے موضوعات کی شکایت بڑی توجہ اور دلسوزی کے ساتھ سنی اور انہیں یقین دلایا کہ "جاؤ ذکر دو میں تمہیں اپنے قلم سے زندہ جاوید کر دوں گا اور نیچ نیچ کے سارے فرق مٹا دوں گا ، اب سے تم سمجھو کہ تم ایک سید زادے کی آغوش خیال میں ہو" اس یقین دہانی کا یہ کرشمہ ہے کہ ان کے مضامین موضوعات کی وہ کثرت ہے کہ جیسے

کعبے میں دعاؤں کا ہجوم

وہ جو خاجا صاحب کے ادبی کارناموں پر کلام کرنا چاہتے ہیں انہیں اس تنوع اور وسعت کا سبب بھی بتا دوں وہ سبب صرف یہی نہیں ہے کہ خاجا صاحب اپنی ادبی انا کی تشکیل کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے محض اس خیال سے ایسے موضوعات کو اپنایا کہ ان کے اسلوب میں اچھوتا پن آ جائے انفرادی اسلوب کی نفسیات پر غور کرنے والوں کو یہ بات شاید زیادہ اہم معلوم ہو اور یہ ہے اہم بھی ہو ، مگر خاجا صاحب کے اسلوب کے سلسلے میں ایک لاشعوری محرک بھی تھا اور وہ تھا وحدت کا متصوفانہ نظریہ جسے انہوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا تھا ۔ اسی نظریے کا اثر ہے کہ ان کا انداز نظر تمثیلی ہے وہ زندگی کے ہر تصرف کا کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور نکال لیتے ہیں ۔ وہ چاہے جس پر لکھ رہے ہوں یا لالٹین پر خامہ فرسائی کر رہے ہوں یا مچھر پر اپنے مطلب کی بات کہنے کی یا کہنے کی تقریب پیدا کر لیتے ہیں اور یہ عمل کچھ اس قدر فطری ہوتا ہے کہ آورد کا گمان نہیں ہوتا ، بلکہ ان کے ذہن کی خلاقی اور مشاہدے کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے نفسیات کے ماہروں نے تخیل کی خلاقی کا ایک معیار یہ ٹھہرایا ہے کہ وہ کتنی سرعت کے ساتھ متضاد اور متنافی پاروں میں وحدت پیدا کرتا ہے ۔ یہ ایک ایسا معیار ہے جو انیسویں صدی میں کولرج سے لیکر آج تک باطل نہیں ہوا ہے ۔ اس معیار سے دیکھیے تو خاجا صاحب جیسا خلاق تخیل ان کے معاصرین میں کم نظر آئے گا ۔ اکثر خلاق ذہن ایک یا دو سطحوں پر زیادہ موثر طور پر کام کرتے ہیں ۔ باقی سطحوں پر تخلیقی شان سے کام نہیں کر پاتے خاجا صاحب کی خلاقی نے جتنی سطحوں پر کام کیا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان کی جولانگاہ کی وسعت سے واقف

ادب، صحافت، سیاست، تاریخ، طب، مذہب، تصوف اور سائنس جیسے بے شمار موضوعات پر انہوں نے لکھا ہے، اور سب میں ایک ایسی تخلیقی شان پیدا کی ہے جسے ادبیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو ان کی شخصیت جامع کمالات ہونے کی وجہ سے بہت ہونے کی وجہ سے بہت سے پہلو اور رنگ رکھتی ہے، مگر میں یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر ایک تخلیقی فن کار تھے اور ان کی شخصیت میں جو ایک طرح کی ناصبوری ملتی ہے وہ بھی ان کی تخلیقی توانائی کی دلیل ہے اور آپ اگر مجھ سے یہ سوال کریں کہ وہ کیسے تخلیقی فن کار تھے اور یہ کہ ان کی فن کاری کو کس زمرے میں رکھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ اصل میں ایک انشائیہ نگار تھے اور ان کی بیشتر اچھی تحریروں کو انشائیہ نگاری کے زمرے میں رکھنا چاہیے۔ انشائیہ کا جو ادنا تصور مغرب سے ہندستان میں آیا تھا اور جس کو وہاں لوگوں نے افکار پریشاں کا نام دیا تھا اس کی سب سے اولین اور معتبر مثال خاجا صاحب کی تحریریں ہیں۔ یوں تو انہوں نے ڈراما بھی لکھا اور افسانے بھی لکھے، مگر ان کی ادبی شفاعت کے لیے یہی پارۂ دل کے انشائیے کافی ہیں انشائیے کے میدان میں ان کے جو کارنامے ہیں ان کا خاطر خواہ اعتراف ہمارے ادبی ناقدین نے نہیں کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہماری دانش گاہوں میں خاجا صاحب کے ادبی مرتبہ و مقام کے تعین کا کام کیا جائے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام خاجا صاحب مرحوم کی شخصیت کے حقیقی خد و خال نمایاں کرے گا۔ ان کی زبان کا مطالعہ بھی ایک الگ موضوع ہو سکتا ہے۔ ان کی زبان سادگی کی ایسی رعنائی رکھتی ہے جس کا حصول اتنا آسان نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ہندستانی نثر نگاری کے پارکھوں کا یہ کام بھی ہونا چاہیے کہ وہ دیکھیں کہ اس زبان میں اظہار کی کیسی اور کتنی توانائی ہے اور وہ یہ بھی دیکھیں کہ یہ زبان جذبوں کے جتنے مختلف رنگوں کے اظہار پر قادر ہے کیا ایسی ہی اور اتنی ہی قدرت اسے افکار کی تہہ داری اور پیچیدگی کے اظہار پر بھی حاصل ہے خاجا صاحب کے عام ادبی اسلوب کے ارتقا

مفید ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس اور ایسے دوسرے موضوعات پر کام کی اہمیت کو ہمارے دانش کدے محسوس کریں گے یہ کام اس وجہ سے اہم ہے کہ ہندستانی کے نثری ادب کا نصب نما اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ خاجا صاحب کے ادبی کام اور مقام کا حقیقت پسندانا تعین نہیں ہو جاتا۔

خضر برنی

نیا نغمہ

شمعِ علم و ہنر ہاتھوں میں لے کر اٹھو
دور تک باقی نہ رہ جائے اندھیروں کا گمان
کامیابی کو گلے اپنے لگا لو بڑھ کر
عہد طفلی میں بھی پیدا کرو انداز جواں
دیش کی شان بڑھاؤ تو کوئی بات بنے
پرچم علم سجاؤ تو کوئی بات بنے
نئی نسلوں کو نئی راہ دکھانے کے لیے
خود ہی کرنی ہے نئے طور سے اپنی تنظیم
اپنا ہے راج شکایت کی کوئی بات نہیں
وقت کے ساتھ ہر اک شے میں ہے ممکن ترمیم
نئی تدبیر سجھاؤ تو کوئی بات بنے
پرچم علم سجاؤ تو کوئی بات بنے
امن کے راستے منزل پہ پہنچنے کے لیے
کوئی الجھن نہ رہے کوئی تعطل نہ رہے
صاف دل ہوں تو بدل جاتا ہے حالات کا رخ
کچھ کدورت نہ رہے سینے میں ہلچل نہ رہے
اجڑے ویرانے بساؤ تو کوئی بات بنے
پرچم علم سجاؤ تو کوئی بات بنے
دور اندیشی کے اسباب رہیں پیش نظر
اپنی املاک کو برباد نہ ہونے دینا
سب تمہارا ہے نہیں غیر کا کچھ سود و زیاں
یہی ہے آپ سے درخواست یہی ہے کہنا
اپنی خود شان بڑھاؤ تو کوئی بات بنے
پرچم علم سجاؤ تو کوئی بات بنے

کرامت علی کرامت

امجد نجمی کے خطوط
عبداللطیف عارف کے نام

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۴ء

عارف پر جوش

کو سلام مے نوش۔ کل اطہر الامین
صاحب آئے تھے۔ جلسے کی کامیابی پر میں نے ان کو مبارکباد دی
پیش کر دی۔ بڑے خوش تھے۔ فرمانے لگے وہاں لوگوں میں
کافی جوش و خروش ہے۔ شب قدر میں پڑائی گھر کا
سنگ بنیاد رکھا جائے گا جس کے لیے سب لوگ کے
حاجی صاحب رضامند ہو گئے ہیں۔
کیندراپاڑا کے جلسۂ مشاعرا اور محفل دعوت دونوں
کی کامیابی کا سہرا حقیقت میں صاحب موصوف کے سر ہے۔
اس سے پہلے بھی میں ان کے خلوص سے متاثر ہوا ہوں۔
بڑے کام کے آدمی ہیں۔ کام کے آدمی کام کرنے میں برق،
اور نکتہ چیں حرف گیری میں غرق۔ ایسے پرخلوص انسان
دو چار اور نکل آئیں تو سمجھیے کہ ہمارا بیڑا پار ہے۔
جلسے کی ہر کارروائی ازابتدائے بسم اللہ تا تائے
تمت یعنی سعادت صاحب کے خطبۂ استقبالیہ سے لے کر
اور صاحب کی افتتاحی تقریر تک، نہایت شاندار رہی۔
پھر ہمارے نائب صدر راجا میاں کا تحریری خطاب
گویا نور علیٰ نور ہو گیا۔ ضحیٰ صاحب نے شاعروں کو اشعار
پر جو بے برجستہ ارشاد فرمایا، وہ مختصر ہونے کے باوجود
نہایت مدلل اور مثبت تھا۔ صدر جلسا نے ہندستان
کی عالمگیری شہرت پر جو چند باتیں کہیں، وہ بڑی کام کی

تھیں، خصوصاً بنگالی ادبی کانفرنس کے ساتھ مشاعرے کا
موازنہ تو بڑا لطف دے گیا۔
اب شعرا کے کلام پر مختصر سا تبصرا ملاحظا ہو۔
جلال الدین بدر کے قطعات اچھے تھے اور غزل
بھی خوب۔ اچھی طبیعت پائی ہے۔
جنوں اپنے جنوں میں پختا کار نکلا شعرا کی بھیڑ
بھڑکے میں گھس کر آخر اپنی غزل محفل میں جڑ ہی دی۔
میاں رونق اس دفعا کافی سنجیدا و رمتین نظر آ رہے
تھے۔ نوجوانوں سے مخاطب ہو کر اہل مشاعرا سے خراج
تحسین وصول کر ہی لیا۔ راقم نے بھی دو چار شعر پر داد لے
ہی لی۔ شاکر کی غزل گو چھوٹی تھی مگر پڑھنے کا انداز
نرالا تھا، اس لیے کچھ داد کچھ بے داد بھی۔ بہاالدین
ریاض کی نظم "دو آنسو" اور خالد رحیم کی نظم "حسن
معصوم" دو ایک عشرہ دردر کی چیزیں تھیں نکھری ستھری اور
سلجھی ہوئی۔
شیریں خان ضمیر کی نظم مثلث کو ان کا انداز ترنم محفل
میں لے اڑا۔ ایسا کہ انہوں نے سب کا دل موہ لیا۔ خصوصاً
صدر جلسا تو ان کے گرویدا بن گئے۔ ہر بند کافی موثر تھا۔
حافظا درد نے بھی اپنے ہی شعر پر داد کا ٹیکس
وصول کر لیا۔
حیدر تاباں کی مے نوشی اور "بے پیے کی مدہوشی"
نے ساری محفل کو مست کر دیا۔ مراد صاحب کے تخیلات

اس دفعہ گہرائی لیے ہوئے تھے - قادر بخش سلیم ہمیشہ سے محفل میں "ناصح مشفق" کا فرض انجام دیتے آئے ہیں اور اس دفعہ تو اور اونچے اڑے -

آپ نے تو ماشاءاللہ غضب ہی دکھایا - ایسا جوش ایسی امنگ یہ ولولہ یہ FORCE (زور) اس سے پہلے آپ میں میں نے کم دیکھا - محفل میں آپ کے مسدس کی پذیرائی خوب رہی - سامعین پر آپ ایسا چھا گئے تھے کہ محفل مشاعرہ میں ایک سماں بندھ گیا تھا - میں خود بھی مبہوت سا رہا - واہ شاباش آفریں ! ماشاءاللہ صلی علیٰ ! میرا گیت گویا سنت کبیر داس کا دوہا تھا اور بس - اب رہے میاں محمد خان برکی تو ظالم نے اپنے مزاحیہ اشعار سے جملہ خواص و عوام کو مسخر کر لیا - گویا مشاعرے کے اسٹیج پر کلاون (مسخرا) کا پارٹ ادا کیا - بزم میں ایسا نظر سے بڑھ کر تماشائی زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے بھی چندے ماشے کا لطف آ گیا لیکن سچ پوچھیے تو مذاق مذاق میں بڑے کام اور پتے کی باتیں کہہ گیا - الغرض ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کی طرح ہر شاعر نے اپنے اپنے رنگ کے اشعار محفل میں پیش کر کے اہل کیندرا پاڑا میں ایک نئی روح پھونک دی جس کا اثر تا دیر قایم رہے گا - وہاں کا کا زوال ادب اب جار ایسا ہو تو کچھ عیب نہیں - خیر کچھ ہو ع

ہمتیں اپنی جواں ہیں تو جواں ہے اردو ! نجمی

۲۸ / مارچ سنہ ۶۵ء

مولوی صاحب سلامت

مزاج اقدس ! آج چونکہ یکشنبہ تھا اس لیے اشتیاق دید اور شوق ملاقات میں آستان عالی پر حاضر ہوا تھا - لیکن محرومیٔ قسمت کو کیا کیجیے ؟ معلوم ہوا کہ آپ بہ ہمراج پور کسی کے ہاں دعوت ولیمہ میں تشریف لے گئے ہیں - اللہ اللہ ! کھلے آسمان کے نیچے، تپتی ہوئی زمین پر، چلچلاتی دھوپ میں، تن تنہا پندرہ بیس میل کا سفر اور وہ بھی سائیکل پر ! کہیے ع

ہمارا نور دیدہ دوری منزل میں ہے !

مولانا عبدالرشید صاحب نقاد کی مزاج پرسی سے بعد جب گھر واپس آیا تو اڑیا روزانہ اخبار "سماج" میں ایک خوش خبری نظر سے گزری ، کہ آپ کی اطلاع کے لیے لکھ رہا ہوں - اپنی یادداشت میں نوٹ فرما لیجیے، تا کہ اس کی تصدیق یا تکذیب میں آیندہ اصل مدد ملے - ایک جوتشی پی - کے - کول نامی فروری ماہ سے وارد شہر ہو کر ہنوز یہیں قیام پذیر ہیں - کٹک کے مشاہیر سرکاری آفیسر صحافی، ادیب وغیرہم سے مل کر انہوں نے چند اہم پیشین گوئیاں کی ہیں - سماج کے مدیر شری رادھا ناتھ رت پرجاتنتر کے ایڈیٹر شری جانکی ولبھ پٹنایک اور پبلک سروس کمیشن کے سابق چیرمین شری سونناتھ مہاپاتر وغیرہم ان سے مل کر ان کی قیافہ گوئی پر بحث مباحثہ کر چکے ہیں -

جناب کول اس کے پیشتر صوبۂ بہار میں ایک کامیاب منجم کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں - ان کی چند پیشین گوئیاں درج ذیل ہیں ملاحظہ ہو -

(۱) آیندہ ماہ مئی میں بھارت کے ایک مشہور نیتا یا تو اپنے عہدے سے الگ ہو جائیں گے یا راہیٔ ملک بقا ہوں گے (۲) جولائی یا اگست تک بھارت کے اور ایک لیڈر کی موت واقع ہو گی - (۳) اڑیسہ، پنجاب، کیرل، مدراس، بہار اور مہاراشٹر وغیرہ ریاستوں میں راشٹرپتی شاسن یعنی حکومت صدر جمہوریہ قایم ہونے کے امکانات ہیں - (۴) آیندہ ماہ اکتوبر تک پاکستان کے سب سے اعلا عہدہ دار رہنما کو مسند حکومت سے علیحدہ ہونا پڑے گا - (۵) جون اور ستمبر کے درمیان دنیا کی مختلف ریاستوں میں ایک عالمگیر تباہی کے آثار رونما ہوں گے - زلزلے جاپان، ایران اور شمالی ہند کا کچھ حصہ یعنی پاکستانی علاقوں میں کچھ تباہ کاریاں عمل میں آئیں گی (۶) ملک میں عام طور پر فرقہ وارانہ فسادات ہونے کا اندیشہ ہے (۷) شمالی امریکا وغیرہ ملکوں میں حکام کی سخت مخالفت ہوں گی جس سے ان کی جان عزیز خطرے میں ہو گی -

یہ ہیں چند پیشین گوئیاں جو انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کی ہیں - علم نجوم گو دیگر علوم متعارفہ مثلاً فلسفہ، منطق، موسیقی، طب، سائنس وغیرہ وغیرہ کی طرح ایک اہم اور دلچسپ علم ہے لیکن ہمارے عقیدے کے خلاف ہے - اس کے لیے مختصر فتوا یہی ہے کہ اعتبار مکن شدید - مرقوم الذیل ملاحظہ ہو ؎

علم [illegible] و [illegible]

گر کسے گوید کہ من دانم باد با ورمدار
مصطفیٰ ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے جبرئیل
جبرئیلش ہم نہ گفتے تا نہ گفتے کردگار (عجمی)

۷ / دسمبر ۱۹۶۵ء

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
مدت ہوئی ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

مولانا صاحب - السلام علیکم - مزاج اطہر؟
عمر خیام جس کے خمریات کا شہرا جوار مشرق سے نکل کر دیار مغرب میں گونج رہا ہے اور جو۔ ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

کی طرح اپنے خمکدے کا آپ پیر مغاں ہے، مئے دل کے استعارات میں وہ پتے کی باتیں کہہ گیا ہے جو حرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کو پڑھ کر اہل ذوق اور صاحب دل جھوم اٹھتے ہیں، لیکن ظاہر پرست یورپ ہے کہ محض ان کے سطحی مفہوم کا دلدادہ ہے اور سمجھتا ہے کہ خیام کا فلسفہ بھی یونانی فلسفی ایپیکورس کے فلسفۂ زندگی کے مشابہ ہے یعنی کھاؤ پیو، عیش و عشرت میں زندگی کے دن گذار دو، کیونکہ سب کو آخر ایک دن مرنا ہے حالانکہ ایسی بات ہرگز نہیں ہے - بہرکیف اس کی یہ رباعی ملاحظہ ہو ؎

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست
تاریک دلم نور صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی
ایں مزد بود لطف و عطائے تو کجاست

اسی مفہوم پر شہزادی زیب النسا مخفی کا یہ مقطع پڑھیے ؎

مخفی بہ قدر طاعت ما گر عطا دہند
در روز حشر رحمت پروردگار چیست؟

حافظ کہتے ہیں ؎

سہو و خطائے بندہ اگر نیست اعتبار
معنی عفو و رحمت پروردگار چیست؟

لیکن عرفی شیرازی کی خودداری ملاحظہ فرمایئے - کہتا ہے ؎

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت
قبول کردن و رفتن نہ شرط انصافست!

اب کیا فرماتے ہیں علمائے دین کرام بیچ اس مسئلہ کے خودداری؟

(۲) ایک اور رباعی سنیے - کہتا ہے ؎

آباد خرابات ز مے خوردن ماست
خون دو ہزار توبہ بر گردن ماست
گر ما نہ کنیم جرم، رحمت چہ کند؟
آرائش رحمت ز گنہ کردن ماست

اسی تخیل پر حضرت امیر مینائی کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

غالب فرماتے ہیں ؎

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

غالب ؎

ہفت دوزخ در نہاد شرمساری مضمرست
انتقام است ایں کہ با جرم مدارا کردہ ای

(۳) ایک رباعی اور سماعت فرمایئے ؎

رفتند وز رفتگاں یکے ناید باز
تا با تو بگوید از پس پردۂ راز
کارت ز نیاز می کشاید نہ نماز
بازیچہ بود نماز بے صدق و نیاز

نماز اور نیاز پر ملا شیدا کا یہ شعر ملاحظہ ہو کیا سچ کہا ہے

نماز را نگذارند نیاز پیش آور
دوگانہ را چہ کنی آں یگانہ را دریاب

خدائے بے نیاز کی بے نیازی پر داغ کا یہ قول بھی کتنا چبھتا ہوا ہے - کہتے ہیں ؎

وہاں ہے بے نیازی [illegible] کس کو ہے پروا
یہ طاعت اپنی رہنے دو [illegible] اپنی رہنے دو

اصغر گونڈوی کہتے ہیں ؎

بے نیازی کو تری کچھ بھی پذیرانہ ہوا
شکر اخلاص مرا شکوۂ باطل میرا

گناہ اور سجدۂ نیاز پر غنی کشمیری کا یہ شعر کتنا سچا ہے ملاحظہ ہو ؎

سر پیش فگندن ز گنہ داد بما تم
صد طاعت ناکردہ بیک سجدہ ادا شد

رحمت اور گناہ پر غالب کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا!

سن گنہ اور رحمت پر ان کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے ؎

ذوقِ گنہ سے دل کو نہیں کچھ ہراس ہے
ہم کو بہت بڑی تری رحمت کی آس ہے

ان امیر کا ایک شعر اور یاد آیا ؎

لو عفو معاصی سے لگائے رہیں عاصی
رحمت کو بہت آتے ہیں بخشش کے بہانے

داغ کا یہ سادا شعر بھی ملاحظا ہو ؎

مری بندگی سے مرے جرم افزوں
ترے قہر سے تیری رحمت زیادا

دیکھا آپ نے بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ رحمت، عفو، کرم، فضل، لطف ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
زیادہ چہ۔ واللہ لطیف بالعباد

نجمی

۲۱ دسمبر ۱۹۶۵ء

خط لکھیں گے گرچہ مطلب نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جناب عارف

یا اللہ! عشق اللہ! طبیعت گو بحال ہے جینا گر محال ہے۔ گرانی زندگیوں پر بھاری ہے، سردیوں کی گرم بازاری ہے۔ سال رواں تشریف لے جا رہے ہیں، میاں رمضان دروازا کھٹکھٹا رہے ہیں۔ ایسے میں جی چاہا آپ سے کچھ گپ شپ کر لوں، بزرگوں کی دعاؤں سے دامن مراد بھر لوں۔ لکھنا لکھانا ہم دیوانوں کا فرض ہے اس لیے علم صنایع میں سے صنعت لغز پر آج کچھ عرض ہے۔

لغز کے لغوی معنی ہیں جنگلی چوہے کا سوراخ یا بل اور چونکہ یہ سوراخ نہایت پیچیدا ہوتا ہے اس لیے یہ ایک قسم کے مبہم کلام کا نام ہو گیا جس کو فارسی میں چیستان اور اردو یا ہندی میں پہیلی کہتے ہیں۔ چیستاں چیست آں سے ہے یعنی جس کو سن کر آدمی اس کے معنی مفہوم پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایں چہ معنی دارد؟

آپ کی دلچسپی کے لیے چند پہیلیاں درج ذیل ہیں ان کو پڑھ کر لطف و حظ اٹھائیے گو آپ ان سے آشنا ہی کیوں نہ ہوں؟ ع

لطف ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی

امیر خسرو کہتے ہیں ؎

رنگش چو رنگ زعفران
بریاں چو جان عاشقاں (پاپڑ)

(۱) یا دار دو بر بسم بہ دال
جاناں بگو ایں چیستاں؟
گر مہ شود برادو ستارہ شود پری
(۲) یا خوان نعمت تو کند کے برابری (ڈبرابری)

چار مہینے بہت چلے
(۳) اور آٹھ مہینے تھوڑی
امیر خسرو یوں کہیں کر (نالی)
بوجھ پہیلی موری!

بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں ؎

ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں طرف وہ تھال پھرے
موتی اس سے ایک نہ گرے
(آسمان اور تارے)

تجمل صاحب فرماتے ہیں ؎

کان میں رکھ تو یہ ابہام
نیچے لٹکے اوپر نام (بالا)

شاد عظیم آبادی کا شعر ہے ؎

برسوں نہ منہ لگاؤ تو وہ بھی رکی رہے
پہلو میں وہ اگر تو قدم پر جھکی رہے (تلوار)

کوئی صاحب بنی کہتے ہیں ؎

پیپل کی کونپل ڈوبے اور ہاتھی کھڑا نہائے
بنی غریب پیاسا جا کر پیاسا واپس آئے (اوس)
جو بیخ نہ ڈوبے گھڑا نہ پھوٹے چڑیا پیاسی جائے (یا شبنم)
ایک اچنبھا ایسا دیکھا ہاتھی کھڑا نہائے

تو بھی بنی ہے دھاگے سے اور میں بھی بنا ہوں دھاگے سے
تو کھلتی ہے پیچھے سے میں کھلتا ہوں آگے سے
(کرتی اور پاجامہ)

ایک کے کرے دو دو کے کرے چار
جتنے چاہیں دو دو کرے ایک ہو یا ہزار (آئینہ)

زلف میں جکڑا ہوا ہوں پیر میں زنجیر ہے
گھاٹ کا اترا ہوا ہوں قتل کی تدبیر ہے (کنگھا)

امیر خسرو ؎

بیسوں کا سر کاٹ لیا
نا مارا نا خون کیا (بہنی)
سر پر پتھر منہ میں انگلی (انگوٹھی)

ہاں اقبال کا یہ مقطع بھی اسی صنعت سے متعلق ہے ؎

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھنا
میں جس کے ساتھ ہوں اسے ہوتی نہیں شکست

آں سخت کوش کیست کہ گرو زسنگ آب
اقبال محتاج خضر مثل سکندر نمی شود (شمشیر)

مثل نگاہ دیدہ نمناک پاک رو
در جوئے آب و دامن او تر نمی شود

گلشن میں ایک پیڑ ہے جس کو نہیں ہے چین
با ہر نجم حسن ہے تو اندر غم حسین
(مہندی)

ایک ڈبے میں بارہ خانے
ہر خانے میں تیس دانے (سال)

ایک قلعے میں نو دس پریاں
آپس میں سر جوڑے کھڑیاں (نارنگی)

زیادہ چہ؟ از تو نارے واز من نیازے نجمی
۱۲ر فروری ۱۹۶۶ء

ع دگر از سر بگیرم قصۂ زلف پریشاں را

جناب من السلام علیکم - مزاج شریف؟

شعر کے مسحور کن اثر سے یہ نہیں کہ صرف حضرات شعرا ہی متاثر ہیں، بلکہ سیاست داں، حکیم، ادیب فلسفی، مفکر، مورخ، عالم، خطیب اور صوفی بھی اس سے کافی اثر لیتے اور عالم خلوت و جلوت میں اپنے پسندیدہ اشعار (یا شعر) اکثر گنگناتے رہتے ہیں۔ یہ اشعار شاید ان کی سوانح حیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں جن کے اعادے سے ان بچتا منزان جنوں کے بیقراروں کو یک گونہ تسکین ہوتی ہے - نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے اشعار میں ایک طرح کی پیش گوئی مضمر ہوتی ہے اور وہ بسا اوقات الہام کی طرح سچے ثابت ہوتے ہیں، چنانچہ حال ہی میں ان کے ایک ہم مکتب دوست سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ لال بہادر شاستری آنجہانی اپنے اسکول لائف کے زمانے میں مرزا غالب کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

دیکھیے تو بد قسمتی سے غالب کا یہ شعر شاستری جی کے معاملے میں کس قدر سچا ثابت ہوا، کیونکہ تاشقند میں ان کی موت واقع ہوئی جہاں ان کا کوئی رشتہ دار تیمار داری کے لیے موجود نہ تھا نہ فاتحے کے لیے! اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو جو ایک سیاسی، ادیب، مفکر، مورخ اور مقرر تھے، اپنی تقریروں میں کسی کا یہ شعر اکثر دہراتے رہتے تھے ؎

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

چونکہ سیاسی جدوجہد ان کے پیش نظر تھی، اس لئے یہ شعر ان کے بالکل حسب حال تھا۔

ہندستان جنت نشان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے ؎

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

خدا کی شان کہاں اس بدنصیب بادشاہ کے آباد اجداد کا وطن ہندستان؟ اور کہاں وہ دیار غیر برما کا کوہستان؟ کہاں دلی اور کہاں رنگون! فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ع بکشد آب و دانہ دوم خاک گور!

مولانا محمد علی جوہر کا مرقوم الذیل شعر ان کی غریب الوطنی کی موت کی گویا ایک زبردست پیشین گوئی تھی۔ انگریزوں کی سامراج حکومت سے مخاطب ہو کر انہوں نے بھی کہا تھا ؎

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے وہاں
مار و دیار غیر میں ہم کو وطن سے دور

قدرت کے کرشمے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مدعو ہو کر ایک ولولہ انگیز تقریر کے بعد انہوں نے لندن میں انتقال فرمایا اور مدفون ہوئے بھی تو کہاں؟ بیت المقدس کی سرزمین پاک میں - سچ ہے یہ بھی اپنی اپنی نیک نیتوں کا ثمرا ہے!

وما تدری نفس بای ارض تموت - آیت شریف ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا۔

علامہ اقبال کی زندگی سے جب ڈاکٹروں نے قطعی

مایوسی کا اظہار کر دیا تو ان سرگوشیوں کا حال ذاکٹر صاحب کو بھی معلوم ہو گیا۔ مگر آپ مطلق پریشان نہ ہوئے اور کہا تو یہ کہا کہ "میں مسلمان ہوں اور موت سے نہیں ڈرتا"
پھر اپنا یہ فارسی شعر دہراتے رہے ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

دیکھا آپ نے ایمان و یقین کا کیا جذبۂ بے پایاں تھا!
اللّٰھم توفنی مسلما والحقنی بالصالحین - آمین!
استاد ذوق نے انتقال سے تین گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مرنے سے آگے اکثر اپنا یہ شعر مرزا غالب کے وردِ زبان رہتا تھا ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے !
عزیزو اب اللہ اللہ ہے !

میرے والد مرحوم اپنی حیات ناپائیدار کی آخری ساعتوں میں یہ مصرع اکثر دہراتے رہتے تھے۔ ع

ہوئی شام اب ہم چلے اپنے گھر کو!

اللہ ان مرحومین کو بخشے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔
منشی کرامت علی خان جو شہیدی تخلص کرتے تھے، ایک فقیرانا وضع کے آدمی تھے۔ ان کی ایک مشہور غزل کا شعر ہے۔ ؎

تمنا ہے کہ وہ اڑ کر ترے روضہ پر جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طایر روح مقید کا

بعد فریضۂ حج جب وہ مدینا منورا میں داخل ہوئے اور روضۂ مبارک کو دیکھا تو فرط اشتیاق میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور مذکورہ بالا شعر میں جو پیشین گوئی اور تمنا تھی وہ پوری ہو گئی۔
انہیں کا یہ مقطع بہت مشہور اور پیارا ہے ؎

خدا منھ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمد کا

یحیٰ

مسعودہ حیات

ہم راہی

تم جو بیگانہ تھے، بیگانہ ہی رہتے مجھ سے
کیوں مجھے درد کا احساس دلایا تم نے
پھر قدم جم نہ سکے ہوش کی دنیا میں کبھی
کس قدر شوق سے وہ جام پلایا تم نے

تم جو بیگانہ تھے دل میں کوئی طوفان نہ تھا
لمحے پانی کی طرح بہتے چلے جاتے تھے
تم جو بیگانہ تھے آنکھوں کے قریب آنکھ نہ تھی
مرحلے زیست کے ہنستے سے نظر آتے تھے
ایک طوفان بپا کر کے جہان دل میں
ایک دن بھی تو نہ آئے وہ مداوا بن کر
راہ الفت میں اگر کوئی نہ ہم راہی ہو
کون غم دور کرے، خضر و مسیحا بن کر

اسفندار - فروردی - اردی بہشت ۱۳۸۴ ایف ہندستانی ادب جنوری - فروری - مارچ ۱۹۷۵ء

عصمت چغتائی

یہ راستے ترقی کے

"کیا کروں دیدی؟ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔" مسز شہابی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے بھرے پرے شاندار گھر کو جیسے کوئی آندھی اتھل پتھل کر گئی۔ ابھی چند سال پہلے ان کا فلیٹ ہردم قہقہوں سے گونجا کرتا تھا، آئے دن پارٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے کلاکار، منسٹر، سرکاری افسر مدعو کیے جاتے تھے۔ رقص و سرود کی محفلیں جڑتیں قوالیاں، مجرے، ادبی جھگڑے، مشاعرے غرض کوئی ایسا پرلطف ہنگامہ نہ تھا جو اس فلیٹ میں برپا نہ ہوتا ہو۔ بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے دانت کاٹی روٹی تھی۔

ٹھیک طرح نہیں معلوم کہ شہابی صاحب دھندا کیا کرتے تھے۔ گھر پر اور ہوٹلوں میں بڑی بڑی پارٹیاں دینے کے سوا انہیں کبھی کچھ کرتے دھرتے نہیں دیکھا گیا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ سرکاری ٹھیکے لیتے ہیں۔ کچھ لائسنس مل جاتے ہیں جنہیں یہ بڑی کمپنیوں کے ہاتھ اونچے داموں میں بیچ لیتے ہیں۔ کبھی سپلائی کا آرڈر مل جاتا ہے تو بھی یہ خود مغز ماری نہیں کرتے اسے کہیں فروخت کر دیتے ہیں۔ کچھ شکی قسم کے لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بڑے بڑے اسمگلروں سے ساز باز ہے۔ مگر نہ جانے کیا ہوا کہ چند سال میں ہی چڑیاں اڑ گئیں۔ جیسے ان کا دھندا پراسرار تھا، ویسے ہی اس کا خاتمہ بھی پراسرار بھید ہی رہا۔ بس ہوتے ہوتے پارٹیاں دھیمی پڑیں اور پھر بجھ گئیں۔

بڑی بیٹی نے نہ جانے کس کے عشق کے چکر میں پھنس کر خودکشی کر لی۔ دوسری بیٹی نے ادھیڑ عمر کے شادی کر لی بس چھوٹی بیٹی آنکھ کا تارا رہ گئی۔ شہابی صاحب کو دلایتی شراب کے بعد ٹھرا راس نہ آیا اور وہ ایک دم چت ہو گئے۔ پیسا جیسے آتا تھا اسی طرح جاتا تھا۔ کبھی ٹکتا نہ پاتا تھا۔ خرچ دیسے ہی ڈٹے رہے۔ پھر ادھر ادھر قرض چلتے رہے۔ اس کے بعد سب دروازے آہستہ آہستہ بند ہو گئے اور یقین نہیں جہاں تو کروں جھوٹن پھینکا کرتی تھی، وہاں فاقوں پر نوبت آگئی۔

چند سال میں سارے دوست احباب ان کے گھر کا رستہ بھول گئے۔ زندگی ایک مسلسل بھاگم بھاگ ہے۔ کوئی اوندھے منہ گر جائے تو لوگ اس پر سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اسے اٹھا کے بٹھانے یا فٹ پاتھ تک پہنچانے کی کسی کو نہ فرصت، نہ ضرورت۔ عموماً دوسری گلی سے کاوا کاٹ کر نکل جاتے ہیں۔ کسی دوسرے فلیٹ میں جگمگے ہونے لگتے ہیں۔ کوئی دوسرا نو دولتیا اپنی بانگ، کھانے لگتا ہے۔

میں خود مسز شہابی کا نوٹس لینے کے موڈ میں نہ تھی۔ اتنی فرصت بھی نہ تھی۔ پہلے رمی کی پارٹیوں میں دو ایک دفعہ بطور تماشا بین کے جانا ہوا۔ پھر دو پیسہ دو روپیہ پوائنٹ رمی کا چرخا چلتے دیکھ کر راستا چھوڑ دیا۔ مسز شہابی کو وہم تھا کہ شاید میری بڑے لوگوں تک رسائی ہو گی اس لیے اکثر آ جایا کرتی تھیں

"آپ کو سلائی بہت عمدہ آتی ہے۔ مرزا کھتیں
نے ڈلونا چاہا، کر سکے، ہو، - ایک تا ... [illegible]

بارا چودارو بے آسانی سے مل جائیں گے - آپ کہیں تو میں اپنی جان پہچان والیوں سے کہوں -"

"شہانی صاحب مجھے مار ڈالیں گے - اور پھر میری آنکھوں پر زور پڑتا ہے - ابھی عینک بدلی ہے - پھر پانی آنے لگا -"

"خدمتیں سینیں تو ایک درزی بھائیے چھوٹا موٹا درزی آسانی سے میں دلوا سکتی ہوں -"

وہ کچھ کبیدہ خاطر سی ہوگئیں -

"مجھے ذلت محسوس ہوتی ہے - کونے کالج چھوڑ دیا ہے آپ اسی کو کچھ کام دلا دیجیے -"

"آپ کا مطلب ہے فلموں میں -"

"جی ہاں، آپ بہت لوگوں کو جانتی ہیں -"

"کوریسے چاند کا ٹکڑا ہے، مگر فلم کے لیے آپ کو اسے لوگوں کے پاس لے کر جانا پڑے گا -

وہ تیار ہوگئیں اور جس سے بھی سفارش ہو سکتی تھی کردی - ایک دن وہ آکر مجھ پر برس پڑیں - "یہ آپ نے مجھے کن لفنگوں کے پاس بھیج دیا - کم بخت سیدھے منھ بات ہی نہیں کرتے، کل آیئے، پرسوں آیئے - اب میں کہاں سے لاؤں ٹیکسیوں کا کرایا ؟"

"کہاں آپ فلموں کے چکر میں پڑ رہی ہیں - بمبئی میں مروت نہیں چلتی اور بمبئی لاکھوں کی فلمیں بنتی ہیں - نئی اسٹار ایک دم لینا مذاق نہیں - آپ کی بچی شرمیلی ہے -" (میں نے جھوٹ بولا) فلم میں تو بولڈ ہونا ضروری ہے - آپ اسے اور کچھ سکھایئے - ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ وغیرہ -"

وہ تو ایسی بگڑیں جیسے میں نے ان کی کنواری بیٹی کو عیب لگا دیا - "بھلا کیا فیوچر ہے اس لائن میں ؟ لوگ عزت الگ خراب کرتے ہیں اور پھر شادی کے چانس تو ختم ہی سمجھو - کوئی ٹٹا پھوٹا کلرک بھی بات نہ پوچھے گا -"

اس دن وہ کچھ ایسی بگڑیں کہ بہت عرصے تک ملاقات نہ ہوئی - میں بھی بمبئی سے باہر رہی - مگر چند برس میں ان کے دن پھر گئے - فلیٹ میں پھر وہی ہنگامے، پھر وہی دعوتیں، وہی لمبی لمبی گاڑیاں اور ان سے بھی لمبے قہقہے - وہی منسٹروں، سرکاری افسروں، فلم اسٹاروں

اور شاعروں، ادیبوں کے پرے منڈلانے لگے - کمل نے ان کی ڈوبی ہوئی ناؤ پھر سے تیرا دی -

میں انہیں درزی کی دکان کھلوا رہی تھی اب بڑے بڑے درزی کمل کی سیڑھیوں پر سجدے کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں - میں ان کی بچی کو ٹائپسٹ بنوا رہی تھی، جہاں اس وقت وہ بیٹھی ٹائپ رائٹر پر ٹھونگیں مار رہی ہوتی -

منجھلی لڑکی نے بھی رو پیٹ کر ملاپ کر لیا - اس کے پتی کو کمل نے بڑی زوردار نوکری دلوا دی ہے - دو سال ہوئے کمل نے اچانک ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کے لڑکے سے شادی کر لی - چھ سات مہینے سے زوروں سے یورپ میں ہنی مون منا رہی - پھر طلاق ہوگئی اور واپس پرانے سیٹھ صاحب سے ملاپ ہوگیا - وہ بیچارے کچھ بے دانت کے ہاتی ہیں - بس ساتھ جوان لڑکی گھومنے پھرنے کو ہو تو دل کو تراوت رہتی ہے - کمل کے علاوہ کئی اور لڑکیاں اور بیاہتا عورتیں بھی ان کے دربار سے وظیفہ پاتی ہیں - ان کی پارٹیوں کی رونق بڑھانے کے لیے ان کا وجود بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے - بالکل پرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح وہ اپنی وظیفہ خوار کو ایک دوسرے کو بخش بھی دیتے ہیں -

بمبئی کی زندگی کے لیے یہ لڑکیاں اتنی ہی ضروری ہوتی جا رہی ہیں جتنی امریکہ اور یورپ میں کال گرل ایک لازمی جز زندگی بنتی جا رہی ہے - یوں خوب صورت لڑکیوں کو ایک بہت دل چسپ اور نفع بخش مشغلہ ہاتھ لگ رہا ہے - اوپر کی آمدنی کے لیے بھی مواقع بڑھتے جا رہے ہیں - بڑے بڑے ہوٹلوں میں کیبرے اور اسٹرپ ٹیز کا چلن بھی دن بدن بڑھ رہا ہے - ساتھ میں ہیئر ڈریسنگ سیلون اور ساڑیوں اور اسمگل کیے ہوئے سنگھار کے سامان کی پرائیویٹ قسم کی دکانیں چلانے کا بھی اس طبقے کو خاصا موقع مل جاتا ہے -

بمبئی میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بیوی کا بار نہیں اٹھا سکتے - مکانوں کی قلت کی وجہ سے یا تو وہ شادی نہیں کر سکتے یا بیوی کو وطن میں رکھنا پڑتا ہے - سال دو سال میں گھر کا چکر مارتے ہیں - یہ لوگ اپنے خاندان سے بہت پیار کرتے ہیں - سال بھر تک اپنی بیوی

بچوں، ماں بہنوں کے لیے چیزیں خریدتے جمع کرتے رہتے ہیں اور ہر موقع پر انہیں رقم اور سامان بھیجتے رہتے ہیں مگر آخر کر انسان ہیں۔ ضرورت انہیں ایسی عورتوں کی تلاش پر مجبور کر دیتی ہے جو مستقل طور پر ان سے نہ چپکیں، بس کام چلتا رہے۔ یہاں ایک کمرے میں چار چار گھنٹے سے رہتے ہیں اور پیسا جمع کر کے وطن میں وسیع خوش نما گھر بناتے ہیں، جہاں ان کی بیویاں شاید برہا کے گیت گا گا کر زندگی گذارتی ہوں۔ ایسے کتنے ہی مجور تے ہیں جو بمبئی اور ایسے ہی بڑے شہروں میں عام ہو چکے ہیں یہ تو عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب ایک آدمی کا تبادلہ ہوتا ہے تو وہ اپنا زاید زینچر وغیرا نئے افسر کے سپرد کر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اکثر اپنا داشتا کا بھی آتا پتا سونپ جاتا ہے کہ وقت ضرورت کام آسکے۔

مزدور طبقے میں بھی بہت سی سہولتیں پیدا کر لی گئی ہیں۔ ہر سال باہر سے مزدور آتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بال بچوں کو وطن ہی چھوڑ آتے ہیں۔ یہاں انہیں اپنے "انتظام" میں سے حصا دے دیتے ہیں۔ ہر سال نہ جانے کتنی عورتیں بھی اپنے گاؤں میں میاں اور بچوں کو چھوڑ کر بمبئی پیسا کمانے آجاتی ہیں۔ ظاہر ہے محنت مزدوری میں اتنا نہیں ملتا کہ بمبئی کا خرچ بھی اٹھائیں اور محنط زدا علاقے میں میاں اور بچوں کو بھی سہارا دیں۔ ایسی عورتیں صرف روٹی کپڑا اور مونھ چھپانے کو کھولی مل جائے تو ایک گروہ کی مشترکہ داشتا بن کر رہنے لگتی ہیں۔ اچھا کھانے پینے کا بھی ٹھکانا ہو جاتا ہے، سینما وغیرا بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور دل کا بھی ٹھکانا ہو جاتا ہے۔ یہ عورتیں لچی بدمعاش نہیں بڑی وفا شعار بیویاں اور جان چھڑکنے والی مائیں ہیں، جو ہر وقت اپنے میاں اور بچوں کے خیال میں مست ہو کر جیتی ہیں۔

جنوبی ہندستان میں دولت کی تقسیم انتہائی نا برابر ہے۔ امیر بے حد امیر اور غریب بے انتہا غریب ہیں۔ خاص طور پر ملیالی بہت ہی تنگی کی زندگی گذارتے ہیں۔ ان کے یہاں جی بھر کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ لڑکی جہاں آٹھ [illegible]

کے ہات بمبئی بھیج دیتے ہیں۔ یہاں وہ کسی تجربا کار خشی حال آیا کے سپرد کر دی جاتی ہیں وہ باقاعدا ان کی ٹریننگ کرتی ہے۔ سب سے پہلے انہیں بمبئی کی چالو زبان سیکھنا پڑتی ہے۔ یہ خشی حال آیائیں عموماً "موسی" کہلاتی ہیں، جو غیر شادی شدا ہوتی ہیں وہ "ماتا" یعنی آیا یا دیدی کہلاتی ہیں۔ پہلے کچھ روز وہ ان سے اپنا ہی کام کراتی ہیں، پھر انہیں صرف کھانے کپڑے پر کہیں چھوٹے موٹے کام پر لگوا دیتی ہیں۔ جب یہ کچھ سیکھ جاتی ہیں تو انہیں بڑے گھروں میں تجربا کار آیا کے ہات کے نیچے دس پندرا روپے ماہوار تنخواہ پر کام مل جاتا ہے۔ دو چار سال میں تھوڑا کھانا پکانا اور اوپر کا کام سیکھ کر تیس چالیس کمانے لگتی ہیں۔ قسمت والی ہوئیں تو کسی فلم اسٹار کے دربار تک پہنچ جاتی ہیں ان بخشش وغیرا ملا کر خوب کما لیتی ہیں۔ اچھی ساڑیاں اور سونے کی زنجیر وغیرا بنا لیتی ہیں۔

یہ لڑکیاں بڑی پابندی سے جو کچھ بھی کماتی ہیں اس کا بڑا حصا وطن بھیج دیتی ہیں جس سے ان کے بھائیوں کی تعلیم وغیرا چلتی ہے۔ ایسی لڑکیاں برابر بمبئی آتی رہتی ہیں اور کما کما کر خاندان کو پالتی ہیں۔ ان میں سے زیادا تر لڑکیوں کے باپ ناکارا ہوتے ہیں جو بیٹیوں کی کمائی پر ٹھرا پی کر بیوی کو مارتے ہیں۔ موت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں یا کہیں بھاگ جاتے ہیں، دور کسی شہر میں مزے سے کسی دوسری عورت کے ساتھ عیش اڑاتے ہیں۔ بھائی بڑے ہو کر باپ کی پیروی کرتے ہیں، مگر یہ بیٹیاں خاندان کا اصل سہارا ہوتی ہیں۔

پھر بمبئی کی بے حیائی فضا میں ان پر جوانی آتی ہے۔ اس کے بعد یا تو گھر کا مالک ہی ان پر ہات صاف کر دیتا ہے۔ اس سے بچیں تو خانساماں، بیرے چھٹی کر دیتے ہیں، ورنہ ایسا ناطقا بند کرتے ہیں کہ نکلوا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ ناتجربا کار لڑکیاں اگر پھنس جاتی ہیں تو اپنی ماسی یا ماتا کے پاس جاتی ہیں اور اسے اپنا دکھڑا سناتی ہیں وہ دو چار گالیوں کوسنوں کے بعد ان کی مدد کرتی ہے۔ ان میں جو بوڑھی ہو جاتی ہیں وہ غیر قانونی دائی کا پیشا اختیار کر لیتی ہیں اور بڑی معمولی فیس لے کر ان کا علاج کر دیتی [illegible]

بگڑتا تو ہفتہ دو ہفتہ لوٹ پیٹ کر پھر کام پر آجاتی تھی۔

آیا لوگ دو قسم کی ہوتی۔ ایک تو وہ جو گوا سے آتی ہیں اور دوسری منگلور اور کیرالا کی طرف سے آتی ہیں۔ گوانی آیا کا معیار اونچا ہے۔ وہ ذرا شکل وصورت میں بھی بہتر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ جنوبی ہندستان کی آیاؤں کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ چونکہ گوانی آیائیں انگریزوں کے زمانے سے اس پیشے میں جمی ہوئی ہیں اس لیے ان میں پادری اور ان کی موسیاں اور مانا ممی کافی اچھی حالت میں ہیں۔ گوا سے اب زیادہ کم عمر بچیاں بہت کم آتی ہیں۔ وہاں کچھ اقتصادی الٹ پھیر کی وجہ سے اب ان کا بمبئی کی طرف اتنا بہاؤ نہیں، لیکن جنوبی ہندستان کی بھوکی، بدصورت لڑکی بہ افراط آرہی ہے۔

ان میں سے جو زیادہ خوش نصیب اور صورت کی غنیمت ہوتی ہیں وہ اسمگلروں اور بوٹ لیگروں کے گروہ کی خدمات بھی حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کی مالی حالت کافی اطمینان بخش ہوتی ہے۔ کسی ایک کے کمرے میں بیوی کے طور پر رہنے لگتی ہیں، لیکن اس کمرے کا مالک ہمیشہ ایک ہی نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ وہاں بیگم بن کے رہتی ہیں۔ وہاں پینے پلانے کی محفلیں جمتی ہیں تو ہوسٹس اپنی سہیلیوں کو اپنی مدد کے لیے بلا دیتی ہے۔ اسمگلر لوگ بڑے خوش مزاج اور دریا دل ہوتے ہیں۔ ان لڑکیوں کے پاس عمدہ نائیلان کی ساڑیاں، ٹرانزسٹر گھڑیاں اور کیمرے تک ہوتے ہیں۔ اپنے بھائی باپ کے لیے امپورٹیڈ قمیصیں، انڈرویئر بھجواتی رہتی ہیں۔ بعض تو اسمگل کیے ہوئے مال کا لین دین بھی کرتی رہتی ہیں۔ آپ ان سے کہیں تو سینٹ کی شیشیاں، لپ اسٹک، چھوٹے سپرے، نائیلان کے سویٹر اور کبھی کبھی قیمتی نگ اور موتی بھی منگا دیتی ہیں۔

یہ جب بڑی عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو وطن سے بچیاں منگوا کر انہیں دھندے سے لگانے لگتی ہیں۔ اس کا کچھ کمیشن لیتی ہیں جب تک چھوکری بڑی ہو کر بغاوت نہ کرے اس کی پوری تنخواہ مہینے کے مہینے لے جاتی ہیں۔ کچھ خود رکھ لیتی ہیں۔ کچھ اس کے گھر والوں کو بھیجتی رہتی ہیں۔ پھر ایک دن وہ سب کچھ سمجھنے لگتی ہے۔ موسی بہت چلاتی ہے،

ہے اور اپنا پیسا آپ سنبھالتی ہے۔

مصیبت اس وقت ہوتی ہے جب ان لڑکیوں کا کسی غیر عیسائی سے تال میل ہو جاتا ہے۔ ان کے خاندان والے تو ان کی شادی کے خیال سے ہی لرز اٹھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی روزی کا سہارا ہوتی ہیں۔ لڑکے میں شادی کرنے کی نہ ہمت ہوتی ہے نہ توفیق۔ اس کے خاندان والے بھی مخالفت میں گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اس لیے شادی کا سوال ختم ہو کر دوستی چلتی رہتی ہے۔

ہندستان کی ہر لڑکی کی طرح انہیں بھی شادی کا بہت ارمان ہوتا ہے۔ لڑکے کو طرح طرح سے گھیرتی ہیں پھندے ڈالتی ہیں۔ مگر وہ پھڑک کر نکل جاتا ہے۔ ویسے وہ خود بھی فٹ پاتھ پر سوتا ہے یا کسی کے گھر میں خانساماں بیرا ہوتا ہے تو کچن یا بالکنی میں پڑ رہتا ہے، یا ہارا داری میں بوریا ڈال کر بسیرا کرتا ہے۔ لڑکی اپنے مالک کے یہاں کسی کونے میں رات گزارتی ہے۔ وہ دلہا کو گھر داماد بھی نہیں رکھوا سکتی، نہ خود سسرال میں رہ سکتی ہے۔ ایسے میل عام طور پر دوستی کی حدوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے اگر پھنس ہی گئے اور جھانسا دے دلا کر شادی کر لی تو مصیبت میں جان پڑ جاتی ہے۔ شادی شدہ زندگی کا نہایت تکلیف دہ (بمبئی میں بہت عام) دور شروع ہو جاتا ہے۔

مرد نوکر بہت کم اپنے مالکوں کے فلیٹ میں سوتے ہیں۔ عموماً انہیں باہر سیڑھی میں یا احاطے میں جگہ ملتی ہے۔ اس لیے وہ تو اپنی دلہن کو اپنے ہاں مدعو نہیں کر سکتے۔ آیا لوگ فلیٹ کے اندر سوتی ہیں اور گھر میں جب سب سو جاتے ہیں تو چپکے سے دلہا میاں کو کچن یا بالکونی میں لے آتی ہیں اور صبح تڑکے کھسکا دیتی ہیں۔ اکثر پکڑی جاتی ہیں۔ گھر کی بیگم کسی کام سے باورچی خانہ یا ملحقہ بالکنی میں پہنچ جاتی ہیں اور چور پکڑے جاتے ہیں۔ اس وقت دونوں کی نوکری پر بن آتی ہے۔

اب اس کا بھی علاج نکل آیا ہے۔ عام طور پر گیراج کا دستور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے لوگوں نے انہیں بھی کرایے پر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ اب زیادہ تر گیراجوں میں چھوٹے موٹے اسٹور اور لانڈری کھل گئی ہیں۔ اکا دکا موٹر کے مالک ابھی تک موٹر گیراج

یہ ڈرائیور یار دوستوں کو موقع بہ موقع گیرج استعمال کے لیے دے دیتے ہیں۔ ویسے انہیں گھنٹوں کے حساب سے کرایہ پر بھی اٹھاتے ہیں اور ضرورت مند جوڑے وہاں تنہائی کے مزے لوٹ سکتے ہیں۔ ہر محلے میں ایسا گیرج ایک آدھ ضرور ہوتا ہے۔ یہاں لوگ ٹھرے کی بوتلیں گرما گرم کیے، اور چھوکریاں لے کر آتے ہیں اور داد عیش دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ سنسان ترین ساحل سمندر کے کنارے اور اوبڑ کھابڑ چٹانوں کی آڑ میں ریلوے اسٹیشن کے تاریک کونوں میں بھی زندگی کی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ میرین ڈرائیو پر سمندر کے کنارے پانی کی یورش کو کم کرنے کے لیے سیمنٹ کے بے ہنگم تکون سے ڈالے گئے ہیں بیچ بیچ میں تھوڑی سی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ جب سمندر کا پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے تو وہاں آڑی ترچھی کھاٹیں بچھ جاتی ہیں اور دھندا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر کھاٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں اور دھندا بند ہو جاتا ہے، مگر یہاں مانسون کے زمانے میں کام چلانا ممکن نہیں۔

بمبئی کی آبادی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ فٹ پاتھ لبریز ہوتے جا رہے ہیں زندگی مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے بمبئی بڑھتا جا رہا ہے، مشکلیں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ گرہستی خواب بنتی جا رہی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ہزار سہولتوں کے باوجود شادی وبال جان بنتی جا رہی ہے۔ اچھے فارغ البال طبقے کو شادی جھنجھٹ ہی لگتی ہے۔ بڑی تیزی سے شادی کی رسم ختم ہو رہی ہے اونچے طبقے کو جملہ لوازم زندگی کے ساتھ حسین اور تیار لڑکیاں اتنی آسانی سے ملتی ہیں کہ شادی ٹھپ ہو جاتی ہے، مگر طلاق کے بعد وہاں ہندستان کی طرح سستے نہیں چھوٹتے، بلکہ "ایلی منی" (یعنی نان نفقا) دینا پڑتا ہے۔ شوقین لوگ چار چار بیویوں کا نان نفقا برداشت کرتے ہیں، مگر عام طور پر ایک درمیانہ درجے کا انسان ایک طلاق کے بعد ایسا جھٹکا کھاتا ہے کہ ساری عمر پنپ نہیں پاتا۔ طلاق بیوی اگر دوسری شادی کرے تو نان نفقا بند ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ اگر ہوشیار ہوتی ہے تو صرف دوستی کرتی ہے دوسری شادی نہیں کرتی اور مزے سے ایلی منی بٹورتی

رہتی ہے۔ اس لیے وہاں کے مرد شادی سے کترانے لگے ہیں۔ انگلینڈ میں ہر سال بڑی تعداد میں جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ سے لڑکیاں آتی ہیں۔ انہیں او پیر گرل کہتے ہیں۔ یہ انگلینڈ میں انگریزی سیکھنے آتی ہیں تاکہ امریکا، آسٹریلیا اور کینیڈا جا سکیں۔ یہ لڑکیاں گزارے کے لیے ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ کنوارے انہیں داشتہ کے طور پر رکھ لیتے ہیں۔ یہ بالکل ان کی بیویوں کی طرح تمام خدمات انجام دیتی ہیں۔ روزانہ کام کرنے والی کی بجائے انہیں رکھنا آسان ہے۔ کبھی گڑبڑ میں ان کے بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں یہ آسانی سے فروخت کر دیتی ہیں، کیونکہ بچے گود لینے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ان میں سے بہت سی ہوٹلی ایشیائی باشندوں کے ساتھ بھی رہ جاتی ہیں۔ جب انگریزی فرفر بولنا آ جاتی ہے اور اچھی نوکری مل جاتی ہے تو چل دیتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری آ جاتی ہیں۔

یہ لڑکیاں ہر حال میں بیویوں سے زیادہ سستی پڑتی ہیں۔ جب جی چاہے لات مار کر نکال دو، کچھ نہیں کر سکتیں۔ وہ پرانا عزت و ناموس کا ڈھکوسلا ختم ہو چکا ہے۔ نئی عورت کو بڑی شدت سے یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ جنسی آسودگی تمہارا پیدائشی حق ہے۔ اگر غیر آسودہ رہو گی اور دلہا کا انتظار کرو گی تو تمہاری ساری نسوانیت ختم ہو جائے گی۔ کام میں کھ، جب ہی ہوشیاری دکھا سکتی ہو جب جنسی طور پر آسودہ ہو۔ اگر کوئی سرپھری لڑکی اپنی پاک دامنی پر مصر رہے تو نکو بن جاتی ہے۔ اسے ذہنی طور پر مفلوج اور ناکارا سمجھا جاتا ہے۔ جیسے ہندستان کی لڑکی اپنی عزت کے لٹ جانے کے خیال سے لرزتی ہے اسی طرح ولایتی لڑکی اپنی پاک دامنی کے خوف سے پاگل ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی بدنصیب لڑکی زیادہ دن تک پاک دامن رہ جائے تو اس کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ بری بری خفت مول کر کے اپنی جان بچاتی ہے۔ جیسے یہاں اوباش لڑکی کو نیچا سمجھا جاتا ہے، وہاں باعصمت لڑکی برف کا تودا اور بانجھ سمجھی جاتی ہے۔

جو فیشن ولایت میں چلتا ہے۔ بہت پرانا ہو کر ایک دن ہندستان بھی پہنچ جاتا ہے۔ لمبے بال، چھوٹے بال، تنگ پینٹ، ڈھیلی پینٹ، چوڑی بیلٹیں۔

ڈوداسی بنتی ہیں - دیر سے آئیں مگر آگئیں اور آیندا بھی آتی رہیں گی - بہت جلد شادی سے بیزاری کی رسم بھی یہاں پہنچ جائے گی - خاص طور پر مشینوں کے شہر میں جہاں ضروریات زندگی کی چھینا جھپٹ بہت شدید ہے - یہاں بھی شادی صرف سرمایا داروں فلم اسٹاروں اور اسمگلروں کے بس کی بات رہ جائے گی - موٹر گاڑی تو کم ہی لوگ رکھ سکتے ہیں - زیادا تر تو ریلوں بسوں اور تانگوں پر ہی چلتے ہیں - اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اخلاق کمزور ہو جائیں گے اور وہ بدچلن اور اوباش ہو جائیں گے - بعض لوگ اپنی بیویوں سے زیادا داشتاؤں کو نبھاتے ہیں - ایک تھرڈ کلاس آدمی کی بیوی سے ایک اول درجے کے آدمی کی داشتا زیادا عزت اور آرام وصول کرتی ہے - داشتا ہونے میں کوئی ٹوٹا نہیں رہا - بچوں کا سوال تو انہیں والدین گود لے لیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے حق سے محروم نہیں ہوتے - ولایت میں تو جھٹ سے طلاق مل جاتی ہے مگر ابھی ہندستان میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں - دو تین سال انتظار کرنا پڑتا ہے، تب طلاق جائز ہوتی ہے - اتنے عرصے دوستوں کی طرح اپنے اپنے دلدار کے ساتھ لوگ رہتے ہیں جو بچے ہوتے ہیں وہ متبنا بنائے جاتے ہیں جب پہلی بیوی سے طلاق مل جاتی ہے تو شادی کر لیتے ہیں - یہ ٹھاٹ صرف صاحب حیثیت لوگوں کو نصیب ہیں، ورنا ایک بڑا طبقا ایسا بھی ہے جہاں میاں بیوی کو مار کر نکال دیتا ہے اور یا تو بچے کو چھین لیتا ہے یا انہیں چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور بمبئی کے وسیع شہر میں گم ہو جاتا ہے - اکثر کسی کونے میں دوسری عورت کے ساتھ مزے اڑاتا پکڑا جاتا ہے - بیوی بچوں کو بھیک مانگنے سڑک پر چھوڑ دیتی ہے اور خود کسی ضرورت مند کے گھر روٹی کپڑے پر عارضی بیوی بن جاتی ہے جب اور بچے ہو جاتے ہیں تو وہ بھی اوب کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے - یہ تیسرا سہارا ڈھونڈتی ہے - ایسی عورت بہت آرام دہ ہوتی ہے اور اکثر دائمی کنوارے ان ہی پر گزارا کرتے ہیں - کبھی ایک عورت کئی ضرورت مند ساجھے میں بھی رکھ لیتے ہیں - کبھی بیوی سے اکتائے ہوئے منھ کا مزا بدلنے کے لیے دوستی یا چند روپوں کے بدلے میں عیش بھی کر لیتے ہیں - ایسی بھی عورتیں ہیں جو اپنے وطن میں کال پڑنے پر بمبئی کمائی کے لیے آ جاتی ہیں - یہ بچوں کو میاں کے پاس چھوڑ آتی ہیں وہ وہاں اپنی زمین کے ٹکڑے سے چمٹا رہتا ہے - یہاں یہ پیسا کما کر بھیجتی رہتی ہیں - ایسی عورتیں عموماً کسی ضرورت مند کا سہارا لیتی ہیں جس سے رہنے کھانے کا خرچ نکل آتا ہے - کبھی تحفا تحایف میں کچھ مار لیتی ہیں، کچھ گھر کے پیسوں سے چرا لیتی ہیں اور سب پیسا اپنے میاں اور بچوں کو بھیج دیتی ہیں - ان عورتوں کو اوباش اور آوارا سمجھنا غلط ہے - یہ ہر وقت اپنے بچوں کو یاد کر کے تڑپتی رہتی ہیں - ان میں اور اس مرد میں کوئی فرق نہیں جو یہاں سے اپنے بیوی بچوں کے لیے کما کر پیسا بھیجتا ہے اور ضرورتاً کوئی عورت رکھتا ہے -

ان عورتوں سے بھی گری ہوئی وہ ہیں جو فاراس روڈ کے ڈربوں میں رہتی ہیں جنہیں کہیں ٹھکانا نہیں ملتا وہ ایسے دلالوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں جو الو کا خون چوس کر چند سال میں انہیں ختم کر دیتے ہیں - یہ اس موقع کے لیے تڑپتی ہیں کہ کوئی اللہ کا بندا انہیں بھگا لے جائے اور وہ خوگیر کی بھرتی ٹھنسانے کی بجائے ایک کی ہو کر رہ سکیں - پارسائی کے جذبے سے مجبور ہو کر نہیں زندا رہنے کے لیے کیونکہ ڈربوں میں رہنے والیاں بہت جلد مر جاتی ہیں یا ہزاروں بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں اور سسکتی رہتی ہیں -

چند نیم سرکاری اور سرکاری خیراتی ہسپتال ان عورتوں کے علاج کے لیے مہینے میں ایک دوبار آدمی بھیجتے رہتے ہیں مگر اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا - ہسپتالوں میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا جو حال ہے وہ ظاہر ہی ہے - کچھ آشرم اور سرکاری گھر ایسی عورتوں کی تھوڑی بہت مدد کرتے ہیں - اس کا بھی وہی حال ہے جو دوسرے محکموں کا ہے - کسی بھی وقت چلے جایئے - اور خاص طور پر شام کو ان جنگلوں والے غلیظ گھروں میں دس دس اور بارا بارا برس کی لا تعداد لڑکیاں سامنے کھڑی نظر آ جائیں گی جنہیں ان کے گاہکوں کے سوا کوئی نہیں دیکھتا - ان کی زندگی پر فلمیں بنیں جنہیں دیکھ کر اسمبلی کے مقدس آب ہیروں کو بڑی کوفت ہوئی -

یہ خوب صورتیاں سجا کے رکھنے کے لیے تو ہیں۔ ان کا ذکر بدمذاقی ہے، اگر کوئی توجہ نہ دے تو شان قائم رہتی ہے۔ خاص طور پر یہ بات بڑی ناگوار گذرتی ہے کہ ولایتی ٹورسٹ اجنتا، ایلورا اور تاج محل دیکھنے کے بعد خشی خشی ہمارے دیش کے گن گانے کی بجائے ایسے نازک مقامات کی تصویریں لے جاتے ہیں اور وہاں سب دکھاکر ناک کٹواتے ہیں۔ اصل میں بے چارے ٹورسٹ ہمارے دشمن نہیں ہیں وہ دنیا بھر کا حسن دیکھ کر اتنے بور ہو جاتے ہیں کہ انتہائی بھیانک گندگی ذرا چونکا دیتی ہے۔

بمبئی، کلکتہ، مدراس، دلی وغیرا دن بدن ترقی کر رہے ہیں۔ ایک دن سارا ملک اسی طرح ترقی کرے گا اور اس کے ساتھ زندگی کا یہ رخ بھی "ترقی" کرے گا۔ جو آج بمبئی کو نصیب ہے، کل پیلی بھیت، ہاتھرس اور جھومری تلیا کو بھی میسر آجائے گا۔ اسی وقت ہم صحیح معنوں میں ترقی یافتہ کہلائیں گے۔

چاند سلطانہ

آزاد نظم

[illegible]

آج ٹوٹا مری وفا کا غرور
ساز دل تو جو آج توڑ گیا
دل کے دامن پہ نقش ماضی کا
کتنی یادوں کی گرد چھوڑ گیا
میری تاریکیاں بھی چھین ہی لیں
پھر تجھے روشنی ملے نہ کہیں
میٹھی نیندوں کی نرم نرم سی سیج
تیرے خوابوں کو بھی ملے نہ کہیں
چند یادوں کے زخم ہیں دل پر
یا کہ تیری جفا کے صدمے ہیں
یا تری ملتفت نگاہوں سے
مست اور پر خمار ہو کے ہیں
میری معصوم آرزوؤں کو
خودکشی کے لئے نہ کر مجبور
تیری یادوں کا واسطہ تجھ کو
بے نیازی کا چھوڑ دے دستور
زندگی کی طویل راہوں پر
ہم سفر مل کے کھو بھی جاتے [illegible]
ایک موہوم سی [illegible] پر
پھر بھی ہم تیرے در پہ [illegible]

شبنم عارفی

غزل

لٹ گئے دل بن گئے انجان تمہیں کیا معلوم
ہو گیا کوئی پریشان تمہیں کیا معلوم
اتنی بھرپور نگاہوں سے ادھر مت دیکھو
آئینہ ہو گیا حیران تمہیں کیا معلوم
ڈھونڈتے پھرتے ہو کیوں دیر و حرم میں جا کر
میکدے میں ہے مسلمان تمہیں کیا معلوم
کتنی ٹھنڈک ہے شب ہجر کے سناٹوں میں
یہ سلگتے ہوئے ارمان تمہیں کیا معلوم
جب کہ اس دل کے تڑپنے کا نہیں اندازہ؟
ترا اٹھتے ہوئے طوفان تمہیں کیا معلوم
کون گلشن میں ہے دل شاد بتائے تو سہی
سب کے کچلے گئے ارمان تمہیں کیا معلوم
کس طرح گل رہیں شاداب چمن میں شبنم
زندگی سب کی ہے ویران تمہیں کیا معلوم

محمد عبداللطیف خان

ڈاکٹر سید عبداللطیف

ڈاکٹر صاحب ضلع کرنول کے ایک بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد شاہ حسین الحسنی کرنول کے ایک مشہور عالم و صوفی تھے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۹۱ء ہے۔ آپ کا خاندان اپنی بزرگانہ عظمت اور قلندرانہ طرز زندگی کی وجہ سے سارے ملک میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خاندان میں قدامت پرستی اس درجہ پرتھی کہ فرنگی تعلیم مشکوک نظروں سے دیکھی جاتی تھی اور یہ خیال عام تھا کہ جو کوئی فرنگی تعلیم حاصل کریگا اپنے مذہب سے منحرف ہو جائے گا، چنانچہ ڈاکٹر صاحب اپنے زمانۂ طفلی میں حسب قاعدہ قرآن شریف کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا خیال تک نہ آیا، لیکن آپ کی والدہ محترمہ بڑی روشن خیال تھیں، ڈاکٹر صاحب خود فرماتے تھے کہ میری ماں کی تربیت اور روشن خیالی نے میرے لیے عالا تعلیم کے دروازے کھولے۔ وہ خاندانی روایات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بچے کو انگریزی زبان سکھانے کی طرف مائل ہوئیں، لیکن کھلے طور پر وہ ایسا اقدام نہ کر سکتی تھیں، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے والد خود فرنگی تعلیم کے مخالف تھے اس لیے انہوں نے پڑوس ہی میں ایک کلرک کو جو مدراس یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو انگریزی پڑھانے کے لیے مقرر کیا۔ اس زمانے میں مدراس کے تعلیم یافتہ کلرک بھی معیاری انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے نہایت خاموشی سے یہ تعلیم حاصل کرنی شروع کی وہ خود کہتے تھے کہ میرے والد ایک زمانے تک اس سے ناواقف تھے کہ ان کا لڑکا انگریزی زبان سیکھ رہا ہے، لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا انگریزی سیکھ رہا ہے تو بہت خفا ہوئے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا کہ انگریزی زبان سیکھ کر قرآنی تعلیم کو یورپ میں عام کر دینگے تو وہ خاموش ہوگئے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب نے اپنا وعدا پورا کیا۔

ڈاکٹر صاحب بچپن ہی سے ذہین اور ہشیار تھے اس لیے انہوں نے بہت جلد اس زبان پر عبور حاصل کر لیا۔ ابتدائی تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد جب وہ مدراس یونیورسٹی پہنچے تو یہاں انہیں اس کا اندازا ہوا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کس قدر آگے ہیں ان کی عالا ذہانت اور امتیازی کامیابی کی وجہ سے وہ نہ صرف ماہانا فیس کی جھنجٹ سے بے نیاز ہوئے بلکہ کالج کی طرف سے انہیں ایک معقول وظیفا بھی مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں آپ نے بی، اے کامیاب کیا اور سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ حیدرآباد تشریف لائے اور یہاں آپ کا تقرر جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت استاد انگریزی کے ہوا۔ کچھ عرصے ملازمت کرنے کے بعد آپ عالا تعلیم کے لیے انگلستان روانا ہوئے یہاں سے آپ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مقالا جو آپ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کیا، وہ انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر تھا۔ لندن

سے بعد تکمیل تعلیم واپس آنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت پروفیسر انگریزی آپ کا تقرر کیا گیا اور یہ خدمت آپ نے کئی سال تک انجام دی۔

ڈاکٹر صاحب کو پہلا مرتبہ میں نے پروفیسر محمد عبدالرحمان خان صاحب مرحوم صدر جامعہ عثمانیہ کے مکان میں ایک دعوت میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی چالیس سال پہلے یعنی ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ اس دعوت میں اور بہت سے پروفیسر صاحبان شریک تھے۔ ایک صاحب سفید سوٹ زیب تن کیے سر پر کرسٹی ٹوپی (رومی ٹوپی) پہنے ہوئے بڑی بے تکلفی اور مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے گفتگو میں مصروف تھے ان کا انداز تکلم کچھ ایسا دلچسپ تھا کہ میں ان کی طرف زیادہ متوجہ ہو گیا اور اپنے بازو بیٹھے ہوئے ساتھی سے اس خاص شخصیت کی تعریف پوچھی انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ ڈاکٹر سید عبداللطیف ہیں جو جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا مرزا غالب کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کافی مشہور ہو چکے تھے۔ اس محفل میں وہی علمی تذکرے ہو رہے تھے۔ مولوی عبدالرحمان خان صاحب پرنسپل جامعہ عثمانیہ کی یہ خواہش تھی کہ ہر سال ایک ریسرچ جرنل (تحقیقاتی مقالا) نکالا جائے جس میں تحقیقاتی مضامین شایع کیے جائیں۔ اور اس کی ایڈیٹری کے فرایض ڈاکٹر صاحب انجام دیں۔ بہرحال ویڑھ دو گھنٹوں کی بحث کے بعد اس محفل میں یہ طے پایا کہ ایک معیاری تحقیقاتی جرنل نکالا جائے، چنانچہ بعد میں ایک عالا پیمانے پر تحقیقاتی جرنل نکالا گیا۔ جس کی شہرت نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ کے ممالک میں پھیلی تھوڑے ہی دن بعد جب میں نے یونیورسٹی میں داخلا لیا تو ڈاکٹر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

ترجمے میں ڈاکٹر صاحب ید طولا رکھتے تھے۔ بعض دفعا آپ کا ترجما اصل سے بھی شاندار ہو جاتا تھا۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ڈاکٹر صاحب جیسا لایق شخص ہمارا استاد تھا۔ جماعت میں ترجما کرنے کا طریقا یہ تھا کہ مضمون جو ہندستانی میں ہوتا لفظ بلفظ لکھوا دیا جاتا اور حکم دیا جاتا کہ اس کا ترجما کیا جائے۔ کچھ وقفے کے بعد اب ہر ایک طالب علم سے وہ ترجما سنتے تھے ڈاکٹر صاحب ہم پر مہربان تھے اور پہلی نظر ہم پر پڑتی ہم بڑے فخر سے اٹھ کر ترجما سناتے تھے۔ جہاں پسند آیا تعریف کرتے اور جہاں کچھ غلطی ہوئی مسکرا دیتے اور کہتے کہ اس طرح لکھو۔ چنانچہ وہ ترجما لکھواتے لیکن خوبی یہ تھی کہ ہمارے الفاظ کو ڈاکٹر صاحب اس طرح ترتیب دے کر جملے بناتے تھے کہ اس ترجمے کا رنگ ہی اور ہو جاتا۔

قدرت نے ڈاکٹر صاحب کو اس فن میں بڑی مہارت عطا کی تھی۔ ہم نے دوسرے اساتذا کو بھی دیکھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے مقابل میں وہ کوئی مقام نہیں رکھتے تھے۔ بات یہ تھی کہ دوسرے اساتذا صاحبان طلبا کے جملوں کو درست کرنے کے بجائے خد اپنا ترجما لکھوا دیتے تھے۔ غرض دو سال مجھے ڈاکٹر صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ ایک انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال میں یہ ہمیں ترجما کرواتے تھے۔ اس کے بعد جب بی اس سی سال اول میں آئے تو یہ سرسری مطالعا (نان ڈیٹیل) پڑھاتے تھے۔ یہ گھنٹا بھی بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ معیاری قسم کے انگریزی ادب کے تعلق سے بحث ہوتی تھی اور عالا معلومات فراہم کیے جاتے تھے۔ یہاں بھی میرے ذمے نصاب کی کتاب کو جماعت میں باواز بلند پڑھنے کا کام سپرد تھا۔ کچھ صفحے پڑھانے کے بعد اس پر سیر حاصل بحث کی جاتی تھی۔ غرض لایق اور خلیق اساتذا کی تعلیم کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ عمر بھر سائنس پڑھ کر بھی لٹریچر کے دلدادا رہے۔ اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر صاحب جیسے لایق اساتذا کی تعلیم و تدریس ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی غیر معمولی قابلیت اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے ان کا دایرا احباب کافی بڑا تھا۔ حیدرآباد کی ممتاز شخصیتوں سے ان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے چنانچہ نواب سر نظامت جنگ مرحوم جو حیدرآباد کورٹ کے صدر تھے ڈاکٹر صاحب کے گہرے دوست تھے جو آج ملک میں ملکی اور غیر ملکی اخلاقیات پھیلے

یہی طرح اس زمانے میں بھی ملکیوں اور غیر ملکیوں میں ٹکراؤ تھا، لیکن جو حضرات شمالی ہند سے سرسالار جنگ بہادر کے زمانے میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ ان افراد کے خاندان یہاں بڑے عہدوں پر فائز تھے اور جنوبی ہند اور خود حیدر آباد کے باشندے اعلا عہدوں سے محروم رکھے جانے سے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے ٹکراؤ میں شمالی ہند والے ہی اکثر کامیاب رہتے تھے۔ چنانچہ اسی ٹکراؤ کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب اپنے مستحقہ عہدے کو پا نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے جامع عثمانیہ کے شعبے انگریزی کی صدارت کے مستحق تھے، لیکن انہیں یہ موقع نہیں ملا کیونکہ جامع عثمانیہ کی انتظامی کمیٹی کے اکثر اراکین شمالی ہند کے حضرات تھے اور ان ہی کے خاندان کا ایک فرد اس عہدے پر فائز تھا غرض اسی کشمکش میں احتجاجاً ڈاکٹر صاحب نے وقت سے پہلے وظیفہ حاصل کر لیا۔ وظیفہ حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران میں حضور نظام نے انہیں طلب کیا اور ان کی غیر معمولی فراست اور قابلیت سے متاثر ہو کر پوری تنخواہ بطور وظیفہ ان کے نام جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب بڑے وضعدار آدمی تھے انگلستان میں وہ جب تک رہے اپنی وضع و قطع نہیں بدلی خود کہتے ہیں کہ میں لندن میں ہیاٹ کے بجائے شملا باندھتا تھا۔ سوٹ یعنی کوٹ پتلون پر شملا کا وجود ہر ایک کو ان کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ انہوں نے بہت جلد اپنے استادوں کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں لندن سے لٹریری سوسائٹی (ادبی مجلس) کا ایک وفد انگلستان اور امریکا کے انگریزی پروفیسروں کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان سے امریکا گیا تو ڈاکٹر صاحب خاص طور پر اس کے ممبر منتخب کیے گئے۔ حالانکہ اس وقت ان کی حیثیت ایک طالب علم کی تھی۔ جامع عثمانیہ سے وظیفے پر علیحدہ ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کرنول کے ایک امدادی کالج کے پرنسپل بنائے گئے، لیکن بہت جلد وہ سیاسی سرگرمیوں میں منہمک ہو گئے اور اپنی ملازمت سے استعفا دیدیا۔ ان کے تعلقات مولانا ابو الکلام آزاد اور سر محمد اقبال سے کافی گہرے اور دوستانہ تھے۔ اس کے بعد محمد علی جناح سے بھی ان کے مراسم بڑھے لیکن سیاسی اختلافات کی وجہ یہ دوستی مستحکم نہ ہو سکی یوں تو ڈاکٹر صاحب اپنی مخصوص طبیعت کی وجہ سیاسی میدان میں ابھر سکے اور نہ کوئی مادی فایدا حاصل کیا۔ ان کے علمی تبحر سے مولانا آزاد بڑے متاثر تھے، انہوں نے اپنی تصنیف ترجمان القرآن انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کر دی، لیکن یہ مولانا کا آخری زمانہ تھا جس وقت مولانا آزاد کا انتقال ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت مولانا آزاد کے مکان میں بحیثیت مہمان مقیم تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے ترجمان القرآن کا بڑی خوبی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کے دو حصے طبع ہو چکے ہیں اور تیسرا حصہ زیر طبع ہے جن حضرات نے مولانا آزاد کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ ان کی زبان کتنی ادق اور طرز بیان کس قدر نرالا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے باوجود ان مشکلات کے نہایت ہی نفیس ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور میری رائے میں یہ ترجمہ انگریزی ادب میں خود ایک شاہکار اور گراں قدر نثر کا نمونہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ہر دلعزیزی اور علمی قابلیت کی وجہ سے انہیں ادبی اور مذہبی مجالس میں صدارت کے لیے انتخاب کیا جاتا۔ کمیٹیوں کے صدور آپ سے اصرار کرتے کہ صدارت قبول کریں۔ چنانچہ آپ صدارت قبول فرما لیتے تھے۔ صدارت کی ذمہ داری وہ قبول کرنے سے اس لیے پیچھے ہٹتے تھے کہ آخری زمانے میں ان کی صحت خراب ہو چکی تھی اس کے باوجود وہ انکار کرکے کسی کی دلشکنی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ یوم انیس کے موقع پر آپ نے باوجود اپنی خرابیٔ صحت کے بڑی دل افروز تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت امام حسین کی شہادت کا غم تو ہر ایک کو ہے، لیکن جو غم حضرت امام حسین کو اپنی قوم کی بے راہ روی کا تھا کوئی نہیں سمجھتا یعنی حضرت امام حسین کو غم اکابر

تھا کہ جماعت ٹوٹ رہی ہے آپس کے جھگڑوں سے اسلامی طاقت متزلزل ہو رہی ہے۔ اگر یہ غم لگ کچھ جاتے تو بہت سی پریشانیاں خودبخود رفع ہو جاتیں غم حسین کو دور کرو اور یہی حضرت امام حسین کے سوگ منانے کا بہترین طریقہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی غالب دشمنی کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ انہوں نے مرزا غالب پر جو تنقیدی کتاب شائع کی وہ تکنیک اور فن تنقید کے لحاظ سے ایک معیاری کتاب ہے، لیکن ایک من چلے شاعر کو میدان میں لاکر مغربی انداز میں تنقید کرنے سے انہیں بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ہندستانی ادب کے پرستار ڈاکٹر صاحب کے مخالف ہو گئے تھے۔

یہ بات بہت پرانی ہے، لیکن دو سال قبل جب غالب کا صد سالہ جشن منایا گیا تو انجمن ترقی اردو کے اراکین نے ڈاکٹر صاحب کو ان کی علم دوستی اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے اس جلسے کی صدارت کے لیے منتخب کیا۔ اس وقت تک مرزا غالب کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی بینائی کمزور ہو گئی تھی اس لیے وہ اپنا مضمون لکھوا دیتے اور جلسے کے موقع پر انہیں کے شاگردوں میں سے کوئی ایک متعلقہ خطبہ ڈاکٹر صاحب کی جانب سے پڑھ دیتا۔ اس موقع پر یہ کام پروفیسر سید محمد صاحب کے تفویض ہوا۔ دوسرے دن جلسہ اردو ہال میں نہایت شاندار طریقے پر منایا گیا۔ اس جلسے کے کچھ دن بعد حکومت کی جانب سے رویندرا بھارتی میں گورنر آندھرا پردیش کی زیر صدارت شری برہمانند ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش کی زیر نگرانی غالب صدی کے جلسے کا انتظام کیا گیا تھا جس کے مہمان خصوصی نواب معظم جاہ بہادر تھے۔ غالب کے تعلق سے اس موقع پر دو کتابوں کے علاوہ میری کتاب پیکر غالب کی رسم اجرا بھی ہوئی جب پیکر غالب کے مصنف کا تعارف عوام سے کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے جو اس اجلاس میں شریک تھے اپنے ایک شاگرد بلال سے پوچھا کہ کیا یہ وہی اپنا لطیف ہے تو اس پر بلال نے مسکرا کر جواب دیا کہ جی ہاں وہی اپنا لطیف ہے۔ تب ڈاکٹر صاحب نے بلال سے کہا کہ جلسہ ختم ہونے پر اس کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ جلسے کے ختم پر بلال میرے پاس آئے اور پورا قصہ سنایا اور کہا کہ آپ کی طلبی ہوئی ہے میں فوراً ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا اور سلام کیا تو مزاحیہ انداز میں کہنے لگے کہ کل آپ میرے گھر تشریف لایئے آپ کا شاندار سواگت کیا جائیگا پھر اپنے خاص انداز میں کہنے لگے کہ اس تصنیف کا ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا اور اس کو راز میں رکھنے کی کیا وجہ تھی؟ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جس دن آپ کا خطبہ گھر پر سنایا جا رہا تھا میں جان بوجھ کر وہاں سے اٹھا کہ کہیں غالب کے تعلق سے میں کچھ کہہ دوں اور آپ اس سے متاثر ہو جائیں تو مسکرا کر کہنے لگے کہ اچھا کل گھر آؤ تو تفصیلی گفتگو کریں گے دوسرے دن جب ڈاکٹر صاحب کے مکان پر گیا تو بڑی دلچسپ بحث رہی اس کے بعد مسکراتے ہوئے ایک بڑا دلچسپ لطیفہ سنایا۔ ڈاکٹر صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ جب اردو ہال کے جلسے میں کرسی صدارت پر بیٹھا تو میرے ایک دوست نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حسین کی مجلس میں یزید کی صدارت کیسی؟ یعنی ڈاکٹر صاحب نے غالب پر کڑی تنقید کی تھی۔ اب انہیں کی یاد اور اعزاز میں مقرر کیے گئے جلسے میں صدر کیسے بنائے گئے۔ اس واقعہ کو ان کے دوست نے دوسرے دن ان کے گھر پر آکر سنایا۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ماہ رمضان کے مقدس مہینے میں یعنی ۱۴ رمضان المبارک م ۴ نومبر ۱۹۷۱ء کو ہوا اسی مہینے میں کام سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ یوں تو رمضان کا ایک واقعہ سنیے۔ عشا کی نماز کے بعد چند شاگرد ڈاکٹر صاحب کے ہاں جمع ہو جاتے اور ترجمہ کا کام شروع کیا جاتا۔ کبھی تراویح کے تین بجے چار ہی بج جاتے تھے اور پھر خوشی خوشی ہم اپنے گھروں کو لوٹتے تھے۔ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ حسب معمول رات کے ایک بجے ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے اور خیال تھا کہ گیارہ بجے تک واپس لوٹ جائیں گے، لیکن ہم تو ترجمے میں ایسے محو ہو گئے کہ اچانک سحری کو اٹھنے والے حضرات کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں تو

دیکھی تو معلوم ہوا کہ رات کے چار بجے ہیں - غرض محویت کا یہ عالم ہوتا کہ وقت کا احساس ہی نہ ہوتا ؎

ملا ساقی جو دریا دل بلا نوشوں کی بن آئی
اٹھایا شام سے ساغر تو ہنگام سحر رکھا

ایک سیدھے سادے آدمی کے لیے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کچھ جاذب نظر نہیں تھی، لیکن جب وہ گفتگو کرتے تو سننے والوں پر ایک محویت طاری ہوجاتی تھی - قدرت نے انہیں ایک غیر معمولی دل و دماغ عطا کیا تھا، لیکن آخری زمانے میں، جب وہ قرآن شریف کا ترجما اور تفسیری تحقیقاتی مقالے لکھنے میں مصروف ہوئے تو اس وقت ان کی بینائی بہت کمزور ہوگئی تھی - خصوصاً ایک آنکھ کی روشنی بالکل غایب ہوچکی تھی، لیکن اس باہمت شخص نے ان موانعات کے باوجود جس کام کو تکمیل کرنے کا بیڑا اٹھایا اس کو خدا کے فضل سے مکمل کر کے چھوڑا - خصوصاً جب قرآن شریف کا ترجما آخری مرحلوں سے گذر رہا تھا وہ اچانک سخت علیل ہوگئے اور تقریباً ایک مہینا سکندرآباد کے دواخانے میں انہیں زیر علاج رہنا پڑا - اس وقت ہم تمام دست بدعا تھے کہ ڈاکٹر صاحب جلد اچھے ہوجائیں اور قرآن شریف کا ترجما مکمل ہوجائے چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی طلب صادق اور شاگردوں کی دعا اور پھر مقدس کام کی تکمیل کے ارادے نے انہیں بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ وہ باقی کام آسانی کے ساتھ انجام دے سکے -

قرآن شریف کا ترجما جب چھپ کر منظر عام پر آیا تو بعض منچلے حضرات جن کا پیشہ تنقید نگاری اور تنقیص نگاری تھا اس ترجمے پر اعتراضات کیے اور بعض انگریزی اخباروں میں اس ترجمے کے خلاف مضمون لکھے گئے - ڈاکٹر صاحب نے ان تنقید نگاروں کا منہ توڑ جواب دیا - ان حضرات کا اعتراض تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب عربی زبان سے ناواقف ہیں تو وہ ترجما کیسے کر سکتے - ڈاکٹر صاحب عربی زبان سے کیا حد واقف تھے - میرے خیال میں ان کی عربی زبان کی قابلیت ان تعلیم یافتہ پروفیسر بھوشن سے بھی کئی گنا زیادہ تھی جنہوں نے عربی زبان میں ڈگریاں حاصل کیں - مسٹر پکتھال جو پیدایشی انگریز تھے اور جنہوں نے تعلیمات اسلامی سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ان کی مادری زبان عربی نہ تھی، لیکن ان کا قرآن شریف کا ترجما انگریزی زبان میں ایک مستند ترجما مانا جاتا ہے - انہیں عربی زبان پر کافی عبور نہ تھا اس مقصد کے لیے وہ مصر گئے اور انگریزی داں عربی عالموں سے استفادہ کیا، کیونکہ وہ قرآن شریف کے اردو ترجموں سے ہندستانی زبان نہ جاننے سے مستفید نہیں ہو سکتے تھے - ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں مسٹر پکتھال سے زیادہ خوش نصیب تھے وہ انگریزی زبان کے جید عالم، ہندستانی زبان کے مستند استاد اور عربی زبان پر انہیں کافی عبور تھا - ایسی خوبیوں سے مزین شخص کے لیے ترجما کرنا کچھ مشکل نہ تھا - پھر بھی ان کے حلقۂ احباب میں عربی اور انگریزی جاننے والوں کی کمی نہ تھی ان حضرات نے ڈاکٹر صاحب کے ترجمے جیسے مقدس کام میں انتہائی عقیدت مندی اور پورے انہماک سے ہاتھ بٹایا - ترجما کے طریقے کار کے متعلق کچھ مختصر روداد قارئین کی معلومات کے لیے پیش ہے، تا کہ وہ لوگ جو ڈاکٹر صاحب کے ترجمے سے مطمئن نہیں ہیں حقیقت سے آگاہ ہو کر مطمئن ہو جائیں -

عموماً رات میں عشا کی نماز کے بعد تعطیل کے دن صبح دس گیارہ بجے پانچ چھ حضرات ان کے مکان پر جمع ہوجاتے تھے - یہ حضرات انگریزی، عربی اور ہندستانی زبان کی کافی مہارت رکھتے تھے - کوئی عربی عالم ہوتا تو کوئی انگریزی اور ہندستانی ادب کا ماہر ہوتا - مختلف مستند انگریزی اور ہندستانی ترجموں کو سامنے رکھ لیا جاتا اور احتیاطاً شاہ ولی اللہ صاحب کا فارسی ترجما پیش نظر ہوتا - قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی جاتی اس کے بعد اس آیت کے مختلف ترجمے انگریزی میں پڑھے جاتے پھر ہندستانی ترجموں کی باری آتی اگر ضرورت محسوس ہوتی تو شاہ ولی اللہ صاحب کا فارسی ترجما بھی پڑھا جاتا - ترجموں کے تعلق سے بحث ہوتی بعد میں ڈاکٹر صاحب کافی غور و فکر کے بعد اپنا انگریزی ترجما تحریر کرواتے تھے - مثلاً

کمزور ہونے کی وجہ وہ خود نہیں لکھ سکتے تھے۔ مجھے اکثر ان ترجموں کو تحریر کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

غرض اتنی کاوشیں اور غور و فکر کے بعد جب ترجما کیا جاتا تو اس کا مستند ہونا یقینی ہے گستاخی معاف اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں قدرے ضد تھی بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ جو وہ کہتے دوسروں کو ماننے کے لیے اصرار کرتے تھے اس طرح تھوڑی دیر کی بحث اور متفقہ رائے کے بعد ترجما لکھا جاتا تھا۔ ایک واقعا بیان کرتا ہوں ایک ترجمے کے ضمن میں کافی بحث ہوئی میں مصر تھا کہ ترجما بدلا جائے لیکن ڈاکٹر صاحب نے نہیں مانا آخر میں بھی ان کا شاگرد تھا میں نے عرض کیا کہ اس ترجمے کے آپ ذمے دار ہیں۔ آپ کے کہنے پر لکھ دیتے ہیں لیکن بعد میں غور فرمایئے ہمارے جانے کے بعد آپ نے اس ترجمے کو دوبارہ اطمینان سے دیکھا جب دوسرے دن ہم گئے تو مسکرا کر کہنے لگے کہ آئیے آپ کو الہام ہوا ہے اور دوبارہ اس ترجمے کو لکھوایا۔ بعد میں کہا کہ میں بحث و مباحث کا قایل ہوں اس سے بہت سی اچھی باتیں منظر عام میں آتی ہیں۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ میرے شاگرد بغیر سوچے سمجھے خصوصاً قرآنی آیتوں کا ترجما نہ کریں۔ غلط ترجموں سے بعد میں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف جیسی مقدس کتاب کا ترجما کیا یہ ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک قایم رہیگا اور ان کا یہ مقدس اور نیک عمل حق تعالیٰ کے دربار میں ان کی نجات کا وسیلا بن جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ۱۴ رمضان سنہ ۱۳۹۱ھ مطابق ۴ نومبر سنہ ۱۹۷۱ء کو ساڑھے پانچ بجے صبح ہوا۔ مرنے سے قبل وہ معروف حمد الٰہی رہے۔ بالآخر سرزمین دکن کا یہ درخشاں ستارا ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی و سیاسی کارناموں اور جامع صلاحیتوں کا تذکرا اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہے۔

ہندستانی پڑھیے - ہندستانی لکھیے - ہندستانی بولیے

م - اخلاق

ایک لڑکی ایک جام

ایک لڑکی، ایک جام
جام جس کو توڑنے کی سعیٔ لا حاصل میں بکھرے ٹوٹ کر خود
وقت کا ایک ایک لمحہ
اور
ہر گردش زمانے کی
دلوں پر اور گہرا کر کے چھوڑے اس کا نقش
ایک لڑکی، ایک جام
جام جس کو پیتے پیتے عمر ساری بیت جائے
اور
باقی ہی رہے جس کی شراب
ایک لڑکی ایک جام
جام جس کو چھو نہ پائے شوق کے لب
اور
جس کی آرزو میں
جلتے جلتے بجھ گئی شمع حیات

سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر برھان

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

فرض کیجیے آپ نے اپنا ایک گھر بڑی تمناؤں اور آرزوؤں سے بنایا ہے جس میں موجودہ زمانہ کی تمام سہولتیں اور آسانیاں فراہم ہیں۔ یہ مکان بنایا تو اصل میں آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کی آسائش و راحت کے لیے تھا، لیکن آپ کے تعلقات وسیع تھے۔ اس لیے آپ کے دوست احباب جو ہر مذہب و ملت کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ ان کے لیے اس مکان کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ یہ لوگ آتے تھے اور بے تکلف تھوڑے بہت دن یہاں مقیم رہ کر مکان کی آسائشوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مکان بہرحال آپ کا تھا۔ اس کا دروبست دیکھ بھال اور نگرانی یہ سب آپ کی تھی۔ آپ اس حالت میں کس اطمینان اور خود اعتمادی سے رہتے تھے! لیکن ایک دن صبح کو جب آپ کی آنکھ کھلی تو اچانک معلوم ہوا کہ ملک میں انقلاب آگیا ہے۔ جاگیر جائیداد اور املاک کے قاعدے اور قانون بدل گئے ہیں، اور ان قوانین کے ماتحت آپ کے مکان پر کسٹوڈین کا قبضہ ہوگیا ہے آپ رہیں گے اب بھی اسی مکان میں وہ مکان ہوگا اب بھی آپ کے نام سے منسوب! بلکہ آپ اس مکان میں پہلے سے زیادہ وسعت اور آرام کا و آسائش کا سامان ہوگا۔ فرنیچر بھی پہلے سے زیادہ قیمتی اور [illegible] ہوگا، لیکن دروبست اور اس کا انتظام [illegible] کے ہاتھ میں ہوگا جو ہو سکتا ہے کہ آپکا بھائی بند ہی ہو اور غیر نہ ہو۔ فرمایئے! اگر آپ کے مکان کے ساتھ یہ معاملہ پیش آئے تو آپ کو طبعی طور پر صدمہ اور رنج ہوگا یا نہیں؟ ہوگا۔ اسی بنا پر ہم کو شروع میں ہی یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) بل ۱۹۷۲ء سے جو حال میں ہی پارلیمنٹ سے منظور ہو کر صدر کی تصدیق و توثیق کے بعد نافذ ہوا ہے۔ مسلمانوں کو عام طور پر مایوسی ہوئی ہے اور اس یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ جو ان کو گہرا تعلق اور جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ اس کو شدید ٹھیس لگی ہے جس سے وہ بلبلا اٹھے اور سراسیمہ و مضطرب ہو گئے ہیں، لیکن زمانہ سدا یکساں نہیں رہتا۔ وہ بدلتا ہے۔ تو سماج کی قدریں بدلتی ہیں۔ رہن سہن اور آپس کے علائق و روابط کے قاعدے قانون اور ضابطے بدلتے ہیں اور اس وقت وہی لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو وقت کی دیوار پر ان لکیروں کو پڑھ کر جدید دور کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کی کوشش بیدار۔ مغزی اور روشن دماغی کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی اور وہ زمانے کے ساتھ آگے بھی بڑھتے رہتے ہیں مسلم یونیورسٹی کا بل موجودہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے تاریخ کا ایک نہایت اہم موڑ ہے اور ان کی آئندہ نسلوں پر اس کے بہت دور رس اثرات پڑیں گے۔ اس لیے [illegible] مسلمان جذبات

سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی نظر سے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس یونیورسٹی کے ماضی اور حال کا جایزہ لیں اور اس کی روشنی میں یہ طے کریں کہ مستقبل میں جو امکانات ہیں ان سے کس طرح عہدہ برا ہو سکتے ہیں زمانہ کا آہنگ بدلا ہے تو انہیں بھی اپنے نغمے کے لیے ایک ایسی لے تلاش کرنی ہوگی جو اس آہنگ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے قومی مسایل و معاملات کبھی جذباتیت کی راہ سے طے نہیں ہوتے ترجمان حقیقت نے اسی لیے کہا ہے:

جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

اب آیئے پہلے اسی یونیورسٹی کے ماضی کا جایزہ لیں۔

سرسید کا نصب العین

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ۱۸۷۵ء میں سرسید نے جو ایم او کالج قایم کیا تھا، اگرچہ اس کا دروازہ غیر مسلموں پر کبھی بند نہیں ہوا، چنانچہ سرسید کی زندگی میں اس کالج سے جو ایک سو بیس طلبا گریجویٹ ہوئے ان میں ۹۷ مسلمان تھے اور باقی ۲۳ ہندو، لیکن اس کالج کے قیام کا اصل مقصد مسلمانوں کو تعلیم جدید سے بہرہ یاب کرنا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے ۱۸۵۷ء کے حوادث و واقعات کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا تھا۔ انگریزوں کے جذبۂ انتقام اور غیظ و غضب کا نشانہ سب سے زیادہ یہی بنے تھے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کی پسماندگی کا منظر نہایت درد انگیز اور تشویش افزا تھا۔ اس لیے سرسید نے اپنی زندگی مسلمانوں کی تعمیر و ترقی اور ان کی تشکیل نو کے لیے وقف کر دی۔ فرقہ پرستی اور قوم پروری میں صرف ایک باریک فرق ہے۔ اگر سرسید یہ سب کچھ اس نیت اور اس ارادے سے کرتے کہ انہیں مسلمانوں کو ہندوؤں کا مدمقابل اور برابر کا حریف بنانا ہے تو وہ فرقہ پرست کہلاتے، لیکن انہوں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ جسم کا اگر کوئی ایک عضو کمزور ہو جائے تو پورے جسم کی تندرست

نہیں کہا جا سکتا تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ سرسید کا یہ عمل قوم پرورانہ نہیں تھا اور اس سے پورے ہندستان، قوم اور ملک کو فایدہ پہنچنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ سرسید کی پوری زندگی ان کے اسی بلند اور نیک ارادے و مقصد کی ترجمان ہے۔ اس زمانے میں جو انصاف پسند ہندو تھے وہ سرسید کا اس عظمت فکر و عمل کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال کی دیواروں میں جن چندہ دینے والوں کے نام کندہ ہیں۔ آپ دیکھیں گے ان میں ہندوؤں کے نام بھی ہیں ایک طرف سرسید کی بلند فکری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوؤں کو اپنی ایک آنکھ کہتے تھے اور دوسری جانب ہندوؤں میں سرسید کی پذیرائی اس درجا تھی کہ جالندھر میں جب ان ہندوؤں کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا تو ایڈریس میں صاف طور پر اس کا اعتراف کیا گیا تھا کہ سرسید صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی لیڈر ہیں۔ بہرحال سرسید نے یہ کالج اصلاً اور حقیقتاً مسلمانوں کے لیے بنایا تھا اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ عمل آج کل کے اصطلاحی معنی میں فرقہ پرستانہ تھا۔ چونکہ مسلمان مذہب کے بغیر رہ نہیں سکتے اور اس کا تحفظ اور اس کے احکام کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ اس بنا پر سرسید نے کالج میں انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم کے ساتھ دینیات اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ اسلامی شعایر اور اسلامی تہذیب و روایات کے تحفظ و بقا اور ان کی نشو و نما کے لیے جو چیزیں ضروری تھیں ان کے بھی انتظامات کیے اور اس طرح انہوں نے مسلمان نوجوانوں کی اسلامی تربیت کو بھی ان کی تعلیم کا لازمی جز قرار دیا۔ انہیں ... کی بنا پر سرسید کے نزدیک تعلیم کے لیے ... زندگی ناگزیر تھی۔ سرسید نے ایک ... بڑی صفائی اور قوت سے کہا ہے ... لیے اس سے زیادہ ... تاریخ کو بھول جائے اور اپنے ... انہیں ان مسلمانوں ...

کو مشنری اسکولوں میں بھیجتے تھے کہ وہاں تعلیم خواہ کتنی ہی عالا اور عمدا ہو، لیکن بچے اپنے دین سے منحرف ہو جاتے تھے۔ ایک لکچر میں کس سوز و گداز اور درد سے کہتے ہیں۔ مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ان کو غیرت نہیں آتی (لکچروں کا مجموعہ ص ۱۵۸)

سرسید کا یہ کالج صرف ایک تعلیم گاہ نہیں تھا، بلکہ در حقیقت انیسویں صدی کے ربع آخر میں ایک ایسی ہمہ گیر اور نہایت توانا تحریک تھی جس نے ہندستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا اور ان کی حیات ملی و قومی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو اس تحریک سے متاثر نہ ہوا ہو۔ عجب اتفاق ہے سرسید نے جب اپنی تحریک شروع کی تو یہ زمانہ عالم اسلام میں بحران کا زمانہ تھا، چنانچہ اسی زمانے میں ترکی، مصر، انڈونیشیا، ایران اور مراکو اور نائجیریا میں بھی اصلاحی تحریکیں اور بڑے بڑے مفکر اور مصلح پیدا ہوئے۔ لیکن سرسید نے جن حالات میں تحریک شروع کی۔ اس کو جس طرح کامیاب بنایا اور اس تحریک نے مسلمانوں میں جو انقلاب عظیم برپا کیا، اگر ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر سرسید کا موازنہ اس زمانے میں عالم اسلام کے دوسرے مفکرین مصلحین سے کیا جائے تو بے مبالغہ مجموعی حیثیت سے سرسید سب سے زیادہ قد آور ثابت ہوں گے یوں تو اس دنیا کی ریت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی حیات مستعار کی ہر راحت و آسایش قربان کرکے ایک چیز ایجاد کرتا ہے پوری دنیا اس ایجاد سے فایدہ اٹھاتی رہتی ہے، لیکن اس کے مر جانے کے بعد تاریخ کی چند کتابوں کے علاوہ دنیا اس شخص کا نام تک بھول جاتی ہے، اس لیے اگر آج سرسید کو بھی لوگ بھول گئے تو اس پر حیرت اور اسی کا شکوہ کس سے اور کیوں کریجیے۔

سرسید کے ذہن میں یونیورسٹی کا تصور

سرسید ایسا حوصلہ مند شخص یونیورسٹی سے کم کس چیز پر قانع ہو سکتا تھا، چنانچہ ان کا اصل ارادہ یونیورسٹی ہی قایم کرنے کا تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں سید محمود نے جو اسکیم ۔ار فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اس میں انہوں نے صاف صاف اس بات کی تصریح کر دی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسا یا کالج ہی قایم کرنا نہیں ہے، بلکے ایک یونیورسٹی قایم کرنی ہے۔ پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے اور ہندستانی میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دار العلوم نام رکھنا چاہیے (حیات جاوید جلد اول) اس یونیورسٹی کی نسبت سرسید کے عزایم اور مقاصد کس در جا بلند اور عالا تھے اس کا اندازا ان کی ایک تحریر کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہوگا فرماتے ہیں۔

"یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں کہ اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں جو ٹکڑا ٹیڑا علم کا وہ دیتی ہے اس کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جبکہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنے قومی علوم پھیلائیں گے فلسفا ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو تجربا بناتی ہے۔"

اس کے بعد نہایت صفائی سے فرمایا۔

اے دوستو! میں قدیم ایام میں ہوں کیونکہ مجکو ایک یونیورسٹی نے ال-ال ڈی کی ڈگری دی ہے ہم آدمی حب کا بنیں گے جب ہمارا قلعہ جارے ہاتھ (؟)

ہوگی - سرسید کی یہ تقریر اور اس کے علاوہ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اور کہا ہے اس سب کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سرسید جس قسم کا یونیورسٹی مسلمانوں کے لیے قایم کرنا چاہتے تھے اس کی خصوصیات حسب ذیل تھیں -

(۱) یہ یونیورسٹی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے طرز پر ہوگی اس بنا پر اس کے لیے اقامتی کردار اس کا جزو لاینفک ہوگا اور اس کا معیار تعلیم ہوگا جو ان یونیورسٹیوں کا ہے - فرق صرف اسی قدر ہوگا کہ ان یونیورسٹیوں میں عیسائی عقاید اور مغربی تہذیب کی تعلیم ہوتی ہے اور اس یونیورسٹی میں اسلامی عقاید کی تعلیم دی جائے گی اور اس کی فضا اسلامی تہذیب کی ہوگی -

(۲) اس مقصد کے پیش نظر مغربی علوم وفنون اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں اسلامی علوم وفنون اور دینیات کا درس بھی ہوگا -

(۳) یونیورسٹی حکومت کے کنٹرول اور اس کی مداخلت سے بلکل آزاد ہوگی -

(۴) اس یونیورسٹی کا انتظام تعلیم تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا اور اس معاملے میں وہ کسی کے تابع نہیں ہوں گے -

(۵) اس مقصد کے لیے یونیورسٹی کے تمام اخراجات کا تکفل مسلمانوں کو خد کرنا چاہیے - گورنمنٹ کی امداد پر بھروسا کرنا یونیورسٹی کے مقاصد سے اعراض برتنا ہے -

تعلیمی خدمختاری وآزادی

ان دفعات میں ہمارے مقصد کے پیش نظر وہ دفعات (۳ - ۴ - ۵) زیادا اہم ہیں جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یونیورسٹی حکومت کی مداخلت سے آزاد ہوگی - مسلمان اپنی تعلیم کے خد مالک اور اس کے اخراجات کے خد متکفل ہوں گے - درحقیقت سرسید کی یہ راے تعلیم سے متعلق اسلامی فکر کی بلکل صحیح ترجمان ہے - اسلام میں تعلیم دین کی ہو یا امور دنیا کی ایک نہایت مقدس اور ضروری

فریضۂ انسانی ہے اس بنا پر اس کو بلکل آزاد اور حکومت وغیرہ کے دباو سے محفوظ ہونا چاہیے اور ساتھ ہی تعلیم چونکہ نوع انسان کے علاوہ اس کو ذریعۂ معیشت بنانا ایک مشہور مثل کے مطابق کشمیر کی بیٹی ہوئی ایک نہایت قیمتی شال سے جوتوں کے صاف کرنے کا کام لینا ہے - پوری تاریخ اسلام میں تعلیم سے متعلق ارباب علم اور اصحاب درس وتعلیم کا تعامل اس امر کی بین شہادت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تعلیمی نظام کو حکومت کے اثر سے ہمیشا آزاد رکھا ہے - چنانچہ اسی علی گڑھ کالج سے نو تین برس بیشتر دیوبند میں مدرسا قایم ہوا تو اس کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے مدرسے متعلق اپنے وصیت نامے میں جواب تک محفوظ ہے - مدرسے کے ارباب انتظام کو سخت تاکید کی کہ مدرسا کا تعلق حکومت سے (چاہے اپنی ہو یا غیروں کی) ہرگز کسی قسم کا نہ ہو اور نہ گورنمنٹ کی کوئی گرانٹ منظور کی جائے -

الحمد للہ دارالعلوم دیوبند آج بھی جبکہ اس کا سالانا بجٹ تیرا لاکھ روپے ہے اپنی اسی وضع پر قایم ہے میری طالب علمی کے زمانے کی بات ہے ایک مرتبا سرمیاں محمد شفیع اور سرمیاں فضل حسین جو اس زمانے میں وایسراے کی اکزکٹو کونسل کے ممبر تھے دیوبند تشریف لاے ان کے اعزاز میں مدرسے کے نودرا میں ایک جلسا ہوا - سرمیاں محمد شفیع نے (مجھے اب یہ یاد نہیں کہ دونوں حضرات ساتھ آے تھے یا یکے بعد دیگرے) نے اپنی تقریر میں مدرسا اور اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی اور پھر حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے فرمایا - گورنمنٹ کی بڑی خواہش ہے کہ وہ مدرسے کو گرانٹ دے - یہ گرانٹ بغیر کسی شرط کے ہوگی - اس سے مدرسے کو ایک فایدا یہ بھی ہوگا کہ طلبا کو ریلوے کنسیشن مل جاے گا - اسی سلسلے میں انہوں نے وہ بات بھی کہی جو آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اقلیتی کردار کے محافظ عام طور پر کہتے ہیں انہوں نے کہا آپ حضرات کو گورنمنٹ سے گرانٹ لینے میں تامل کیا ہے ؟ گورنمنٹ آپ کو جو روپیا دے گی یہ تو وہی روپیا ہے جو

آپ سے حاصل کرتی ہے۔ اس تقریر کے جواب میں مدرسے کی طرف سے حضرت الاستاد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے ایک نہایت فصیح و بلیغ اور پر مغز تقریر کی اور مدرسے کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے سر شفیع کی بات کے رد میں فرمایا۔ جی ہاں آپ نے بجا فرمایا کہ گورنمنٹ کی صورت میں جو روپیہ ہم کو دے گی وہ اصل میں ہمارا یعنی ملک و قوم کا ہی روپیہ ہوگا، لیکن یہ روپیہ جن ہاتھوں سے ہم کو ملے گا اس میں ان ہاتھوں کے اثر کا آجانا ضروری ہے اور ہم مدرسے کو اس اثر سے محفوظ رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ مولانا ایک نہایت بلند پایا مقرر بھی تھے۔ اس لیے انہوں نے روپیہ میں ہاتوں کے اثر کا فلسفہ ایسے موثر اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا کہ حاضرین پر اس کا بڑا اثر ہوا اور سر شفیع پھر کچھ نہ کہہ سکے اور اپنے مشن میں ناکام واپس ہوئے۔ یہ واقعہ انگریزوں کے زمانے کا تھا۔ اب آزادی کے بعد کا ایک واقعہ سنیے غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت اتر پردیش میں سمپورنانند جی وزیر تعلیم تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں مولانا حفظ الرحمان صاحب مرحوم مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند اور راقم الحروف ہم تینوں سمپورنانند جی سے ملاقات کے لیے ان کے مکان پر گئے۔ حسب معمول بڑے تپاک سے ملے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ اب جب کہ ملک آزاد ہو گیا اور ایک قومی حکومت قایم ہو گئی ہے۔ دار العلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی گرانٹ پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا محمد طیب صاحب نے فوراً جواب دیا "سمپورنانند جی اگر حکومت مسلمانوں کی بھی ہو تب بھی ہم مدرسے کے بانی کی وصیت کے مطابق کوئی گرانٹ منظور نہیں کر سکتے۔ ہمارا اصول ہی یہ ہے کہ ہماری تعلیم ہر قسم کے بیرونی اثر اور دباؤ سے آزاد رہے۔ اس کے بعد صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولانا ابو الکلام آزاد وزیر تعلیم دیوبند تشریف لے گئے، لیکن الحمد للہ مدرسہ آج تک اپنی اسی وضع پر قایم ہے۔ درحقیقت یہی وہ خاکساران جہاں ہیں جن کی نسبت مولانا شبلی نے فرمایا تھا:

اے که پرسی چه کسانیم و چه سامان داریم

آنچه با هیچ نیرزد به جهان آن داریم

مانه آنیم که بر شیوهٔ ارباب حشم

روئے در راه به در دولت سلطان داریم

خاکساران جهانیم و ز اسباب جهان

بوریائے که در کلبهٔ احزان داریم

سر سید کے دل کی یہی پکار تھی جس کا اظہار ان کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہند کی زبان سے اس وقت ہوا جبکہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کرتے ہوئے آپ نے علی گڑھ کی جامع مسجد میں فرمایا

"ضرورت اس کی ہے کہ وہ (جدید) تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقاید و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثر سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں میں غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔" (جوہر جامعہ جوبلی نمبر ص ۱۵۳)

ایک عبرت انگیز واقعہ

قومی حمیت و غیرت۔ عزت نفس اور خود داری کا بھی وہ مقام رفیع و بلند تھا کہ جب کبھی ہم نے اسے نظر انداز کیا ہے۔ غیروں سے بے محابا طعنے سنے اور ذلتیں اٹھائی ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا حالی نے ایک سخت عبرت انگیز واقعہ لکھا ہے۔ انہیں کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں۔

"جب دوسری بار سید محمود (فرزند سر سید) لفٹنٹ انگلستان کو گئے اور کیمبرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا ایک بہت بڑا کالج ہے اور آج کل اس کا ارادہ ... کیمبرج ... متعلق ...

کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت عظیم الشان عمارت از سر نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپے اس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے برسبیل تذکرہ اپنے دوست سے کہا کہ اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اس میں روپیا ضائع کرنے سے کیا فائدا؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایا اس کی ضرورتوں سے بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیا مدرستہ العلوم (علی گڑھ) ہی کی امداد کے لیے دے دیں۔ ان کے دوست نے کہا۔ "ہندستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟" سید محمود نے کہا چھ کروڑ وہ (انگریز دوست) سن کر نہایت متعجب ہوا اور یہ کہا "جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلا ہوں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے ایک مدرسا قایم نہیں کر سکتے۔ ان کی اعانت کرنی گناہ ان کو تباہ ہونے دو!" (حیات جاوید ج ا ص ۱۵۴)

یہ نوٹ کر لیجیے کہ آج بھی ہندستان میں مسلمان کچھ زیادا چھ کروڑ ہی ہیں اور بدقسمتی سے ان کے تعلیمی مسایل آج بھی وہی ہیں جو مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تاسیس کے وقت تھے۔ وائے ماماندگی شوق و تہی داماں آرزو! تو میں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں، ہمریان تیز گام کی گرد کارواں بھی نظر نہیں آتی اور ہم پوری ایک صدی کے بعد بھی آج وہیں ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا! ؎

ہر پھر کے ایک ہی دائرہ میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی ہے کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں!

سرسید کی مایوسی اور ناکامی

یہ وہ وقت تھا جبکہ کوئی شخص تعلیمی حکومت کی اجازت کے بغیر نہ توڑ سکتا تھا اور پھر یونیورسٹی کا معاملا تو ایسا تھا کہ حکومت اگر اس کو تسلیم نہ کرے تو اس کا وجود ہی معتبر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر یونیورسٹی اور اس کے مقاصد سے متعلق گورنمنٹ کو لکھا گیا، لیکن اس نے مسلم یونیورسٹی کے نام سے یونیورسٹی کے قیام کی اجازت اور اس کو گرانٹ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں "جب گورنمنٹ سے اس کا جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قایم کرنا چاہتی ہے۔ تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دینے کی" یا وجہ اس کے سرسید کا ارادا یہی تھا کہ یونیورسٹی قایم کی جائے ان کو یقین تھا کہ جب تک موجودا یونیورسٹی کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا۔ تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہو گی۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسے پر قایم کرنا آسان کام نہ تھا نہ طالب علم اور نہ ان کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونے والا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعا ہیں۔ قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودا یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے کو ہی فوز عظیم سمجھا جائے۔ الغرض سرسید کو اپنا منصوبا پورا کرنے سے بلکل مایوسی ہو گئی۔ یونیورسٹی کا خیال انہوں نے بلکل چھوڑ دیا۔ (حیات جاوید ج ا ص ۱۴۳-۱۴۴)

مدرستہ العلوم علی گڑھ کا قیام

سرسید کو اپنے تصورا اور جذبے و ولولے کے مطابق یونیورسٹی کے منصوبے میں اگرچہ مایوس اور ناکام ہونا پڑا تھا، لیکن وہ حالات سے بددل ہو کر چھوڑ دینے والے انسان نہیں تھے۔ ان کا عقیدا تھا کہ سخت مجبور کن اور صبر آزما حالات میں بھی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے زیادا سے زیادا جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ کرنا چاہیے اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیے۔ عربی کا مشہور مقولا ہے۔ "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ"، یعنی جس چیز کو بتمامہ حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کو بتمامہ ترک بھی نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ انہوں نے بقول مولانا حالی کے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی ہے کہ

نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرستہ العلوم قایم کر دیا جو بعد میں مسلم اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے مشہور ہوا

اس کالج میں سرسید کو مجبوراً کورس تو وہی اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیوں کا مجوزہ اور ان کے ہاں رائج تھا، لیکن ایک اس کورس سے قطع نظر مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے یونیورسٹی کے سلسلے میں سرسید کا اور جو کچھ منصوبہ تھا اس کو انہوں نے کالج کی راہ سے مکمل کرنے کا پختہ عزم کر لیا سرسید کے سامنے یونیورسٹی کا جو ایک عالا منصوبہ تھا اس کا ایک جز یہ بھی تھا کہ گورنمنٹ کے اثر سے اس کو آزاد رکھا جائے، لیکن جیسا کہ آپ نے مولانا حالی کی زبان سے ابھی سنا اس وقت کے مسلمانوں کے پیش نظر ان ہونی بات تھی۔ اس لیے سرسید نے جب یونیورسٹی کا خیال ترک کیا تو اب گورنمنٹ سے بے تعلقی کے بارے میں بھی اپنا نقطۂ نظر بدل لیا کہ شیخ سعدی ایسے ناصح مشفق کی نصیحت ہے ؏

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

چنانچہ کالج کے سلسلے میں سرسید نے جو کچھ کیا اس کا اگر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو ان سب کا مقصد تین چیزیں ہی نظر آتی ہیں۔

(۱) کالج میں اگرچہ کورس وہی ہوگا جو اور یونیورسٹیوں میں اور خصوصاً الٰہ آباد یونیورسٹی میں مروج ہے لیکن اس کورس کی تعلیم اعلیٰ ہے۔ اعلیٰ ہونی چاہیے اور اگر اس کے لیے بیش قرار تنخواہوں پر یوروپین اسٹاف درکار ہو تو اس میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) کالج کے لیے گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے تاکہ ایک طرف گورنمنٹ کی امداد و اعانت سے کالج ترقی کرے اور اس کے کام آگے بڑھیں۔ اور دوسری جانب کالج کے فارغ التحصیل طلبا کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں سہولت اور آسانی ہو اور وہ حکومت کے معتمد علیہ بن سکیں۔

(۳) کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ دینیات اور اسلامی شعار اور روایات کی ایسی فضا پیدا کی جائے کہ علوم جدیدہ کے اثر سے مسلمان نوجوانوں کے مذہبی عقاید متزلزل نہ ہوں اور وہ کردار، اخلاق اور عمل کے اعتبار سے پکے سچے مسلمان رہیں۔

راہ کی مشکلات

لیکن سرسید کا کام آسان نہیں تھا، راہ میں سخت مشکلات اور دشواریاں حائل تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ۱۸۷۰ء میں انگلستان کے سفر سے واپس آنے کے دو ماہ بعد ہی انہوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی اصلاح کی غرض سے تہذیب الاخلاق کے نام سے جو رسالہ جاری کیا تھا اس میں اس میں ان کے قلم سے ایسے متعدد مذہبی مضمون شایع ہو چکے تھے جنہوں نے ان کے مذہبی افکار و عقاید سے متعلق مسلمانوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اور غیظ و غضب کے جذبات پیدا کر دیے تھے، چنانچہ سرسید کی طرف سے کالج کی اسکیم کا شایع ہونا تھا کہ ان کی مخالفت کا طوفان امنڈ پڑا۔ ان کی تذلیل و تنقیص میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا اور عام طور پر کہا یہ گیا سرسید یہ کالج مسلمان نوجوانوں کو عیسائی بنانے کی غرض سے قایم کرنا چاہتے ہیں۔ علما سرسید سے کس درجہ بدگمان تھے؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہو سکتا ہے کہ جب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے درخواست کی گئی کہ وہ مجوزہ مدرسے میں دینیات کی تعلیم کا انتظام اپنی صوابدید سے کریں تو مولانا نے جواب دیا۔ "سرسید اس مدرسے کے کاموں سے دست بردار ہو جائیں تب مذہبی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری باب پنجم ص ۲۱۶)

چندا کی فراہمی

لیکن سرسید کو یقین تھا کہ ایک وہ قوم جو عرصۂ دراز سے جمود ذہنی اور اس کے باعث جہالت و ضعیفیت میں گرفتار ہو اس کی اصلاح پھولوں کی سیج نہیں ہے، اس راہ میں قدم قدم پر ان کو عوایق و موانع سے سابقہ ہوگا۔ سرسید نے ان سب پر عبور پانے کا عزم بالجزم کر لیا تھا، چنانچہ مخالفتوں کے ان طوفانوں میں وہ مدرستہ العلوم کے لیے چندا کرنے کے واسطے نکل کھڑے ہوئے اور کالج کی لگن میں انہوں نے نہ اپنی صحت کا خیال کیا نہ اچھے برے

کا امتیاز برتا نہ لوگوں کے سب وشتم اور ان کے لعن طعن کی پرواہ کی، جہاں کہیں جاتے درد دل کی کہانی اسی سوز و گداز سے سناتے کہ مخالفوں کے دل بھی نرم ہو جاتے تھے۔ کالج کے قیام کا ایک جنون تھا جو ان کے دل و دماغ پر سوار تھا۔ درحقیقت اس نے ان کو پارا صفت مضطرب و بے قرار بنا دیا تھا۔ سفر کے درمیان لوگ ان کے اعزاز میں دعوتیں اور پارٹیاں کرنی چاہتے تھے تو دعوت کے بجائے اس کے خرچ کا روپیہ بھی چندے میں وصول کر لیتے۔ شادی بیاہ کی تقریب میں دولہا کو جو روپیہ ملتا وہ مدرسے کے چندے کے لیے ہتیا لیتے۔ حد یہ ہے اس کار خیر کے لیے انہوں نے ایک ناٹک بھی کر ڈالا اور اس میں خود سوانگ بھی بھرا نیکی کا کام بہرحال کار نیک ہے اس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں، چنانچہ چندہ دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور عیسائیوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بہرحال اسی طرح دن رات ایک اور اپنے آپ کو فنا کر کے — بیس برس کی مدت میں سات آٹھ لاکھ (جواب یقیناً ایک کروڑ سے کم نہیں) کی عمارت تیار ہو گئی اور کالج کی سالانہ آمدنی اسی ہزار تک پہنچ گئی۔ یہی وہ عمارت ہے جس کو دیکھ کر ایرانی سیاح نے کہا تھا! خدا کی قسم یہ تو معجزہ معلوم ہوتا ہے جو کام سلطنتوں سے نہیں ہو سکتا اسے تنہا ایک شخص نے کیسے کر دکھایا (حیات جاوید ص ۱۷۵) لیکن یہ سب کچھ تو بعد میں ہوا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جب مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کی صدارت میں اس مدرسے کا افتتاح اور چھاؤنی کے پرانے بنگلوں میں ایک ماہ بعد یعنی یکم جون کو مدرسے میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا تو اس وقت کچھ بھی پاس نہ تھا۔ سرسید اس زمانے میں سرکاری ملازم تھے۔ پوری فضا تیرہ و تار تھی۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ آج جس مدرسے کا آغاز اس بے سر و سامانی کے عالم میں ہو رہا ہے کل وہ ایشیا کی ایک عظیم یونیورسٹی ہو گا۔

سرسید کی انتہا پسندی اور بے اعتدالیاں

اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید کا یہ کارنامہ اس درجہ عظیم الشان انقلاب آفریں اور تاریخ ساز ہے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام روشن رہے گا اور تاریخ کے صفحات ان کی شخصیت کو فراموش نہیں کر سکیں گے لیکن آج جبکہ ہم سو برس کی مسافت طے کر چکے ہیں اور اس مدت میں کیسے کیسے انقلابات آتے رہے اور یہ مدرسہ نشیب و فراز کی کیسی کیسی وادیوں سے گزرتا رہا۔ ایک ناقد مورخ کا فرض ہے کہ ان سو برسوں کا جائزہ لے کر یہ بتائے کہ مدرسے نے اپنے اس طویل سفر میں کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے؟ کہاں اس سے کیا غلطی ہوئی ہے؟ اور کیوں؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ آج ہندستان کے مسلمان تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں وہ بصیرت اور عزم و ہمت کے ساتھ اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتے جب تک وہ اپنے ماضی کا جائزہ اشخاص و افراد کی رعایت کے بغیر دیدہ وری کے ساتھ نہیں لیں گے۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ ملک کی تقسیم نے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے فن تاریخ نویسی کو بھی بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس فن کے لیے جس معروضی نقطۂ نظر OBJECTIVE کی ضرورت ہے وہ مجروح ہو گیا ہے، چنانچہ تقسیم کے بعد سے اب تک سرسید کے عہد سے متعلق ہندستان اور پاکستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں معروضی نقطۂ نظر کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔ پاکستان کا مورخ سرسید کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا وہ قومی نظریے کے بانی مبانی وہی تھے اور ان کے تمام کام ہندوؤں کے بالمقابل مسلمانوں کو ابھارنے کی غرض سے تھے اس کے برعکس ہمارے ہندستان کے مسلمان مورخ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرسید ایک خالص ہندستانی اور نیشنلسٹ تھے انہوں نے جو کچھ کیا ہندستانی قوم کے لیے کیا تھا اور مسلمانوں کے لیے سرسید کی جدوجہد یا برادران وطن کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر انہوں نے جو راہ اختیار کی اس کا تذکرہ زبان قلم پر لاتے ہوئے ان کو شرم آتی یا ڈر لگتا ہے۔ ان میں ایک ہندو دشمنی کا عیب زبوں ہے اور دوسرا احساس کمتری کا شکار! یہ غیر معروضی طریق تاریخ نویسی نہ فن کے ساتھ انصاف ہے۔ نہ سرسید کے ساتھ اور نہ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ (۱)

عبدالرحمان پرواز

مفتی صدرالدین خان آزردہ

مفتی صدرالدین آزردہ اپنے دور کے ان صاحبانِ فضل و کمال میں سے تھے، جن کی علمی صلاحیت، ذہانت، معاملہ فہمی، ادبی بصیرت، ناقدانہ نظر اور شعر و شاعری میں عالمانہ دست گاہ کا اعتراف معاصرین علما کو بھی تھا اور شعرا کو بھی۔ انہوں نے اپنی گوناگوں اوصاف کا نقش سب کے دل پر بٹھا دیا تھا۔ ایک طرف بڑی بڑی علمی شخصیتیں ان کی خوبیوں کا ذکر کرتی ہیں تو دوسری طرف اس دور کے بلند پایہ شعرا نے بھی ان کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے ہیں۔ سرسید احمد خاں اپنی کتاب آثارالصنادید میں جہاں ان کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شان میں نثر میں مدحیہ قصیدہ لکھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے قطع نظر اس کے کہ اس زبدۂ جہان و جہانیاں کی صفات کا احصا محالات سے اور کمالات حصر مرتبۂ متعذرات سے ہے جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صورت صفات میں سے لکھے یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے تو کون صفت قابلیت اول لکھنے کی اور مدح لیاقت بیان کرنے کی رکھتی ہے۔ مدت تک یہ عقدہ بند زبان اور گرہ دل نشان تقریر رہتا ہے کہ کون سی صفت سے آغاز اور کون سی مدح سے ابتدا کرے۔

مجلس تمام گشت و بپایان رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

بے تکلف و بے آمیزش تصنع ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتی اور مستجمع علوم بے منتہا ہو، اب سوا اس گروہ علمائے روزگار کے بساط علم پر جلوہ گر نہیں۔ ان حضرت کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج ہے۔ ارباب فہم و ذکا اور ناخن فکر عقدۂ نا خیل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا معنی لبی اس در جا کہ راستہ دور ست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کی، واقعی معلوم ہو گیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا۔ اگر ان کا مدرس صاحب مصحف گل پر تصنیف نہ لکھتا، بلبل امی ہوتی۔ ان کی دقت طبع اور حدت فہم کے سامنے لالہ کے داغ اور سنبل کی پریشانی اور امداغوان کی جگر خانی کی وجہ اسے مضمون پیش پا افتادہ ہے۔ اگر ان کی رائے روشن معجزہ نما ہو نقطۂ موہوم کو اشارۂ انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لا یتجزا کو دو نیم۔ قلب مومن عرش اللہ گویا انہیں کے دل کی شان میں ہے کہ حال انفاس فیض اقتباس کے واسطے گوش بر آواز رہتا ہے اور لی مع اللہ ان پر علی الدوام صادق ہے کیونکہ کوئی وقت ایسا نہیں کہ جبرئیل ان کا بارگاہ قرب الٰہی پر دیر تک اجازت کا منتظر رہے۔ ارادۂ حق میں تیز رو

اور مسلک دنیا میں کامل کوشش لیکن تنگری ظاہر درولیشی معنوی کی پردا پوشش ہے ؎

کسانے کہ راہ خدا داشتند
چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

اگر مولوی جامی زندہ ہوتے تو یہ بیت ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد
بہ تدبیر عبید اللہی آمد

سوا اس الفس و آفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے جو کہ ارباب معنی پر یہ بات ظاہر ہے کہ لباس فقر میں مصروف طاعت ہونا اور گوشۂ خلوت کو واسطے فراغ عبادت کے اختیار کرنا موجب شہرت ہے، اور ہمت بلند بسبب کثرت اہل دنیا کے اس شغل کے وہم سے باز رکھتی ہے۔ لباس ظاہر کو اختیار کیا اور بسکہ احقاق حق اور فریاد رسی عباد اور عدل و انصاف افضل عبادات ہے۔ منصب صدارت کو اپنے ذمے پر لیا۔ سبحان اللہ کیا طریقۂ داد ہے اور کیا سر رشتۂ انصاف ہے کہ نوشیروان ان کے دیوان عدالت میں عہدۂ پیشکاری کے لایق بھی نہیں سمجھا جاتا۔ باقی رہا عدل عمر یہاں بسبب ادب کے کچھ نہیں کہا جاتا۔ شوکت ظاہری سے ان کے دربار میں دارا کو گذر نہیں اور جلالت باطنی سے ان کی خلوت میں فرشتے بار نہیں۔ باوجود ان مراتب بلند اور اس منصب ارجمند کے خلق محمدی اختیار کیا ہے کہ افادۂ علوم بر افاضت مسایل دین ہے ہر وقت ہر ادنا کو اجازت سخن ہے۔

نواب مصطفا خاں شیفتا نے جب اپنا مشہور تذکرۂ "گلشن بے خار" لکھا تو مفتی آزردہ کا حال شامل نہیں کیا۔ اس کو دیکھ کر مرزا غالب نے شیفتا کو لکھا۔

"در گلشن نہ مفتی خاصہ دگوہرین نہ گلشن نامہ در ردیف الف بہ نگارش اشعار پرویں نثار حضرت آزردہ از چہ است ہر چند ذکر خدام بر ضمیر مقام بہ جریدۂ این فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد لیکن اگر بہ مقتضائے فراجت جراتی بکار برفتہ است چہ شد۔ تلافی آں نہ پذیرش

عذر نیاز حاجت نمی افتاد۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیفتا نے آزردہ کا حال بڑا کر نہ صرف یہ کمی پوری کر دی، بلکے کمال شناسی کا حق بھی ادا کر دیا۔ اس کے چند جملے ملاحظا ہوں۔

"دعوے ادراک علمش از جبل جبلا ... بہ این خوبی قبائے قابلیت بر بالائے تنومند دانش گر قضا بہ این روشن دلی و آگہی و آگاہی آئینہ ضمیری نیفروختہ - بہ این فضیلت شاعری فر این سر نہ کشیدہ و بہ این عظمت ساحری از بابل نرسیدہ با خیال شرح کمالاتش طوطئ خامۂ من بہ ایں عبارت گفتار نغمہ سنج بے زبانی است۔"

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی جنہوں نے مدتوں تک ان سے فیض حاصل کیا اور ۱۲۷۲ھ میں ان سے رخصت ہوئے۔ انہیں "آخر فضلائے دلی" قرار دیتے ہیں۔ ان کے تبحر علمی، حسن بیان، وجاہت و ریاست، قادر الکلامی و سخن فہمی اور مروت و اخلاق کا تذکرا ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"در عصر خود یگانۂ روزگار و نادرۂ عصر بود ریاست درس و تدریس معقولات، بالخصوص افتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ مشرقیہ و شمالیہ دلی و امتحان مدارس و صدارت حکومت دلی باوے متعلق شدہ - در جمیع علوم از صرف و نحو و منطق و حکمت و ریاضیات و معانی و بیان و ادب و انشا و فقہ و تفسیر و حدیث ید طولی داشت و ہمہ علوم را درس می گفت۔ صاحب وجاہت و ریاست بود۔ نزد امرا و علما و حکام و رعایای شہر جز بادشاہ دلی یکی از اعیان و اکابر بلدہ خاص و نواحی آں ادب و سما نبود کہ بمکان او نیامدی - طلبا علم برائے اخذ علم و اہل دنیا برائے مشاورت معاملات و منشیان برائے اصلاح انشا و شعرا برائے مشاعرہ - در ... زبان بہ این جمعیت و قوت حافظہ و حسن تحریر و متانت فہم و فصاحت بیان و بلاغت معانی با مروت و اخلاق و احسان دیدہ نشد۔"

مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی لکھتے ہیں۔

"تمام علوم صرف، نحو، منطق، ریاضی ..."

بیان ادب، انشاء فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں طولیٰ رکھتے تھے، درس دیتے تھے۔ آباو اجداد آپ کے کاشمیر کے اہل بیت علم وصلاح سے تھے۔ مگر آپ کی ولادت دلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ وفقہ وحدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں اور فنون عقلیہ کو مولوی فضل امام خیر آبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا اور شیخ محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ دی۔ آپ بڑے صاحب وجاہت وسیادت اور اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے۔ ریاست درس وتدریس خصوصی افتائے ممالک محروسا متربیا، بلکہ مشرقیا وشمالیا دلی اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی کی آپ پر ہوئی۔ بجز شاہ دلی کے تمام اعیان واکابر وعلما وفضلا خاص دلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلبا تو واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورت معاملات اور منشی لوگ بغرض اصلاح انشا اور شعرا واسطے مشاعرا کے آتے تھے۔ اس اخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیت اور قوت حافظا وحسن تحریر و متانت تقریر و فصاحت بیان و بلاغت معانی کے صاحب مروت و اخلاق اور احسان نہیں دیکھا گیا۔

مولوی کریم الدین لکھتے ہیں۔

"آزردہ گنجینۂ علم، کان علم، بحر سخا، خزن لطف وجود وعطا، لبیدِ دوران، حسان ہندستان، عالم کامل، فاضل اجل، فقیہ بے مثل، عالم باعمل، مدح میں ان کی جو لکھوں سو کم ہے۔ کیونکہ وہ ایسا ہی عالم ہے۔ ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرۂ شعرائے ہندستانی میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ان کا نام لکھوں مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ بدون تام نامی ان کے یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور نیز احباب تو ہو گا کہ مجھے اس زمانے کے شعرائے ہندستانی گروہ میں وہ مثل شہنشاہ کے ہیں۔"

حافظ امام بخش صابر لکھتے

[illegible]

شاعری سے ان کو ننگ وعار ہے لیکن شاعری کو اس کے ساتھ منسوب ہونا باعثِ اعتبار اور ملیے افتخار ہے۔ اگر شعر اس سے بلند مرتبہ نہ ہوتا شعر اسبت شعر سے آسمان بریں تک نہ پہنچتے۔

بشیر الدین احمد لکھتے ہیں۔

"بے شائبۂ تکلف و بے آمیزش مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل سوائے سرگروہ علمائے بساط عالم پر جلوہ گر نہ تھا۔"

عبدالغفور خاں نساخ

"راقم کو دلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ حضرت کے علم وفضل کا حال مشہور ہے۔ حاجت بیان نہیں۔"

مولانا عبدالحی نے "گل رعنا" میں لکھا ہے۔

"مفتی صدر الدین خان بہادر عالی خاندان، والا دودمان، سرمایۂ نازش ہندستان فضل وکمال اور فنون ادبیا کی بے نظیر قابلیت میں آپ اپنا جواب تھے۔ سرزمین ہند میں جامعیت کے دو ہی چار ایسے شخص ہوے ہوں گے۔ اس کے ساتھ مزاج دیکھو تو خلق مجسم اور لطف مصور، علم وکمال میں بقول شیفتا "در فنون ادبیا ثانی اعشیٰ و جریر است و در مراتب حکمیا ثالث باقر ونصیر۔"

لالا سری رام صاحب اپنے تذکرۂ خم خانۂ جاوید میں تحریر فرماتے ہیں۔

"عربی، فارسی اور ریختا، تینوں زبانوں پر قادر تھے۔ ہر ایک زبان میں نہایت فصاحت وبلاغت سے داد سخن دی ہے۔ جناب آزردہ مرحوم ان چند اشخاص میں سے تھے جنہوں نے اعلا درجے کی جامع قابلیت و فضیلت کے باوجود ملک سخن میں بھی اپنی اعلا استعداد کا سکا بٹھا یا ہے۔ آپ اپنے زمانے کے مشاہیر تھے اور نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ منصب اعلا پر ممتاز وحکام رسا ہونے کے باوصف آپ کی طبیعت ظاہری نمایش سے کوسوں دور تھی۔ دنیاوی آسایش کے تمام سامان بہم پہنچائے، اگر خدیبا سادا وضع سے بسر کرتے رہے۔ عدالتی کاروبار سے فرصت سے طلبا کا حلقا آپ کے گرد رہتا تھا۔ طالب [illegible]

عزوت مند کے ساتھ نقد و جنس سے سلوک ہوتے تھے۔ نہایت منصف، خوش مزاج، نیک نفس، نفاست پسند تھے۔ چنانچہ آپ کی نفاست پسندی کی اکثر حکایتیں مشہور ہیں۔ ان اوصاف کے ماسوا زندہ دلی، خلق مجسم کہنا مبالغا نہیں۔

مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"والد مرحوم نے مفتی صاحب سے بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے فضل و کمال و جامعیت کے بے حد معترف تھے۔ فرماتے تھے ان کا سلوک مجھ سے ایسا تھا جیسا اپنے خاص عزیزوں سے ہوتا ہے۔ عید کے دن ہمارے ہاں آتے تو جس طرح اپنے عزیزوں کو بطور عیدی کے کچھ دیا کرتے ہیں۔ ایک اشرفی میرے لیے بھی ضرور لاتے۔ نانا میاں فرماتے یہ اشرفیاں بطور تبرک رکھو۔ فضل و کمال علمی کے ساتھ ادب و شعر کا ذوق بھی تینوں زبانوں میں تھا۔ عربی، فارسی، ہندستانی تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کا ہندستانی کلام بہت تھوڑا ہے، مگر جتنا ہے انتخاب ہے اور پایۂ بلند کے شایاں ہے۔ والد مرحوم ایک مشاعرے کا حال سناتے تھے جس میں ان کی غزل نے تمام اکابر کا رنگ پھیکا کر دیا تھا۔ "دور نہیں۔ منظور نہیں" مصرع طرح تھا۔

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دست جنوں
کیوں ہے بے کار گریباں تو مرا دور نہیں

یہ شعر بھی جو ہمیشہ میری زبان پر رہتا ہے انہیں کا ہے۔

کام اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوے تو یہی رندان قدح خوار ہوے

والد مرحوم اپنے چچا کا جنہوں نے مدینۂ منورا میں انتقال کیا۔ جب کبھی ذکر کرتے تھے تو مفتی صاحب کا یہ شعر ضرور پڑھتے تھے۔

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے

والد مرحوم فرماتے تھے کہ ادب عربی کا ذوق ان سے بڑھ کر میں نے وقت کے کسی فاضل میں نہیں پایا۔ حماسہ کے سینکڑوں اشعار نوک زبان تھے۔ متنبی کا درس دلی میں سب سے پہلے انہیں نے دیا۔ ورنہ اس کا کلام درس کی چیزوں میں شامل نہ تھا۔

انہوں نے متنبی کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ افسوس ان کے مصنفات غدر میں ضایع ہو گئیں۔ صرف ایک عربی رسالا "لا تشد الرحال" کے متعلق میری نظر سے گذرا اور ایک تحریر سلسلۂ "امتناع نظیر" پر ہے۔

انیس الرحمان ایم-اے

جان پہچان

راستوں پر ہزاروں چہرے ہیں
جن کے اپنے جدا جدا خد و خال
جن کی اپنی الگ الگ رنگت
اور اگر ان میں کوئی بھی چہرے
چلتے پھرتے ادھر ادھر سے کہیں
سامنے آئے اور گذر جائے تو
ان کی تصویر اپنی آنکھوں میں
نقش ہوتی ہے۔ اور ایسی صورت
جان پہچان ہونے لگتی ہے
اور اسی طرح اپنی آنکھوں سے
چند ایسی بھی صورتیں ہیں جو
ذہن کے بیکراں سمندر میں
دھیرے دھیرے اترنے لگتی ہے
جیسے اپنے ہی گھر کا کوئی فرد
یا کوئی اپنا بے تکلف دوست
اپنی آنکھوں کی روشنی بن جائے
اور اگر گھر میں بیٹھے بیٹھے کبھی
یا کبھی راستوں پہ چلتے ہوے
ان سبھی صورتوں سے جی گھبرائے
اور پھر اک اداس لمحے میں
اپنی صورت کا دھیان آ جائے
اپنی مجبوریوں پہ سوچیں ہم
سب کو پہچانتے تو ہیں لیکن
خود کو پہچان ہی نہیں پائے

مدن موہن لال سکسینا بی۔ اے، ال ال۔ بی

کچھ پرانی یادیں

۱۸ر جنوری سنہ ۱۹۷۴ء - مکرمی تسلیم

اس خط کے ساتھ کئی چیزیں بھیج رہا ہوں ۔

(۱) رباعیات عمر خیام کے ایک قدیم ترین نسخے کے پہلے صفحے کا فوٹو ۔ یہ نسخہ میرے والد کے پاس تھا اور اب نیشنل میوزیم نئی دلی میں ہے، اس نسخے کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنی کتاب خیام مطبوعہ سنہ ۱۹۳۳ء مطبع معارف اعظم گڑھ میں صفحہ ۱۶۱ پر کیا ہے، مجھے یاد ہے کہ اس سلسلے میں مولانا ایک بار سنہ ۱۹۳۱ء یا سنہ ۱۹۳۲ء میں غریب خانے پر بھی تشریف لائے تھے، اس نسخے کی تمام رباعیات کی نقل میرے والد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے، اگر کوئی صاحب عمر خیام پر کچھ کام کر رہے ہوں تو مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

(۲) جہاں آرا بیگم کی بیاض پر میرے والد کا ایک مطبوعہ مضمون جو انہوں نے ہندی میں ترجمہ کر کے کلاندھی میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا، یہ نسخہ بھی میرے والد کے پاس تھا، اور اب کلا بھون یونیورسٹی بنارس میں ہے، اس کے اندر کے ایک صفحے کا فوٹو بھی میں نے مضمون کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے، اس نسخے کی نقل میرے والد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے، اگر کوئی صاحب اس کو مرتب کرنا چاہتے ہوں تو مجھ سے رابطہ قائم کریں ۔

(۳) رسالہ در علم ساعات کے ایک بہت ہی قدیم نسخے کے دو صفحوں کا فوٹو ۔ یہ نسخہ میرے والد کے پاس تھا اور اب نیشنل میوزیم نئی دلی میں ہے ۔ یہ مختصر رسالہ جرمنی زبان میں شایع ہو چکا ہے، اور میں نے اس کو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس الہ آباد میں دیکھا تھا، انگریزی اور ہندستانی میں غالباً اس کا کہیں ذکر بھی آیا ہے ۔ آپ نیشنل میوزیم سے خط و کتابت کر کے یہ رسالہ معارف میں چھاپ سکتے ہیں

(۴) ایک مضمون "کچھ پرانی یادیں" معارف میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں، اگر یہ آپ کے مذاق کا نہ ہو تو مہربانی کر کے اس کو واپس کر دیجیے ۔

(۵) کتاب المجسطی کے سرورق کا فوٹو یہ نایاب نسخہ جس کے سرورق پر شاہجہانی عہد کے ایک باکمال مصور نے محقق طوسی کی ایک رنگین تصویر بنائی ہے میرے والد کے پاس تھا اور اب بھارت کلا بھون بنارس میں ہے ۔

اگر شبلی اکیڈمی کے اغراض و مقاصد اور گذشتہ سرگرمیوں کی رپورٹ شایع ہوئی ہو تو اس کی ایک کاپی مجھے آپ بھجوا دیں، ممنون ہوں گا ۔ معارف کی تازہ ترین اشاعت کی ایک کاپی بھی آپ عنایت کریں ۔ میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں ۔

نیازمند

مدن موہن لال

اب ایسے ہندو اصحاب بہت کم رہ گئے ہیں جن سے پرانی مشترک تہذیب کی یاد تازہ ہو جاتی ہو۔ ان میں ایسے اور کشمیری پنڈتوں میں اس کی کچھ یادگاریں باقی ہیں۔ مضمون نگار انہیں میں ہیں۔ ان کا یہ مضمون گو کایستھوں کے رسم و رواج پر ہے، لیکن اس میں پرانے نقوش کی جھلک ہے، اس لیے اس کو ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے شایع کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کے ساتھ انہوں نے جو خط بھیجا ہے اس کو بھی شایع کیا جاتا ہے، اس سے ان کے خاندان کی علم دوستی کا اندازہ ہوگا۔

“دوم”

پرانی یادوں کے دماغ میں کچھ خانے ہیں، اس مضمون میں صرف اس خانے کو کھول رہا ہوں جن میں چالیس پچاس برس پہلے کی وہ یادیں محفوظ ہیں جو لکھنؤ کے کایستھ گھرانوں میں ہندستانی اور فارسی زبان کے ذوق کا خاکا پیش کرتی ہیں۔

میری پیدائش ایک ایسے ہی کایستھوں کے خاندان میں ہوئی جہاں لڑکے شروع سے ہی ہندستانی اور فارسی پڑھتے تھے اور لڑکیاں ہندی، لیکن جو زبان گھر میں سبھی بولتے تھے وہ ہندستانی۔ خاندان بھر میں میری صرف دادی تھیں جو ہندستانی لکھ سکتی تھیں اور بغیر نقطے رکھ کر ابجد لکھنا جسے انہی نے سکھایا تھا۔

میری ماں ہندستانی لکھ پڑھ نہ سکتی تھیں، مگر ان کو شیخ سعدی کی وہ مشہور مناجات پوری یاد تھی جو کریما بہ بخشائے بر حال ما کہ ہستم اسیر کمند ہوا سے شروع ہوتی ہے، کیونکہ میں ان کی پہلی اولاد تھا، اور جب گھر پر میرے دادا صاحب منشی کاشی پرشاد مجھے فارسی پڑھانے بیٹھتے تھے تو وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہتی تھیں۔

بعض گھرانوں میں جس دن سے بچے کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا، ایک رسم منائی جاتی تھی جس کو مکتب یا بسم اللہ کہتے تھے، آج بھی یہ رسم منائی جاتی ہے، مگر اب اس کو دو یا تین برس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، لڑکوں کو پانچ چھ برس کے سن ہی سے ہندستانی اور کچھ عرصے بعد فارسی پڑھانا شروع کر دیتے تھے، فارسی پڑھانا بہت ہی آسان تھا، چند اوراق کی ایک کتاب ہوتی تھی جس کا نام تھا آمد نامہ، اس کو تھوڑا سمجھا اور زیادہ رٹا بس آ گئی فارسی، اس کے بعد کریما، گلستاں اور بوستاں پڑھنے لگے۔

لڑکے جوان ہوتے اور ان کی شادی کی بات چیت شروع ہوتی تو ایک نئی ضرورت یہ پیدا ہوتی کہ وہ کچھ کام چلاؤ قسم کی ہندی لکھنا پڑھنا سیکھ لیں کیونکہ ناگری سے خط و کتابت ناگزیر ہو جاتی، ہندی لکھنا پڑھنا فارسی سے بھی آسان تھا، کیونکہ اس میں تو بس کا، کھا، گا، کھا پڑھا لکھنا سیکھ لیا اور بن گئے ہندی داں۔ زبان اپنی وہی ہندستانی۔ بس خط کی جگہ پتر، خطی کی جگہ پرستا، غم اور افسوس کی جگہ دکھ اور کھید، جواب کی جگہ اتر، جلدی کی جگہ شیگھر، اور جان من کی جگہ پر پران پیاری لکھ دیا ہو گئی ہندی، ہندستانی کو ہندی بنانے کا یہ سہل نسخہ بہت سے کایستھ نوجوان جانتے تھے۔

سرکاری زبان انگریزی تھی، اس لیے سب ہی کایستھ انگریزی بھی پڑھ رہے تھے۔ اس طرح تین زبانیں نہ سہی تین رسم الخطوں سے ہر پڑھا لکھا کایستھ واقف ہوتا تھا، اس سلسلے میں ایک رسم یاد آ رہی ہے۔ اس کا نام تھا دیکھا بھالی۔ شادی سے چند روز پہلے ایک رسم ہوتی تھی تلک کی، جو اب بھی ہوتی ہے، مگر تلک سے بھی پہلے ایک رسم ہوتی تھی جس میں لڑکی کے گھر سے چند لوگ ہونے والے دولہا کو دیکھنے آتے تھے، اس رسم کا نام تھا دیکھا بھالی جس روز تلک ہوتا، یعنی لڑکے کی پیشانی پر ٹیکا یا قشقہ لگایا جاتا اسی دن دوپہر کو لڑکی کے گھر والے کچھ بچوں کو ایک پنڈت کے ساتھ بھیجتے، لڑکا نہایت تہذیب کے ساتھ ان بچوں کے پاس آ کر بیٹھتا اور ایک [illegible] پر کچھ تحریر کر کے ان کو دیتا جس کو وہ بچے [illegible] اور احتیاط سے اپنے گھر لے جا کر [illegible] رسم کے لیے شادی [illegible]

تھیں، یہ رسم ہمارے خاندان سے چالیس برس ہوئے اٹھ گئی، لیکن اس کی ایک بڑی خوبصورت یادگار ہمارے پاس محفوظ ہے، وہ ہے وہ وصلی جو ہمارے والد مرحوم بابو گوری پرشاد سکسینا نے اپنی دیکھا بھالی کے موقع پر ۷ر اپریل سنہ ۱۹۰۶ء کو لکھی تھی، والد صاحب کا سن اس وقت اٹھارہ برس کا تھا، چونکہ خوشنویسی اور مصوری کا ان کو بڑا شوق تھا، اس لیے جس وصلی پر انہوں نے اپنی تحریر لکھی اس کے حاشیے پر طلائی نقش و نگار بنے ہیں، تحریر اس طرح ہے۔

سری گنیش آیر (ہندی رسم الخط میں)

پھر جلی نستعلیق میں فارسی کی یہ رباعی ہے ؎

اے مہر سپہر سرفرازی
وے مایۂ بحر بے نیازی
دارم ز عنایت تو امید
کز فضل و کرم دلم نوازی

آخر میں نیچے اپنا نام گوری پرشاد اور تاریخ ۷ر اپریل سنہ ۱۹۰۶ء انگریزی رسم الخط میں لکھا ہے، اس خوبصورت قطعے کو میرے نانا صاحب نے فریم کرا کے اپنے کمرے میں لگا رکھا تھا۔ ساٹھ برس ان کے کمرے کی زینت رہا۔ ان کے انتقال کے بعد میں لے آیا اور اب میرے کمرے میں خاموش دیوار پر آویزاں ہے۔ خاموش اس لیے کہا کہ اب میرے خاندان میں اس کو پڑھنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

دولہا میاں کی قابلیت کا امتحان دیکھا بھالی پر ختم نہ ہو جاتا تھا۔ ایک رسم اور ہوتی تھی، شادی ہو جانے کے بعد دوسرے دن اس کو کلیوا کہتے تھے، کلیوا میں شام کے وقت دولہا اپنے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ سسرال پہنچتا تھا، اور گھر کے اندر اس کو بلا لیا جاتا تھا۔ اس سے پردا کوئی نہ کرتا تھا، تمام عورتیں اس کو گھیر کر بیٹھ جاتی تھیں اور وہ بڑے اصرار کے بعد وہ ایک شعر سناتا تھا جس کے لیے اس کو لڑکی کے والدین یا دوسرے افراد نذرانا دیتے تھے اس کے ساتھ جو لڑکے آتے تھے وہ بھی غزلیں سناتے تھے، اس کے جواب میں لڑکی کے گھر والے لڑکے کو خوب خوب غزلیں [illegible] ایک ایسی ہی غزل شادی کے موقع پر ایک

لڑکے نے محض اپنی یادداشت سے پوری ایک فارسی کی غزل سنائی تھی جس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے، شعر تھا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس موقع پر غزلیں ایک مخصوص لحن کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں اور تلفظ کی صحت کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اس زمانے کے کھاتے پیتے کایستوں میں ایک فقرا اکثر سننے میں آتا تھا کہ "شراب نہیں پیوگے اور قلیا نہیں کھاؤگے" تو زبان کا شین قاف کیسے درست ہوگا، ایک وہ زمانا تھا اور ایک یہ زمانا آیا ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگ جو لکھتے وقت تو قاف اور کاف میں فرق کرتے ہیں مگر بولتے وقت قاف کی آواز کو کاف سے ادا کرتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ ہندی کے سیلاب کا اثر ہے یا پنجاب سے آئے ہوئے لوگوں کا کرم ہے۔

شادی کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ شادی کے لیے آجکل کے جیسے دعوت نامے نہیں جاتے تھے، بلکہ ایک لمبی فہرست عزیزوں کی تیار کی جاتی تھی جس کو بند کہتے تھے۔ خاندان کے نائی باری اس بند کو گھر گھر لیجاتے تھے اور ناموں پر صاد کروا لیتے تھے کوئی دستخط کے بجائے صرف م بنا دیتا تھا، اس بند کے اوپر کی عبارت ہندستانی آمیز فارسی میں ہوتی تھی، چنانچہ سنہ ۱۹۳۵ء میں میری ایک بہن کی شادی میں جو بند لکھا گیا تھا اس کی عبارت تھی۔

"بروز مبارک ۲۴ر جون سنہ ۱۹۳۵ء یوم سوموار مطابق اساڑ بدی اشٹمی شادی دختر نیک اختر ایں خاکسار قرار یافتہ۔ بارات از خانہ — ساکن — بوقت ۹ بجے شب خواہد آمد۔ دعوت بھات بتاریخ ۲۵ر جون سنہ ۳۵ء دعوت پرکھار بتاریخ ۲۶ر جون سنہ ۳۵ء بوقت ۹ بجے شب قرار یافتہ۔ مترصد کہ جمیع اصحاب مع برادران و برخورداران شریک دعوت شدہ بندہ را مرہون منت سازند۔"

یہ عبارت بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھی گئی تھی مجھے یاد ہے کہ بعض حضرات بند کی عبارت میں بڑی ان

پرواز ی دکھاتے تھے، افسوس ہے کہ اس عبارت کا میرے پاس کوئی نمونہ محفوظ نہیں ہے۔

بندر کا کام ختم ہوتا تو پھر ایک فہرست اس سامان کی بنتی جو لڑکی کے گھر سے تلک کے لیے لڑکے کے گھر جاتا تھا، ایک ایسی فہرست بھی میرے پاس ہے جس میں فارسی کے الفاظ کثرت سے آئے ہیں، خلق نقد در تھال - نقد با بر اسپ - پوشاک زنشا - پائے شوی - باغبان وغیرہ -

شادی کے بعد بچے کی ولادت پر زچا، زچا خانا اور جنم کنڈلی کے لیے زائچا وغیرا بہت سے فارسی کے الفاظ سننے میں آتے تھے۔ زچا اور زائچا تو اب بھی مستعمل ہیں - البتا جب سے زچا خانا گھر سے اٹھ کر اسپتال میں پہنچ گیا اس لفظ کے استعمال کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی -

تیوہاروں میں ایک تیوہار یعنی تقریب جم دوج کی امتیازی شان سے ساتھ ہمارے خاندان میں منائی جاتی تھی، اس تیوہار کا ذکر جن لفظوں میں منشی رام پرشاد نے اپنی کتاب ہندو تیوہاروں کی اہمیت مطبوعا ۱۹۲۴ء مفید عام پریس لاہور میں کیا ہے۔ وہ پہلے نقل کرتا ہوں -

"گو بردھن سے دوسرے روز جم دوج کا تیوہار ہوتا ہے، اور تمام مکان کو صاف اور آراستا کر کے دلدر یعنی افلاس و مصیبت سے نجات ہوتی ہے اور جمراج سے پناہ ملتی ہے، اس روز بہن اور بھائی کسی پاک دریا میں اشنان کر کے دعا کے واسطے تیار ہوتے ہیں اور ہندو اپنے قلم دوات بہی کھاتے، ہل یا تلوار وغیرا کو پوجتے ہیں، اور بعض ان سے کام لینے کا بھی شگون کرتے ہیں، اس روز لین دین اور حساب کے بہی کھاتے تبدیل کر کے نیا حساب شروع ہوتا ہے اور بہن اپنے بھائی کی پیشانی پر ٹیکا یعنی قشقا کھینچ کر آئندا آٹھ مہینے کی مہم میں اس کی کامیابی کی دعا کرتی ہے اور ساتھ سفر رفتنت مبارک باد کہتی ہے -"

یہ "سفر رفتنت مبارک باد" والا فقرہ تو ہم نے اپنے گھر کبھی نہیں سنا، کیونکہ ہمارے خاندان میں جم دوج کے موقع پر بہن بھائی کے ٹیکا نہیں لگاتی صرف قلم کی پوجا اور اس سے کام لینے کا شگون ہوتا تھا، یہ پوجا صبح سے وہ شری چترگپت جی کی مورتی کے سامنے کی جاتی تھی کیونکہ دیومالا کے مطابق چترگپت جی عالم بالا کے جو منشی اور انسانوں کی زندگی کا کھاتا رکھنے والے شمار کیے جاتے ہیں، کایست اپنے کو انہی کی اولاد مانتے ہیں، چنانچہ منشی کشوری لال صاحب نے اپنی کتاب اقوام الہند مطبوعا ۱۸۷۲ء نول کشور پریس لکھنؤ میں بارا کایستوں کی تواریخ کے بارے میں ایک نظم فارسی زبان میں لکھی ہے جس کے دو اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

چترگپت است والد اینہا
ادب آموز رسم و آئین ہا
از دو مادر دوازدہ پسر اند
از علوم ریاضی با خبر اند

چونکہ چترگپت جی کا نہ کوئی مندر ہے اور نہ ان کی مورتیاں بازار میں ملتی ہیں، اسلیے ضروری ہوتا تھا کہ جم دوج کی پوجا کے لیے ایک مورتی بنائی جائے، چنانچہ خاندان کی وہ عورت جس میں بت سازی کی خدا داد قابلیت ہوتی تھی، یہ کام اپنے ذمے لیتی تھی اور ایک دن پیشتر سے تالاب کی چکنی مٹی میں روئی ملا کر ایک چھوٹا سا مجسما بنانا شروع کر دیتی تھی، اس مجسمے کو ایک لکڑی کی پٹری پر بٹھا کر پوجا کے مقام پر رکھ دیا جاتا تھا گھر کے چھوٹے بڑے سب وہاں جمع ہوتے تھے، وہ ایک ایک قلم اور کاغذ کا ٹکڑا اپنے ساتھ لاتے تھے - پوجا کے بعد اس کاغذ کے ٹکڑے پر یہ عرضی لکھتے تھے جس میں بھگوان سے پرارتھنا ہوتی تھی کہ تو اپنی کائنات میں سے مجھے چھ چیزیں عطا کر دے، علم، عمل، فراخ دستی، ایمان داری اور تندرستی، پھر اس عرضی پر اپنا نام لکھ کر چترگپت جی کی مورتی کے چرنوں میں رکھ دیتے تھے، اور ہاتھ جوڑ کر اٹھ جاتے تھے - یہ عرضی بھی فارسی کی ایک رباعی کی صورت میں ہوتی تھی

اے خالق ہر بلند و پستی
شش چیز عطا بکن ز ہستی
علم و عمل و فراغ دستی
ایمان داری و تندرستی

بعض کم فہم حضرات جو فراخ دستی کا صحیح مطلب نہیں سمجھ پاتے تھے اس خیال سے کہ اس رباعی میں کہیں دولت کا تو ذکر نہیں ہے۔ کئی لاکھ روپیے کی رقم بھی اس رباعی کے نیچے لکھ دیتے تھے، یہ رسم بھی ہمارے خاندان سے اب اٹھ گئی ہے۔ کتنے عرضی لکھنے والے چلے گئے جو بچے ہیں اور اپنی عرضیوں میں لاکھوں روپے کی رقم لکھا کرتے تھے، آج بھی اسی طرح تنگدست ہیں جیسے پہلے تھے۔

رئیس مالیگانوی

غزل

وہ خوبرو سا چاند بھی سنولا گیا ہے آج
غم کا لباس کون اسے پہنا گیا ہے آج

اُس کو بھی خبر ہے کہ جس سے یہ گل کھلا
چہرہ مرے حضور کا مرجھا گیا ہے آج

اس موڑ پر جو بورڈ ہے منسوب ان کے نام
بازو میں میرا نام بھی لکھا گیا ہے آج

اک چہرہ اس ہجوم میں نکلا جو بے نقاب
کتنے حسین چہروں کو شرما گیا ہے آج

یہ دل نہیں ہے دوستو! زخموں کی سیج ہے
وہ کونسا ستم ہے جو چھوڑا گیا ہے آج

یوں پیکر خلوص کی تضحیک کی گئی
جھوٹے ظروف کی طرح برتا گیا ہے آج

موجود جس جگہ ہے جفاؤں کا اژدہام
میری دعا کو اس جگہ تولا گیا ہے آج

ان کی نگاہ پڑتے ہی دل مطمئن ہوا
مژگاں سے میرے زخموں کو ٹانکا گیا ہے آج

محفل میں اپنی تلخ نوائی کے کرب سے
آتش کدے کو اور بھی دہکا گیا ہے آج

دانشوروں کے شہر میں منصور بن کے وہ
دار و رسن کا واقعہ دہرا گیا ہے آج

نفرت تھی جن دیاروں سے کل تک اسے رئیس
اس کو انہیں دیاروں میں دیکھا گیا ہے آج

ڈاکٹر ولی الحق انصاری

غزل

نغموں میں کسک پاتے ہیں ماتم کی طرح ہم
گھبراتے ہیں شادی سے بھی اب غم کی طرح ہم

چاہا تھا کہ انساں کو ملے زندگیٔ نو
مصلوب ہوئے عیسیٰ مریم کی طرح ہم

اب سودۂ الماس کو بھی زخم جگر پر
انگیز کیا کرتے ہیں مرہم کی طرح ہم

سمجھا نہ ہمیں کوئی بھی اوراق جہاں پر
ہیں آج بھی اک جملۂ مبہم کی طرح ہم

ہوں گے گل خنداں کبھی یہ یاد نہیں ہے
اتنا ہمہ تن اشک ہیں شبنم کی طرح ہم

بھولے نہ کبھی گمشدہ فردوس طرب کو
تا عمر تڑپتے رہے آدم کی طرح ہم

اے دوست ہر اک برگ گل گلشن دل پر
شعلوں کی جگہ دیتے ہیں شبنم کی طرح ہم

وست فلک پیر سے رہتے ہیں پریشاں
اے شوخ ترے گیسوئے برہم کی طرح ہم

مت پوچھ کہ کیا حال طبیعت کا ہے اے دوست
رو دیتے ہیں خوشیوں میں بھی اب غم کی طرح ہم

اے وائے کہیں کس سے کہ یوں کاٹ رہے ہیں
دن عیش و مسرت کے شب غم کی طرح ہم

مت پوچھ کہ کیا حال ہے اپنا دوروں سے
جلتے ہیں شب و روز جہنم کی طرح ہم

ہے ایک ہی حالت پہ طبیعت کی اداسی
ہر روز بدلتے نہیں موسم کی طرح ہم

تبدیل وطن سے جو ہوئے مختلف رنگوں سر
ہیں اہل وطن قوم ہے پرچم کی طرح ہم

وہ دور گزیدہ [illegible]
[illegible] ہم

حکیم محمد ذہین

بھائی حسین حسان صاحب

بچو! آپ کو اپنے پیام تعلیم کے اڈیٹر حسین حسان صاحب مرحوم کے حالات زندگی معلوم کرنے کا ضرور اشتیاق ہوگا۔ میں بھائی حسان صاحب سے تین سال چھوٹا ہوں مگر میں بھی دائم المریض ہوں بہر حال کوشش کروں گا کہ جو کچھ میرے حافظے میں ہے، وہ سب تحریر میں آجائے اور آپ کے لیے سبق آموز ہو۔

ہمارا پیدائشی وطن پیلی بھیت ہے جہاں ہم تینوں بھائی پیدا ہوئے۔ محمد حسین حسان، ان سے چھوٹا میں اور سب سے چھوٹے محمد معین۔ اپنی والدا سے صرف ہم یہ ہی تین بھائی تھے۔ پہلی والدا سے دو بھائی دو بہنیں تھیں۔

والد صاحب ۷۔۸ گاؤں کے زمیندار تھے ہمارے سوتیلے بھائی محمد مبین صاحب زمینداری کے کاموں میں زیادا دخیل تھے۔ والد صاحب بڑے زندا دل، خوش مزاج خوش اخلاق، ہنس مکھ اور فقیر دوست تھے۔ انہیں فقیری نسخے خوب یاد تھے۔ ایک فقیری نسخوں کی بیاض بھی رکھتے تھے۔

ایک زمانا میں والد صاحب قبلہ مرض سل میں مبتلا ہوگئے کافی علاج کیا افاقہ ہوا اور خون پھیپھڑوں سے آنے لگا اس زمانے میں وہ اپنے گاؤں کریم گنج تشریف لے گئے۔ گاؤں پہنچے تو دیکھا کہ مکان کے باہر الاؤ میں آگ جل رہی ہے صبح کا وقت ہے لوگ الاؤ کے چاروں طرف بیٹھے ہات سینک رہے تھے [illegible] والد صاحب وہاں سے گئے۔ اتنے [illegible]

کے بیٹھنے والوں میں سے ایک آواز آئی۔ "باورچی پانی پلاؤ" والد صاحب نے ملازم کو آواز دی۔ وہ بزرگ بولے "نہیں تم خد لاؤ، وہ جو تمہارے گھر میں کورے گھڑے بھرے رکھے ہیں ان میں سے پلاؤ" والد صاحب اندر گئے تو واقعی کورے گھڑے پانی سے بھرے رکھے تھے۔ انہوں نے لاکر خد پانی پلایا اور اپنی بیماری کا حال بیان کیا۔ بزرگ نے کہا اچھا۔

قلم دوات لے کر آو۔ والد صاحب قلم دوات لیے اندر گئے۔ بزرگ باہر تخت پر نسخہ لکھ کر غایب ہوگئے۔ باہر آکر دیکھا، بزرگ غایب، چاروں طرف آدمی دوڑائے مگر کہیں پتا نہیں چلا۔ تخت پر نظر پڑی تو دیکھا کہ کوئلے سے نسخہ لکھا ہے۔ والد صاحب نے فوراً نسخہ کاغذ پر لکھ لیا۔ دوسرے ہی دن پیلی بھیت واپس جاکر دوا کا استعمال شروع کر دیا۔

ایک ہفتا کے استعمال سے مرض کا نام ونشان باقی نہیں رہا پھر یہ مرض کبھی نہیں ہوا۔ افسوس کہ فقیری نسخوں کی یہ بیاض ہمارے ہات نہیں لگی ہمارے ایک بزرگ عزیز حکیم جلیل اللہ خاں صاحب تھے جن کی عمر سو سال سے تجاوز کر گئی تھی ۱۹۷۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا میں جب بھی بریلی جاتا ان سے ضرور ملتا۔ وہ ہمارے خاندانی حالات بیان کرتے ایک دن کہا کہ تمہارا [illegible] شجرا موجود ہے اور ایک فقیری نسخوں کی بیاض بھی [illegible] چاہتا ہوں آپ کی امانت آپ کے حوالے کر دوں لیکن [illegible]

فرمایا کرتے تھے کہ آپ کے دادا کریم جان صاحب کی زندگی تک ریاست کا نظم نسق بہت اچھا رہا۔ ان کے انتقال کے بعد خاندانی اختلافات شروع ہوگئے بہرحال اختلافات کی وجہ سے ریاست چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوگئی ریاست کا زوال شروع ہوگیا۔

میرے والد دو بھائی تھے۔ نبی جان صاحب، آصف جان صاحب۔ نبی جان صاحب ہمارے والد آصف جان صاحب تایا تھے ان ہی کے نام سے محلا آصف جان موسوم ہے۔ تایا صاحب نے اچھی عمر پائی تھی، مگر خاندانی اور جائیدادی اختلافات اس درجا بڑھ گئے کہ ان کو قتل کرادیا گیا۔ قاتل گرفتار ہوگیا اس کو عمر قید ہوگئی آخر میں وہ پاگل ہوکر مرگیا۔

والد صاحب کے صرف چھ سات گاؤں باقی رہ گئے تھے۔ شہری جائیداد میں محلا آصف جان تھا جس میں ۴۰ فی صد مکان ہمارے تھے۔ آخر میں اس محلا میں خاندان کا ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا کچھ انتقال کر گئے کچھ باہر پردیسوں میں چلے پورا محلا خالی ہوگیا ایک عرصے دراز کے بعد وطن جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنے پیدائشی محلے میں بھی گئے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ محلا آصف جان کہاں ہے۔ بلکل جغرافیا ہی بدل گیا پوچھنے پر لوگوں نے بتایا۔ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ ہر طرف چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے ہیں پرانے مکانوں کا نام و نشان نہیں۔ ایک معمر بزرگ نے بتایا کہ کس طرح مکانوں پر ستاروں اور کہاروں نے قبضا کیا۔ لاکھوں کی جائیدادوں مفت لوٹ کر غیروں نے فایدا اٹھایا۔ بھائی حسین حسان ۷ - ۸ سال کے، میں ۳، ۴ سال کا چھوٹا بھائی محمد معین ڈیڑھ سال کا تھا کہ والدا محترما اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ قبلا والد صاحب کی پہلی بیوی سے چار بچے تھے۔ دو لڑکے دو لڑکیاں ہماری پیدائش سے قبل ہی ہماری ان دو بہنوں کی شادی ہوچکی تھی۔ بڑے بھائی محمد یسین کی شادی موضع اٹنگا کے ایک زمیندار کے یہاں طے پائی تھی۔ اٹنگا بیلی بھیت سے تقریبًا ۱۵ - ۲۰ میل ہے۔ شادی میں دلچسپ حادثا پیش آیا۔ براتی مختلف سواریوں رتھ ابو وغیرا پہنچے مگر ہم اپنے چند قریبی عزیزوں کے ساتھ ہاتی پر سوار تھے۔ تقریبًا ۱۲ - ۱ بجے بارات رخصت ہوئی۔ ہم جنگل میں داخل ہوئے سورج غروب ہوچکا تھا۔ جب ہاتی راستا بھٹکنے لگا تب مہاوت نے گھبرا کر کہا کہ ہاتی بخار ہوگیا ہے آپ لوگ کود جائیے۔ سب لوگ بہت پریشان ہوئے میں حکیم خلیل اللہ خان صاحب کی گود میں سو رہا تھا بھائی حسین خان صاحب اور ایک عزیز کے پاس۔ غرض کہ خلیل اللہ خان صاحب مجھے گود میں لیے ہوئے، اور سب بھی یکے بعد دیگرے کود گئے۔ ہاتی ایک طرف چل پڑا، مہاوت کسی درخت کو پکڑ کر نیچے کود گیا اور ہم لوگوں میں آملا۔ اس تاریک اور بھیانک بیابان جنگل میں راستا نہایت دشوار ہوگیا۔ فیل بان اس جنگل سے کسی قدر واقف تھا وہ اپنے اندازے کے مطابق ایک طرف کو چل پڑا اور سب کو اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔

کافی مسافت طے کرنے کے بعد ایک بستی کے آثار نظر آئے سب لوگوں کی جان میں جان آئی جب گاؤں میں داخل ہوئے آدھی رات سے زیادا گزر چکی تھی کسی طرح گاؤں کے مکھیا کو جگایا اور اپنی بپتا سنائی بھلا آدمی تھا اور اٹنگا کے زمینداروں میں تھا۔ اس لیے پہلے تو اس نے اخلاقًا رات گاؤں میں گزارنے پر اصرار کیا، مگر سب نے معذرت خواہ ہوکر اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ مکھیا نے فورًا اپنے آدمی کو بیل گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی تیار ہوکر آگئی بھائی حسان صاحب اور میرا نیند سے برا حال تھا، چنانچے سب سے پہلے ہم دونوں بھائی سوار ہوگئے جب سب اطمینان سے بیٹھ گئے۔ مکھیا کو سلام و شکریا ادا کرکے رخصت ہوگئے دوسرے باراتی جو اپنے وقت پر پہنچ چکے تھے سب پریشان بیٹھے تھے والد صاحب نے تلاش کرنے کو آدمی دوڑا دیے۔ جنگل سے گزرنے تک ہاتی کی چنگھاڑ اور گھنٹا کی آوازوں کی گونج سے ہر شخص خوف و ہراس میں مبتلا تھا۔ سب کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب ہاتی ہماری گاڑی کی طرف آرہا ہے اس خوف سے مہاوت گاڑی بان کو راستے کے بارے میں ہدایت دیتا رہا۔ خدا خدا کر کے جنگل راستے سے گزر کر میدانی رستے پر آگئے۔ جب سب نے اطمینان کا

سانس لیا۔ ہمیں ڈھونڈنے والے رستے میں مل گئے خدا خدا کرکے منزل مقصود پر عرصہ اندھیرے پہنچے تب سب کی جان میں جان آئی۔ صبح کو ہاتی کی تلاش میں آدمی روانا کیے گئے انہوں نے واپس آکر ہاتی کی موت کی خبر دی اس خبر کو سن کر سب ہی کو افسوس ہوا ــــ بڑی بہن شادی کے چند سال بعد والد کی زندگی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کی گود میں دودھ پیتا ایک لڑکا تھا وہ بھی پہلی بھیت والد صاحب کے پاس رہتی تھیں۔ ہم لوگوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ گھر میں تین چار مامائیں تھیں۔ بہت پرانی اور وفا دار۔ ان کا تو سوائے اس گھر کے اور کوئی گھر نہیں تھا۔ اس گھر میں پل بڑھ کر بوڑھی ہو گئیں گویا گھر کے ممبر کی حیثیت رکھتی تھیں گھر میں زیادا کنٹرول ان ہی کا تھا۔ ہمشیرا کے آنے کے بعد گھر کے انتظام ان کو سونپ دیے ہیں۔ باہر ڈیوڑھی پر بھی پرانے ۳ - ۴ ملازم تھے۔ جس میں عبدالرزاق صاحب بہت پرانے بزرگ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے بڑے ہمدرد وفا دار بزرگ تھے۔ والد صاحب ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی بڑی عزت کرتے والد صاحب کو ان پر پورا بھروسا اور اعتماد تھا۔ جب تک ہم پہلی بھیت رہے انہیں کی گود میں پلے بڑھے۔ ایک مولوی صاحب جو ہم لوگوں کو قرآن، ہندستانی، فارسی پڑھاتے اور نگران کی حیثیت سے مستقل قیام رکھتے تھے۔ ایک ماما جس کو گھر کے سب ہی لوگ بنجارن کے نام سے پکارتے تھے انہیں کی گود میں چھوٹا بھائی محمد حسین پرورش پا رہا تھا والد صاحب نے بھائی محمد حسین صاحب کو گورنمنٹ اسکول میں داخل کرا دیا میں گھر پر ہی مولوی صاحب سے پڑھتا تھا ــ حسین صاحب کو ہاکی کھیلنے کا بہت شوق تھا ہمارے مکان سے ملحق ایک بہت بڑا پائیں باغ تھا جو کبھی کسی وقت ہمارے گھر کی عورتوں کی تفریح گاہ تھا جس میں پردے کے لیے چاروں طرف دیواریں تھیں۔ کسی وقت یہ باغ بہت خوبصورت سبز و شاداب رہا ہوگا اب ایک خوبصورت گھاس کا کھلا میدان تھا جس کو حسین صاحب نے اپنے ہاکی کھیل کے لیے منتخب کیا۔ اسکول سے واپسی کے بعد ہم لوگ اسٹکس لے کر باغ میں پہنچے اور اسکول، محلے اور رشتے داروں کے بچے جمع ہو گئے اور کھیل شروع ہو گیا۔ والد صاحب قبلہ کا موسم سرما میں ہمیشا یہ دستور تھا۔ انڈے کا حلوا۔ گاجر کا حلوا۔ پنڈیاں وغیرا بنوا کر ہر ایک بچے کو حصا بقدر ایک ماہ تقسیم کر کے فرماتے اپنی اپنی الماریوں میں بند کر کے تالا لگا دو ہم لوگ ہاکی کھیل کر واپس ہوتے تو سیدھے اپنے کمرے میں جاتے اپنی الماریاں کھول کر حلوا یا پنڈیاں کھانے بیٹھ جاتے اگر کسی کا مہینے سے پہلے ختم ہو جاتا تو جس کا باقی ہے اس کے کھانے کے لیے ترکیبیں لڑاتا کبھی تو خشامدانا انداز اختیار کرنا کبھی معصومانا خفگی کا اظہار کرنا، اگر والد صاحب کے علم میں آجاتا تو تھوڑی سی ڈانٹ پھٹکار کے بعد اپنے حصے میں سے دے دیا کرتے۔ حسین صاحب بہت محتاط تھے اپنا حصا پورے مہینے چلاتے۔ والد صاحب ہم سب کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ انہیں اچار چٹنی اور مربا جات کا بے انتہا شوق تھا۔ چنانچہ لکڑی کا ایک صندوق خانا دار تھا جو کھانے کے وقت کھولا جاتا اور دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو تقسیم ہوتا آخیر میں کھانے کے بعد مربا اناناس یا سیب وغیرا تقسیم ہوتا۔ ہمارا مکان بہت بڑا تھا۔ صحن کے آخری حصے میں اناج کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔

جب اپنی فصل پر ۷ - ۸ گاؤں کا اناج آتا تو بیل گاڑیوں کی لمبی لائین لگ جاتی جب اناج بخاری میں ڈالا جاتا تو ہم بچوں کے لیے ایک دلچسپ کھیل ہو جاتا ہم بخاری کی دیوار پر چڑھتے اور اناج پر کودتے وہ زمانا یاد آتا ہے۔ بخاری سے متصل کھنڈسارتی جہاں شکر تیار کی جاتی تھی۔ شکر سازی کا دور والد صاحب کی زندگی تک چلتا رہا غالباً ۱۹۱۸ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب حسب معمول آخر شب میں ۳ بجے بغرض تہجد اٹھے تھے۔ حقا ملازم تیار کر کے بیت الخلا کی دیوار کے سوراخ میں حقے کی نے داخل کر کے والد صاحب کو اٹھا دیتا

والا صاحب بغرض رفع حاجت تشریف لے جاتے اس دن بھی اجابت سے فارغ ہوکر باہر آئے۔ صحن تک پہنچے تھے کہ چکرایا۔ سنبھل نہ سکے گر کر بیہوش ہوگئے۔ اور زور زور سے خرخراہٹ شروع ہوگئی گھر کے سب ہی لوگ اٹھ گئے۔ سب نے ملکر اٹھایا چارپائی پر لٹا دیا تین دن تک مسلسل کروٹیں بدلتے رہے اور خرخراہٹ بھی جاری رہی ڈاکٹروں نے ہر ممکن کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور انتقال فرما گئے۔ اب یہاں سے ہماری زندگی میں انقلاب شروع ہوتا ہے۔ یہ آزمائشی دور سخت مصایب و شدائد سے شروع ہوتا ہے۔ نانا صاحب، قبلا اور ماموں صاحب بغرض شرکت تجہیز و تکفین یہاں بہت تشریف لائے تھے۔ سیوم کے دن مختصر قریبی عزیز جمع تھے کہ ہم یتیم و یسیر نابالغ بچوں کا مسلا پیش ہوا کہ ان بچوں کا ولی کس کو بنایا جائے بڑے بھائی محمد حسین صاحب نے اپنی بد فطرت تمانیا کر دیا کہ اپنا مخصوص و مصنوعی انداز اختیار کیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں بڑا بھائی ہوں مجھ سے زیادہ ان بچوں کا ہمدرد کون ہوسکتا ہے۔ اس لیے ولی ہونے کا میں ہی مستحق ہوں۔ اس حد تک خشامدانا انداز اختیار کیا کہ نانا صاحب کو یقین ہوگیا۔ چنانچہ بھائی حسین صاحب کو ولی بنانا منظور کر لیا۔ جج جو نابالغوں کا اصلی ولی ہوتا ہے اس کو ہر سال نابالغوں کا حساب دینا پڑتا ہے۔ اس لیے جج کو جاننا ضروری ہوتا ہے کہ ان بچوں کا ولی کون ہے۔ چنانچہ جج کی عدالت میں مہر تصدیق حاصل کرلی۔ سب بھائی اور نانا وغیرا اپنے گھروں کو واپس ہوگئے اور ہم لوگ حسب سابق رہتے رہے اور بھائی حسین صاحب خدکا اور اپنے یتیم و یسیر معصوم بھائیوں اور بہنوں کو برباد کرنے کے اسباب مہیا کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ہم لوگوں کو پدرانا شفقت و محبت سے محرومی کے احساس نے اس درجا مایوس کر دیا کہ ہم دونوں بھائی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اب ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔

بھائی حسین صاحب کے طرز عمل اور سلوک سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم لوگ اس ظالمانا سلوک کو زیادہ دن برداشت نہیں کر سکیں گے۔ خدا اگر کبھی

یا بھائی حسین اتفاق سے یا کھیلتے ہوئے ان کے کمرے میں چلے جاتے تو فوراً یہ کہہ کر نکال دیتے "خبردار یہاں آئے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔" کبھی ہم دونوں کے کان پکڑ کر صحن میں تیز تیز قدموں سے ٹہلنے لگتے یہاں تک کان سرخ ہو جاتے کبھی بوا بہن بول پڑتیں کہ کیوں بلاوجہ بے قصور معصوم بچوں کو تکلیف پہنچا رہے ہو تو ان سے لڑنا ہاں کھیلنا چھوٹ گیا۔ فیس کی عدم ادائگی کی وجہ سے نام خارج ہوگیا۔ مولوی صاحب کو ملازمت سے علحدا کر دیا۔ غرضکے تکلیف پہنچانے کی ہر ممکن کوشش ہوتی رہی بہرحال کبھی بھی بھائی حسین صاحب نے سیدھے منھ بات نہ کی۔ وہ فطرتاً شقی القلب مغرور واقع ہوے تھے۔ صلۂ رحمی، خدا ترسی، انسانی ہمدردی جیسی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر ان کو خوشی ہوتی تھی۔

گاؤں کے نومسلموں کی جھونپڑیاں جلوادیں نتیجے میں ان پر سنگین مقدما قایم ہوگیا۔ جایداد رہن اور بیچنے کی نوبت آگئی۔ بیدریغ روپیا خرچ کیا۔ اسی وقت اتفاق سے چھوٹی بہن بھی آگئی تھیں۔ بڑی بوا بہن تو پہلے ہی سے موجود تھیں دونوں بہنوں کے سامنے انتہائی معصومانا ایکٹنگ کرکے کہ مجھے جیل ہوجائے گی جایداد بھی نکل جائے گی بہنوں نے متاثر ہوکر اپنے زیورات حوالے کر دیے ہماری چھوٹی بہن بہت سیدھی اور معصوم تھیں اسی کے باوجود شوہر کی بغیر اجازت دینا نہیں چاہتی تھیں اس لیے شوہر امانت حسین صاحب بڑے مغلوب الغضب آدمی تھے مگر ان کے یقین دلانے پر کہ سب سے پہلے آپ کے جانے سے قبل آپ کا زیور چھڑا کر دوں گا۔ وہ باتوں میں آگئیں زیور حوالے کر دیا۔

پندرا دن گذرے چہلّم ختم مگر بھائی حسین صاحب کا کہیں پتا نہ چلا۔ کسی نے کہا کہ وہ سسرال آ گئے۔ کوئی کہتا بمبئی پہنچ گئے غرض کے ایسے غایب ہوئے کہ جیسے بہت گئے پردہ نہ آئے چھوٹی بہن نہایت مغموم و افسردہ اپنے گھر آ گئیں جب تک شوہر سے چھپا سکیں چھپایا۔ بہرحال پتا نہ چلا کہ اس معصوم بہن پر کیا گذری۔ بیوہ بہن کی انتظار سے عاجز اور

پریشان ہوکر اپنی سسرال کے مکان آگئیں اور بڑی عسرت و ناداری کی زندگی گذارنے لگی۔ پریشان ہوکر نانا صاحب کو بھائی حسین حسان صاحب نے لکھا۔ نانی صاحبہ سن کر پریشان ہوگئیں۔ دوسرے دن صبح بذریعہ ٹرین نانا صاحب پیلی بھیت پہنچ گئے۔ ہم لوگوں کا حال زار دیکھ کر ان کو بہت دکھ ہوا، اور شام ہی کی ٹرین سے ہم تینوں بھائیوں کو بریلی لے آئے ہمیں دیکھ کے نانی صاحبہ بہت روئیں دھوئیں۔ دوسرے ہم سب کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلے ایک ہفتے کے بعد حسین حسان اور مجھے عربی مدرسے مصباح العلوم میں داخل کرادیا گیا میں چھوٹا تھا اس لیے مجھے قرآن، ہندستانی، فارسی کلاس میں اور بھائی حسین صاحب کو عربی کلاس میں داخل کردیا۔ بھائی حسین صاحب نے دو سال میں اچھی مہارت پیدا کرلی۔
ایک عرب حاجی کلا کے نام سے بریلی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ بریلی کے بازار چوک میں بہت بڑی لمبی چوڑی دکان جنرل مرچنٹ کی تھی ان کے یہاں عربی اخبار آتے تھے۔ حاجی کے ایک دوست مولوی عبدالودود صاحب بانی اسلامیہ اسکول بریلی تھے۔ وہ اکثر رسالوں میں حسان صاحب کے افسانے پڑھ کر متاثر تھے کسی تقریب میں ملاقات ہوگئی۔ مولوی عبدالودود صاحب حاجی صاحب کی دکان سے عربی اخبار لاکر دیتے اور جو مضمون پسند آتا ہندوستانی میں ترجمہ کراتے اور میں یہ ترجمہ ان کے پاس پہنچاتا تھا۔ بھائی حسین حسان صاحب کو بہت کم سنی سے ہی افسانہ نگاری و مضمون نگاری کا شوق رہا ہے۔ رسالہ زمانہ، شمع، نقیب، معارضہ وغیرہ میں مضامین شایع ہوتے تھے اسی زمانے میں نانی صاحبہ بہت سخت بیمار ہوگئیں۔ وہ ایک دولت مند گھر کی بیٹی تھیں۔ اپنے جہیز میں کئی گاؤں لائی تھیں جن میں کسی گاؤں میں ۴ بسوے کسی میں ۵ بسوے تھے۔ نانی صاحبہ بھائی حسین سے کہا کرتی تھیں کہ مولوی عبدالقیوم صاحب کو بلا لاؤ میں ان کے روبرو تمہارے نام یہ جایداد کردوں بھائی حسین حسان صاحب ہمیشہ یہ جواب دیا کرتے کہ جب ہماری اتنی بڑی جایداد نہ رہی تو اس کو ہم کیا کریں گے۔ ماموں وغیرہ سب مخالف ہو جائیں گے ہمارے بڑے ماموں سید عابد حسین صاحب کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ نانی صاحبہ نے اپنے سب سے بڑے لڑکے سید عابد حسین کی شادی اپنے بھائی ظہور الدین کی لڑکی سے کی تھی بھائی اچھی خاصی جایداد کے مالک تھے اس لیے کہ نرینہ اولاد میں یہ ایک تھے جوانی میں کسی لالچی عزیز نے زہر دیا تھا۔ ان کے بھی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ اس لیے بڑی جایداد کی مالک تھیں۔ ماموں عابد حسین صاحب نمک کے محکمے میں مولانا محمد علی کے انڈر میں کام کرتے تھے۔ شادی کے بعد ملازمت ترک کردی اور جایداد کا کاروبار سنبھال لیا۔ جب نانی صاحبہ کا آخری وقت آیا تو اپنے گھر لے گئے اور وصیت نامہ مرتب کرکے دستخط کرانا چاہا تو نانی صاحبہ نے فرمایا کہ حسین اور ذہین کا نام ہے بہرحال ہمارے نام بھی حسب ضابطہ جایداد میں لکھ دیے گئے۔

ہم لوگ بھی نانی صاحب کے پاس ہی تھے ماموں صاحب کا حکم ہوتا کہ کھانا کھا کر سیدھے گھر جاؤ۔ محض اس خیال سے کہ ہمارے بچے ان کی صحبت میں بگڑ جائیں گے۔ ماموں صاحب کے بڑے صاحبزادے صابر حسین صاحب بھی جو بھائی حسین صاحب سے ۳-۴ سال بڑے تھے۔ مصباح العلوم میں پڑھتے تھے۔ ہمارے مدرسے نہیں جاتے تھے بلکہ ملازم پہنچاتا تھا۔

بھائی حسین صاحب قومی تحریک میں حصہ لینے لگے ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے بدیشی کپڑے کے استعمال کی مخالفت میں تحریک چلائی بھائی حسان صاحب نے بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ ٹاؤن ہال کے میدان میں بہت بڑا اونچا ڈھیر لگا ہوا تھا آگ لگائی جا رہی تھی۔ بھائی حسین صاحب کے برابر میں کھڑا تھا میرے سر پر مخمل کی رامپوری ٹوپی تھی وہ میرے سر سے اتار کر آگ میں پھینک دی ۱۹۲۲-۲۳ء میں صوبے یوپی کے والنٹیروں کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ مدرسے مصباح العلوم میں سب کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں بھی تماشائیوں میں تھا تھوڑے فاصلے پر گوروں کا پہرا تھا والنٹیروں کی آمد کا یہ عالم تھا کہ میلوں تک سفید ٹوپیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ چپے چپے پر پہرا تھا۔ اس [illegible]
حسین حسان صاحب کو [illegible]

کی چھت پر مشین گنیں نصب تھیں ایک مزدور نے اپنے پھاوڑے سے گورے پر حملا کر دیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا ادھر مشین گن سے گولیاں چلنے لگیں ہر طرف ایک شور و غوغا پبلک میں ایسا جوش و خروش کہ گولیوں کا مقابلہ عورتیں بھی اینٹ پتھر سے کر رہی تھیں - ہندو مسلم اتحاد ایسا کہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوا نہ آئندہ ہو سکتا ہے - سرکاری افسران اینٹ پتھر سے زخمی ہو رہے تھے اور گولیوں سے پبلک مر رہی تھی - ایک قصائی کا نوجوان لڑکا ٹاون ہال کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اس نے جاتے ہی مشین گن پر قبضا کرنا چاہا جیسے ہی پبلک کو یہ بات معلوم ہوئی تمام نوجوان کا مجمع ٹاون ہال کی چھت پر ہو گیا - پولیس اور سرکاری عملا اتنے بڑے مجمع کو قابو کرنے میں ناکام ہو گیا - گولی کھاتے رہے اور اوپر پہنچتے رہے جو اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے مشین گن سے گولیاں بند ہو گئیں اوپر کے عملے میں بھگدڑ مچ گئی بہر حال کچھ سرکاری عملے کے لوگ زخمی ہوئے کچھ مرے - پبلک کے لوگ زیادا مرے کانگریسیوں نے بہر حال اپنا پروگرام پورا کر لیا - ہم بھی بھائی حسین صاحب کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور گھر آ گئے -

نانی صاحبا بیمار تو تھیں ایک دن حالت زیادا خراب ہو گئی یہاں تک کہ جانبر نہ ہو سکیں اور اللہ کو پیاری ہو گئیں ان کے بعد ہماری حالت اور بھی ناگفتا بے ہو گئی - یتیم و یسیر ہو ہی چکے مگر نانی صاحبا کی محبت و پیار ملا تھا اس سے بھی محروم ہو گئے -

ہمارے تین ماموں اور ایک خالا تھیں بڑے ماموں سید عابد حسین ، منجھلے سید زاہد حسین صاحب سب سے چھوٹے سید ذاکر حسین یہ صاحب بہت غریب بے پڑھے تھے - منجھلے ماموں زاہد حسین صاحب گورنمنٹ سروس میں تھے ان کے تبادلے ہوتے رہتے اس زمانے میں وہ شاہجہاں پور میں تھے ان کے اس وقت کوئی نرینا اولاد نہیں تھی اس لیے چھوٹے بھائی محمد معین کو لے لیا تھا - فطرتاً مزاجی اعتبار سے بڑے ماموں کے مقابلے میں غصا تو بہت تھا مگر محبت ، خدا ترسی ، چھلے رحمی کا جذبا رکھتے تھے بڑے صاف گو - عابد زاہد نمود و نمایش ریاکاری نام کو نہ تھی ، بہر حال منجھلے میاں شاہجہانپور میں پڑھتے میٹرک کر چکے تھے اچانک پلیگ ہو گیا وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اب ہم دو بھائی بڑے ماموں کے یہاں رہ گئے - بھائی حسین حسان صاحب کی خط و کتابت ندوہ سے جاری تھی - ندوہ والوں نے لکھ دیا کہ آپ آ جایئے ادھر ماموں صاحب کے توہین آمیز سلوک سے عاجز تھے ہی بھائی حسین نے فوراً لکھنو جانے کی تیاری شروع کر دی بھائی حسین حسان نے اپنے تعلیمی سلسلے میں کسی عزیز و اقارب کا ایک پیسا کا احسان نہیں لیا - بھائی صاحب ندوہ چلے گئے ادھر نانا صاحب نے ہم نابالغوں کی طرف سے عذر داری کر رکھی تھی - بھائی حسین صاحب کے نام وارنٹ جاری ہو گیا - بمبئی میں ان کی گرفتاری ہوئی مختصر یہ کہ ان کو جیل ہو گئی جس سے ہمیں تو کوئی فایدا نہیں ہوا - پوری جایداد تباہ کر چکنے کے بعد سوائے جیل کے اور ان سے حاصل بھی کیا ہو سکتا تھا چند ماہ جیل میں رہ کر باہر آ گئے داڑھی چھوڑ دی اور پیری مریدی کا پیشا اختیار کر لیا اور مستقل بمبئی میں رہنے لگے بیوی بچے پریشان ہونے لگے - بیوی کے عزیزوں نے ایک اسکول میں استانی کی حیثیت سے ملازم کرا دیا - میں نے بھی چند روز بریلی میں گزار کر بریلی چھوڑ دی - بریلی کے قریب ایک قصبا بہیڑی ہے وہاں اپنے ایک دوست محمد نظر صاحب اوورسیر کے پاس چلا گیا وہاں چھوٹے چھوٹے کاموں کی ٹھیکیداری کرنے لگا چھ سال وہاں رہا - بڑے ٹھیکوں میں ہاتھ ڈالنے لگا - ایک بڑے ٹھیکے میں بڑا نقصان ہو گیا - دوستوں کے تبادلے ہو گئے بد دل ہو کر یہ جگہ اور کام چھوڑ دیا - لیکن میرا قیام ابھی بہیڑی ہی میں تھا کہ نانا صاحب قبلا نے بلوا لیا اور فرمایا کہ چند روز میرے پاس رہو میں ان کے حکم کی تعمیل میں رہنے لگا - تھے بڑے جلالی سید ، پورے محلے پر ان کا رعب طاری تھا - اس لیے ہم بہت ڈرتے تھے ، ۔۔ اسال قبل ان کی تعلیم و تربیت ایک انگریز کمشنر جانسن نے کی تھی - نانا کے والد

نادرحسین صاحب سے ان کی دوستی تھی وہ سوہان کے رئیسوں میں تھے۔ ہانسن صاحب نے میر صاحب سے کہا کہ صادق حسین کو میں پڑھا دوں گا۔ میر صاحب نے رضامندی ظاہر کر دی کمشنر صاحب نے کالج میں داخل کرا دیا۔

کمشنر صاحب نے انہیں بی اے کرایا اور کسی اچھے عہدے پر ان کا تقرر کر دیا۔ اس زمانے میں بڑے عہدوں پر انگریز ہی ہوا کرتے تھے۔ ان کا افسر بھی انگریز تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اپنے افسر سے لڑ لیے اور مار پیٹ کر گھر آ گئے اور کمشنر صاحب کو اطلاع کر دی۔ غرضکہ بہت سے عہدوں پر تقرر ہوا، مگر اپنے ہر افسر سے لڑ جھگڑ کر گھر آ جاتے۔ ایک مرتبہ نانا صاحب اپنے ایک عزیز کو کمشنر صاحب کے پاس لے گئے وہ اتفاق سے کوٹ پتلون میں ملبوس تھے۔ کمشنر صاحب یہ لباس دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے خوب ڈانٹا تم لوگ نقال ہو۔ تمہارا اپنا کوئی لباس نہیں ہے۔ غرضکہ اس قدر ڈانٹا کہ ان کی یہ جرات بھی نہ ہوئی کہ سفارش کریں بے نیل و مرام گھر واپس آ گئے۔ نانا صاحب اپنی بدمزاجی کی وجہ سے کسی ملازمت نہ لگ سکے حالانکہ ان کے ساتھی کوئی کلکٹر کوئی ڈپٹی کلکٹر تھے۔

ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نانا کے حکم کی تعمیل میں بھیٹری میں رہنے لگا مگر ہر لمحہ یہ خوف طاری رہتا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جو مزاج و مرضی کے خلاف ہو نانا صاحب اکثر فرماتے کہ جو حسین کو اپنی لڑکی دے گا اس کو اپنی جائیداد لکھ دوں گا۔ یوں خالا صاحبا کی لڑکی طے تھی۔ عام اصطلاح میں ٹھیکرے کی مانگ کہتے ہیں وہ غالباً بوقت پیدائش دونوں بہنوں کے مابین طے ہو گیا ہو گا۔ بہرحال میں نانا صاحب کی خدمت میں رہنے لگا اپنی ہی چارپائی پر سلایا کرتے تھے۔ ایک دن عصر کے بعد انگلیوں پر کچھ گن رہے تھے میں نے معلوم کیا آپ کیا گن رہے ہیں فرمایا کچھ نہیں تہجد گزار شب بیدار تھے دلائل الخیرات بہت پابندی سے پڑھا کرتے۔ ایک دن رات کو سوتے ہوئے فرمایا کہ آج تمہاری ضرورت ہو گی اٹھا دوں اٹھ جانا۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے نیند آ گئی سو گئے۔ حسب

معمول نصف شب کے بعد اٹھ گئے۔ لالٹین لے کر کے لیے اٹھائی ہاتھ سے چھوٹ گئی اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی تو میں اٹھ گیا اور کہا کہ لالٹین جلا دوں۔ بڑی تیز آواز میں کہا نہیں جب میں اس وقت اٹھا۔ میں یہ سن کر پھر لیٹ رہا لالٹین اٹھا کر جلائی اور ڈھیلا اٹھا کر پیشاب چلے گئے۔ چند منٹ بعد آواز دی کہ اب تمہاری ضرورت ہے آؤ پیشاب کر چکے تھے۔ کہا مجھے اٹھا میں نے گھٹنے پکڑ کر اٹھانا چاہا بڑے زور سے ڈانٹا ایسے نہیں بغل میں ہاتھ ڈال کر اٹھاؤ۔ بغل میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔ دیوان خانے کے سامنے کھٹولا پڑا تھا کہا یہاں بٹھاؤ۔ تھوڑی دیر بیٹھے فرمایا جانماز پر لے چلو میں اٹھا کر جانماز پر لے گیا سجدہ میں چلے گئے اور کہا پیٹ سہلاؤ میں پیٹ سہلانے لگا چند منٹ کے بعد میں نے دریافت کیا کچھ سکون ہوا مگر مکرر دریافت کرنے پر جواب نہ ملا تب میں بہت پریشان ہوا اور گھر والوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں سب ہی آ گئے اس وقت بڑے ماموں کے علاوہ سب ہی موجود تھے۔ بظاہر کوئی ایسی علامت نہیں تھی کہ سے سمجھا جاتا کہ موت واقع ہو جائے گی کسی قسم کی بیماری بھی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی موت کی اطلاع پہلے ہی ہو چکی تھی دن اور وقت سب معلوم تھا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد ہمارے منجھلے ماموں صاحب نے اپنی بڑی صاحبزادی فہمیدا جو ان کی بہت چہیتی بیٹی تھیں ان کے لیے بھائی حسین حسان صاحب کو منتخب کیا یہ ماموں صاحب کی پہلی بیوی سے تھیں پہلی بیوی سے صرف تین لڑکیاں تھیں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ان کے انتقال کے ایک عرصے کے بعد ماموں صاحب کی بڑی بھاوج نے یہ دوسرا رشتہ ایک غیر خاندان میں تھا۔

ماموں صاحب نے مجھ سے بھی ذکر کیا میں نے کیا مناسب ہے ان کی بہن خالا نے بھی اپنا فیصلہ دے لیا، لیکن بھائی حسین حسان صاحب کو ان

کی کوئی خبر نہیں نہ میں نے ہی کوئی اطلاع کی ماموں صاحب نے بھائی حسان صاحب کو بلانے کے لیے ٹیلگرام دے دیا۔ بھائی حسان صاحب نے جواب میں معذرت چاہی پھر دوسرا ٹیلگرام دیا کہ اس وقت تمہاری سخت ضرورت ہے۔ فوراً روانہ ہو جاو چنانچہ تیسرے دن صبح میں آ پہنچے۔ ماموں صاحب نے تاریخ عقد تعین کردی۔ بھائی حسین صاحب کو جب معاملہ کی نوعیت معلوم ہوئی تو بہت گھبرائے بے انتہا پریشان ہو گئے مجھے بہت ڈانٹا کہ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں کی اور دلی واپس جانے کی کوشش کرنے لگے لیکن ان کا سوٹ کیس چھپا دیا گیا۔ ادھر عقد کی تاریخ بھی آ پہنچی۔ دعوت نامے سب کو پہنچ چکے مہمان بھی جمع ہو گئے۔ حضرت مولوی یسین صاحب بھی عقد پڑھانے آ گئے۔ ادھر دولہا صاحب کی تلاش ہو رہی ہے جب تلاش کرنے والے تھک کر چور ہو گئے ہار کر بیٹھ گئے تلاش کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ ماموں صاحب کا مارے غصے کے برا حال بے انتہا پریشان۔ غرضیکہ تمام براتی اور مولوی یسین صاحب واپس ہو گئے۔ تلاش برابر جاری رہی۔ تیسرے دن اپنے دوست شکور صاحب کے یہاں ملے مگر عقد کے دن سمیع الدین وکیل کے یہاں رہے بہر حال شکور صاحب سمیع الدین وکیل اور دوسرے دوستوں نے بہت دیر تک سمجھایا تب بمشکل تمام راضی ہوئے۔

پھر دوبارہ تاریخ عقد طے ہوئی اور بھائی حسین بادل نخواستہ دولہا بنے۔ یوں شادی میں اچھا خاصا ہنگامہ رہا خوب چہل پہل رہی عقد ہوا مہر پر مجھے اعتراض ہوا تو بڑے ماموں صاحب نے فرمایا کہ ہمارے خاندان میں ۲۵ ہزار کا بندھا ہے تمہاری ماں کا بھی ۲۵ ہزار کا مہر تھا۔ ایک صاحب بولے یہ سب تمہارے بڑے ہیں تم کیوں دخل دیتے ہو۔ میں نے دیکھا دولہا بھی خاموش ہے میں بھی خاموش ہو گیا۔ یہ تقریب بخیر و خوبی ختم ہو گئی دوسرے دن دولہا بھی دلی واپس ہو گئے۔ کچھ دن کے بعد میں بھی دلی پہنچ گیا۔ اہلیہ کا نکاح میں حکیم کبیر الدین صاحب کی ہمدردی و مہربانی سے داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں بھائی قرولباغ گلی نمبر ۲ میں رہتے تھے۔ پڑوس کی ایک عورت کھانا پکا دیتی تھی اس طرح ۴ - ۵ سال گذر گئے۔ نہ ادھر سے رخصتی کی تحریک نہ ماموں صاحب کی طرف سے۔ ہر دو طرف خاموشی طاری تھی۔ بھائی حسین حسان صاحب سے اس مسئلے پر کبھی گفتگو بھی نہیں ہوئی۔ یوں بھی بہت کم بات چیت ہوتی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میرے مستقبل کے بارے میں کوئی فکر تھی یا نہیں۔ بچپن سے ہی بہت کم گو کم سخن واقع ہوئے تھے یاد نہیں کہ کبھی بھی مجھ سے یہ دریافت کیا ہو کہ تمہارا کیا ارادہ ہے، کیا کرنا چاہتے ہو۔ یا کیا کرو گے۔

ایک روز میں نے کہا کہ آپ بھی خاموش ہیں اور ماموں صاحب بھی کوئی تحریک نہیں کر رہے ہیں آخر یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی۔ بہر حال جو خدا کو منظور تھا ہوا۔ عقد ہو چکا ہے۔ عقد کو بھی ۵ - ۶ سال گذر چکے اب میں چاہتا ہوں کہ میں کانپور جاکر بھاوج کو لے آؤں۔ بہت دیر سوچ و بچار کے بعد کہا تمہاری مرضی کل چلے جاو۔ چنانچہ دوسرے دن شام کی ٹرین سے کانپور روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن کانپور پہنچ گیا۔ گھر کے سب ہی لوگ بہت خوش ہو گئے چھوٹی بہنیں مجھ سے بے انتہا محبت کرتیں بالکل اپنے سگے بھائی کی طرح۔ ان سے خوب ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ رہی یہ سب سے چھوٹی عایت بہت شریر زندہ دل، منجھلی آصفہ بہت ہی پابند شریعت صوم و صلوات کی پابند۔ ماموں صاحب آفس جا چکے میں دوپہر کا کھانا کھا کر میں سونے گیا یوں بھی کھانے کے بعد سونے کا عادی تھا۔ سفر کی تکان رات کا جاگا ہوا۔ بڑی غافل نیند سویا۔ اب دونوں بہنوں کو مذاق کا موقع مل گیا۔ میں تقریباً ۵ بجے اٹھا تو دیکھتا ہوں کہ سیدھے ہاتھ میں ایک بغدادی قسم کا آئینہ میرے ہاتھ پر بندھا ہے میں سمجھ گیا کہ یہ عایت کی حرکت ہے اس نے خوب دل کھول کر میرے منہ پر سیاہی لگائی آئینہ ہاتھ پر بندھا اس لیے کہ اٹھتے ہی اپنا چہرا دیکھ لیں۔ جیسے ہی ان کو معلوم ہوا کہ میں اٹھ گیا

دونوں چھپ گئیں میں ان کو ہر کمرے میں ڈھونڈتا رہا اور دوسرے لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے - چند منٹ تلاش کیا منجھلی آصفا غریب ہاتھ لگ گئیں - وہ کہہ رہی منجھلے بھائی میں نے نہیں کیا - ہم آصفا کی مرمت کر ہی رہے تھے کہ ماموں صاحب آگئے یہ ہنگامہ دیکھ کر حیران رہ گئے جب میرا چہرا دیکھا تو ہنسے بغیر وہ بھی نہ رہ سکے کہنے لگے تم نے اس غریب لالی کو پکڑ لیا - کسی نے کہا دھوبی سے بس نہ آئی گدھیا کے کان پکڑے - اتنے میں عائشا بھی آگئیں اور ماموں کی آڑ لے کر بیٹھ گئیں میں نے وہیں جا پکڑا اور اس کا منہ کالا کر دیا - بہر حال اچھا خاصا مذاق رہا - شام کو ماموں صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی - ماموں صاحب کی گفتگو میں شکوہ کا انداز بلکل نہیں تھا - تین روز کانپور رہ کر چوتھے روز دہلی روانا ہوئے بھاوج کی خواہش ایک دن اناؤ میں ٹھہرنے کی تھی وہاں ان کی سہیلیاں رہتی تھیں - تیسرے دن ہم دلی پہنچ گئے - بھائی صاحب کی امانت ان کے سپرد کی - سنہ ۱۹۲۸ء میں حسیب میاں پیدا ہوئے میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا جب حسیب میاں چھ مہینے کے تھے کہ حیدر اباد گورنمنٹ سے بلاوا آگیا - نواب میر عثمان علی خان نے ایک کالج قائم کیا تو حکیم مقصود جنگ بہادر اس کے ڈائرکٹر تھے - حکیم کبیر الدین صاحب - حکیم فضل الرحمٰن صاحب اور حکیم الیاس خان صاحب نے اعلا حضرت کی منظوری حاصل کر کے بلوایا میں اناٹمی کے چارٹ واٹر کلرس سے تیار کرتا میرا تعارف نواب مقصود جنگ، حکیم کبیر الدین صاحب نے کرایا - اس لیے مجھے بھی بلوالیا - ہم حیدر اباد روانا ہو گئے - حکیم الیاس خان صاحب نہیں گئے - دس سال کے بعد سنہ ۱۹۳۷ء میں دلی واپس ہوا اس وقت شعیب میاں ۳ سال کے تھے -

جامع کی سلور جوبلی جو اوکھلے میں ہوئی تھی میں اور بیوی شریک رہے - کچھ دن دلی رہ کر ہم لوگ حیدر اباد واپس ہو گئے - سنہ ۱۹۴۸ء میں حسیب میاں کی والدہ کے انتقال کی خبر حیدر اباد پہنچی - انتقال دلی میں مرض آنتوں کی دق میں ہوا - ایک بچہ ایک سال کا چھوڑا محمد متین بہت خوبصورت تھا سنہ ۔۔۔ میں اس کا بھی انتقال ہو گیا - دوسری شادی کب ہوئی اور کیسے ہوئی بھائی حسین صاحب نے اپنے خطا کے ذریعے کبھی کوئی اطلاع نہیں دی - بہت عرصے کے بعد حسیب میاں کے خط سے معلوم ہوا -

اب یہ ایک بات تشنا رہ جاتی اور لوگوں کو تشویش میں ڈالتی ہے کہ بھائی حسین حسان نے پہلی شادی سے اس قدر ناراضگی کا اظہار کیوں کیا - کہ عین وقت پر روپوش ہو گئے - میں نے بھی کبھی ان سے اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کی - میرا خیال ہے کہ اس وقت ان کے وہم و تصور میں بھی نہیں تھا کہ بغیر علم اطلاع اور مرضی معلوم کیے یہ واقعا اچانک پیش آجائے گا - یہ بلکل نفسیاتی بات ہے - دوسرے تحریک آزادی میں بڑے جوش و خروش سے کام کر رہے تھے - اگر اس وقت رخصت کر کے لے آتے تو آزادی حلب ہو جاتی اور جو کام ان کو سونپا گیا تھا وہ چوپٹ ہو جاتا - اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت شادی کے بندھنوں میں الجھ کر رہ جاؤں -

خلیل تنویر

نیند آنکھوں میں

گرفت کتنی ہی سخت ہو -
سناٹے کی سرحد سے گذرتے ہوئے
ہاتھ سے پتوار چھوٹنے لگتے ہیں
لہو میں تیرتی ہوئی کرچیوں کی چبھن
آہستہ آہستہ ایک بے نام سکون میں
تبدیل ہونے لگتی ہے
نیند آنکھوں میں اترنے لگتی ہے

بڑے آدمیوں کے خطوط ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے نام

علامہ سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر "معارف" اعظم گڑھ

"ہندستانی ادب" کے نام سے علم وادب اور نثر کا جو ماہانہ مجموعہ آپ نکالنا چاہتے ہیں، اس کی کامیابی و ترقی کا خواستگار ہوں۔ حیدرآباد دکن ہندستانی کی مشترکہ زبان اور اسکے ادب کی ترقی کے لیے جو کوششیں اب تک بروئے کار لا چکا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ یہ نیا ماہانہ مجموعہ اس سلسلے کی ایک مزید ترقی یا نقا کرئی ہوگی۔ انشا اللہ تعالیٰ ضرورت تھی کہ ہندستان کی مشترکہ ادبی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس سے اس ملک کے سارے رہنے والوں میں متحدہ ذہنی و ادبی تصور پیدا ہو۔ والسلام   سید سلیمان ندوی   ۱۰ر مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

شاہ معین الدین صاحب ندوی مرحوم سابق ایڈیٹر "معارف" اعظم گڑھ

مکرمی۔ السلام علیکم۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ دارالمصنفین نے اسلامی علوم وفنون اور اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اور آج کل ہندستان میں یہ چیزیں اور ان کے ادارے جس نازک دور سے گذر رہے ہیں ان سے آپ پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن ان موانع اور مشکلات کے باوجود دارالمصنفین انشا اللہ اپنا کام پورے استقلال کے ساتھ انجام دے گا لیکن اس میں آپ جیسے اصحاب علم کی بھی مدد کی ضرورت ہے اس کی اپیل روانہ خدمت ہے آپ کو دارالمصنفین اور اس کے کاموں سے جو دلچسپی ہے اس کے پیش نظر توقع ہے کہ آپ اپنے رسالے میں اس پر نوٹ لکھ کر ناظرین کو ممبر بننے کی جانب توجہ دلائیں گے تاکہ دارالمصنفین اطمینان کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دے سکے۔ والسلام

معین الدین احمد ندوی - ۱۱ر اپریل سنہ ۱۹۶۹ء

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سابق پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد   ۹ر مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

جناب من - آپ کی گشتی چٹھی پاکر مجھے خوشی ہوئی کہ آپ ہندستانی ادب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں آپ کا یہ ارادہ کہ ایک رسالہ اس مقصد کے پورا کرنے کے لیے نکالیں بہت تعریف کے لائق ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کی کوشش سے "ہندستانی ادب" ملک کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا اور اس کی عبارت کی معتدل طرز سے ہماری زبان کو یقیناً بڑی مدد اور قوت پہنچے گی۔ خدا کرے "ہندستانی ادب" میانہ روی، سادہ عبارت، زبان کی صحت کا نمونہ بنے جس سے اور رسالے اور اخبار ہدایت پائیں۔

مدتیں گذریں کہ کوئی تصویر میں نے نہیں کھنچوائی - اس لیے تصویر بھیجنے سے معذور ہوں۔

نیازمند
عبدالستار صدیقی

شمس العلما خواجہ حسن نظامی کی امیر خسرو ہر دیو اردو ہندی لائبریری درگاہ حضرت نظام الدین دلی ۲۰ مارچ ۱۹۵۴ء

جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ "ہندستانی ادب" حیدر آباد - سلام علیکم -
آپ کا رسالہ ملا - باوجود بینائی کی خرابی کے میں نے پڑھا - اس کے نام میں بہت گہرا نکتہ ہے اس مجھے
پر ایام گذشتہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں - منادی میں آپ کے اس اچھے کام کا تذکرہ شایع ہوگا -
نظم لال قلعہ بہت غلط اور بہت دل آزار ہے - میری ساری عمر انگریز حکومت کے مظالم ۱۸۵۷ء کے
خلاف قلم فرسائی میں گذری ہے - اس لال قلعے کی نسبت یہ غلط خیالات میری برداشت سے
باہر ہیں - مہربانی کر کے مطلع کیجیے کہ آپ کے خیالات بھی وہی ہیں جو اس نظم میں ظاہر ہوے ہیں -
میں نہیں چاہتا کہ اردو کے خدمت گذاروں کے خلاف کچھ لکھوں - مخلص حسن نظامی

ڈاکٹر ذاکر حسین سابق پرنسل جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی جامعہ نگر ۱۳ ستمبر ۱۹۴۱ء

مکرم بندہ - تسلیم - نوازش نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ - کاش میں آپ کے پرچے کے لیے کچھ
بھیج سکتا، لیکن اپنے معمولی فرائض کی انجام دہی میں ہی اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے قاصر رہتا ہوں اس لیے
لکھنے کا مزید کام انجام دینے سے قاصر ہوں - امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے - خدا کرے کہ آپ کے
رسالے کا نیا سالنامہ خوب آب و تاب سے شایع ہو - نیازمند ذاکر حسین

نواب صدر یار جنگ بہادر سابق صدر و صدور محکمے امور مذہبی حیدرآباد

حبیب گنج ضلع علی گڑھ - ۸ / فروری ۱۹۴۱ء

کرم فرما - السلام علیکم - سپاس یاد فرمائی - افسوس ہے کہ تعمیل فرمایش سے بوجوہ مجبور ہوں
اور طالب عفو - حبیب الرحمان صدر یار جنگ

اکبر علی صاحب مدیر "صحیفہ"

از دفتر صحیفہ روزانہ پل چادر گھاٹ حیدر آباد دکن (صحیفہ نگر) ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ
م ۱۴ امرداد ۱۳۵۰ف
جناب والا تسلیم -
معاف فرمائیں اگر ایک تلخ حقیقت کی طرف توجہ والا معطوف کراوں -
مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو مجھ سے یا صحیفے سے ناخوشی پیدا ہوگئی ہے اور آپ کی کوششیں ان دونوں
کے خلاف نقصان رسانی میں مصروف ہیں کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ ناخوشی کے ازالے کی کوئی تدبیر
میرے ہات میں ہے کہ جس سے آپ کی ہم دونوں سے ناخوشی دور ہو جاے - میں اپنی طرف سے اتنی
وجہ یہ بیان کر سکتا ہوں کہ انجمن ترقی اردو کی نسبت مجھے جناب کے مضامین سے اتفاق نہ تھا اور
انھیں صحیفے میں درج نہ کر سکا - اس کے سوا دیگر حالات میں مجھ سے کوئی قصور سرزد نہیں ہوا، بلکہ زمانے
طالب علمی سٹی کالج سے میں دلی لیف ہوے ناموافق نہیں رہا فقط
خدمت گزار خلق محمد اکبر علی مہتمم صحیفہ

نجیب اشرف ندوی اندھیری - بمبئی - ۵ / اپریل ۱۹۴۱ء

کرمی - تسلیم - آپ کا والا نامہ "ہندستانی ادب" کے سلسلے میں آیا تھا - بہت بہت شکریہ - میں

سرکاری کام سے باہر گیا ہوا تھا اس لیے جواب تاخیر سے دیا جا رہا ہے اسکے لیے عذرخواہ و عفو طلب ہوں۔ رسالہ اگر شایع ہو چکا ہو تو اس کی ایک کاپی ارسال فرما کر ممنون کیجیے اسکے دیکھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ رسالہ کس معیار کا ہے، تاکہ اگر میری تحریر اس قابل ہو تو ارسال خدمت والا کروں، ورنہ آپ کی ردی کی ٹوکری کے ڈھیر کو بڑھانے اور آپ کے قیمتی وقت کو ضایع کرنے سے کیا فایدہ -
یاد فرمائی کے لیے ایک مرتبہ پھر شکریہ قبول فرمایے - آپ کا خادم نجیب اشرف ندوی

حسین امام (ممبر وائسرائے اگزیکٹو کونسل) ۲۱-۱-۴۴ ۱۹ء

کرمی - تسلیم - مجھے آپ کے موقر جریدہ "ہندستانی ادب" کی دو اشاعتیں درکار ہیں یعنی فروری ۱۹۴۳ء و اپریل ۱۹۴۳ء - میں منت پذیر ہونگا - اگر قیمت مجھے بسبیل ڈاک بھیجدیں -
نیاز مند حسین امام (رکن ایوان مملکت ہند)

ڈاکٹر نظام الدین معتمد آل انڈیا اورینٹل کانفرنس - یکم مہر ۱۳۴۸ ف

خدمت شریف کرمی خانصاحب رکن بلدیہ
آج کے رہبر دکن کی مقامی خبروں میں آپ کی تحریک کی کامیابی بیحد مسرت کا باعث ہوئی - آپ اور آپ کے لایق رفقا اور مجلس بلدیہ قابل مبارک باد ہیں - کانفرنس کی جانب سے ہدیہ تشکر قبول فرمایے - ایسے مواقع بلدہ میں کم حاصل ہوتے ہیں اور بلدیہ کی جانب سے یہ تواضع حیدراباد کی روایتی مہمان نوازی کے شایان شان ہے -

سید محمد اعظم - پرنسپل سٹی کالج ۳۱ر فروردی ۱۳۵۰ف

کرمی - تسلیم - بجواب نیم سرکاری مورخہ ۲۴ر فروردی ۱۳۵۰ف ترقیم ہے کہ جناب کی مکرر یاد فرمائی کا شکریہ - مجھے افسوس ہے کہ آپ کے پہلے خط کا جواب معروفیت کی وجہ سے اس سے پہلے نہ دیسکا پیام اور تصویر بھیجنے سے مجھے معاف فرمایا جائے - میں اپنی عادتوں سے مجبور ہوں - ایسی باتوں سے ہمیشہ بچتا رہا ہوں - بھلا نکالیے اور اچھا نکالیے اس کی ہر طرح مدد کرونگا - امید کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہونگے فقط خاکسار سید محمد اعظم

نواب میر اکبر علی خاں (موجودہ گورنر اڑیسا) اسٹیشن روڈ حیدراباد - ۱۷ر آبان ۱۳۵۰ف

(۱) کرمی خان صاحب! تسلیم - آپ کا اور مولوی سید محمد صاحب کا مکرر کا عنایت نامہ ملا - لیکن ہر دو خطوط میں ٹھیک پتا درج نہ ہونے سے فوری جواب میں تاخیر ہوئی - میں مبلغ ۶ روانہ کر رہا ہوں - آپ جس مناسب غرض کے لیے چاہیں صرف فرمائیں - میرے یہاں کوئی فوٹو کا بلاک نہیں ہے، البتہ رہبر دکن کے پاس میرا بلاک ہے - مولوی سید محمد صاحب چاہیں تو وہاں سے حاصل فرما سکتے ہیں - اب وقت بھی کم ہے اور میں زیادہ مصارف میں بھی پڑنا نہیں چاہتا اسلیے فوٹو اور بلاک کی علحدہ قیمت روانہ نہیں کی گئی - امید کہ آپ کی سالگرہ سے سال نو کا نمبر کامیاب ہوگا - مولوی محمد علی صاحب موسوی بھی تشریف لائے تھے ان سے بھی گفتگو ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ میری جانب سے یکصد سال نو کے مبارکبادی رقعے چھپوائے جا رہے ہیں - ان رقعوں کو مع بل کے روانہ کر دیجیے تو اسی وقت رقم کی ادائی ہو جائے گی فقط
مخلص میر اکبر علی خاں

(۲) مکرمی خان صاحب - تسلیم - میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجکو خانگی طور پر خلوص کے ساتھ میری غلطی پر توجہ دلائی - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی ہر طرح وقعت و عزت میرے نظروں میں ہے البتہ بعض اوقات ایسی سہو ہو جانا ممکن ہے - میرا تعلق منشا آپ کو تکلیف دینا یا کوئی نامناسب برتاؤ کرنا نہیں تھا، چونکے آپ کو رنج ہوا ہے مجکو بیحد افسوس ہے اور میں معافی چاہتا ہوں - میں انشاء اللہ ممکن کوشش کروں گا اپنے اختیار تمیزی کو جو آپ حضرات نے اپنی مہربانی سے مجکو استمال کا موقع دیا ہے - بہترا استمال کروں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کے لیے دعا کریں اور کوئی غلطی ہو بھی تو خلوص اور ہمدردی کے ساتھ منصفانا طریقے پر ظاہر کریں امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے -

مخلص میر اکبر علی خان

(۱) مہر علی فاضل - ناظم آرایش بلدا - ۲۴ر فروردی ۱۳۵۰ف

مکرمی خان صاحب - تسلیم - بصورت مجبوری میں یہ نوٹ آپ کو لکھ رہا ہوں - کار ہائے محرم میں کچھ ایسا اضافا ہو گیا ہے کہ باقی عملے سے اسکی وقت پر انجام دہی مشکل نظر آ رہی ہے - اور سخت چادر گھاٹ سے تعاون کی توقع نہیں - کیا آپ براہ مہربانی اپنے متعینا عملے کو کل سے تین یوم کے لیے روانا فرما دیں گے ۱۱ر محرم کو آپ کا عملا واپس کر دیا جاے گا - نیز یاقوت پورا کا کام بھی جاری ہو جاے گا فقط

آپ کا مہر علی فاضل

(۲) مکرمی خان صاحب - تسلیم - ۶ر۱ر ۱۳۵۱ف

آج شام کو میں افطار اور کھانے کی دعوت میں جا رہا ہوں اس وجہ سے افسوس ہے کہ گھر میں نہیں رہونگا - آپ کل سات بجے شب کے تشریف لائیں تو میں ممنون ہونگا فقط راقم مہر علی فاضل

محمد شاہ عالم خان صاحب سابق نایب میر مجلس بلدیا حیدراباد

برادرم جناب خان صاحب رکن بلدیا - السلام علیکم - ملتویا اجلاس کی تاریخ مقرر نہ ہونے میں بلدیا نہ آسکا - ۲۴ر امرداد کو میں بلدیا آ رہا ہوں اور ۳۱ر امرداد کے اجلاس تک بلدیا ہی میں رہونگا کیا آپ میرے مڈل کا تحریک امرداد کی اجلاس میں روانا فرماد یے، اگر روانا نہیں کی گئی ہے تو اس قدر تحریک کافی ہے کہ نایب میر مجلس کو مڈل دینے کے لیے مڈل تیار کرا کر جو خزانے نظامت بلدیا میں محفوظ رکھا گیا ہے وہ مڈل نایب میر مجلس کو روانا کر دیا جاے دیگرا فقط تاریخ ۲۰ر امرداد ۱۳۵۰ف - محمد شاہ عالم خان

سجاد مرزا صاحب سابق معتمد تعلیمات حیدراباد - جوبلی ہل ۲۶ ۵؍۵

مکرمی - تسلیم - رسالا اور عنایت نامہ یا شکایت نامہ کا شکریا - آپ کا غصا دور تبرا سر آنکھوں پر آپ نے شکایت کرتے وقت یہ فراموش کر دیا کہ جامعا کا جوبلی نمبر ہے - میں جامعا کی اعلا ترین کمیٹی کا رکن تھا ہوں اور وہاں سے یہ فرمایشی ایسے زمانے میں وصول ہوئی جبکے میں دو ماہ کی رخصت پر تھا - آپ کے حکم کی تعمیل کر تا رہا ہوں اگر آپ اسی عنوان پر مضمون کے طالب ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی خدمت میں بھی اسی نوعیت کی کوئی چیز پیش کی جاتی - جامعا کے حلقے میں جو وسیع تر ہے ایسی چیزیں پسند کی جاتیں - آپ کے یا حیدراباد کے حلقے میں تو ایسی چیز بدعت ہے - آپ نے اپنی ذرا نوازی سے اوار کے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا میں تو اپنے کو مستحق تصور نہیں کرتا - یہ آپ کی محبت کا نتیجا ہے - آپ کا اختلاف [illegible]

…ر میں تشریف لائے اور انتظار کر کے چلے گئے۔ معاف فرمایئے۔ سجاد مرزا

محمد بہادر علی خان صاحب یوزی بی اے سابق معتمد انجمن مہدویہ حیدرآباد چنچل گوڑہ

مکرمی محترمی - السلام علیکم - مولوی سید علی سید اللہ صاحب مرحوم نے مہدویہ بورڈنگ کے ذریعہ قوم کی جو خدمت کی ہے اس کو کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا ہم سب کا جنہوں نے اس بورڈنگ اور ان کے خدمات سے استفادہ کیا ہے فریضہ ہے کہ مرحوم کی یاد تازہ کرنے کے لیے یوم منائیں اس سلسلے میں جناب سے مشورت مقصود ہے بتاریخ ۹ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء روز شنبہ بوقت ۷ ½ بجے شام مرکزی انجمن مہدویہ پر تشریف لا کر اپنے قیمتی مشوروں سے استفادہ کا موقع دیں گے جس کے لیے میں جناب کا شکر گذار رہوں گا فقط محمد بہادر علی خان یوزی بی اے

محمد عارف خان صاحب زمیندار شہزاد پور - کراچی پاکستان - ۲۱ مئی سنہ ۱۹۶۰ء

بخدمت شریف حضرت بھائی صاحب قبلہ - بعد از قدمبوسی عرض ہے قسم ہم تمام بخیریت ہیں اور آپ کی خیریت کے متمنی ہیں دیگر یہ کہ عرصے دراز کے انتظار کے بعد سرفراز نامہ سرفراز ہوا جس کو دیکھ کر خیریت معلوم ہوئی اور ساتھ ہی بات سر کنے کے تفصیلات معلوم ہوئے خداوند عالم سے دعا ہے کہ آپ کو صحت عطا فرمائے دیگر یہ کہ بعد بقر عید برخوردار صدیق میاں کی شادی مقرر ہے براہ کرم آپ اس موقع پر کم از کم تشریف لا کر شرکت فرمائیں اور ہم سب کو خوش کریں تو بڑی نوازش ہوگی - امید کہ یہ موقع اچھا ہے کہ تبدیل آب ہوا بھی ہو جائے اور ہماری خوشی بھی ہو باقی حالات خیریت ہیں امید کرتا ہوں کہ مجھے تاریخ آمد کے تار سے یاد فرمائیں گے سب کی طرف سے قدمبوسی عرض ہے - حسب الحکم مکان والوں کو اور دوسرے بچوں کو مبارکباد پہنچا دی گئی - خدا حافظ -
خادم محمد عارف خان

محمد امیر علی خان صاحب سابق ممبر بورڈ آف ریو حیدرآباد - سردار باغ - چنچل گوڑہ - ۲۸ اردی بہشت ۱۳۵۵ف

(۱) برادر عزیزم سلمہ - السلام علیکم - آپ کے دو عنایت نامے وصول ہوئے - معافی چاہتا ہوں کہ اس سے قبل اس کا جواب ادا نہ ہو سکا - اس کی وجہ یہ تھی محلے میں غیر معمولی مصروفیت ہو گئی تھی جس کی تفصیلات غالباً معلوم ہو چکی ہوں گی اخبار وطن کی اجرائی کے متعلق دلی مبارکباد قبول فرمائیں - اردو زبان کا املا اس میں کوئی شک نہیں بعض اوقات حروف کے مطابق نہیں، لیکن یہ مسئلہ اس درجہ بنیادی ہے کہ اس میں ترمیم غور طلب ہے بہرحال آں برادر نے جو مہم شروع کی ہے اس کو جاری رکھنا مناسب ہے - اخبار وطن ملکیت آپ کا ہے اور اس میں کسی کو دخل نہیں، البتہ ہم سب کی دعا ہے کہ اس کے ذریعے آں برادر اور مالک و ملک کی حقیقی خدمت فرمائیں - آں برادر کی صلاحیت سے امید ہے کہ بفضلہ اس میں کامیابی ہوگی - محمد امیر علی خان

(۲) ۲۷ اسفندار ۱۳۴۸ف - مائی ڈیر خان صاحب تسلیم
میرے سکونتی مکان سے متصلاً کوچے کی حالت صفائی قابل اطمینان نہیں - براہ کرم اس کی صفائی کے لیے توجہ فرمائی جائے تو مناسب ہے - امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے - مخلص محمد امیر علی خاں

محمد حبیب الرحمان صاحب معتمد انجمن ترقی اردو - ۴ مارچ سنہ ۱۹۵۳ء

(۱) مکرمی - السلام علیکم - مبلغ چھ روپے بابت چندہ سالانہ رسالہ "ہندستانی ادب" مرسل خدمت ہیں رسید سے ایما فرمایا جائے - ارسال چندے میں قدرے دیر ہو گئی جس کا افسوس ہے فقط
حبیب الرحمان

(۲) ۹ر اپریل ۱۹۵۳ء ۔ مکرمی۔ السلام علیکم ۔ آپ کا مراسلہ مورخہ ۳ر اپریل ۱۹۵۳ء وصول ہوا اس سے پہلے بھی آپ نے جو اپیل بھیجی تھی وہ بھی مجھے مل گئی تھی ۔ مگر میں نے خاموشی اختیار کی اس لیے کہ خود کو اس موقف میں نہیں پایا کہ اپیل کا کوئی تشفی بخش جواب دے سکوں ۔ بھائی صاحب ! جن "بے حس لوگوں" کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ۔ مجھے بھی حقیقت میں انہیں سے سابقا ہے ۔ کامل تین برس کی ذاتی کوششوں اور کاوشوں کے بعد میں صرف سوا سو اصحاب کو رکن بننے پر مائل کر سکا ۔ اور ان میں بھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو محض میری مروت ، دوستی و تعلقات کی بنا پر انجمن سے بندھے ہوئے ہیں ۔ ورنہ کبھی کے علحدہ ہو جاتے ۔ نتیجا یہ ہے کہ انجمن کے وسایل بے حد قلیل ہے اتنے قلیل کہ دوسروں سے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور شرم اس لیے آتی ہے کہ ہم دوسری طرف اردو کا دم بھرتے اور اس کا دکھڑا رونے میں بڑے پیش پیش نظر آتے ہیں ۔ بہر حال اس دکھڑے کو کہاں تک بیان کیا جائے ۔ مختصر یہ ہے کہ انجمن سردست اس قابل نہیں ہے کہ مزید اخبارات و رسایل خرید کر دارالمطالعوں کو دے سکے ' اور یہی وجہ تھی کہ میں آپ کو کوئی امید افزا جواب نہ دے سکا ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بے بسی کو محسوس فرمائیں گے ۔ خاص کر اس لیے بھی کہ آپ خود اس کو ایک مدت سے بھگت رہے ہیں ۔ ہو سکے تو مارچ ۱۹۵۳ء کا ایک اور پرچا بھیج دیجیے جس میں "ہمارے خیالات" کے تحت " آل انڈیا کانگریس اور ہندستانی" پر بڑا اچھا مضمون آپ نے قلم بند کیا ہے ۔ یہ پرچا قاضی عبدالغفار صاحب کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں شاید ان کے کچھ کام آجائے ۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے ۔ حبیب الرحمان

ڈاکٹر جعفر حسین صاحب سابق پروفیسر عمرانیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۔ ۸ر نومبر ۱۹۴۱ء

(۱) خان صاحب ، تسلیم ۔ آپ کا کارڈ تو وصول ہوا گذشتہ مضمون کی بے رحمانہ جراحی کے بعد یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ آپ مجھ سے ایک اور مضمون کی توقع رکھ رہے ہیں ۔ آپ نے جو موضوع تجویز کیا ہے اس پر میں ہر سال بہت کچھ پڑھتا رہتا ہوں اور تھوڑا بہت لکھتا بھی ہوں ۔ میرے لیے زیادہ مشکل بھی نہ تھا اور دلچسپی کا باعث بھی ہوتا کہ مقامی (ادبی اور دفتری) زبان کی روشنی میں ہندستان کی عام زبان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا ، مگر مجھے آپ سے یہ سخت شکایت ہے کہ آپ نے باوجود وعدے کے میرا مضمون پورے کا پورا شایع کرنا تو درکنار سلسلے سے بھی شایع نہیں کیا حالانکہ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ " میں پروفیسروں کے مضمون کو سید الکاتب کے حوالے کرتا ہوں ۔" میں نے کہا بھی تھا کہ میں پروفیسر نہیں ہوں صرف ریڈر ہوں ، مگر آپ کے اطمینان دلانے پر میں نے اپنا مضمون آپ کے حوالے کیا تھا ۔ اسی قسم کی ناقدری آپ سے پہلے اور مقامی ایڈیٹروں نے کی تھی ۔ میری سمجھ میں واقعی نہیں آتا کہ لوگ کیوں خواہ مخواہ اصرار سے مضمون مانگتے ہیں اور پھر بغیر لکھنے والے کی رائے دریافت کیے اس کی "تکا بوٹی" کرتے ہیں یا چھاپتے ہی نہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا یہ کسی خاص قسم کا مذاق ہے ؟ یا میں نے کسی کا کچھ بگاڑا ہے کہ وہ عزت افزائی کے بہانے دل آزاری کرتے ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ نے انجمن ترقی اردو اور خاص کر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کی شان میں ایک دل آزار تحریر کو نقل کرنا ضروری سمجھا اور اپنی طرف سے بھی نوٹ لکھا تو میری کیا حقیقت ہو سکتی ہے ؟ ملک و قوم کے پڑھے لکھے نوجوانوں سے کیا اتنی بھی توقع بیجا ہے کہ وہ علم و ادب نہ سہی عمر ہی کا لحاظ کرتے ؟ ہندستان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مشرقی تہذیب سے ہٹتا ہوا دیکھ کر جتنا قلق ہوتا ہے اس کا وہی اندازا کر سکتا ہے جسے اپنی تہذیب سے سچا لگاو ہے ۔ زیادہ کیا لکھوں ، اگر دعا و ں میں یقین ہوتا تو دعا کرتا کہ آپ کو بھی نیک اور صحیح خیالات کی توفیق ہو ۔ آپ جس سے جس قدر چاہیں اختلاف کریں سخت سے سخت تنقید لکھیں ، مگر بے غیرت اور بے دلیل تحریروں سے دل آزاری کرنا اور

ن کا پاس ادب نہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں فقط جعفر حسین

(۱) جناب منیجر صاحب "ہندستانی ادب" تسلیم - آپ کا بل نمبر ۷۶ رقمی نے اور "ہندستانی ادب"
ول ہوا - میں نے یہ رسالہ طلب نہیں کیا تھا - اس لیے بل کے ساتھ ہی واپس کر رہا ہوں - ہر شخص اپنے
ات سے واقف ہے - مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی خریداری قبول کرنے سے مجبور ہوں - اپنے مضمون
علم سے متعلق رسالے اور اخبار پڑھنے کا ہی موقع نہیں ملتا، اس لیے رسالہ نہ بھیجیں تو مہربانی ہوگی فقط
جعفر حسین ۹ مئی ۱۹۵۳ء

ڈاکٹر سلام سندیلوی ام ال ال بی پروفیسر دلی کالج ۲۴ اگست ۱۹۵۸ء

محترمی عالیجناب جی - ام - خان صاحب - السلام علیک - مزاج گرامی
تقریباً چھ ماہ ہوئے جب میں نے آپ کی خدمت میں خط روانہ کیا تھا - اس کے جواب سے محروم رہا -
س کے بعد خط بھیجنے کی جرات نہ کی - بہرحال آپ کی خیریت مولانا انقر موہانی سے معلوم ہوتی رہتی ہے - میں آج تک
سمجھ سکا کہ آخر آپ کس بات پر مجھ سے ناراض ہیں - خط و کتابت میں تاخیر کا ہونا عدیم الفرصتی کی بنا پر ہے
س کا شکار آج کے مادی دور میں ہر انسان ہے - اور آپ بھی ہیں - بہرحال اگر کوئی خاص وجہ باعث کبیدہ خاطری
ہو تو مطلع فرمایئے تو میں آپ سے معذرت کے لیے تیار ہوں - میری عادت خواہ مخواہ بگڑنے کی نہیں ہے کیونکہ
میں صلح جو ہوں - آپ سے تقریباً ۱۵ سال کے قدیمی تعلقات ہیں - میں نہیں چاہتا کہ یہ تعلقات ختم ہو جائیں - ویسے
آپ کی جیسی مرضی ہو - ایک غیر مطبوعہ مضمون "رباعی کے بجائے قطعات کا رواج" روانہ کر رہا ہوں - امید ہے کہ کسی
قریبی اشاعت میں شایع کر کے ممنون فرمائے گا - اپنی صحت سے مطلع فرمایئے - میں اور میری چھوٹی بہن اور بیوی خیریت سے
ہیں - چھوٹی بہن سسرال میں سندیلہ میں ہے - بیگم صاحبہ آپ کو آداب کہتی ہیں فقط نیاز کیش - سلام سندیلوی

حسینی شاہد صاحب ام اے عثمانیہ پرنسپل اردو کالج حیدرآباد - ۲۸ جولائی ۱۹۴۶ء

محترم - تسلیم - کرم نامہ ملا - یاد فرمائی کا شکریہ - صحافتی اصول اور اخلاقی پابندیوں سے ادارے "رباب" باخبر ہے - نظم
خدنگ کاوش صاحب نے بھجوائی تھی - مسودہ دفتر میں موجود ہے - ادارے کو اس کا علم نہ تھا کہ یہ نظم شایع شدہ ہے - اس سلسلے
میں آپ خدنگ کاوش صاحب سے مراسلت فرما سکتے ہیں - نظم کا مسودہ ہمارے ہاں موجود ہے چاہیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں -
امید کہ گاہ گاہ سے یاد فرمایا جائے گا - نایب مدیر حسینی شاہد

ماسٹر جگت سنگھ صاحب ایڈیٹر رہنمائے تعلیم" لاہور، رام گلی ۲۳ دسمبر ۱۹۴۵ء

جناب من - نوازش فرمائے بندہ - آداب عرض - کارڈ گرامی ملا - شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اب آپ کی طبیعت رو بصحت
ہے - اور زخم مندمل ہو رہے ہیں - خدائے بزرگ آپ کو جلد تر آرام کلی دے اور ہر طرح سے خیریت بخشے ! مضمون ارسال
کر رہا ہوں - اسے چھاپ دیجیے - لاہور سے نانک سنگھ کا مختصر حال آپ نے "ہندستانی ادب" میں چھاپ کر مجھے ممنون
فرمایا - اب میں چاہتا ہوں کہ نانک سنگھ میں رہ کر میں نے اہل نگر گردوارا سے متعلق دیگر مقامات تاریخی اور استانوں کا
جو ذکر اذکار اپنے رسالے میں شایع کیا تھا وہ بھی آپ نکالدیں گے یا نہیں ؟ وہ حالات دلچسپ کافی ہیں - اگر اجازت
دیں تو میں وہ رسالہ آپ کی خدمت میں بھیجدونگا آپ اسے ملاحظہ کر کے جو جو حصہ اسکے اندر قابل اخراج ہو اسے خارج
کر دیجیے اور باقی حصہ چھپوا دیجیے اس سے یہ فایدہ ہوگا کہ جن ہندو سکھ اور مسلمان اصحاب نے میرے دورے کا حال
اب تک وہ پڑھا ہے وہ اس متعلقہ مضمون کو بھی پڑھ لیں تاکہ زائر کبھی نہ کبھی وقت وہ ان حالات سے مستفید ہو سکیں
مضمون رسالہ تعلیم ماہ ستمبر ۱۹۴۴ء میں شایع ہوا تھا اگر وہ رسالہ آپ کے ہاں موجود ہو تو بہادر دنا میں حکم آنے پر
بھیجدوں گا - اس مضمون کے چھپ جانے کے بعد آپ کے خریدار بہت محظوظ ہونگے بالخصوص سکھ لوگ

آپ کے شکر گذار ہونگے۔ محرم ختم ہوے امید کہ آپ دفتر نظامت تعلیمات میں کسی وقت جاکر میرا کام کردیں گے
آج کل موسم میں حد درجے کی خنکی ہے - سردی کافی زوروں پر ہے۔ بارش نہیں ہوئی مگر اس بڑھتی ہوئی خنکی
کی وجہ کسی قدر گرد و نواح میں اولے پڑنے کی صورت نظر آتی ہے - میری طبیعت اچھی ہے - سب سارا دن گھر
میں چارپائی پر پڑا رہتا ہوں یا بیٹھا ڈاک واک کی دیکھ بھال کر لیا کرتا ہوں - بچے دفتر سے آکر دفتر رسالے
کا تھوڑا بہت کام کرتے رہتے ہیں - دونوں بڑے بچے آداب گذار ہیں اور خیریت ہے۔ کرمی شیخ صاحب
ملیں تو سلام عرض ہو - آپ کا جگت سنگھ

اشفاق حسین صاحب ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو

برادرم جناب خان صاحب - ہندستانی ادب پہنچا - شکریا قبول کیجیے - ابتدا اچھی ہے - خدا کرے یہ دن
دگنی ترقی کرے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے خلوص اور جوشِ عمل سے یہ ترقی ہی کرتا رہے گا - آپ کا کارڈ
بھی ملا - ایک ریڈیائی افسانہ ادھوری کہانی بھیج رہا ہوں - اگر آپ مناسب سمجھیں تو نشرگاہ اورنگ آباد
اچھی اور معیاری نشر شدا تقریریں بھی ہندستانی ادب کے لیے بھیج جا سکتی ہے - والسلام - آپکا اشفاق

منظور حسین صاحب شور علیگ سابق پروفیسر ناگپور یونیورسٹی

مکرمی - تسلیم - نظم "نوائے وقت" ارسال خدمت کر رہا ہوں - والسلام - ۸/ فروری ۱۹۴۴ء

مخلص - منظور حسین شور (علیگ)

میکش حیدر آبادی

ڈیر خان صاحب - آپ کا پہلا عنایت نامہ بھی اور یہ بھی - میں بہت جلد مضمون اور نظم روانہ کروں گا - میر حسن اور
ظفر سے بھی لکھوا کر بھیجو گا - اور ہاں آپ چاہیں تو اچھی نشر شدہ تقریر پر بھی چھاپ سکتے ہیں - کبھی ممکن ہو تو
آپ ضرور ملیے - اس سلسلے میں گفتگو بہتر ہوگی - آپ کا مرسلا اشتہار میں "سب رس" کے دفتر پر بھیج رہا ہوں
اس خواہش کے ساتھ کہ وہ ضرور چھاپیں - آپ کا میکش

نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکیٹکٹ حکومت حیدرآباد - برکت پورہ - ۳۱/ اکتوبر ۱۹۵۵ء

کرمی جناب جی - ایم - خان صاحب ایڈیٹر "ہندستانی ادب" تسلیم - آپ کا مکتوب ۱۲۴ مورخہ ۲/ ستمبر
۱۹۵۵ء مع اپیل امداد ملا - آپ کی اپیل پر غور کیا گیا - آپ نے جو حالات ظاہر کیے وہ قابل لحاظ ضرور پائے
گئے مگر مجھے افسوس ہے کہ قواعد ٹرسٹ کے لحاظ سے کوئی گنجائش ایسی نہیں ہے کہ آپ کے پرچے کی مالی اعانت کی جائے
اگر آئندہ کوئی صورت نکل آئے تو اس بارے میں حتی الامکان سعی کی جائے گی فقط زین یار جنگ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پروفیسر دلی یونیورسٹی - ار مئی ۱۹۶۰ء

(۱) جناب خان صاحب - تسلیمات - آپ کے بھجوائے ہوئے "ہندستانی ادب" کے تینوں پرچے ملے۔
شکر نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو - امید ہے آپ کے لطف و کرم کا یہ سلسلا جاری رہے گا - آپ اس
دور میں "ہندستانی" کی جو خدمت کر رہے ہیں، دوسروں کے لیے لائق رشک اور قابل تقلید ہے - خدا آپ کو
توفیق دے اور آپ کی لگن میں کبھی فرق نہ آئے -

نیاز مند گوپی چند نارنگ

(۲) ۱۲ ستمبر ۱۹۶۰ء محبی جی - ام، خان - تسلیمات - آپ کے ۱۶ اگست اور ۱۵ جون کے نوازش نامے موصول ہوئے تھے افسوس کہ ان دنوں میں دلی سے باہر تھا اس لیے جواب دینے میں تاخیر ہوئی - آپ نے اشتہاروں کے بارے میں لکھا ہے - میں نے متعلقہ افسران سے بات چیت کی ہے - معلوم ہوا ہے کہ "ہندستانی ادب" کی تعداد اشاعت بہت کم ہے، اور ہماری اشتہار فقط ان رسالوں کو ملتے ہیں جن کی اشاعت کم از کم ایک ہزار سے زاید ہو - نیا فارم آپ کو بھیج رہا ہوں - اسے بھر کے دفتر کو بھیجیے اور ان سے انگریزی میں خط و کتابت کیجیے - خدا نے چاہا تو کام بن جائے گا - ادھر دو مہینوں سے آپ کے رسالے کی زیارت نہیں ہوئی! میرا ایک مضمون "رادھا اور کرشن کی تمثیل" پر اور دوسرا میر تقی میر کی "مثنوی مور نامہ" پر بالترتیب رسالہ آج کل "روشنی" اردو اور رسالہ آہ نو کراچی میں شائع ہو چکے ہیں - اگر پسند آئیں تو آپ بھی انہیں "ہندستانی ادب" میں شامل کیجیے - نیازمند گوپی چند نارنگ

تمکین کاظمی صاحب ایڈیٹر "الدنیا" ماہوار حیدرآباد - ۸/جولائی ۱۹۵۵ء

برادر کرم! آپ کو اور دوسرے بھائیوں کو بہت شکایت تھی کہ میں حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کے متعلق بہت کم لکھتا ہوں لیجیے میں ایک سلسلہ "شخصیات" کا شروع کر رہا ہوں، یہ شخصی خاکے بالکل ذاتی خاکے ہیں اور میں انہیں نہایت ایمانداری سے مرتب کر رہا ہوں، انشاء اللہ شاہیر ہند و دکن سے متعلق سب کے خاکے لکھتا ہوں، پہلی قسط حاضر ہے - سردار نواز جنگ پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا اور نہ آیندہ کوئی اٹھائے گا، دیکھیے احباب اسے پسند کرتے ہیں یا نہیں، میں نے بلا کم و کاست صحیح واقعات پیش کیے ہیں اگر احباب کو یہ طرز پسند آئے تو دوسرے خاکے بھی پیش کروں گا اس کے متعلق اپنی اور احباب کی رائے شایع فرمایئے فقط تمکین کاظمی

(۲) برادر کرم! تحیۂ مسنون - حامل ہذا نور الحق سلمہ میرے عزیز ہیں، انہوں نے بمبئی میں آپریٹنگ سیکھی ہے اور ایک سینما میں آپریٹر کی حیثیت سے کام بھی کیا ہے - بھائی سید محمود صاحب سے چونکہ مدت سے نیاز حاصل نہیں ہوا اس لیے میں بالراست سید صاحب موصوف کو مخاطب کرتے ہوئے ڈر رہا ہوں کہ کہیں وہ بھول نہ گئے ہوں لہٰذا مستدعی ہوں کہ آپ از راہ کرم سید محمود صاحب سے میری طرف سے عزیز موصوف کو ملا دیں اور فرمائیں کہ اپنے سینماؤں میں سے کسی ایک میں ان کو رکھ لیں تو بڑی عنایت سرفرازی بندہ نوازی کرم بخشی مہربانی وغیرہ وغیرہ ہوگی - زیادہ کیا عرض کروں - آپکا تمکین کاظمی

(۳) بلاحظہ جناب جی - ام، خان صاحب مدلطفہ مدیر "ہندستانی ادب" وغیرہ
برادرم کرم - تسلیم - مجھے ٹرائی کلر بلاک کی ضرورت ہے براہ نوازش حامل ہذا کے ذریعے روانہ فرمایئے تو عنایت ہوگی - امید ہے کہ آپ خیریت سے ہونگے - آپکا تمکین کاظمی - ۲۶/۶ ۱۹۵۲ء

علی احمد صاحب ام - اے سابق پرنسپل محبوب نگر کالج حیدرآباد - ۲۸ امرداد ۱۳۵۵ف

(۱) جناب خان صاحب السلام علیکم - طویل انتظار کے بعد جلیل نمبر ملا لیکن اس کو دیکھنے کے بعد اب اگر میں تاخیر اشاعت کا شکوا کروں تو بیجا نہ ہوگا - ضخامت، تعداد مضامین اور حسن ترتیب کو دیکھ کر آپ کی محنت و کاوش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے - حصۂ نظم، حصے نثر سے زیادہ ہے اور ایک شاعر کے لیے یہی ہونا چاہیے تھا - نثر کا حصہ اگر مختصر ہے لیکن اتنا جامع کہ شاید ہی جلیل کی زندگی کا کوئی پہلو چھوٹا ہو - ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ صوری محاسن بھی موجود ہیں - میں اس کامیابی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں جلیل نمبر کی ایک کاپی میں شمالی ہند کے ایک صاحب کو بھیجنا چاہتا ہوں - اگر آپ کے پاس کوئی کاپی زاید ہو تو بھجوا دیجیے - میں انہیں پوسٹ کر دونگا - امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے -
نیازمند علی احمد

(۲) مکرمی خان صاحب - سلام نیاز - افسانہ نمبر ملگیا - ابھی اس کا لطف اٹھا ہی رہا تھا کہ آپ کا عنایت نامہ ملا - افسانہ نمبر بحیثیت مجموعی نہایت خوب اور جامع ہے - اس کی خوبیوں نے تاخیر کی تلخیوں کو زائل کر دیا - افسانہ [illegible] ایسا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے - والد صاحب کے کلام کے متعلق میں نے عزیز احمد صاحب کو لکھ دیا ہے وہ آپ کے پاس بھیجدیں گے - آیندہ شمارا کے لیے ایک نظم جو درس میں ہے بھیجتا ہوں - میرا خیال ہے کہ آپ اس "ترقی پسند عنصر" کے خلاف نہ ہوں گے - امید کہ آپ مع الخیر ہوں - براہ کرم میرے نام کے ساتھ ڈپٹی ایڈیٹر کمیں کیونکے میں اسے کوئی ڈگری نہیں سمجھتا - نیاز آگیں علی احمد ۲۹ / خرداد ۱۳۵۴ف

آصف جہاں بیگم صاحبہ ناز بلگرامی حیدرآباد ۴ - ۱۰ - ۱۳۷۱ف یکشنبا

(۱) محترمی - سلام مسنون - "ہندستانی ادب" کے لیے مضمون روانہ خدمت ہے شایع کر کے ممنون فرمایئے -

آصف جہاں بیگم بلگرامی

(۲) برادر گرامی قدر - السلام علیکم - یہ آپ بیتی ہے جو مضمون کی شکل میں یا ایک افسانے کی صورت میں بھیجی جا رہی ہے آپ مناسب سمجھیں تو چھاپ دیجیے ورنہ واپس فرمایئے - ہاں براہ کرم جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے میرے مضامین غور سے دیکھا کیجیے اور آپ زبان - محاورے بلکے اگر ضرورت ہو تو پلاٹ تک بدل سکتے ہیں میں نے آپ کو اپنی جانب سے ہر طرح مجاز گردانا ہے' اگر آپ پسند کریں تو میں محرم کے متعلق بھی ایک مضمون دینا چاہتی ہوں جو ادھورا ہے اس میں نہ مذہبی باتیں ہیں نہ کسی جذبات پر حملہ نہ کوئی اور ایسی بات گر پھر بھی خدا جانے - آپ کا اور پڑھنے والوں کا کیا خیال ہو ؟ اچھا خدا حافظ - خدا کرے آپ مع متعلقین بلکل بخیر و عافیت ہوں - اگر آپ میرا افسانہ بھی شایع کرنا چاہیں تو "فضا بیگم" حیدرآباد کے نام سے کیجیے اور ہاں میں زنانہ کالج کی لکچرر بھی ہوں بلکے [illegible] گرلز اسکول کی ہوں جو توپ کے سانچے میں ہے - صاف کرنے کی مہلت نہیں ملی ذرا توجہ سے کاپی کروائیے شعر اور شاعری میں ضمین غالب کے اشعار میں غلطی ہوئی ہے - "تف نالا" ہونا چاہیے تھا - آپکی بہن آصف جہاں

کراشن نیکوف ریسرچ اسکالر عثمانیا یونیورسٹی حیدرآباد - ۲۲ / جنوری ۱۹۵۹ء

محترم جی - ام' خاں صاحب ! مجھے آپ کی چٹھی مل گئی ہے' اگر آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو کل دوپہر کے وقت میرے بنگلا نمبر ۳ (یونیورسٹی کیمپس) تشریف لائیے ! آپ کا کراشن نیکوف

ام - سی - مونا اطالوی طالبا روم

محترم - تسلیم - معاف کیجیے کہ اب تک میں نے آپ کے مہربان خط کا جواب نہیں بھیجا ہے اور آپ کے رسالے بھیجنے کے لیے آپ کا شکریا نہیں کیا ہے - مجھکو بہت کام کرنا پڑا جس کو میں ملتوی نہیں کر سکی اور اردو میں خط لکھنا میرے لیے ایک طول گو خشگوار بات ہے - اس کے سوا آپ نے چھوٹے حرف خط کے آخر میں میرے لیے کچھ نہ کچھ مشکل تھے اور میں میرے نئے استاد کی آمد کا انتظار کرنا چاہتی تھی تا کے وہ مجھکو کچھ مدد کرے - آپ کے رسالے کی ایک ایسی تعداد دیکھ کر میں بہت خوش اور حیران بھی تھی - مجھکو ان سب رسالے بھیجنا آپ کی بڑی مہربانی کی بات ہے اور آپ کا بڑا شکریا کرتی ہوں - رسالے بہت دلچسپ ہیں اور مجھکو ایک طول عرصے تک پڑھنے کا مضمون میرا پڑھنا تو ابھی تک کچھ نہ کچھ آہستا ہے - میں نثر اچھی طرح سے پڑھ سکتی ہوں - نظم ابھی تک تھوڑی سی مشکل لیکن مجھ امید ہے کہ میں اس میں بھی ترقی کر سکونگی - آپ کے رسالے کی لکھائی آزادی اصلاح پر ہونا ایک دلچسپی کی بات ہے - مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر ایک درست صلاح دینے کے لیے میں [illegible] سے نہیں جانتی ہوں لیکن تیسرے سال کے لیے انگریزی زبان کا مطالعہ کر کے میں اچھی طرح سے [illegible]

... اور تلفظ الگ الگ ہونے سے نکالتی ہیں۔ آپ کے الفاظ "یہ رسالا ہندی اور اردو زبان کا قائل ... ہے" مجکو بہت پسند ہیں - میرے خیال میں اختلاف کی تلاش کرنے سے توحید کی تلاش کرنا بہتر ہے - ... پینتالیس سال کے ہیں ایک High School میں انگریزی زبان کی استاد تھی لیکن اب مجکو یہ کام پسند ہے اور مجھے ایک سال کی چھٹی ہے جس میں زبانیں کا مطالعہ کرنے کا ارادا ہے - وہ مجکو بہت پسند ہے - سمندر کے رہ میں آپ کی خدمت سے ایک تقویم بھیج رہی ہوں جس میں ہالینڈ کی تصویریں ہیں حالانکہ آپ کے چھپنے ہمارے ہینوں سے اور ہیں امید ہے کہ آپ کو یہ تصویریں پسند ہوں گی - آپ کا خط میری ان کے پتے پر پہنچا، مگر میرا ہی پتا یہ ہے -

DANCKERTSSTRAAT 22.
THE HAGUE.

والسلام
ام - سجا مونا

عاتق شاہ صاحب افسانہ نگار حیدرآباد

کرمی ایڈیٹر صاحب - تسلیم - یہ شاید پہلا اتفاق ہے کہ جویں "اشارے" کے نام سے ایک افسانا بھیج رہا ہوں - بہت ممکن ہے کہ آپ کے مقاصد میں پورا اتر سکے - مستقل طور پر آپ کے پرچے میں افسانے لکھنے کا خیال ایک زمانے سے ہے، لیکن کالج کی مصروفیات اس خیال سے باز رکھا اور اب ایک حد تک اس قید وبند سے آزاد ہوں - اس خصوص میں آپ کی رائے معلوم کرنے کا جذبا کس حد تک روا ہے شاید اس کے اظہار کی ضرورت نہیں - بہر حال مجھے اس بات کا ضرور انتظار رہے گا کہ آپ کی رائے معلوم کروں، اور مجھے امید ہے کہ جناب زیادا انتظار میں نہ رکھیں گے - "خط بیرنگ ڈالا جا سکتا ہے -
عاتق - حسینی علم - جلال کوچہ - مکان ۶-۲-۲

مجیب صاحب خیرابادی شاعر حال ساکن کراچی پاکستان

کرم فرمائے محترم خان صاحب - السلام علیکم - امید کہ مزاج بعافیت ہوں گے - مجھے ندامت ہے کہ بعض وجوہات اور کچھ بخار رفرا آجانے کی وجہ سے اس عرصے میں ملاقات نہ کرسکا آپ سے نظم جلد دینے کا وعدا کیا تھا لیکن کچھ دیر ہو ہی گئی معاف فرمائے گا - نظم عنبر حامل ہذا کے بدست روانا فرماد یجیے اور آپ کی امانت خد میں ہی ہے لیکر کسی وقت حاضر خدمت ہوں گا - نیز اپنی خیریت سے اور نظموں کی رسید سے براہ کرم ایما فرمایئے
ناچیز مجیب خیرابادی

محمد نعمت اللہ خان صاحب صوفی صوفی منزل - محلا چنچل گوڑا حیدرآباد - ۲۴ مئی ۱۹۵۲ء

(۱) محترم بندا! السلام علیکم رحمۃ اللہ برکاتہ - امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے - مسلسل سفر اور حیدرآباد سے باہر رہنے کی وجہ ملاقات نہ ہوسکی - انشا اللہ حاضر خدمت ہونگا - اس وقت ایک زحمت دے رہا ہوں وہ کہ حامل نامہ شیخ حسین صاحب صدیقی میرے عزیز دوست کے بھائی ہیں اور میرے بھی دوست ہیں زمانے کے ہاتھوں پریشان حال ہیں - معلوم ہوا ہے کہ خزانے عامرا میں سیکل اسٹانڈ کا ٹھیکا ابھی خالی ہے کسی کو نہیں دیا گیا ہے، اگر انہیں مل جائے تو ایک گونا پریشانی میں کمی ہو جائے - یہ ٹھیکا جناب مددگار صاحب (۲) عامرا جناب ... صاحب کا اختیاری ہے جو آپ کے دوست اور پڑوسی ہیں - براہ کرم موصوف ان کی سفارش فرماکر وہ ٹھیکا انہیں دلواکر دستگیری فرمائی جائے تو میرے لیے باعث منت ہوگا - امید کہ ... عاجلانا توجہ فرماکر ممنون فرمایا جائے گا -
آپ کا صوفی

(۲) کرم فرما ! السلام علیکم رحمۃ اللہ برکاتہ بتاریخ ۵ر ڈسمبر ۱۹۵۱ء بروز چہارشنبہ بوقت شب غریب خانے پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماکر میرے ہمراہ چاے نوش فرمایئے ۔ میں اس بات کا بھی عرض کردوں کہ اس میں آپ سے شخصی طور پر انتخابات کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ یہ کوئی اشتہاری مضمون و تحریر نہیں ہے، بلکہ صرف ایک شخصی تبادلۂ خیال ہوگا ۔ اس موقع پر صرف آپ اور مولوی فراست علی صاحب مولوی اقبال حسین صاحب اور مولوی محی الدین احمد صاحب مولوی جی ۔ ام، خان صاحب ، مولوی دولت صاحب شریک ہونگے ۔ امید کہ جناب ضرور تشریف لاکر ممنون فرمایا جاے گا فقط آپکا نیازمند صدیق

عنایت اللہ خان صاحب سابق پرنسپل ہائی اسکول دلی

۲۸ر۴ر ۱۹۴۴ء

محترمی ! السلام علیکم ۔ میں نے آپکا رسالہ " ہندستانی ادب " پڑھا ۔ واقعی کیا خوب رسالہ ہے کہ جی طبیعت باغ باغ ہوگئی اور لٹریچر کے لحاظ سے یہ اپنا نظیر نہیں رکھتا ۔ میں نے آپ کے کہنے کے مطابق پانچ اس کا چندا بھیج دیا ہے ۔ امید ہے کہ آپ نے وصول کر لیا ہوگا ۔ اچھا اب بھی ملاقات ہوگی ۔ خدا حافظ

آپ کا خیرخواہ عنایت اللہ خان

کرشن چندر صاحب مشہور افسانا نگار

۱۸ر ۶ر ۱۹۴۴ء

محترمی ! تسلیم و نیاز ۔ آپ یقیناً مجھ سے بے حد خفا ہوں گے ۔ لیکن پیشتر اسکے کہ آپ مجھے اپنے آنے والے خط میں گالیاں دیں میں بہ عجلت تمام آپ کو یہ خط تحریر کر رہا ہوں ۔ مجھے آپ کے پانچوں خط مل گئے تھے تاخیر کی بہت سی وجہیں تھیں جنہیں یہاں بیان کردینے سے آپ کو یا مجھے کوئی خاص فایدہ نہ ہوگا ۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کو خط کے ساتھ ہی افسانا بھی بھیج دوں ۔ آج تک ایسا نہ ہوسکا ۔ اس لیے یہ خط لکھ کر معذرت خواہ ہوں ۔ غالباً افسانا نمبر میں شریک نہ ہوسکیگا ۔ لیکن اگر آپ تین چار ماہ کی مزید مہلت مجھے بخش دیں تو ممکن ہے کہ میں آپ کی کوئی خدمت کرسکوں ۔ یہ امر میرے لیے موجب راحت بھی ہوگا کیونکہ حیدرآباد جس تن دہی سے اردو کی خدمت کر رہا ہے اس کے لیے میں اور کیا ہدیہ اخلاص پیش کرسکتا ہوں !

خاکسار کرشن چندر

سید سعداللہ قادری سابق اڈیٹر روزنامہ "سلطنت" حیدرآباد

(۱) محترمی ! تسلیم ۔ ایک صاحب نے میرے شدید اصرار پر آپ کے رسالے کے لیے مضمون تحریر فرمایا ۔ یہ مضمون میں نے پڑھا ہے ۔ نہایت اچھا ادبی اعتبار سے بلند ہے اور ہر طبقے کے لوگ پسند کریں گے ۔ میں نے ان صاحبہ سے اسی اشاعت میں شایع کروا دینے کے وعدے سے وہ مضمون حاصل کیا ہے ۔ اب کی اشاعت میں آنا ضروری ہے کیا آپ کے اس ماہ کے پرچے میں گنجایش ہے ؟ اگر نہیں ہے تو کوئی مضمون روک کر اس کے لیے جگہ نکالیے ۔ وہ بہت اچھا لکھتی ہیں ۔ اگر اس دفعا حسب وعدہ مضمون شایع کر دیا گیا تو آگے اچھے اچھے مضامین لکھیں گی ۔ مطلع فرمایئے کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں ؟ مجھے امید ہے کہ آپ اس بارے میں نفی میں جواب نہ دیں گے ۔ امید آپ کے مزاج بخیریت ہوں گے ۔ مخلص سید سعداللہ قادری

(۲) محترمی خان صاحب ۔ تسلیم ! میرے عزیز ترین دوست اور رسالے قلم کے شریک مدیر منظر حسین رضوی نے میرے اصرار پر " ہندستانی ادب " کے لیے ایک مضمون بعنوان (بیٹ) تحریر فرمایا ہے جو ساتھ بھیج رہا ہوں ۔ شایع فرماکر ممنون فرمایے ۔ رفیعہ سلطانہ صاحبہ کا مضمون جس کا تذکرہ میں نے آپ سے کیا تھا انشاء اللہ دو تین دن بعد روانا کردوں گا ۔ وہ چند دنوں کے لیے گلبرگہ گئیں ہیں ۔ ان سے مضمون لے کے بھیجوں گا

دیکھیے ورنہ وہ مجھ پر ناراض ہونگی - "ہندستانی ادب" کے متعلق کوئی خاص اطلاع ہو تو تحریر کیجیے، تاکہ علم کی زیر ترتیب اشاعت میں شایع کی جاسکے - جواب سے مطلع فرمایئے - امید کہ آپ بخیریت ہوں گے -

مخلص سید سعد اللہ قادری ۱۲/۲ ۱۳۵۰ف

(۴) محترمی، خان صاحب - برادرم مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب کی شادی کا رقعہ روانہ خدمت ہے - آپ دعوت میں مقررہ وقت پر ضرور تشریف لائیں - میں وہاں آپ کا منتظر رہونگا - اگر آپ نہیں آئیں گے تو مجھے سخت رنج ہوگا - مخلص دلی سید سعد اللہ قادری ۱۴ر فروری ۱۹۳۹ء

بہادر یار جنگ بانی اور صدر مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد

(۱) مکرم جناب خان صاحب - السلام علیکم رحمۃ اللہ - انتخاب کے مقابلے میں شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد قبول فرمایے - میری دعا ہے کہ خدا آپ کے زمانے رکنیت کو آپ کے حلقے کے لیے ہر طرح مبارک و مسعود بنائے - اور آپ سے وہاں کی بہترین خدمتیں انجام دلائے - اگر آپ گذشتہ تین سال کے مصارف بلدیا کی حلقہ واری تقسیم پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بلدیہ کے تمام حلقوں میں سب سے زیادہ رقم حلقۂ اول بیرون پر صرف ہوئی ہے - درآنحالیکہ اس تین سال کی مدت میں ایک تحریک بھی مجلس میں اس حلقے سے متعلق نہیں رکھی گئی - حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کی دنیا ابھی بعض خاص حالات میں بعض خاص طریقوں کو چاہتی ہے - جماعت عامّہ سے بیگانگی بہ نسبت جائز دوستی حلقے کے باشندوں کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوگی - یہ میرا دوستانہ اور برادرانہ مشورہ ہے کہ سوالات اعتراضات اور تحریکات سے حتی الامکان الگ رہکر اگر کام لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا - جب کبھی اور جہاں کہیں میری ضرورت ہو مجھے ہر وقت اپنا اور اپنے حلقے کا تصور کیجیے فقط

یکم آبان ۱۳۴۶ف آپکا مخلص محمد بہادر خان غفرلہ

(۲) برادرم جناب خان صاحب - السلام علیکم ورحمۃ اللہ - احمد عبد العزیز صاحب قدیم ملک پیٹ میں رہتے ہیں اور وہاں نل نہونے کی وجہ سے پریشان ہیں - اپنے اہل محلا کی طرف سے یہ وہاں نل اندازی کی درخواست کر رہے ہیں اور سب کی امداد کے طالب ہیں - اپنے زمانے میں خود میں بھی اس قسم کی کوشش کر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ کام دشوار ہے لیکن سعی جاری رہے تو انشا اللہ کامیابی ہو ہی جائے گی - امید کہ آپ اس کام کی طرف خاص توجہ فرمایں گے - پارچا آج روانا کر رہا ہوں - اکبر علی خان صاحب کے ایٹ ہوم میں آپ نے اس کام کو اپنے ذمے لے ہی لیا تھا - براہ کرم تقسیم کروا دیجیے فقط آپکا مخلص بہادر یار جنگ

۱۴/۴ ۱۳۴۷ف

(۳) خان صاحب کرم - السلام علیکم رحمۃ اللہ - گذشتہ ذوالحجا میں جبکہ اپنی اہلیا کی زچگی اور شدید علالت کی وجہ سے میں یہ بتایا تھا سلور جوبلی مبارک کے سلسلے میں تقسیم کے لیے پارچا ملا تھا مجھے خیال تھا کہ میں نے میر محلا صاحبان کے توسط سے انکو اپنے وارڈ میں تقسیم کروا دیا ہے، لیکن آج جب بعض کاموں کے سلسلے میں سامان کا ایک کمرا کھولا تو اس میں سے یہ پارچا برآمد ہوا - روانا کر رہا ہوں - میر محلا صاحبان سے اپنے طور پر معلوم کر لیجیے کہ کن محلوں میں تقسیم ہوا ہے اور باقی محلوں میں اپنی نگرانی سے تقسیم کروا دیجیے - سخت شرمندا ہوں اور زحمت دہی کی معافی چاہتا ہوں فقط آپکا مخلص بہادر یار جنگ ۱/۴/۴۷ ۱۳ف

فہرست پارچا

چادر	دھوتیاں باریک دھاری کی	ساڑیاں بڑی سرخ دھاری کی	ساڑی سیاہ حور کی	—
۴۰ عدد	۲۵ عدد	۴۴ عدد	۳۴ عدد	

بہادر

(۴) خان صاحب - کرم و مہربان - تسلیم - ٹھاکرز کا ٹکٹ پہنچا - ممنون ہوں - مبلغ روپیے قیمت ٹکٹ اور عہ روپیے حسب وعدہ برائے پرچم عطیہ حاضر ہیں - قبول فرمایئے - اس تقریب کو کامیاب بنانے میں آپ نے جو زحمت گوارا فرمائی وہ ہر طرح قابل تشکر اور قابل مبارکباد ہے - خدا آپکو اچھا رکھے اور آپ سے ملک کی اسی طرح ایسی ہی اچھی خدمتیں انجام دلوائے فقط آپکا مخلص محمد بہادر عفی اللہ ۳/آذر ۱۳۴۸ ف

(۵) جناب خان صاحب ! سلام مسنون - گذشتہ کئی دن سے اپنی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ پابندی سے ساتھ ڈاک نہیں دیکھ رہا ہوں - آپ کا ۲۸/مہر کا مکتوب میں نے آج یکم آبان ۱۳۴۸ف کو دیکھا جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ جواب کے لیے آپ کو زحمت انتظار گوارا کرنی پڑی ہو - جس غرض کے لیے آپ نے ملاقات کی خواہش فرمائی تھی اگر اب بھی وہ باقی ہے تو آپ مجھ سے کل بتاریخ ۲/آبان ۱۳۴۸ف روز جمعہ بوقت ۸½ ساعت صبح ملاقات فرما سکتے ہیں - میں منتظر رہونگا فقط ۱/۲/۱۳۴۸ف محمد بہادر خان عفی عنہ

(۶) مکرمی جناب خان صاحب - تسلیم - جشن سال نو کے ڈنر کا کارڈ پہنچا - ان شاء اللہ شرکت کی مسرت حاصل کروں گا فقط آپ کا مخلص محمد بہادر خان عفی لہ ۲۹/۱۲/۱۳۴۸ف

(۷) مکرمی جناب خان صاحب رکن بلدیہ - تسلیم - سال نو کی تحریک سے متعلق جلسے کا اطلاع نامہ میں نے دیر سے دیکھا - اس دن مجلس جاگیرداران کی ایک اہم میٹنگ تھی اس لیے نہ آسکا - اگر سال نو کو ایک عید منانے کا قصد ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ پہلے اپنے سال کی حقیقت پر بھی ایک نظر ڈال لیں - آپ نے تو غور فرمایا ہی ہوگا، مگر میں احتیاطاً ہمارے سال فصلی کی مختصر تاریخ آپ کو لکھتا ہوں - یہ سن فی الحقیقت سن یزد جردی سے ماخوذ ہے جو ایران کے آخری بادشاہ یزد جرد نے جاری کیا تھا اور جو اب تک ہمارے پارسی بھائیوں میں جاری ہے - سلطنت ایران کے مٹ جانے کے بعد یہ سن بھی ایران سے مٹ گیا - لیکن جب سلطان جلال الدین - ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر نظام الملک طوسی نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ ایک ایسا سن جاری کیا جائے جسکے مہینے فصلوں سے مطابق ہوں اور وصول مالگزاری میں سہولت ہو تو اس کی خواہش پر مشہور شاعر اور فلسفی عمر خیام نے اس سن یزد جردی کو حضرت رسالتمآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے مطابق کر کے "سن جلالی" کے نام سے جاری کیا، مگر مہینے وہی ایرانی رکھے - یہ سن اب تک ایران میں جاری ہے لیکن اس کا نام سن شمسی ہے اور افغانستان میں بھی یہی سن جاری ہے، مگر مہینوں کے نام انہوں نے بار ابرج پر سے حمل جوزا سرطان وغیرہ رکھ لیے ہیں -

جب اکبر کے عہد حکومت میں بھی ضرورت ہندستان میں پیش آئی تو اسکے وزرا نے عمر خیام ہی کے اصول پر ایک سن اکبر کے "مذہب الٰہی" کی مناسبت سے "سن الٰہی" کے نام سے جاری کیا، چنانچہ ہمارے سن فصلی کے مہینے اب بھی ماہ الٰہی کہلاتے ہیں - اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے -

وزرا اکبر نے اصول تو عمر خیام کے لیے مگر ایک غلطی یہ کی کہ اکبر کے عہد میں ہجری قمری کے لحاظ سے سن اسوقت تھا اسی کو سن الٰہی شمسی قرار دیدیا، اور یہ سمجھ لیا کہ یہ سن سن جلالی کی طرح ہجرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مطابق ہے حالانکہ گردش قمر اور سورج کے اطراف گردش کرنے ارض میں ہر سال دس روز کچھ گھنٹوں کا فرق آجاتا ہے اس طرح ہر تین سال کے بعد قمری سال ایک مہینا بڑھ جاتا ہے - اس لحاظ سے چاہیے تھا کہ اکبر کے عہد تک جو تقریباً ایک ہزار سال بحساب قمری گذرے تھے اس میں سے تین سال پر ایک مہینا از روئے حساب گھٹا دیا جاتا، مگر ایسا نہیں کیا گیا - یہی وہ ہے کہ ایران والوں کے سن شمسی میں (جو عمر خیام کا مرتب کردہ اور بلکل صحیح ہے) اور ہمارے سن فصلی میں جو سن الٰہی ہے تینتیس سال کا فرق ہے - وہاں اس وقت ۱۳۱۷ھ ہے تو ہمارے یہاں ۱۳۴۷ف - اگر آپ ایران وافغانستان والوں سے دریافت کریں کہ ہمارے سن کا مبدا کیا ہے تو وہ صاف کہدیں گے کہ ہجرت

رسول اللہ انکا مبدا ہے۔ مگر کوئی اگر ہم سے پوچھے کہ آپ کے سن کا مبدا کیا ہے تو ہم کچھ نہیں بتا سکتے اور وہ دنیا کے کسی اہم واقعہ سے مطابق نہیں ہوتی۔ اکبر کے وزرا کی کی ہوئی غلطی ابتک قایم ہے۔

نواب مختار الملک بہادر نے اس سن کو تو اسی طرح باقی رکھا مگر مہینوں کی اصلاح کی۔ ایرانی سال فروردی سے شروع ہوکر اسفندار پر ختم ہوتا ہے۔ فروردی انکا بہار کا مہینا ہوتا ہے۔ تیر و خرداد میں گرمی ہے۔ امرداد و شہریور میں مینہ برستا ہے اور دے و بہمن میں سردی ہوتی ہے۔ لیکن ہندستان اور ایران میں جو بعد مسافت ہے اس کی وجہ سے مختار الملک بہادر نے محسوس کیا کہ یہاں مذکورا مہینے موسموں سے مطابق نہ تھے۔ اسلیے پہلے آبان سے سال شروع کرکے دیکھا پھر امرداد کے اور بعد اذان آذر سے شروع کیا اور محسوس کیا کہ یہ ترتیب ہماری فصلوں کے لیے موزوں ہے۔ اب نہی سال اور وہی مہینے رایج ہیں۔

سال نو کے یوم عید منانے سے قبل غور کر لیجیے کہ ایک ایسے سن کا سال نو جس کا کوئی مبدا ہی ہو۔ ایک مضحکا تو نہ بنجائے گا۔ پھر یہ بھی غور فرما یے کہ کیا ہمارا سال نو موسم بہار میں ہورہا ہے۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ اپنے سن کو درست کرنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ یا نہیں۔ دنیا کا کوئی سن میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے سن کی طرح اپنی ابتدا کے لیے کوئی اہم تاریخی پس منظر نہ رکھتا ہو۔ جلدی میں لکھ دیا۔ اس کو رائے نہ سمجھیے اگر فرصت ہو تو کبھی ملیے گفتگو کریں گے۔ والسلام۔ آپکا مخلص محمد بہادر خاں ۲۲ر آبان ۱۳۴۷ف

نواب ماندور خان صاحب جاگیردار حیدرآباد ۲۸ر۴ر ۱۹۵۲ء

مائی ڈیر جی۔ ایم، خان صاحب تسلیم۔ بمبئی میں آپ سے شام میں اسلیے ملنا نہیں ہوا کہ نواب صاحب بلہاری مع اپنے بچوں کے تشریف لائے تھے۔ اور نواب ظہیر یار جنگ سے ملاقات کرکے وہاں سے (تاج محل ہوٹل) روانا مغرب سے کچھ پہلے ہوئے۔ اور ماہیم شریف سے تقریباً ½ ۸ بجے واپسی ہوئی۔ سامان ساتھ کا لیاگیا تھا اسلیے میرے اسٹیشن پر اتر گیا۔ انشاءاللہ کسی دن صبح یا شام آپ کے بتائے ہوئے اوقات میں آپ سے آپ کے دولت خانے پر میں خود ہی آکر ملونگا۔ اسیوقت آپ کنجیاں دے سکتے ہیں۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے فقط مخلص ماندور خان

ماہر القادری ایڈیٹر "فاران" کراچی

(۱) مکرمی! السلام علیکم۔ آپ کے رسالے کے چند شمارے بھی ملے، اور کرم نامہ بھی۔ شکریہ آپ کی تحریر نے حیدرآباد کی یاد کے نقوش ابھار دیے ہیں ۔ ہائے۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ "فاران" تبادلے میں حاضر ہوا کرے گا۔ مہینے کی ۱۰ تاریخ تک نہ پہنچے تو ایک کارڈ ضرور ڈال دیں، تاکہ رسالہ دوبارا حاضر کر دیا جائے۔ اور گذشتہ پرچے بذریعہ رجسٹری بھجوا رہا ہوں۔ مخلص قدیم ماہر القادری

(۲) جناب مکرم! السلام علیکم۔ آپ کا کرم نامہ ملا اس خلوص و محبت کے لیے شکر گذار ہوں۔ آپ کی صحت کے لیے دعا کرتا ہوں، دق خدانخواستہ لا علاج مرض نہیں ہے، پہلے اور دوسرے اسٹیج میں علاج سے یقینی نفع ہوتا ہے انشاءاللہ العزیز آپ بھی صحت یاب ہو جائیں گے! اور کیا عرض کروں۔ مخلص ماہر

رام پال مشہور ادیب

(۱) [illegible] "ہندستانی ادب" نے نواز ہوا۔ یقین مانیے یہ آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ مجھے بہت پسند آیا۔ پہلے تو میں بگڑا، لیکن جب میں نے صرف ہجے دیکھے تو سمجھا۔ آپ کے مضامین کا انتخاب بھی خوب تھا۔ [illegible] آپ کے ہاں۔ [illegible] کام دیکھا جاتا ہے۔ یہ بات قابل تحسین ہے [illegible]

مذاق کے حامل ہیں ۔ نہ معلوم اس زمانے میں آپ اشتہارات کے بنا کیسے پرچا نکالتے ہیں ۔ خیر خدا آپ کی ہمت اسی طرح بلند رکھے ۔ کوئی خدمت نیازمند ۔ راجپال

(۲) خان بھائی ۔ تسلیم ۔ آپ کا نہایت دلچسپ خط ملا۔ شکریا ۔ ذہنی طور پر میں "آستک" یا "ناستک" دونوں پہ یقین نہیں رکھتا اور اعتقاد رکھتا ہوں کہ یہ ایرٹ اینسٹائن کی
کے دو جز ہیں، لیکن انکا ذکر ہندو فلسفے میں بھگوان کرشن نے سترویں باب میں ہے، ہے یا دوئی کے بھید بھاد میں بتلادیا تھا۔ سکھ دکھ اندھیرا اجالا ۔ گرمی سردی ۔ امیر غریب ۔ نیک بد ۔ گناہ ثواب ۔ ہر چیز کو آپ حساب کے طریقے پر پرکھ سکتے ہیں۔ جیسے ۔ مثبت نفی (٥ = ١ + ١ -) برابر ہے سفر۔ سفر وہ ہے جس کا شروع ہے آخر ۔ نہ ابر نہ ازل ۔ نہ ابتدا نہ انتہا۔ یہ وہ ہے جو لامحدود ہے۔ لافانی ہے ۔ لاثانی ہے ۔ سو میں آپ کے جلی حروف میں لکھے ہوے سے جو نکا تہیں آپ ضروری حصا ہیں ۔ رہا آپ کا طرز تخاطب ۔ مجھے پسند ہے ۔ "انسانی برادری" یہ وہ حالت ہے جب آدمی اپنے آپ کو "میں" سے اونچا اٹھالیتا ہے جب آدمی دوسرے کو ظاہری نشانیوں سے ہیں یا باطنی خوبیوں سے پہچانتا ہے ۔ مجھے انسان پہ فخر ہے ۔ مجھے آپ کا پرچا دوبارا نہیں ملا ۔ گو مجھے ہندستانی سے عشق ہے ۔ لیکن شاید انتظار اور مجبوری اس کا ضروری جز ہیں ۔ راج

سلیمان اریب ایڈیٹر صبا حیدر اباد ۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۶۶ء

محترم خان صاحب ! آداب عرض ہے ۔ گرامی نامہ ملا ۔ آپ سے اور "ہندستانی ادب" سے خفگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں آج کل صفیہ کی صحت کی وجہ سے کافی پریشان ہوں اور ادھر کئی دنوں سے میری معاشی حالت بھی بڑی خراب ہے ۔ پرچا پابندی سے نکلتا نہیں ہے اس لیے آپ کو ملا ہی نہیں ۔ کشمیر نمبر اور اس کے بعد کا شمارہ پیر تک آپ کو مل جائے گا ۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ آپ کا مخلص اریب

محمد ظفر احمد "برہان" دلی ۔ ۱۳/۱۰ر ۱۹۶۹ء

مکرم محترم ! سلام مسنون ۔ مزاج گرامی ۔ آپ کا خط موصول ہوا۔ حیات ذاکر حسین کا اشتہار آپ نے شایع فرمادیا ہے جس کے لیے کارکنان ادارا ممنون ہیں۔ آپ "برہان" کے کسی بھی علمی مضمون کو "برہان" کے حوالے سے ضرور شایع فرمائیں اس کی ہر وقت اجازت ہے ۔ والسلام محمد ظفر احمد

رازق الخیری ایڈیٹر "عصمت" کراچی ۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۶۶ء

مکرمی ۔ "ہندستانی ادب" کا جوبلی نمبر اور ایک پرچا ملا۔ جس سے آپ کی خیریت معلوم ہوگئی ۔ خدا آپ کو تندرست رکھے ۔ ادب اور زبان کی جو خدمت آپ کر رہے ہیں وہ گراں قدر ہے ۔ رازق الخیری

شمس کنول ایڈیٹر "گگن" بمبئی ۱۶ر جولائی ۱۹۶۶ء

(۱) برادر عزیز ۔ پچھلے مہینے آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا تھا ۔ میں بے حد مصروف تھا اس لیے جواب فوری نہ دے سکا، معذرت کا طالب ہوں، اگرچہ میں اردو پرچے کو زندہ رکھنے کے مسائل سے بخوبی واقف ہوں، مگر پھر بھی آپ کے خط سے یہ جان کر کہ آپ "ہندستانی ادب" کو بند کر دینے پر مجبور ہیں بے حد دکھ ہوا ۔ میرے دکھ کی زیادتی کا سبب یہ بھی ہے کہ اردو زبان کی اس لمبی چوڑی دنیا میں صرف آپ ہی کی ذات ہے جو اردو املے کے مسئلے میں میری ہم نوا ہے ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ ایک بار پھر ہمت کریں قدرے اپنے طریق کار کو بدلنے کی اشتہارات کے لیے کوشش کریں ۔ اشتہارات کے معاملے کا آغاز اور ماہر سے آ[illegible]

اور باہر سے آئے ہوئے مضامین کا اِملا اشتہارات بھیجنے والوں اور مضمون نگاروں کی مرضی پر چھوڑ دیں اور سرورق کے لیے سوچ سمجھ کر دو رنگ کا ایک ڈزائن بنوا کر مستقل طور پر ایک بلاک بنوالیں۔ میں آپ کی مشکلات کو جانتے ہوئے بھی یہ ہی کہوں گا کہ کسی طرح "ہندستانی ادب" زندہ رہے۔ جولائی کا "گگن" ملا ہوگا۔ آئندہ "گگن" اشاعت خاص کی صورت میں شایع ہوگا۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ "گگن" کی اس خاص اشاعت کے لیے ایک مضمون لکھیں، اگر مضمون اردو املے کے آوازی اصول کے موضوع پر ہو تو بہت ہی اچھا ہے ظاہر ہے اس موضوع پر ہندستان میں آپ سے بہتر دوسرا کوئی نہیں جو لکھ سکے۔ بہر نوع میں ایک ہفتے تک آپ کے جواب اور مضمون کا منتظر رہوں گا۔ قدرت کرے آپ بعافیت ہوں۔ آپ کا بھائی۔ شمس کنول

(۲) محترمی۔ اطلاع کے طور پر عرض ہے کہ "گگن" کا دفتر کلیان سے بمبئی منتقل ہو گیا ہے۔ براہ کرم تبادلے اور جملہ خط و کتابت کے لیے مندرجہ بالا پتا نوٹ فرمالیں۔ نیاز کار شمس کنول ۲۰/۵ سنہ ۱۹۶۵ء

نسیم انہونوی ایڈیٹر "حرم" لکھنؤ

۲۷/۶/ سنہ ۱۹۶۶ء

(۱) برادرم! سلام مسنون۔ عنایت نامہ ملا، شکریہ۔ حرم کے رجسٹر میں پتے کی درستی کے لیے نوٹ کرا دیا گیا ہے۔ آپکا سلور جوبلی نمبر میری نظر سے گذرا تھا، مگر یاد نہیں آتا کہ میں نے کیا لکھا تھا آپ کو لکھا بھی تھا یا نہیں۔ حافظہ عمر کے تقاضے سے بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ویسے معروفیت بھی بہت ہے۔ حرم، کلیان اور سرپنچ کی ادارت کے ساتھ ہی بکڈپو کا عظیم کام بھی دیکھنا پڑتا ہے جس کے سہارے یہ سب چل رہے ہیں۔ سلور جوبلی نمبر نہ جانے کون صاحب میری عدم موجودگی میں لے گئے پتا نہیں چلتا ورنہ میں پھر اپنی رائے لکھ دیتا۔ رسالہ نکالنا درد سر مول لینا ہے، نہ جانے آپ کیسے پرچا نکالے جا رہے ہیں۔ میں نے تو اگر بکڈپو نہ قایم کر دیا ہوتا تو رسالے فنا ہو چکے ہوتے، مسلسل نقصان ہی ہوتا رہتا ہے۔ والسلام۔ آپکا نسیم انہونوی

(۲) برادرم! آداب عرض! کارڈ آپکا ملا، مسرت ہوئی۔ سالنامہ نہ کیسے جاتا۔ بھیجا گیا تھا، مگر کفایت کے مدنظر معمولی ڈاک سے۔ آپ نے اتنی تاخیر کے بعد لکھا کہ اب نہ تو سالنامہ دفتر میں موجود ہے نہ فروری نمبر۔ افسوس کہ تعمیل نہ کر سکوں گا۔ پرچا نہ ملنے کی شکایت اسی ماہ میں کر دیا کریں۔ آپکا نسیم

(۳) محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ بھائی صاحب اتنا سا وضاحت تو ملنا ہی چاہیے کہ ان رسایل کا نام اور مقام اشاعت آجائے اور قارئین کو علم ہو جائے کہ ایسے مضامین کن رسایل میں شایع ہوتے ہیں۔ اسمیں آپ کا کوئی نقصان نہیں۔ رسایل کو ممکن ہے کچھ فایدا پہنچ جائے۔ میری ناچیز رائے میں ہر مضمون کے آخر میں (بشکریہ نام رسالا و مقام) شایع فرمایا کریں۔ ویسے آپ جو مناسب تصور فرمائیں۔ والسلام آپکا نسیم - ۱۰/۴/ سنہ ۱۹۷۰ء

عبداللہ چغتائی مشہور ادیب لاہور

محترم معظم جناب خان صاحب! السلام علیکم۔ میں آپ کا ممنون ہوں آپ نے "ہندستانی ادب" کا دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء کا پرچا ارسال کیا، مگر میں نے دراصل اپریل سنہ ۱۹۶۲ء کا طلب کیا تھا جس میں ایک مضمون میرے مطلب کا تھا۔ بہرحال آج آپ نے دوسری ڈاک میں ایک خط اور ایک اور پرچا "ہندستانی ادب" کا ارسال فرمایا اور حالات سے مطلع کیا جس کے لیے تہِ دل سے شکر گذار ہوں۔ اللہ کرے وہ مطلوبا پرچا بھی میسر آجائے۔ میں نے آپکا یہ علمی کارنامہ اول [illegible] زندگی میں دیکھا ہے ایک رسالا الٰہ آباد سے "ہندستانی" نکلتا تھا۔ اور آپ نے ہمت سے اس کا الگ ہی [illegible] ہے جو ضرور قابل ستایش ہے اور اپنے رنگ کا واحد پرچا ہے۔ ان احباب میں ڈاکٹر زور کی وفات ایک [illegible] الفاظ میں بیان ہونا مشکل ہے جو اس کی مفارقت سے احساسات پیدا ہوئے ہیں ان سے سنہ ۱۹۲۱ء [illegible] عزیزوں کی طرح تھے جبکہ وہ ابھی طالب علم ہی تھے۔ اب رفقا میں سروری صاحب، سید محمد صاحب، غلام رسول [illegible] ہوا۔ آ[illegible] ملاقات ضرور ہوگی، آنکھیں ان کو دیکھنے کو ترستی ہیں، یہ وہ دوست ہیں کہ جن

...سان ناز کرتا ہے۔ میں آپ کے کرم کا شکر گذار ہوں۔ - عبداللہ چغتائی

سرور تونسوی ایڈیٹر "شان ہند" ۲۸/۳/سنہ ۱۹۷۲ء

تسلیم۔ گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ وہ دن دن حالت ٹھیک کر رہا ہے۔ "شان ہند" ہر ماہ حاضر خدمت ہوتا رہے گا۔ مارچ کا شمارہ دو دن تک روانہ کر دونگا اور اپریل کا ۱۵ اپریل کو۔ انشاء اللہ یہ یکم مئی کو روانہ کیا جائے گا۔ میرے ہاں زیادہ سے زیادہ دس بارہ رسائل تبادلے میں آتے ہیں۔ آپ نے جو فہرست ... ہے ان میں سے سات آٹھ رسالے بھی میرے ہاں آتے ہیں۔ شاعر بمبئی ۔ شمع، شبستان، پاکیزہ آنچل، مصحف علی رود۔ نئی دلی ۔) آتے ہیں یہ چار رسالے شمع والوں کے ہاں ہیں۔ گگن بمبئی بھی آتا ہے یہ بھی کسی تبادلہ منظور نہیں کرتا۔ اور بس۔ کار خدمت لائقہ سے حکم فرمائیں۔ میں زیادہ کئی پاکستانی رسائل و ...یر بھی تبادلے میں منگاتا تھا اور ان کی تعداد ایک صد کے قریب تھی۔ مگر وہ اب کئی سالوں سے آنے بند ہیں۔

نیازمند سرور تونسوی

عبدالحمید بوابرے ایڈیٹر صبح امید بمبئی ۵/جولائی سنہ ۱۹۶۶ء

محترم! تسلیم۔ آپ کا خط ملا۔ بیحد رنج ہوا۔ افسوس ہے ان اردو زبان کی اشاعت و تبلیغ کے زبانی نعرا لگانے والوں پر۔ آندھرا پردیش ایسے اردو کے صوبے میں ایک معمولی سی اشاعت کو بڑا نہیں سکے۔ اگر بڑا نہ سکے تو کم از کم اس حد تک تو اسے قائم رکھنے کی قارئین اور اردو کے حامی کوشش کرتے۔ تعجب ہے کہ شہر حیدرآباد سے بے شمار اردو کے ماہنامے نکل رہے ہیں، لیکن ایک ۲۵ سال سے جاری ماہنامے کو پنپنے کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ آپ ہمت نہ ہاریں کبھی تو ان لوگوں کو ہوش آئیگا اور وہ "ہندستانی ادب" کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں گے۔ آپ کا مخلص عبدالحمید بوبرے

ڈاکٹر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ - ۵/جنوری سنہ ۱۹۷۱ء

برادر عزیز! السلام علیکم - مزاج شریف۔ آپ کا دعوت نامہ ملا۔ دلی شکریہ۔ میں اس ہفتے حد سے زیادہ ...ت رہا ہوں۔ اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ آپ پہلے اپنا کارڈ تلاش کر کے دوا و علاج جاری کرائیں تو دی دعوت ہے۔ ویسے ان شاء اللہ جب فرصت ہوگی حاضر ہو کر ہمطعامی کی مسرت حاصل کروں گا۔ اگر کارڈ نہ ملے تو ڈاکٹر رحیم صاحب نے فرمایا ہے کہ ایکبار آپ دوا خانہ جا کر دوبارہ ... دے لیں تو گھر پر دوا کا انتظام ہو سکے گا۔ خیر طلب رشید

سید مسعود ضیاء الدین زمیندار ظہیرآباد ۱۲/جنوری سنہ ۱۹۶۸ء

...ب بھائی صاحب محترم۔ آداب عرض۔ نہایت شرمندہ ہوں کہ عید پر نہیں مل سکا۔ ظہیرآباد سے صرف دو دن کے لیے آیا تھا۔ عید کے دوسرے دن واپس ہو گیا اور ابھی تک یہاں قیام ہے ممکن ہے کچھ دن اور رہوں۔ آپ کا مزاج بحال ہو گا۔ گھر کا تمام کام ختم ہو چکا ہو گا۔ گھر کی رونق تو بہت بڑھ گئی ہے۔ خواہشمندوں کی نظروں میں کھب گیا ہو گا۔ نیا سال شروع ہو چکا ہے جیسے سا تھوڑی رسالے کے لیے آپ کی تگ و دو اور پریشانی ایک تھا ... لوگ نئے سال کی خوشی مناتے ہیں اور ہم نئے سال کی مزید پریشانیوں کے بوجھ سے دبے جاتے ہیں۔ زندگی کی پریشانیاں اور الجھاوے ہیں ایک کو نپٹو تو دوسرا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ میں منگل یا چہارشنبہ تک ... ملوں گا۔ امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ خدا حافظ

مخلص مسعود

سلام سندیلوی پروفیسر دلی

مکرمی جناب بھائی خان صاحب - السلام علیک - مزاج گرامی - آپ کا خط مجھ کو مل گیا تھا، لیکن اس دوران میں اسکول میں انسپکٹر صاحب کا معاینہ ہو رہا تھا، اس وجہ سے کافی مصروفیت رہی - اس بنا پر خط کا جواب بھی نہیں دے سکا - آپ کے خط سے پتا چلا کہ آپ سو صفحے کے بجائے دو سو صفحوں کا نمبر نکالنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کے اندازے سے دوگنا روپیا فرچ ہوگا - میں نے اس بات کا تذکرا مولانا صاحب سے کردیا آپ کے خط میں فوری جواب طلب باتیں دو تھیں - اول یہ کہ نمبر کے فروخت ہونے کے بعد پوری رقم ایک قسط میں آئے - دوسری بات یہ تھی کہ کچھ رقم پیشگی آئے - مولانا صاحب نے اس مسئلے میں گفتگو ہوئی - انہوں نے فرمایا کہ فروخت ہونے کے بعد ساری رقم ایک قسط میں تو آ سکتی ہے - مگر پیشگی روپے کا سوال مشکل ہے - کوئی شخص پیشگی روپیا نہیں دے سکتا ہے کیونکہ زمانا بہت بے اعتبار ہو چکا ہے - اس لیے پیشگی رقم کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے - اب آپ جیسا مناسب سمجھیں سوچ کر قدم اٹھائیں - سلام نیازکیش فقط

احمد ابراہیم علوی ایڈیٹر لکھنو ۲۰ جنوری ۱۹۶۶ء

محترم جناب خان صاحب سلام مسنون - "ہندستانی ادب" کا سلور جوبلی نمبر بذریعے رجسٹری موصول کرکے ازحد مسرت ہوئی - ذرا نوازی اور خلوص کے لیے تہے دل سے شکریا قبول فرمائیں - اردو کشی کے اس دور میں کسی اردو رسالے کا نکالنا اور پھر سلور جوبلی نمبر نکالنا جوے شیر لانا ہے - بغیر کسی استہارات اتنے شاندار اور ضخیم نمبر کی اشاعت پر سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کس طرح مبارکباد پیش کروں میں اپنے کو بہت حقیر تصور کر رہا ہوں - خدا کرے "ہندستانی ادب" دن دونی رات چوگنی ترقی کرے - امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا - والسلام آپکا احمد ابراہیم علوی

شاعر نازش پرتاب گڑھی

مکرمی! تسلیم - نظمیں بھیجے عرصا ہوا مگر اب تک رسید نہ ملی - دسمبر اور جنوری کے پرچے بھی تک نہیں ملے، البتا فروری کا شمارا مل چکا ہے مگر صرف اطلاع غرض ہے ورنا اب مجھے نہ کلام کی رسید کی ضرورت ہے اور نہ پرچوں کی حاجت - امید کہ آپ بخیر ہوں گے - مخلص نازش پرتاب گڑھی ۲۵ فروری ۱۹۵۰ء

یوسف دہلوی ایڈیٹر "شمع دلی" ۳۰ جون ۱۹۵۰ء

محترمی - گرامی نامہ موصول ہوا - جون کا شمع حسب معمول آپ کو روانا تو کیا گیا تھا - شاید رستے میں خرد برد ہو گیا اس وقت ہمارے دفاتر میں اس کی ایک بھی کاپی اپنے فائل کے علاوا موجود نہیں ہے اس لیے دوبارا بھیجنے سے معذور رہا ہاں اگر کہیں سے کوئی کاپی ہات لگ گئی تو ضرور آپ کو بھیج دی جائے گی - امید ہے معاف فرمائیں گے -
آپکا مخلص ماہ نامہ شمع یوسف دہلوی

مرزا عمر بیگ مالک ابراہیمیا پریس حیدرآباد ۵ مئی ۱۹۶۹ء

مکرمی! خان صاحب - السلام علیکم - آپکا کارڈ مورخہ (+) آج صبح ۱۰ بجے آیا - میں صبح ناشتہ کی دعوت کے لیے گیا ہوا تھا ۱۱ بجے واپس آنے پر کارڈ مجھے ملا - دعوت میں شرکت کے لیے یاد فرمائی کا بے حد شکریا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دعوت کب ہے؟ آپ نے کارڈ میں جمعہ ۱۵ مئی لکھا ہے - (اگر دن صحیح ہے تو تاریخ ۱۶ مئی ہوگی - اگر تاریخ ۱۵ مئی صحیح ہے تو دن پنجشنبا ہوگا) آج یعنی ۱۵ مئی پنجشنبا کو حاضر ہونے کا وقت نہیں رہا [illegible]

+ -2 - ~~(+6)~~

H_2SO_4 .

2 + 32 + 64

64
32
96
2

= 98 mol.

= 49 (eq.)

~~NaOH~~

23 +

NaOH

23 + 16 + 1

= 40 Eq. mass

REGD. No. H.16.

HINDUSTANI-ADAB,

SADATH VILLA, 16-11-17, SALEEMNAGAR
COLONY-1, MALAKPET,

HYDERABAD-36, (A.P),

INDIA.

EDITOR,

G.M. KHAN

M.A. (OSMAN.)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اقبالؔ

DR. ZAKIR HUSAIN ... JAMIA NAGAR NEW DELHI

ہندستانی ادب

سعادت ولا - ۱۶۰-۱۱-۱۲ - سلیم نگر کالونی - ۱ - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ - آندھرا پردیش - انڈیا

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان

ام۔ اے (عثمانیہ)

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025

انجمن ترقیٔ ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱٦)　　　جلد (۳۵) نمبر (۷-۸-۹)

خرداد - تیر - امرداد ۱۳۸۴ ف　　　اپریل - مئی - جون ۱۹۷۵ء

چندا سالانا　　　سولا روپے

مہدی نواز جنگ نمبر

ہندستانی ادب

سعادت ولا - ۱٦-۱۱-۱۷ - سلیم نگر کالونی - ا - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳٦ آندھرا پردیش - انڈیا -

ایڈیٹر

جی - ام - خان ام - اے (عثمانیا)

جی - ام - خان نے دائرہ پریس - چھتا بازار - حیدر اباد ۲ میں چھپواکر سعادت ولا - ۱۶ - ۱۱ - ۱۷ سلیم نگر کالونی - ۱ - ملک پیٹ - حیدر اباد ۳۶ سے شایع کیا —

ہمارے خیالات

مہدی نواز جنگ نمبر

یہ سچ ہے کہ اس نمبر میں نواب مہدی نواز جنگ بہادر مرحوم سے متعلق ایک بھی مضمون نہیں ہے، مگر ہم نے اس نمبر کو "مہدی نواز جنگ نمبر" کا نام دیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ کہ اس نمبر کے ایک سو صفحوں میں (۳۶) صفحے صرف ایک ہی شخصیت سے متعلق ہیں اس لیے ہم نے اس نمبر کو "مہدی نواز جنگ نمبر" کا موزوں ترین نام دیا ہے۔ شروع میں صفحہ ۳ تا ۸ اداریے کے یہ صفحے ہمارے ہی قلم سے مہدی نواز جنگ سے متعلق ہیں، اور آخری صفحے ۸۱ تا ۱۰۰ ہمارے نوٹ اور نواب صاحب مرحوم کے شخصی خطوط پر مشتمل ہیں۔

ہمارے اور نواب صاحب کے شخصی قریبی تعلقات کی بنا پر ایک عرصے سے ہمارا خیال تھا کہ ہم نواب صاحب کے بعض بچے کچے دوست احباب، ملنے والوں اور عزیز اقربا اور رشتے داروں کے نام اس نمبر کے مضامین کے سلسلے میں خطوط لکھیں گے، اور ان تمام مضامین کی وصولی کے بعد پورے ایک سو صفحے کا نمبر نواب صاحب سے متعلق لکھوا کر حقیقی معنی "مہدی نواز جنگ نمبر" شایع کریں گے، مگر سخت افسوس کا مقام ہے کہ ہماری بدترین اور آئے دن گرتی صحت نے آج تک بھی یہ خطوط لکھنے کی اجازت نہیں دی، اور اب تو ہم چل چلاؤ پر ہیں، اپنی (۷۴) سالہ عمر کی گھڑیاں گن رہے ہیں، نہ معلوم کس آن ہماری زندگی کی یہ ٹمٹماتی شمع گل ہو جائے! ہم نے غالباً پچھلے کسی ایک نمبر میں بھی لکھا تھا کہ ہمیں T.B. یا دق ہو گئی ہے۔ سینے میں ہمیشہ ہی درد رہتا ہے، اور یہ درد آئے دن بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، دوسرے ہمارا سیدھا پیر بیکار ہو گیا ہے۔ ہم جب کسی طویل عرصے تک پیدل چلتے ہیں تو سینے کا درد بڑھ جاتا ہے، اور چلتے وقت پیر اپنی اصلی حالت میں حرکت نہیں کرتا، بلکہ اس کو گھسیٹنا پڑتا ہے، اس لیے تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم مجبوراً کھڑے ہو جاتے ہیں، اس طرح سے منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، اور یہ منزلیں بالکل ہی مختصر یعنی دو چار فرلانگ سے زیادہ طویل نہیں ہوتیں۔ ان مختصر منزلوں کے طے کرتے وقت بھی سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے — سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب چلنے پھرنے سے شدید تکلیف ہوتی ہے تو پھر ہم چلتے پھرتے کیوں ہیں؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ ہم رسالے کے کام سے اور اپنی روزانہ ضروریات کے پورا کرنے کے لیے شہر میں زیادہ تر بس میں اور ضرورت پڑنے پر آٹو رکشا میں سفر کرتے ہیں، مگر مکان سے بس اسٹاپ تک تقریباً چار فرلانگ کا فاصلہ پیدل پیدل ہی طے کرنا پڑتا ہے، اور بالکل اسی طرح واپسی بھی ہوتی ہے، اور ضرورت سے شہر میں گھومتے پھرتے وقت بھی بعض مقامات پر ہم پیدل چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شہر حیدرآباد میں ٹیکسی کا سفر بہت مہنگا پڑتا ہے۔ یہاں ٹیکسی میں صرف ٹورسٹ یا دولت مند شہری ہی سفر کرتے ہیں، لیکن آٹو رکشا یا اسکوٹر رکشا اوسط طبقے کے لیے موزوں سواری ہے، اس لیے آٹو رکشا کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ سخت افسوس کا مقام ہے کہ ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کا شمار مالی اعتبار سے اوسط طبقے میں بھی نہیں ہے، اس لیے وہ روزانہ یا کبھی کبھار بھی آٹو رکشا میں سفر نہیں کر سکتا۔ بس کا سفر سستا بھی ہے اور اچھا بھی ہے، اور یہ صرف معمولی اوقات یا WEAH OURS میں اور رش کے اوقات یا PEAK HOURS میں بس کا سفر بدترین سفر ہوتا ہے، اس لیے کہ صبح اور شام کے اوقات میں دفاتر، اسکولوں اور کالجوں جانے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ہر بس کے بھر جانے کے بعد بھی کثرت سے مسافر بچ رہتے ہیں، جو مجبوراً آٹو رکشا یا معمولی رکشا میں سفر کرتے ہیں، اگر ہم جیسے کمزور اور نحیف و نزار آدمی غلطی سے کسی بھری بس میں سفر کریں تو بلا مبالغہ ہمارا کچومر ہی نکل جائے۔ شہر حیدرآباد کی سنگل یا ہر چھوٹی بس میں (۳۶) نشستیں مقرر ہیں، مگر PEAK HOURS میں (۳۶) کے علاوہ، اور بھی چالیس پچاس آدمی بس میں زبردستی بھی گھس پڑتے ہیں، اور بس کی سیڑھیوں پر بھی کھڑے ہو جاتے ہیں، چونکہ یہ روز روز کی عادت سی پڑ گئی ہے، اس لیے کنڈکٹر ان کو منع نہیں کرتا۔ ڈبل اس DOUBLE DECKER میں بھی

مدر انگریزی میں لکھا ہوا ہے کہ پاسنجروں کو کھڑے رہنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن صبح اور شام رش کے اوقات
میں سنگل بس سے زیادہ تعداد میں پاسنجر بلا تکلف کھڑے ہو جاتے ہیں، اگر وہ کھڑے نہ ہوں تو وقت پر دفاتر اور
سکولس اور کالجوں وغیرہ کو وقت پر پہنچ نہیں سکتے ۔

موقع محل سے اس نوبت پر ہیں یہ کہتے صد درجہ شرم سی محسوس ہوتی ہے کہ شہر حیدرآباد میں بس اسٹاپس
رکیو Q سسٹم نہیں ہے۔ بس کے آتے ہی تمام پاسنجر بلکل وحشیوں اور جنگلیوں کی طرح بس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں،
ہا کے بیٹھنے کے لیے جگہ مل جائے، اور اس شرمناک جنگلی پن اور وحشی پن کی طاقتور، بلوان اور خصوصاً نوجوان اپنے
ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور ہم جیسے نحیف و زار اور کمزور لوگ منہ تکتے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دوسری
تیسری یا چوتھی بس میں جب کبھی موقع ملے سفر کرتے ہیں۔ ہم اس موقع پر جنرل مینجر اور چیرمن اور ممبران A.P.R.T.C.
سے خاص طور پر مخاطب ہیں کہ وہ ایک نئے قانون کے ذریعے کیو Q سسٹم کا ایک ضروری دفعہ بنائیں، اور پولیس کی
مدد سے جلد سے جلد بس اسٹاپس پر کیو Q سسٹم لازمی طور پر جاری کر دیں، اور اگر وہ اپنے آپ کو اس قانون کے
نافذ کرنے میں مجبور اور قاصر پاتے ہیں تو ہم ان تمام اوپر گنائے گئے عالی عہدے داران A-P-R.T-C. سے سختی
کے ساتھ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی خدمت سے استعفا دیدیں، تاکہ کوئی دوسرے موزوں اور قابل عہدے داروں
کے آنے کے بعد یہ ضروری قانون نافذ اور رائج کیا جا سکے!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندستان کے دوسرے بڑے شہروں، مثلاً دلی - الہ باد - کانپور - کلکتہ - مدراس -
بنگلور - بمبئی - احمد آباد وغیرہ وغیرہ میں بسوں کے لیے کیو Q سسٹم لازمی ہے تو پھر ۱۸ لاکھ آبادی والے جیسے بڑے
شہر حیدرآباد میں بسوں کے سلسلے میں کیو Q سسٹم کیوں نہیں ہے۔؟ اس سوال کا جواب، ہم صرف ذمے دار عہدے داران
A.P.R.T.C سے چاہتے ہیں! اس نوبت پر ہم ان سے سختی کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ وہ بتائیں کہ آیا خدا ان کے
لیے اور ہم ۱۸ لاکھ شہریوں کے لیے شرم کی بات نہیں ہے کہ دو سو سے زیادہ B USR OUTES والے شہر میں
کسی بھی بس اسٹاپ پر کیو Q سسٹم رائج اور جاری نہیں ہے؟ اس لیے تہذیب اور تمدن کے اس بدنما داغ اور
دھبے کو دور کرنا عہدے داران A-P-R-T-C کا پہلا اور اولین فرض ہے! حیدرآباد میں سرکاری بس سسٹم کو قائم
ہوئے تقریباً چالیس (۴۰) سال سے زیادہ عرصہ ہوا ہے، اور اس وقت سے آج تک کسی بھی روزانہ اخبار، ہفتہ وار
اور ماہوار رسالے نے کیو Q سسٹم قائم کرنے کی طرف A-P-R-T-C. کو توجہ نہیں دلائی ہے، اور یہ شرف
صرف اور صرف پہلی بار ''ہندستانی ادب'' کو حاصل ہوا ہے، ہم نے بات بلکل موقع محل سے کہی ہے، جب ہم نے اپنی
جسمانی کمزوری کا ذکر کیا تو بس میں سفر کا سوال بھی پیدا ہو گیا، اور ہم نے کھلے طور پر لکھ دیا کہ PEAK HOURS
میں بس میں سفر کرنا ہم جیسے کمزوروں کے لیے ممکن نہیں، اس لیے کہ دوسرے نوجوان اور طاقتور پاسنجر بلکل جنگلیوں اور
وحشیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں، اگر ہم بھی اپنے نازک سے بس میں جانے کی بےجا کوشش کریں تو ہمارا تو کچومر ہی
نکل جائے گا! وہ لوگ جو پہلے سے بس اسٹاپ پر آ کر کھڑے ہوتے ہیں، ایسے رش کے وقت اپنے اولیت کے حق سے
محروم ہو جاتے ہیں، اس لیے اس کا واحد اور بہترین حل کیو Q سسٹم ہے، یعنی ایک کے پیچھے ایک یا ایک کے بازو
ایک پاسنجر کھڑا رہے تو قانون اور قاعدے کے مطابق کوئی بھی شخص ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، جو پاسنجر بیچ
رہیں دوسری، تیسری یا چوتھی بس میں، جیسی بھی شکل ہو آسانی سے سوار ہو سکتے ہیں!

آخر میں ہم منسٹر آندھرا پردیش روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن - A-P-R-T-C اور چیف منسٹر حکومت
آندھرا پردیش سے بھی پر زور طریقے پر مطالبہ کرتے ہیں، نیز سختی کے ساتھ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سارے آندھرا پردیش
میں بس اسٹاپس پر کیو Q سسٹم کا قانون جلد سے جلد نافذ کر کے تہذیب اور تمدن کے اس بدنما داغ کو آندھرا
پردیش کی پیشانی سے ضرور مٹا دے!

آمدی ... مطلب یہ کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر کا اصلی نام سید محمد مہدی ہے۔ ان کا صحیح سنہ [redacted]

پیدائش ہمیں یاد نہیں رہا، اس لیے غلط سنہ لکھ کر ہم ہمیشہ کے لیے قصداً کسی غلطی کے مرتکب ہونا نہیں چاہتے۔ تقریباً آٹھ سال پہلے ان کا انتقال ہوا تھا، اور اس وقت ان کی عمر (۷۳) سال کی تھی۔ آخر میں نواب صاحب کے خطوط پر ہمارے نوٹ میں ہم نے ان کی عمر کا ذکر کیا ہے، جو خود نواب صاحب نے ہمارے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے اپنے بھانجے کی موجودگی میں ہم سے بیان کی تھی۔

نواب صاحب کی تعلیم غالباً میٹرک تک ہوئی تھی، اور انہوں نے کالج کی صورت نہیں دیکھی تھی، مگر فطرتاً بلا کے ذہین اور فرہیں واقع ہوئے تھے۔ کالج کے تعلیم یافتہ بھی ان کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ نواب صاحب کے والد بقول نواب صاحب، عربی، فارسی کے عالم فاضل اور نہایت ہی قابل شخص تھے۔ ان کے والد مہاراجا سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت اور موروثی پیشکار ریاست حیدرآباد تھے، جو آگے چل کر صدر اعظم باب حکومت یا پرائم منسٹر آف حیدرآباد بنے تھے۔

مہاراجا بہادر اپنے استاد کی قابلیت کی قدر کرتے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے عربی، فارسی کی تعلیم کے لیے انہیں اپنا استاد بھی مقرر کیا تھا، اور اپنے اسٹیٹ سے ماہوار چار یا سو روپے تنخواہ دیا کرتے تھے۔ یہ استاد شاگرد کے قریبی تعلق کا اظہار، اس نوبت پر اس لیے ضروری ہے کہ مہدی نواز جنگ کی ملازمت اور ترقی میں اس نے بہت اہم رول ROLE ادا کیا ہے۔

اسکول کی تعلیم کے بعد مہدی نواز جنگ محکمۂ انجمن امداد باہمی میں ملازم ہو گئے تھے۔ ملازمت کے دوران میں نواب صاحب نے انجمن امداد باہمی کا امتحان بھی کامیاب کر لیا تھا، اور ترقی کرتے کرتے مددگار امداد باہمی بن گئے تھے۔ اس کے بعد مہاراجا بہادر کی سفارش کی بنا پر ناظم یا ڈائرکٹر امداد باہمی کے اعلا عہدے تک پہنچ گئے تھے، مہاراجا بہادر جب صدر اعظم باب حکومت یا پرائم منسٹر آف حیدرآباد بنے تو انہیں ایک مستعد، کارگذار اور قابل معتمد یا سکرٹری کی ضرورت پڑی، چنانچہ ان کی فرہیں اور قدر شناس نظر انتخاب سید محمد مہدی، ناظم امداد باہمی پر پڑی، اس لیے کہ وہ اپنے استاد کے ذریعے ان کے بیٹے مہدی کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ مہاراجا بہادر نے بحیثیت صدر اعظم باب حکومت سید محمد مہدی ناظم امداد باہمی کے نام معتمد باب حکومت سے احکام جاری کر دیے، اور حسب حکم صدر اعظم بہادر مہدی نے ان کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر معتمدی باب حکومت کا جائزہ لے لیا۔

مہاراجا بہادر ہر حیثیت سے قابل شخص اور عالم فاضل بھی تھے، نیز شاعر بھی تھے، چنانچہ فارسی میں موقی اور ہندستانی میں شاد تخلص کرتے تھے۔ فارسی اور ہندستانی کے دو دیوان ان کے یادگار ہیں۔

صدر اعظمی کی ماہوار سات ہزار روپے کی آمدنی کے علاوہ ان کے نام سالانا بارہ لاکھ روپے کی جاگیرات بھی تھیں، اس لیے وہ حیدرآباد کے امیرانہ ٹھاٹ کی زندگی بسر کرتے تھے، اور روزانہ ان کا دربار بھی ہوا کرتا تھا، جس میں عالم، فاضل لوگ، اور شعرا وغیرہ بھی جمع ہوا کرتے تھے، اس بنا پر انہیں امور سلطنت میں زیادہ وقت دینے کی فرصت نہیں تھی، چنانچہ امور سلطنت کے سب کام ان کے لائق معتمد سید محمد مہدی انجام دیا کرتے تھے، اور مہاراجا بہادر کو کامل یقین تھا کہ ان کا معتمد مہدی ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کریگا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مہدی نے صدر اعظم، اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔

مہاراجا کشن پرشاد کی کابینہ میں کئی ایک صدر المہام یا وزیر سلطنت تھے، جن میں صدر المہام یا وزیر فینانس سر اکبر حیدری تھے۔ یہ شخص بھی اپنے فن کا ماہر اور قابل آدمی تھا۔ اس نے حضور [illegible] علی خان کے پاس بہت زیادہ رسوخ حاصل کر لیا تھا، اور عثمان علی خان اس کی بات سنتے بھی تھے۔ بحیثیت وزیر فینانس سر اکبر نئی نئی اسکیمیں برائے منظوری کی غرض سے صدر اعظم کے ہاں بھجوایا کرتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کی ہر [illegible] منظور ہو جائے، اگر اس کی بعض اسکیموں کو صدر اعظم نے نامنظور کر [illegible] (مہدی) نواز جنگ [illegible]

کو سخت ناگوار گذرتی تھی، بہر حال مہدی نواز جنگ کی ان مخالفتوں سے تنگ آکر ایک روز حضور عثمان
علی خان سے فرمان کے ذریعے وہ خود صدر اعظم باب حکومت یا پرائم منسٹر آف حیدرآباد بن بیٹھا۔ مہاراجا
تو گھر بیٹھ گئے اور مہدی نواز نواز جنگ نے رخصت لے لی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں نے معتمدی باب حکومت
کے زمانے میں ایک سے زیادہ مرتبہ سر اکبر حیدری کی مخالفت کی تھی، اس لیے اگر میں ان کی ماتحتی کروں تو
نہ معلوم کس بری طرح سے وہ مجھ سے بدلا لیں۔ سر اکبر نے اپنے خاص آدمیوں کو بھیج کر مہدی نواز جنگ سے
بارہا کہلوایا کہ تم رخصت سے باز آؤ اور فوراً معتمدی کی خدمت پر رجوع ہو جاؤ، میں تمہارے کام سے بخوبی واقف
ہوں، اور مجھ کو تم جیسے ایک لائق اور کارگذار معتمد کی سخت ضرورت ہے، اس کے باوجود مہدی نواز جنگ اپنی
خدمت پر رجوع نہیں ہوئے، اور ادھر سر اکبر نے دوسرے شخص کو اپنا معتمد بنالیا۔

حضور عثمان علی خان کی سالگرہ کے موقع پر پہلی رجب کو بعض مستحق سرکاری اور غیر سرکاری افراد کو
جنگ، اور دولہ کے خطابات دیے جاتے تھے، چنانچہ باب حکومت کی معتمدی ہی کے زمانے میں سید محمد مہدی
مہدی نواز جنگ بنے تھے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کسی بھی فہرست میں سید محمد مہدی نے خطاب کے لیے اپنا
نام شامل نہیں کیا تھا، چنانچہ ایک سال ایک فہرست خود مہاراجا بہادر نے اپنے قلم سے ان کا نام شامل
کیا تھا، جس سے یہ مہدی نواز جنگ بہادر مہاراجا کے بیحد سپاس گذار اور شکر گذار بھی تھے۔

مہدی نواز جنگ اور زین یار جنگ کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ جس وقت مہدی نواز جنگ نے رخصت
لی اور گھر بیٹھ گئے تو زین یار جنگ کو اپنے دوست کی بیکاری کی فکر لاحق ہو گئی۔ زین یار جنگ اس وقت
ناظم یا کمشنر بلدیہ تھے۔ یہ انجینئر تھے، آدمی قابل اور ذہین بھی تھے، اور سر اکبر حیدری کی طرح یہ بھی حضور
رستم سے، اور وقتاً فوقتاً سے عثمان علی خاں کے دربار میں جایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے حضور
سے کہا، سرکار! مہدی نواز جنگ سے میں شخصی طور پر واقف ہوں۔ یہ نہایت ہی قابل آدمی ہے، اور افسوس
کا مقام ہے کہ ایک لائق اور کارگذار عہدے دار رخصت لے کر گھر بیٹھ گیا ہے، بعض اسباب کی بنا پر وہ
معتمدی باب حکومت کی خدمت پر جانا نہیں چاہتا ہے، اس لیے حضور والا سے میری عرض ہے کہ مجھ کو ترقی دے کر
ایک نئے عہدے چیف آرکیٹکٹ کی خدمت پر رکھے آرائش بلدہ، اور مہدی نواز جنگ کو ناظم
بلدیہ، یا میونسپل کمشنر کی حیثیت سے بلدیہ بھیجا جائے تو میں عمر بھر حضور والا کا شکر گذار رہونگا، چنانچہ حضور
نے زین یار جنگ کی تحریک سے اتفاق کر لیا، اور دوسرے ہی روز فرمان جاری ہوا، جس کی رو سے زین یار
جنگ چیف آرکیٹکٹ بنے اور مہدی نواز جنگ ناظم بلدیہ یا میونسپل کمشنر کی حیثیت سے جائزہ لیا۔ یہ ۱۹۳۵ء
کا واقعہ ہے۔ اسی زمانے میں ہم نے پہلی بار بلدیہ کا انتخاب لڑا تھا، اور اپنے حلقے اول بیرون سے کامیاب
ہوکر بلدیہ میں آئے تھے، ہم دوسرے تمام ارکان کے ساتھ کامیاب ہوکر جب بلدیہ میں آئے تھے اس وقت ابھی
زین یار جنگ ہی ناظم بلدیہ تھے، چنانچہ مہدی نواز جنگ کو جائزہ دینے کے بعد کونسل ہال میں زین یار جنگ
نے مہدی نواز جنگ نئے ناظم بلدیہ کا فرداً فرداً ہر رکن بلدیہ میونسپل کونسلر سے تعارف کرایا تھا، اس طرح
سے پہلی بار ہم مہدی نواز جنگ سے متعارف ہوئے تھے، اور ہماری ان کی یہ پہلی ملاقات تادم زیست قائم
اور برقرار رہی۔ ہمارے ان کے شخصی تعلقات بڑھ گئے۔ ہم ان کے گھر جایا کرتے تھے، اور وہ بھی ہمارے
گھر آیا کرتے تھے، چنانچہ آخری بار مرنے سے ایک دن پہلے آئے تھے۔

اس آخری ملاقات کا ذکر ہم نے تفصیلی طور پر صفحا (۱۸) سے آگے اپنے نوٹ میں کیا ہے، اور اس نوٹ
میں مہدی نواز جنگ کی درجہ بدرجہ ترقی کا حال بھی وضاحت کے ساتھ موجود ہے، اس لیے اس نوبت پر
ناظم بلدیہ بننے کے بعد کچھ سے ان ترقیوں کا ذکر بے جا اور بے معنی سا ہے۔ اب ہم ہمارے اور ان کے شخصی
... کہ ایک شخص جو ہم سے عمر میں دس سال بڑا تھا، اور مالی اور معا

اعتبار سے بھی اس کا مقام ہم سے کہیں برتر و بالا تھا، آخر ہمارا اگرویدا اور فریفتہ ہونے کی کیا وجہ تھی؟
اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہماری سچائی - صاف گوئی - صداقت اور حق پرستی نیز خود داری کی دل سے
قدر کرتے تھے۔

اس وقت کی مجلس بلدیا (۳۶) ارکان پر مشتمل تھی۔ تیرا ارکان تیرا حلقوں سے منتخب ہوا کرتے تھے،
اور (۲۳) ارکان حکومت حیدرآباد کے نامزد ہوا کرتے تھے، جو مختلف مفادات کی نمائندگی کرتے تھے۔ ۱۹۲۸ء
سے کارپوریشن کا دوسرا دور شروع ہوا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تھی، اس
لیے تمام اشیائے مایحتاج مہنگی ہو گئیں۔ بلدیا کی مالی حالت بہت ہی خراب تھی، اور اس کا مواز نا صرف
(۲۲) لاک کا تھا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں مہدی نواز جنگ نے مجلس بلدیا کی منظوری سے حکومت حیدرآباد سے
(۴۰) لاک کا قرض حاصل کیا تھا، اس سلسلے میں بلت اور تعمیرات کی کئی ایک نئی اسکیمیں بنائی گئیں۔
نواب صاحب اپنا جو بھی اسکیم پیش کرتے ہماری اکثریت کے ساتھ مجلس سے اس کی منظوری حاصل
کر لیتے تھے۔ جتنے بھی نامزد ارکان تھے ان کے اور نواب صاحب کے تعلقات معتمدی باب حکومت کے
زمانے سے تھے، اور بعض منتخب ارکان بھی اندھا دھند ان کا ساتھ دیدیا کرتے تھے، اور یہ بات بعض
واجبیت پسند منتخب ارکان کو پسند نہیں تھی، چنانچہ بعض مسائل میں ہم اور حکیم سید علی - نواب میر احمد
علی خان - مدیراج - حکیم نارائن داس - شاہ عالم خان وغیرا وغیرا جیسے واجبیت پسند منتخب ارکان
مباحث میں حصہ لیتے اور شدت کے ساتھ نواب مہدی نواز جنگ ناظم بلدیا کی بعض غیر ضروری تحریکوں
کی مخالفت کرتے تھے۔ مذبات میں بعض اوقات ہماری تقریر شدت کے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی تھی،
وہ برسرِ اجلاس مسکراتے ہوئے ہماری اس واجبی مخالفت کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔ اجلاس کے ختم
ہوتے ہی ہم ان کے قریب جاتے اور کہتے کہ نواب صاحب ہمارا دل صاف ہے۔ ہماری جو بھی مخالفت
تھی برسرِ اجلاس تھی۔ ہمیں آپ سے قطعی شخصی مخالفت نہیں ہے۔ وہ بھی کہتے خان صاحب! میرا دل بھی
بالکل آئینے کی طرح صاف ہے۔ آپ سے متعلق میرے دل میں بھی کوئی کدورت یا خیال نہیں ہے، جو بھی
مباحث میں ہوا، اور برسرِ اجلاس ہوا اس کو میں نے بھی بھلا دیا ہے۔ پھر ہم دونوں مسکراتے ہوئے
سینکڑوں آدمیوں کے سامنے گلے ملتے۔ دوسرے ارکان یہ سمجھتے کہ ہم مہدی نواز جنگ کی دعوتوں میں
شرکت نہ کریں گے۔ ان کا یہ خیال غلط تھا۔ ہم مہدی نواز جنگ کی ہر دعوت میں شریک ہوتے تھے، اور
رات میں اجلاس کے بعد وہ ہمیں اپنے ساتھ گھر لے جاکر اپنے سارے ارکان خاندان کے ساتھ ہمیں
کھانا کھلواتے اور پھر اپنی کار میں ہمارے گھر واپس لوٹاتے تھے۔ ان کے گھر کی بنی ہوئی حلیم بہت لذیذ
ہوتی تھی، اور وہ ہمیں بہت مرغوب اور پسند تھی۔ ہم ان کی بیوی کو بہن کہتے ہیں، چنانچہ نواب صاحب
کی موجودگی میں ہم اپنی بہن سے فرمائش کر کے حلیم کھایا کرتے تھے، اور ہماری فرمائش پر نواب صاحب
مسکراتے ہوئے فرماتے، اپنے بھائی کی فرمائش پوری کیجیے تو ہمیں بھی کھانے کے لیے کچھ مل جائے گا۔
جنگ کا زمانہ تھا، ہر چیز مہنگی اور نایاب ہو گئی تھی ہم تمد T.K چائے پیتے اور ہمارے ہاں
آنے والوں کو بھی وہی چائے پلاتے تھے، مگر وہ چائے مشکل سے ملتی تھی۔ ... الیکشن سے پہلے ہمارے
گھر پر کافی مجمع ہوتا تھا۔ ان میں حیدرآباد کے شاعر اور ادیب وغیرا جمع ہوتے، اور خوش باش
وقت گذارنے والے افراد بھی شامل ہوتے تھے۔ شام کے اوقات میں ... صاحب اپنی بیگم صاحبہ
کے ساتھ کار میں آتے، اور دو چار پیکٹ T.K کے لے آتے تھے۔ ... پر کھڑی ہوتی
اور وہ خود پیکٹس لیے ہماری طرف چلے آتے۔ یہ دیکھ کر ہم دوڑ کے دوڑ سے ان کی طرف جاتے، وہ ہم
سے کہتے کہ جائیے آپ اپنی بہن سے باتیں کیجیے، ہم ان شاعروں سے باتیں کرتے ہیں۔ شاعر اور

ادیب بھی ان کی طرف لپکتے اور خوشی کے ساتھ کہتے، بہت اچھا کیا نواب صاحب، جو آپ یہ بسکٹس لے آئے ہیں K.T. ختم ہو گئی ہے، اس لیے ہم سب لوگ لپٹن چائے پی رہے ہیں۔ نواب صاحب ان لوگوں سے باتوں میں مصروف ہو جاتے، اور ہم ادھر کار سے باہر کھڑے ہو کر اپنی بہن سے باتیں کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد واپس ہوتی ہم سب لوگ مل کر انہیں واپس کرتے، اور ہم ان کا دلی شکریہ بھی ادا کرتے تھے۔

انہیں ملاقاتوں میں نواب صاحب کے گھر مشاعرا بھی طے ہو جاتا تھا۔ نواب صاحب سے یہ فرمائش رات شاعر اور ادیب ہی طے کر لیتے تھے۔ ہم اس کی سخت مخالفت کرتے تھے، اس لیے کہ ہر شاعرے کے موقع پر انہیں کافی زیر باری ہوتی تھی۔ کئی آدمیوں کا کھانا۔ رات بھر کی چائے، اور صبح کا ناشتا، اور یہ گرانی باری ہمیں سخت ناگوار تھی، مگر شاعروں وغیرا کی فرمائش کو وہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے تھے۔ چاہے نہ چاہے مجبوراً ہم خد بھی ہر مشاعرے میں شریک رہتے تھے۔

بلدیا سے وہ نوڈ کار پوریشن کے چیرمین بن کر گئے۔ اس کے بعد معتمد یا سکریٹری صنعت و حرفت رہے۔ پولیس ایکشن کے بعد وزیر لیبر اور سوشل ویلفیر بنے۔ حالاکے چیرمین تھے، سالار جنگ اسٹیٹ کے بھی چیرمین تھے اور سوشل ویلفیر بورڈ کے بھی چیرمین رہے تھے۔ جس دفتر میں بھی رہے ہم ان سے ملنے ضرور جایا کرتے تھے۔ ہر دفتر کے پیشی کے چپراسی کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ اگر جی۔ ام۔ خان آئیں تو کارڈ نہیں لے آنا، بلکہ ان کے آتے ہی کمرے کا دروازا کھول دینا، اور جب ہم اندر داخل ہوتے تو بے تپاک طریقے پر ہم سے ملتے۔ اگر اہل غرض موجود ہوتے تو ہم کو اپنے چیمبر میں بٹھایا جاتا، اور اگر وہ اکیلے ہوتے تو بر سر اجلاس ہی ہم دونوں معروف گفتگو ہوتے۔ پرانے شہر میں ان کے اعزاز میں اگر کوئی تقریب ہوتی، اور وہاں ان کی گلپوشی بھی ہوتی تو وہ ہار لے کر سیدھے ہمارے گھر چلے آتے۔ کار سے اتر کر دیوان خانے میں آتے، اور مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتوں سے وہ ہار ہیں گلے میں ڈال دیتے۔ اس کے بعد ہم وہ ہار واپس کرتے ہوئے یہ کہتے کہ یہ ہار ہماری بہن کو لے جا کر دیدیجے، اس لیے کہ حقیقی معنی میں اس ہار کی مستحق وہ ہیں۔ پھر ہم دونوں مل کر باتوں میں معروف ہو جاتے، اور وہ بیان کرتے کہ آج فلاں جگہ تقریب تھی، پرانے شہر میں آنے کے بعد آپ سے ملے بغیر کیسے جاتا، اس لیے یہ ہار لیے سیدے آپ پاس چلا آیا۔

ہمارے حال پر ان کی طرف یہی ایک عنایت نہیں تھی، بلکہ اس سے پہلے بھی بلکل اس نوعیت کی عنایات بے کراں ہمارے شریک حال رہا تھی ان عنایات، نوازشات اور کرم فرمائیوں کو ایک ایک کر کے ہم کہاں تک گنائیں، مختصر یہ کہ جب کبھی وہ پرانے شہر میں مدعو ہوتے تو اسی طرح پھول کے ہار لا کر ہمارے گلے میں ڈال دیتے اور یہ کہتے ہوئے خوش ہوتے کہ، چونکہ آپ اس ہار کے مستحق ہیں، اس لیے یہ ہار لے کر میں اپنے گھر نہیں آیا، بلکہ سیدے آپ پاس چلا آیا۔ اتنے گہرے دوستانا تعلقات کے باوجود، ۱۹۲۸ء میں پہلی ملاقات سے لے کر مرتے دم تک کبھی بھی ہم نے ان سے پیسوں کی ضرورت نہیں بتائی، حالانکہ اس زمانے میں ہم نے فاقے بھی کیے تھے اور طرح طرح کی مالی مشکلات بھی برداشت کی تھیں۔ ہماری اس معاشی زبوں حالی کا ذکر بار نواب میر احمد علی خاں، سابق وزیر حکومت آندھرا پردیش نواب حیدر نواز جنگ بہادر سے کیا تھا۔ نواب صاحب اس سے بے حد متاثر اور متفکر ہوے۔ اس زمانے میں وہ خد وزیر حکومت آندھرا پردیش اور چیرمین سوشل ویلفیر بورڈ بھی تھے۔ اپنی کار میں نواب احمد علی خاں اور رائے جانکی پرشاد مرحوم سکریٹری سوشل ویلفیر بورڈ کو بھی ساتھ لیتے آئے، اور سوشل ویلفیر کے دفتر میں دو سو روپے ماہوار کی ملازمت کا پیشکش کیا۔ ہم نے ملازمت کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے رسالے کے ساتھ کچھ کیجیے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہم نے کہا کہ سوشل ویلفیر کے جتنے بھی دفتر ہیں ان کے نام رسالا جاری کروا دیجیے اور اس کے چندے کی رقم ہمیں پیشگی دلوا دیجیے۔ جانکی پرشاد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ضلا (۱۵) سنٹر ہیں۔ اس وقت رسالے کا چندہ آٹھ روپے سالانا تھا۔ جانکی پرشاد نے کہا، رائے صاحب آپ (۱۵) سنٹروں کے لیے رسالے کا آرڈر دے دیجیے ...

۳ کر بعد میں بھجوا دیجیے، اگر سالانہ چندے کی جملہ رقم ایک سو بیس (۱۲۰) روپے کا ایک آج ہی فلاں صاحب کے حوالے کر دیا جائے ...

شاہد صدیقی

غالب کا غم نامساعد حالات کا نتیجا ہے

علاما اقبال نے اجڑی ہوئی دل میں آرام کرتے ہوئے غالب کا جب ماتم کیا تو گلشن ویمر میں سوے ہوے گوئٹے کا خیال آیا۔ مشرق کے اس بے مثال شاعر کی اپنے زمانے میں ایسی نا قدری ہوئی کہ معمول پڑھے لکھے لوگ اسکے منہ آنے لگے، اور زبان و بیان میں غلطیاں ڈھونڈتے رہے۔ رام پور، کلکتا اور لکھنو کے سفر کیے، اور نامراد رہے۔ کبھی بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں قصیدا لکھے کبھی ملکۂ وکٹوریا کے اور کبھی تجمل حسین خاں کے عیش کی داد دی، بقول خد

"نجم الدولا بہادر — ایک قرض دار۔
بھوگ سنا رہا ہے۔ کرھی سے شراب،
گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا،
میوا فروش سے آم۔ صراف سے
دام، سب قرض کیا زندگی اس بڑے
شاعر کی گذری تھی۔"

بڑے شاعر میر بھی تھے زندگی کی میں ان کا بھی حصا بہت کم تھا، مگر ان کو اس کی فکر کب تھی۔ غالب کو تو زندگی اور اس کی راحت سے محبت تھی۔ اس کے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کیسے کیسے ہات پیر نہیں مارے تھے، اور اس کی محرومی نے انہیں کتنا بے چین نہیں رکھا۔ تمنا رکھتے تھے کہ ایک عالم کے میزبان بن جائیں، اور حال یہ تھا کہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے وہ خد دربدر کی بھیک مانگے۔

خیر یہ تو ان کی زندگی پر ایک نگاہ تھی، لیکن اگر علاما اقبال، غالب کے اس دور میں ہوتے تو انکو یہ حسرت نہ رہی کہ غالب نا قدری کا شکار رہے، اب گر گئے پر انکو رشک نہ آتا۔

مولانا حالی نے "یادگار غالب" لکھی، پھر عبدالرحمان بجنوری "محاسن کلام غالب" لیکر میدان میں آے۔ اسکے بعد ہندستان کے بے مثال ادیب الدم غالب سے آشنا ہوے۔ رشید صاحب کو غالب سے زندگی میں ملنے کی تمنا ہوئی۔ خلیفا عبدالحکیم شیخ اکرام۔ احتشام حسین خاں سب نے غالب پر لکھا، اور ایکدم غالب علی کل غالب ہو گئے۔

غالب کی زندگی۔ غالب کا فلسفا۔ غالب کا فن سب پر اتنا لکھ دیا گیا ہے کہ اب کوئی نیا زاویہ یا پہلو ڈھونڈھ نکالنا قابو سے باہر ہے۔

غالب کو مولانا حالی نے "حیوان ظریف" کہا ہے، پھر بھلا اس حیوان ظریف کے پاس غم کا گذر کیسے ہو سکتا ہے، اسلیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ غالب کا غم یقیناً نامساعد حالات کا نتیجا ہے۔ ان حالات کے بہت کچھ ذمے دار خد غالب تھے۔ غالب نے اپنا معیار زندگی اتنا بلند کر لیا تھا کہ محدود آمدنی میں وہ حسب منشا زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس کے علاوا غالب کو اور بھی بہت سے غم تھے، جس میں تھوڑے تو ان کے اپنے لاے ہوے تھے، اور کچھ کیسے

ہوئے غم تھے، اور بہت کچھ آفات ارضی وسماوی کے پیدا کردہ تھے۔

غالب کے غم کو معلوم کرنے کے لیے ان حالات کا پتا لگانا ضروری ہے، جس کے سبب وہ اس غم والم سے دو چار ہے۔

مرزا غالب مغلیا دور کے بہترین ترجمان تھے، وہ تمام خصوصیات جو مغلوں میں عام تھیں، وہی غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں نظر آتی ہیں۔

غالب ایک پرآشوب دور میں پیدا ہوئے، انہوں نے مغل حکومت کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غالب کو مغلیا حکومت سے جو وابستگی تھی، اسی کی بنا پر عہد مغلیا کا یہ زوال انہوں نے محسوس کیا۔ یہ غم بھی ان کے لیے بڑا شدید تھا، انہیں اسی کرب انگیز کرنا پڑا۔ اسکی وجہ سے ان کی ذاتی زندگی کو مایوسی اور ناکامی کے علاوہ کچھ اور نہ حاصل ہوا۔

اس عظیم الشان عہد کے مٹنے کے بعد ایک نئی حکومت کا تسلط ہو رہا تھا، جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ باعث خیر ہوگی یا باعث شر۔

اسکے علاوہ غالب جس دور میں رہ رہے تھے، وہ ایک شکست خوردہ معاشرا تھا۔ ان ناساعد حالات کی بنا پر ان کی مایوسی اور محرومیاں بڑھ گئیں اس قدیم تہذیب کے زوال کا بہترین بیان ان کے اس قصیدے میں ملتا ہے جو ملکۂ وکٹوریا کی تعریف میں کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے کلام میں ان کی ذاتی زندگی کی محرومی اور ماحول کی مایوسی کا ایک عجیب امتزاج ملتا ہے، گویا دونوں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ الگ نہیں کیا جا سکتا خود کہتے ہیں ؎

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

غالب کو اس نظام کی شکست وریخت کا بھی بہت غم تھا، اسکے باوجود انہوں نے قضا وقدر کے نظریے کو اپنا کر اپنی غم زدہ طبیعت کو بہت کچھ سکون دیدیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ زندگی میں خوشی اور غم لازم وملزوم ہیں، وہ خود یہ کہکر اپنے کو تسکین دیدیتے ہیں کہ ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

حالات نے غالب کو مایوسی اور محرومی کے سوا کچھ نہ دیا، لیکن اس کا مقابلہ انہوں نے نہایت جرات سے کیا، اور بڑے سے بڑے غم کو انگیز کرکے اسکے ساتھ مصالحت کر لی، وہ شدید مصائب کو بھی جھیل جانے کا سلیقہ سیکھ گئے تھے ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

زوال آمادہ عہد کے علاوہ غالب کے بہت سے ایسے غم تھے جو ان کی ذاتی زندگی سے عبارت تھے۔ مرزا کا بچپن بھی ایسا گذرا تھا، جس میں انکو محبت کرنے والی عزیز ترین ہستیوں کے غم سہنے پڑے۔ یہ ہستیاں ان کے باپ اور چچا تھے۔ مرزا غالب کا ننیہال اور سسرال دونوں بہت متمول تھے۔ ان کے بچپن کا بیشتر حصہ انکے ننیہال میں گذرا۔ ننیہال میں پرورش پانے سے احساس برتری کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہاں کے رئیسانہ ٹھاٹ کی وجہ سے انہوں نے زندگی کا اعلا معیار بنا لیا تھا جو بعد میں ان کو نہ حاصل ہو سکا اس بلند معیار کو نبھانے کے لیے وہ طرح طرح سے جدوجہد کرتے رہے، اور روپیا حاصل کرنے کے سارے وسایل کام میں لاتے رہے۔ انہوں نے آخر دم تک ہار نہ مانی، لیکن پھر بھی انسان تھے اسلیے شکست خوردگی کا احساس انکو بے چین کر دیتا تھا، اور وہ بعض وقت جھنجلا کر شکوا کر ہی بیٹھے تھے۔ کبھی آسمان کو سارے ظلم وستم کی وجہ سمجھتے تھے، اور طنزیا انداز میں کہتے ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب! دشمن آسماں اپنا

مرزا غالب کو مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا ان کا ذریعے آمدنی بہت محدود تھا، اور اخراجات ضرورت سے زیادہ اسلیے ان کا مقروض ہونا بھی لازمی تھا۔ قرض کی ادائیگی کے لیے مرزا کو دوسروں کے آگے ہات پھیلانا پڑا۔ جو ان کی غیور طبیعت کے قطعی منافی تھا۔

قرض خواہوں سے کسی صورت میں نجات نہیں ملتی تھی۔ ان کے تقاضوں سے الگ تنگ تھے، غرضکہ مرزا کو معاشی اور مالی ہر طرح کی پریشانیاں برداشت کرنی پڑیں۔

اسکے بعد پنشن کا ضبط ہونا بھی ایک ستم ہو گیا۔ پنشن کی وصولیابی کے لیے ان کو دور دراز کے سفر کرنے پڑے، پھر بھی خاطر خواہ فائیدا نہیں ہوا اس کی وجہ سے وہ ہزاروں روپے کے مقروض ہو گئے مقدمے کا فیصلا بھی غالب کے خلاف ہوا۔ انگریزوں کے بارے میں ان کی اچھی رائے تھی، اور ان سے بہتر توقعات رکھتے تھے، لیکن یہاں بھی ان کو مایوسی ہوئی، اس طرح ان کے یہاں محرومی کا احساس بڑھتا گیا، اسلیے کبھی وہ گھبرا کر موت کی آرزو کرنے لگتے تھے، نتیجے کے طور پر اس طرح کے اشعار ان کے قلم سے نکلنے لگے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے، پر نہیں آتی

مرزا غالب کے غموں کے بہت سے محرکات تھے، ان کے عزیزوں نے اچھا برتاو نہیں کیا، اور دھوکا دیا۔ سب سے بڑا غم چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی موت کا تھا، ان کا انتقال عین جوانی میں عجیب و غریب حالات میں ہوا۔ یہ غم مرزا کے لیے انتہائی شدید تھا، اور اسی وجہ سے وہ ترک دنیا کی طرف مائل ہو گئے تھے ان کے یہ اشعار اسی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب کی زندگی کا بڑا المیا یہ بھی تھا کہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عارف کو انہوں نے اپنا بیٹا سمجھا تھا، اور اسی محبت و شفقت سے ان کو پالا تھا، لیکن وہ بھی عین عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ یہ غم بڑا جانگسل ثابت ہوا، اور

مرزا کو اس سے روحانی کرب و اذیت سے گذرنا پڑا، جس کا اظہار انہوں نے ایک   کی شکل میں کیا ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اسکے علاوا غالب کی ایک مرثیا نما غزل بڑی پیاری ہے، یہ مرثیا انہوں نے اپنی محبوبا کی یاد میں لکھا تھا۔ اپنی محبوبا کا ذکر بھی انھوں نے اکثر خطوط میں کیا ہے، اسکے مرنے کا غم بھی بہت گہرا تھا، کیونکے اس مرثیے کے لفظ لفظ سے درد و اثر کا اظہار ہوتا ہے ؎

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

غالب کو اپنے خاندان اور پیشۂ سپہگری پر بڑا ناز تھا، اسی نسلی برتری کی وجہ سے ان میں انانیت کا جذبا پیدا ہو گیا۔ اپنی خاندانی عظمت اور بڑائی کے آگے سب کو ہیچ سمجھتے تھے اور بڑے فخر سے کہتے ع

"سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری"

مگر جب قمار بازی کے جرم میں مرزا کو گرفتار کیا گیا تو انکو بہت صدما ہوا۔ انکو اپنی عزت اور وقار کے سارے ایوان مسمار ہوتے نظر آئے، حالانکے گرفتاری کی یہ مدت بہت مختصر سی تھی، مگر غالب کی عزت نفس کو اس سے کاری ضرب لگی، انہوں نے مفتنہ کو ایک خط میں اپنی توہین کا حال بڑی افسردگی اور درد سے لکھا ہے ؎

"سرکار انگریزی میں بڑا بار رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، اب بدنام ہو گیا ہوں، اور ایک بڑا دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا، مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں"

غالب کو اپنی ناقدری کا بہت احساس تھا،

اس کا اور زیادہ ملال تھا کہ ان کا مقابلہ ایسے لوگوں سے کیا جاتا ہے جو کسی صورت سے ان کی ہمسری کے لائق نہیں، ان کی پزیرائی جیسی کہ وہ چاہتے تھے، اس دور میں نہ ہو سکی - اس بات کا ان کو بہت قلق تھا. اپنے ہم وطنوں سے شکایت بھی کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے دیار میں بےکسی کے خوف سے مرنا بھی نہیں چاہتے ؎

مجکو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

شہرت اور ناموری کی خواہش ان کو ہمیشہ رہی، لیکن غم سے دوچار رہے ؎

از بس کہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی تھا

بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوق کا سر آنکھوں پر بٹھایا جانا ان کو بہت شاق گذرتا تھا. مرزا کی خواہش تھی کہ بادشاہ کے سارے لطف و کرم بس ان کے لیے مخصوص ہوں، کیونکہ ذوق کو وہ اپنے مقابلے میں گردانتے ہی نہیں تھے اور اس کی وہ دوسروں سے توقع کرتے تھے کہ سب ان کی سخن فہمی کو مانیں -

قسمت کی ستم ظریفیوں کے وہ ہمیشہ شکار رہے ۱۸۵۷ء سے غدر میں پنشن اور قلعے کی تنخواہ دونوں بند ہو گئی - قیمتی مال و اسباب جس جگہ رکھا تھا وہ بھی لٹ گیا -

ان ہی الجھنوں نے ان کو بڑا پریشان رکھا، پھر بھی ان کی شخصیت کی جو سب سے نمایاں چیز "انا" تھی اس کی مدد سے انہوں نے صبر آزما حالات کا مقابلہ بڑی پامردی اور دلیری سے کیا - وہ اپنی اس "انا" کی بدولت اپنے علاوہ دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، لیکن بعض اوقات وہ اپنے عمل سے خود بیزار نظر آنے لگتے ہیں ؎

مانا بڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

[illegible]
[illegible]

غالبؔ پے در پے غموں کی وجہ سے زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں قسمت کی ستم ظریفی سے خائف اور اللہ میاں سے شکایت کرنے لگتے ہیں - ایک عجیب بیچارگی حسرت و افسردگی کا احساس ہونے لگتا ہے خود کہنے پر مجبور ہوتے ہیں ؎

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پہ نہیں آتی

غالبؔ سب کو خوش دیکھنے کی دیرینہ تمنا اپنے دل میں رکھتے تھے - حد یہ کہ وہ اس شہر میں رہنا تک پسند نہیں کرتے جہاں ان کو کوئی بھوکا ننگا نظر آئے، جس شخص کے دل میں دوسروں کا درد اتنا ہو وہ بھلا کیوں کر آسودہ خوش یا مطمئن رہ سکتا ہے، غم دوراں کی فکر میں وہ ہمیشہ گھلا کرتے تھے -

غالبؔ اپنی ازدواجی زندگی سے خوش و مطمئن نہ تھے، شادی کو ہمیشہ حبس دوام اور بیوی کو پھانسی کے پھندے اور طوق و بیڑی سے تشبیہ دیتے، بلکہ ان کو ہمیشہ کسی شوخ و شنگ کی تلاش تھی، جو ان کے دل کو ایک میٹھی خلش سے بھر دے، ہر ادا، ہر انداز ان کے سکون دل کو ڈھانے کے لیے ہو ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

ظاہر ہے یہ اشعار غالبؔ کی لذت پرستی کی دلیل ہیں - یہ ہیولا ان کا بنایا ہوا تھا، مگر اس بھرپور جمالیت کو اس منفی آتش نفس کی تلاش ختم کر دیتی ہے جس کی صدا ان کے لیے جلوۂ برق فنا ہے -

غالبؔ زندگی بھر رنج و الم میں مبتلا رہے، ہر [illegible] زمانے کے ظلم و ستم

رقیبانہ چشمکیں، اقتصادی بدحالی۔ آخر وہ بھی ایک انسان تھے کوئی پتھر نہیں اسلیے بے اختیار کہہ دیتے تھے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

لیکن غالب اپنے آپ کو تسکین بھی دے لیتے ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بعض اوقات ان ناسا عد حالات میں وہ درد و کرب سے گذرتے اور اللہ میاں کو بھی نہیں بخشتے تھے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اللہ میاں کے بارے میں ان کے دل میں شک پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہیں بھی یا نہیں جو ان کو اتنے مصایب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

غالب کے ارمانوں اور خواہشوں کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ قدرت نے ان کو نہ جانے کتنا ارمان بھرا دل عطا کیا تھا۔ ظاہر ہے سب کی تکمیل ہونی تو ناممکن تھی، اس کی وجہ سے غالب کی غمگینی بڑھتی جاتی تھی، خود کہتے ہیں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان کی افسردگی میں ایک چبھن ایک جلن سی تھی ؎

آتش دوزخ میں وہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے
اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی جلادے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی
جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

غالب کو اپنے غم و الم کا مداوا ہوتا نظر نہیں آتا تھا کوئی ایسا نہیں ملتا تھا جو ان کے غموں کو ہلکا کر سکے اس لیے وہ طنزیہ لہجے میں شکایت کرتے ہیں ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

وہ موت کو اپنے غموں کا علاج سمجھتے ہیں ؎

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

پھر بھی وہ ان پر آشوب حالات میں بھی اپنی بلند حوصلگی کا ثبوت دیتے رہے ؎

یہ نعش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غم دوراں کے ساتھ غم جاناں بھی غالب کی زندگی کے ساتھ تھا، غالب ایک جذباتی انسان تھے، جن کی فطرت میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اپنی انفرادیت کا بڑا احساس تھا وہ میر کی طرح دور سے جلووں کے قایل نہ تھے، بلکہ حسن کا قرب چاہتے تھے۔ محبوب کی بے اعتنائی اور غیر سے اس کی رسم و راہ ان کے لیے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے، اور تو وہ کچھ کر نہ سکتے تھے۔ ہاں اپنے طنز کے تیروں کی بارش ضرور کرتے ؎

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

غالب محبوب کی ہر ہر ادا پر نثار ہوتے ہیں، وہ اس کی بے نیازی اور بے تعلقی کو ایک ادائے دلربانہ سمجھتے ہیں، لیکن محبوب کبھی ان کے ساتھ وفا نہیں کرتا، اس لیے وہ نہایت سادگی سے کہتے ہیں ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

لیکن ہر معاملے میں مایوسی اور ناکامی نے ان کو بہت دل گرفتہ کر دیا تھا۔ حالات زمانہ ان کے لیے انتہائی ناسازگار ثابت ہوئے، اس کے لیے وہ اپنی قسمت کو ذمے دار ٹھہرانے لگے۔ اب ان پر محبوب کی عنایتوں اور نوازشوں کا بھی اثر نہیں ہوتا تھا، کیونکہ محبوب کی خصوصیت [illegible] ان کے غم کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔ اتنے سارے [illegible] محبوب کی ان سے الفت بہت کم درجہ رکھتی تھی، اور وہ انتہائی حسرت و افسردگی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب غم کی انتہا میں سب کچھ کہہ تو جاتے ہیں، لیکن بعد میں ان کو اس کا احساس ہوتا ہے، اور وہ معذرت کرنے لگتے ہیں ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس مقام پر پہنچ کر بھی وہ اپنے دل میں حسرت تعمیر رکھتے ہیں۔ یہ غالب جیسے حوصلہ مند آدمی کا کام ہے، وہ نفسیات انسانی کے بڑے نباض ہیں کہتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

غالب غم کا اظہار بڑی بلند آہنگی سے کرتے ہیں ؎

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

غم کی انتہا میں وہ دنیا کو ہیچ اور بچوں کا تماشا سمجھنے لگتے ہیں ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

غالب یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا میں ان سے زیادہ الم رسیدہ لوگ ہیں، اور اس طرح ان کو صبر آ جاتا ہے، خود اپنے آپ کو یہ کہکر تسلی دے لیتے ہیں ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

ان تمام باتوں کے باوجود یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غالب کا سارا غم ناسازگار حالات کا پیدا کردہ تھا، ورنہ فطری طور پر وہ انتہائی رجائی واقع ہوئے تھے، شدید سے شدید غم کی وہ پروا نہ کرتے تھے، حد یہ کہ تعزیت کے موقع پر بھی وہ اپنے ظریفانہ انداز سے باز نہ آئے۔

حالی نے ان کو "حیوان ظریف" کچھ غلط نہیں کہا تھا، کیونکہ خود غالب کے اشعار سے ان کی اس افتاد طبع کا اظہار جا بجا ہوتا ہے، مثلاً ان کے یہ اشعار ؎

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

غالب کے یہ اشعار ان کی شوخی و ظرافت کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن باوجود وہ اپنی فطری شوخی اور ظرافت کے باوجود مخالف کے بیوتکوں کا شکار رہے، اور ناساعد حالات نے ان کے غموں کو اور جلا بخشی۔

اتنی مہنگائی کا عالم کہاں تھا پہلے

اتنی مہنگائی لگاتار کہاں تھی پہلے
زیست اس درجہ گراں بار کہاں تھی پہلے
ہر نفس موت کا دیتا تھا کہاں پہلے پیام
سانس اک چلتی ہوئی تلوار کہاں تھی پہلے
بے ضمیری تو نیا روگ نہیں ہے مانا
قوم کی قوم ہی بیمار کہاں تھی پہلے
چور بازاری کو حاصل تھا کہاں اتنا فروغ
یوں گراں سر بازار کہاں تھی پہلے
دانے دانے کے لئے لوگ کہاں تھے محتاج
بھوک یوں در پئے آزار کہاں تھی پہلے
بغض و نفرت کے ارادوں کو اماں دینے
دوستی سایۂ دیوار کہاں تھی پہلے
دیکھتی ہے نہ یہ سنتی ہے ہمارا احوال
اندھی اور بہری یہ سرکار کہاں تھی پہلے

[illegible]

نسیم انہونوی، ایڈیٹر "حریم"

اگر فردوس بر روئے زمین است

ٹورسٹ سنٹر کے کمپاونڈ کے اندر نہ ٹیکسی آسکتی ہے نہ ٹانگا نہ باہر کے قلی دو تین ٹھیلے ہیں جن پر سامان بار کرکے باہر لایا جاتا ہے۔ کچھ قلیوں کو اس کا مجاز کردیا گیا ہے، اور وہی اس سامان کو بسوں سے اتار کر باہر لے جاتے ہیں، اور نئے مسافروں سے من مانی رقم وصول کر لیتے ہیں، اس لیے کہ انہیں قوانین کا علم نہیں ہوتا، وہ اتنے پریشان وارد ہوتے ہیں کہ ان سے تہنک کرنا پسند نہیں کرتے انہیں ٹھیلوں پر سامان لدوا کر جہانگیر میاں ہمیں باہر لائے۔ ٹھیلے والوں نے اس پچاس گز کے فاصلے تک سامان لانے کے دس روپے چارج کیے، سامنے ہی ٹیکسی اور ٹانگا اسٹینڈ ہے۔ سامان اتنا زیادہ تھا کہ ٹیکسیوں پر اسے لے جانا دشوار تھا، اس لیے ٹانگے لیے گئے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کا بنگلا شہر کے گویا دوسرے سرے پر ہے، اسکے بعد شہر کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ بارامولا روڈ اس بنگلے کی مغربی سرحد ہے اس کے بعد ملٹری کیمپ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح ٹورسٹ سنٹر گویا شہر کے مشرقی سرے پر ہے، اور نرسنگ گڑھ مغربی سرے پر۔ فاصلا غالبًا ۲½ میل ہوگا۔ جہانگیر میاں ہمیں گائیڈ کر رہے تھے۔ ٹانگے وسط شہر سے گذرتے، لال چوک اور امیرا کدال کو پیچھے چھوڑتے ہوئے کرن چوک اور پھر نرسنگ گڑھ پہنچ گئے۔ یہ نئی آبادی ہے جو چند سال کے اندر ہی تعمیر ہوئی ہے، اس لیے نہایت صاف ستھری اور کشادہ ہے۔ مکانات تقریبًا ایک ہی وضع کے بنے ہوئے ہیں، اور ہر مکان میں چھوٹے چھوٹے گارڈن بھی ہیں، جن سے یہاں کی خوبصورتی اور بڑھ گئی ہے۔ جب ہمارے ٹانگے ڈاکٹر حیدری صاحب کے بنگلے کے بالکل قریب پہنچ گئے تو ٹانگے پر سے ایک پیکٹ ٹانگے والے کی حماقت سے گر گیا۔ اس میں اچار چٹنیوں کی شیشیوں کے ساتھ ہی گھی کا ڈبا بھی تھا جو کھل گیا، اور تقریبًا تمام گھی سڑک پر بہہ گیا۔ بہر حال جو کچھ بچ سکا اسے سنبھال کر رکھ لیا گیا۔ ہمارے میزبان ڈاکٹر حیدری صاحب بھی اسی وقت کالج سے واپس آتے ہوئے مل گئے۔ سامان اتروانے کے لیے نہ جانے کیسے ایک آدمی کا بھی انتظام ہو گیا تھا، جس نے ہمارا سامان اوپر کی منزل پر پہنچا دیا اس کے بعد ہم کو کبھی کوئی مزدور یا قلی شہر میں کبھی نہ ملا، جیسا کہ دوسرے شہروں یا پہاڑی اسٹیشنوں پر مل جاتے ہیں۔ جب بھی شہر کے کسی بازار میں سامان خریدا خود ہی اس کے قلی بنے اور تانگے یا ٹیکسی پر رکھوا کر لائے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ یہ زمانا دھان بونے کا ہوتا ہے، اس لیے دیہات کے لوگ جو حمالی کرتے ہیں دیہاتوں کو چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر حیدری صاحب کا بنگلا تین منزلا ہے۔ نیچے کی منزل میں ان کا شاندار ڈرائنگ روم، مطالعے کا کمرا، اور رہایش کے کمرے ہیں، اوپر کی منزل میں ان کی ہمشیرا صاحبا ان کے شوہر فدا صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے فرزند ارجمند جہانگیر میاں رہتے ہیں۔ اگلی منزل کے دو کمرے جن میں سے ایک بڑا ہال تھا، ہمارے لیے قالینوں اور مسہریوں سے آراستا تھے۔ پاس ہی

باورچی خانہ اور باتھ روم تھا، یہ جگہ اتنی صاف ستھری، کشادہ، ہوادار اور آرام دہ تھی کہ پھر کسی دوسری جگہ کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوسکی۔ اس وقت ہم سب بے حد تھکے ہوئے تھے، پھر بھی جلدی سامان سیٹ کیا جانے لگا۔ جگہیں تقسیم ہونے لگیں، بستر لگائے گئے، تھوڑی ہی دیر بعد حیدری صاحب نے چائے اور ناشتا لگوادیا، بڑی حد تک تو کسل آرام دہ قیام گاہ پاکر ہی دور ہوگیا تھا۔ سری نگر جیسی جگہ میں اس آسانی سے ایسی جگہ کا مل جانا نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا، رہا سہا کسل چائے نے دور کردیا۔ اس کے بعد سب کو نہانے کی فکر ہوئی۔ گو ڈاکٹر حیدری صاحب نے پانی کا کسی حد تک انتظام کردیا تھا، لیکن تیرہ آدمیوں کے غسل کے لیے جتنا پانی درکار تھا، اس کا تیرھواں حصہ بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ اس سال برف باری کم ہونے کے باعث سری نگر میں پانی کا قحط ہے۔ نل کو پریشر کی کمی کے باعث اتنا نیچا کردیا گیا تھا کہ بہت ہی کم اونچی بالٹی ہی اس کے نیچے لگائی جاسکتی تھی۔ پانی قطروں کی صورت میں نکلتا تھا۔ ایک لوٹا پانی بھی دس منٹ سے کم میں نہ بھرتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اوپر کی منزل میں پانی اسٹور کرنا آسان نہ تھا پھر بھی ہم سب نہائے بغیر چین نہ پاسکتے تھے، اس لیے اس احتیاط اور کفایت کے ساتھ ہم نے غسل کیا جیسے کہ پانی سے نہیں دودھ سے نہا رہے ہوں، یا یوں سمجھیے کہ جسموں کو اسپنج کردیا گیا تھا۔ بہرحال ہم سب غسل کرکے اور لباس میں تبدیلی کرکے جامے سے انسانیت میں آگئے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کھانا لگوادیا۔ اس وقت اگر ڈاکٹر صاحب نے یہ انتظام نہ کیا ہوتا تو شاید ہم سب یوں ہی سو رہتے۔ اس لیے کہ سامان ہوتے ہوئے بھی اس وقت کھانا تیار نہ کیا جاسکتا تھا اور نرسنگ گڑھ مرکز شہر سے جہاں ہوٹلیں وغیرہ ہیں کافی دور تھا، پھر معلومات بھی نہ تھیں کہ کس ہوٹل میں کیا ملتا ہے اور کیا نہیں ملتا۔

کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگوں کی میٹنگ ہوئی کہ صبح سے کیا ہوگا۔ برتن اور باورچی خانے سے متعلق تمام سامان نکال لیا گیا تھا۔ باورچی خانہ ڈاکٹر صاحب کی ہمشیرہ صاحبہ کا تھا، لیکن اس پر ہمارا قبضہ ہوگیا تھا۔ بیگم فدا صاحب نے اپنا سامان ایک کونے میں کرکے اسے ہمارے حوالے کردیا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ بلا تکلف جس سامان کی ضرورت ہو لے لیا جائے۔ انہوں نے اور محترم ڈاکٹر حیدری صاحب نے جس خلوص محبت اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا اس سے ہم سب اتنا متاثر ہوئے کہ کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔

تسنیم سلمہ کے پیروں میں سنیچر سوار رہتا ہے۔ انہیں ایک گھنٹہ بھی کہیں بیٹھا رہنا گوارا نہیں ہوتا۔ کھانا کھاتے ہی وہ باہر چلے گئے اور ایک گھنٹے کے بعد لال چوک وغیرہ گھوم کر لوٹے۔ صبح کے لیے مکھن ڈبل روٹی اور کنڈنس ملک وغیرہ لیتے آئے۔ ماسٹر حاجی اصغر علی صاحب بھی نرسنگ گڑھ ہی میں حاجی صاحب کی کوٹھی چلے گئے تھے، جہاں لکھنؤ کے مشہور تاجر جناب زین العابدین عرف جنن صاحب کا قیام تھا۔ موصوف سے ماسٹر صاحب کے قریبی تعلقات ہیں۔ دس بجے کے قریب وہ بھی واپس آگئے، اور ہم سب نے سری نگر میں پہلی رات نہایت ہی سکون سے گذاری۔

غسل کی خواہش صبح بھی سب کو محسوس ہورہی تھی، لیکن پانی کی کمی کے باعث ہاتھ منھ دھونے یا وضو کرنے تک پر اکتفا کی، اور وہ بھی بڑی کفایت کے ساتھ۔ حیدری صاحب کے یہاں بھی اسٹو وہی چلتا ہے۔ ہم بھی اسٹو ساتھ لائے تھے، اس لیے ناشتا تیار ہونے لگا۔ چھوٹے کمرے کی جو کھڑکیاں مغرب کی طرف کھلتی ہیں ان سے بارہ مولا جانے والی سڑک تو بس چند قدموں ہی کے فاصلے پر ہے۔ اس طرف دور پر پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں نظر آئیں۔ یہ سلسلۂ کوہ دور تک پھیلا نظر آتا ہے۔ دیکھنے میں ہم اس کا فاصلہ چند میل سے زیادہ نہیں سمجھ سکتے، لیکن معلوم ہوا کہ وہ گلمرگ سے بھی آگے کھلن مرگ کے پہاڑ ہیں اور وہاں کا فاصلہ ۳۰ میل کے قریب ہے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اس سال کشمیر میں برف باری بہت کم ہوئی تھی اور اسی وجہ سے ان پہاڑی چوٹیوں پر برائے نام ہی برف نظر آتی تھی۔ معلوم ہوا کہ عام حالات میں

اس سے کہیں زیادا برف چمکتی رہتی ہے۔

ٹورسٹ سنٹر کے قریب ہی ایک بلند پہاڑی ہمیں نظر آئی تھی، اس پر ایک مندر بھی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ مسلمان اسے تخت سلیمان کہتے ہیں، اور ہندوؤں نے اسے شنکر اچاریا کا نام دے رکھا ہے۔ اس چوٹی تک جانے کے لیے موٹر روڈ نہیں ہے، اور پیدل اتنی بلند چوٹی پر ہمارے پارٹی کے صرف شمیم میاں ہی جا سکتے تھے، اور وہ کسی روز تنہا وہاں ہو آئے تھے، اس لیے وہ جہاں بھی جاتے ہیں زمین کا گز بن جاتے ہیں اور کوئی جگہ ایسی نہیں جسے نہ دیکھیں۔ سری نگر کا کونا کونا انہوں نے چھان مارا۔ سائیکل لے کر ہر ہر سڑک اور ہر ہر محلے میں گھومے پھرے، اور شہر کا پورا حدود اربعا معلوم کر لیا، جبکہ میں سری نگر کا صرف ایک محدود حلقا ہی دیکھ سکا۔ بہر حال ٹورسٹ سنٹر سے نرسنگ گڑھ تک ہمیں پہاڑ کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو سکا۔ معمولی سا نشیب و فراز بھی کسی طرف نظر نہ آیا، اگر حیدری صاحب کے بنگلے کی مغربی کھڑکیاں نہ کھلتیں اور ہم کھیلن مرگ کے سلسلۂ کوہ کو نہ دیکھتے تو یہ خیال بھی نہ آتا کہ ہم ہزاروں فٹ کی بلندی کے کسی پہاڑی علاقے پر ہیں۔ اصل میں کشمیر کو سب سے بڑی شہرت اسی باعث حاصل ہے کہ اتنی بلندی پر بھی اس میں ایسی ایسی طول طویل وادیاں ہیں جن میں سری نگر جیسا عظیم شہر آباد ہے۔

سری نگر کشمیر کا قلب ہے۔ سیاح پہلے یہیں آنے پر مجبور ہے، اس لیے کہ مضافات کے قابل دید مقامات دیکھنے کے لیے سری نگر ہی سے ہر جگہ جایا جا سکتا ہے، اور اسی وجہ سے یہ شہر ہمہ وقت سیاحوں سے بھرا رہتا ہے۔ روزانا سینکڑوں سیاح ہوائی جہاز سے آتے ہیں اور صدہا بسوں اور ٹیکسیوں سے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سری نگر تک ہوائی جہاز سے ہی آنا چاہیے۔ بس اور ٹیکسی کا رستا لوگ کفایت کے پیش نظر یا مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ اول الذکر کے لیے تو خیر مجبوری ہے، لیکن مناظر کے خیال سے اس پل صراط کو طے کرنا دانشمندی کا فعل نہیں، کیونکہ رستے کے مناظر اگر دلکش کہے بھی جائیں تو رستے کی صعوبتیں ان کی دلکشی محسوس نہیں ہونے دیتیں، پھر سری نگر پہنچنے کے بعد مضافات میں جو مناظر ہیں وہ رستے کے نظاروں سے کہیں زیادا دلفریب ہیں۔

سری نگر میں بھی سرکاری راشن کی دکانیں ہیں، اور حیرت انگیز کم قیمت پر ان سے شہریوں کو راشن دیا جاتا ہے۔ بازار میں نرخ بہت زیادا ہے، اس لیے سیاح بھی اگر ضرورت ہوئی تو راشن کارڈ بنواتے ہیں۔ ہمیں بھی راشن کارڈ بنوانا تھا، اس لیے بازار سے مہنگی جنس خریدنے سے پہلے کارڈ بنوا لینا ضروری تھا، چنانچہ میں ناشتے سے فراغت حاصل کر کے ٹورسٹ سنٹر کے لیے روانا ہوا۔ قیام گاہ سے ۲ - ۳ فرلانگ تک کوئی سواری نہیں ملتی کرن چوک پہنچکر میں نے ٹیکسی کرنا چاہی، مگر نہ ملی، تانگے تھے، اس لیے ایک تانگا تین روپے پر ٹورسٹ سنٹر کے لیے طے کیا۔ تانگا کچھ ہی دور گیا تھا کہ رک گیا، اور ایک ضعیف سے شخص تانگے والے کے برابر بیٹھ گئے۔ قبل اس کے کہ میں اعتراض کرتا، خود تانگے والے نے کہا، یہ میرا والد ہے، میں سمجھا کہ وہ بڈھا اس کا باپ ہوگا، لیکن لال چوک میں اترتے ہوے بڈھے نے تانگے والے سے مصافحہ کیا اور اتر گیا، پھر تانگے والے کا ہات جیب کی طرف گیا تو میں سمجھ گیا کہ بڈھے نے پیسے دیے ہیں، اور یہ کہ یہ اس کا باپ نہیں تھا، مگر میں خاموش رہا۔ کچھ دور اور جانے کے بعد پھر ایک جگہ تانگا آہستا سے رکا اور ایک آدمی آ کر تانگے والے کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھ سے اب صبر نہ ہو سکا، میں نے کہا تین روپے اس لیے نہیں دیے ہیں کہ تم سواری بٹھاتے چلو اس نے کہا۔ یہ سواری نہیں ہے جناب والا۔ مجھے غصا آ گیا، اور میں نے کہا سواری نہیں ہے تو کیا جانور ہے۔ تم اسے اتار دو، ورنا میں اتر جاؤں گا۔ میرا موڈ دیکھ کر آخر اس نے سواری اتار دی۔

"تانگے والے میں نے کسی جگہ بھی شریف نہیں دیکھے، لیکن جتنے بدمعاش اور بدتہذیب سری نگر کے تانگے والے ہیں، ویسے پہلے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ حد یہ ہے کہ یہ ہمارے ماسٹر اصغر علی صاحب کا داڑی کا

بھی خیال نہ کرتے تھے جس پر بہرحال جگہ لوگ جدا ہوتے رہے، جیسا کہ بعد میں تجربہ ہوا۔ اس روز سے میں نے تنہا جانے کے لیے پورا تانگا نہیں کیا۔ سری نگر میں یہ بات معیوب بھی نہیں سمجھی جاتی۔ ایک ہی تانگے میں مختلف سواریاں بیٹھ کر سفر کرتی ہیں، یہاں تک کہ پردہ پوش اور بے پردہ مسلم ہندو خواتین بھی بے تکلفی سے آ کر بیٹھ جاتی ہیں۔

ٹورسٹ سنٹر پہنچکر میں نے راشن کارڈ کا فارم بھرا۔ دوسری تفصیلات کے ساتھ ہی یہ بھی دریافت کیا گیا کہ قیام کہاں ہے، اور میں نے جواب دیا۔

کارڈ جلد ہی بن کر مل گیا۔ آٹا اور چاول تو کافی ملا، مگر شکر ۱۳ آدمیوں کو ۲۰ روز کے لیے صرف ۵ کلو دی گئی یعنی فی کس ۱۳ گرام یا سوا تولے یومیہ، جبکہ شمیم سلما ۲۵ - ۲۵۰ گرام شکر روزانہ چائے وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال راشن کارڈ لے کر میں ٹیکسی لی، اور سیدھا بازار آ گیا۔ یہاں کشمیر کے سب سے بڑے تاجر کتب غلام محمد اینڈ سنس کی دکان ہے۔ دفتر میں تو سیل ٹورک کے لیے مجھے انہیں کا پتا دیا تھا، خود غلام محمد صاحب دکان پر موجود نہ تھے۔ وہیں سے میں نے میاں محمد شفیع صاحب کو فون کیا، لیکن بات نہ ہو سکی۔ موصوف کا پتا بھی ادھورا ہی تھا، اس لیے میں نے انہیں تلاش کرنا شروع کیا۔ متعدد حضرات سے معلوم کیا، مگر تفصیلی پتا نہ ہونے کے باعث مکان کا ملنا دشوار ہو گیا۔ بڑی دقت کے بعد ایک صاحب نے صحیح نشان دہی کی اور میں مکان پہنچ گیا، لیکن وہ مقفل تھا، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ میاں محمد شفیع اپنی نئی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے، اور یہ مکان خالی پڑا ہے۔ اسی کو موصوف مجھے قیام کرنے کے لیے دینا چاہتے تھے۔ جہلم میں تیسرے پل کے پاس بالکل جہلم کے کنارے، یہ مکان قلب شہر میں ہے، اگر اس میں قیام ہوتا تو ہر جگہ آنے جانے کی جو دشواریاں ہوئیں وہ نہ ہوتیں، لیکن ڈاکٹر اکبر حیدری کا مکان اب چھوڑا نہ جا سکتا تھا۔ وہ بہرحال نیا تعمیر شدہ تھا اور نہایت صاف ستھری کالونی میں تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب اور ان کے متعلقین کا پر خلوص انداز

میزبانی ایسا تھا۔ اس سے دامن چھڑا کر چلا آنا کفران نعمت کے مترادف ہوتا۔

ڈاکخانہ سے ٹیکسی پر گھر آیا، اور اس طرح چھ روپے صرف کرنے میں راشن کارڈ لے آیا تھا، تا کہ راشن کم قیمت پر حاصل کر سکوں۔

کارڈ لا کر میں نے شمیم سلما کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے جہانگیر میاں سے کہا کہ راشن دلا دیں۔ قیام گاہ کا پتا دریافت کرنے کا مطلب میں یہی سمجھا تھا کہ اسی حلقے کی راشن شاپ سے راشن مل جائے گا، جس میں قیام ہے، لیکن راشن وہاں نہ مل سکا۔ شمیم سلما اور جہانگیر میاں نہ جانے کہاں کہاں دو گھنٹے تک پھرتے رہے، لیکن راشن نہ مل سکا اور لطف یہ کہ ان خوش اخلاق کشمیری راشن شاپ والوں نے یہ بتانے کی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ راشن کہاں ملے گا۔

دوسرے روز شالیمار گارڈنس کی سیر کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ کھانا بھی گارڈنس میں کھانا تھا، اس لیے پوریاں وغیرہ تیار کی گئی تھیں۔ ۱۱ بجے کے قریب ہم سب تو پہلی بار سیر کے لیے نکلے۔ گارڈنس جانے کے لیے بسیں لال چوک سے ملتی ہیں۔ جو قلب شہر میں بسوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں مختلف پرائیویٹ کمپنیوں کی صدہا بسیں کھڑی رہتی ہیں، اور ہر وقت مختلف سمتوں کو آتی جاتی رہتی ہیں۔ سرکاری بسیں بھی چلتی ہیں، لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ ان میں اور سرکاری بسوں میں کمپٹیشن ہوتا ہے، بعض پرائیویٹ کمپنیوں کی بسیں سرکاری بسوں سے بہتر اور آرام دہ ثابت ہوتی ہیں۔ ان کمپنیوں کے آفس بھی اسی قرب و جوار میں قائم ہیں جہاں ٹورسٹ بآسانی سیٹیں بک کرا سکتے ہیں۔

ہم لوگ تانگوں سے لال چوک آئے، اور وہاں سے بس پر بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ ٹورسٹ سنٹر سے تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد بس ڈل گیٹ پہنچ گئی، اور یہاں سے ڈل لیک ہمارے بائیں جانب جھلک رہی تھی۔ ہاؤس بوٹس مسلسل کھڑے تھے۔ ان کے نام عجیب و غریب ہیں غریب ۷۵ فیصدی بوٹس پر TO LET کی تختیاں

لگی ہوئی تھیں، ہلکے پھلکے اور رنگ برنگے شکارے بھی صدہا کی تعداد میں ساحل سے لگے یا تیرتے نظر آرہے تھے۔ بس چلتی رہی اور بائیں جانب ڈل کا دلکش منظر ہمیں میلوں تک نظر آتا رہا۔ سڑک کئی میل تک ڈل کے ساتھ ہی ساتھ پیچ و خم کھاتی ہوئی جاتی ہے، تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر برقی روشنی کے خوبصورت بلب یکتا فینسنگ پر ایستادہ نظر آرہے تھے۔ ڈل گیٹ کے بعد سے منظر اتنا دلکش اور حسین ہے کہ اسے الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ داہنی جانب پہاڑیوں کا لا متناہی سلسلہ، اور بائیں جانب ڈل کا چمکتا ہوا پانی۔ ہاؤس بوٹس اور شکارے۔ میں اس منظر میں کھو کر رہ گیا تھا۔ واقعی ڈل بے حد حسین ہے، جسے ہاؤس بوٹس اور شکاروں نے سجا کر حسین تر بنا دیا ہے۔ تقریباً ۱½ میل جانے کے بعد ہماری بس نشاط کے سامنے رکی، لیکن ہم نے جو پروگرام بنایا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے ہاروَن جائیں، اور واپسی پر شالیمار و نشاط کی سیر کی جائے۔

نشاط باغ سے چل کر بس شالیمار کے گیٹ پر رکی اور اس کے بعد ہاروَن پر جو سری نگر کی قریبی تفریح گاہوں میں گویا آخری منزل ہے، یہاں اتر کر ہم لوگ گارڈن میں پہنچے، لیکن یہ گارڈن نہیں ہے، جیسا کہ ہم سمجھتے تھے۔ اصل میں یہاں واٹر ورکس ہے، اور پانی کو بند بنا کر اسٹور کیا گیا ہے۔ ایک نہر سی اس قدرتی باغ میں بھی تیزی کے ساتھ بہتی ہے، جس سے اس جنگل میں منگل سا ہو گیا ہے پکنک کے لیے یہ سنسان جگہ نہایت موزوں ہے۔ ہم لوگ اب بھوک کی برداشت نہ کر سکتے تھے اس لیے چادریں بچھا کر اسی نہر کے کنارے بیٹھ گئے، اور کھانا کھانے لگے۔ سیاح یہاں کمتر ہی آتے ہیں، اس لیے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ خواتین نے برقعے اتار دیے تھے۔ کھانا کھا کر نہر کا ٹھنڈا اور شیریں پانی پیا۔ ظہر کی نماز دہیں پڑھی گئی، اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم نے واپس ہونے والی بس پکڑی اور شالیمار پہنچ گئے۔ یہ باغ شہنشاہ جہانگیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کی نہر اور فوارے ہیں، جن میں پہاڑی چشمے سے پانی لایا جاتا تھا باغ کے عقبی حصے میں ایک بلند پہاڑی سلسلہ ہے جس سے چشمہ رواں رہتا تھا، لیکن اس سال یہ بلکل خشک تھا۔ فوارے بند تھے، اس لیے اس کی وہ دلکشی نہیں نظر نہ آسکی جو فواروں سے پانی چھوٹنے اور زینہ نما طریق نہریں بہنے سے دیکھی جاتی ہوگی۔ پھر بھی باغ اپنی شان و شوکت حسن و دلکشی میں آپ ہی اپنا جواب ہے۔ اتوار نہ ہونے کے باعث بھیڑ زیادہ نہ تھی، اس لیے ہم لوگ اطمینان سے باغ کے ہر ہر گوشے میں ٹہلتے رہے۔ ایکا ایک ماسٹر اصغر علی صاحب سے ایک ہاکر کی ملاقات ہو گئی جو بچوں کے لیے انگریزی مٹھائیاں وغیرہ فروخت کرتا پھر رہا تھا۔ السلام علیکم کہہ کر اس نے ماسٹر صاحب سے مصافحہ کیا۔ نام پوچھا، اور پھر بضد ہو گیا کہ آج کے روز آپ سب ہمارے گھر چل کر ہمارے مہمان ہوں۔ ہم مرغ ذبح کریں گے آپ کے لیے۔ اس کی یہ دعوت نمائشی نہ تھی۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ ہم سب اس کے گھر چلیں ماسٹر صاحب کی داڑھی اور خواتین کے برقعوں نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اصل میں کشمیری فطرتاً بڑے مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ افسوس کہ ہم لوگ اس کی دعوت منظور نہ کر سکے اس لیے اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہونے لگے تو اس نے پوچھا، آپ لوگ میرک شاہ صاحب کی خدمت میں بھی گئے یا نہیں، ہم ان بزرگ سے واقف نہ تھے، اس لیے اس نے ہمیں بتایا کہ باغ سے اتر کر جو آبادی ہے اسی میں مسجد کے پاس میرک شاہ صاحب کا قیام ہے۔ ضرور حاضری دیں ان کی خدمت میں۔

کشمیر میں پیر پرستی عام ہے۔ بزرگوں سے بیحد شغف ہے جگہ جگہ مزارات ہیں اور وہاں لوگ بڑی ہی عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔ ہم سب کو بھی میرک شاہ صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا، چنانچہ شالیمار سے نکلنے کے بعد ہم نے آبادی کا رخ کیا۔ اتفاق سے مسجد کے پیش امام مل گئے، انہوں نے ہماری رہبری کی، اور ہم حضرت میرک شاہ صاحب کے حجرے تک پہنچ گئے۔ زینے طے کرکے سب سے

پہلے میں اور ماسٹر اصغر علی صاحب اندر داخل ہوئے۔ حجرے میں ایک بہت ہی ضعیف نورانی صورت کے نہایت دبلے پتلے بزرگ ترکی ٹوپی پہنے تشریف فرما تھے۔ ادھر ادھر چند معتقدین اور خدام باادب بیٹھے تھے۔ میرک شاہ صاحب کو دیکھتے ہی میں نے اپنے جسم میں ایک لرزہ سا محسوس کیا۔ نہایت ادب کے ساتھ ہم شاہ صاحب کے قریب پہنچے۔ شاہ صاحب نے نگاہیں اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ بیٹھنے کا اشارا کیا اور ایک خادم کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً چائے کی پیالیاں اور بسکٹ لے کر آ گیا، لیکن شاہ صاحب نے اپنے پاس رکھے ہوئے ایک ڈبے سے خود بسکٹ نکال کر ہمیں عنایت فرمائے۔ ہم نے یہ تبرک کھایا۔ چائے پی اور پھر فارسی میں شاہ صاحب نے ماسٹر صاحب سے باتیں کیں۔ کئی اشعار سنائے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی میری زبان سے نہ نکل سکا۔ چند منٹ بعد ہم رخصت ہوئے۔ اتنی دیر میں خواتین اور بچے بھی شمیم کے ساتھ آ گئے تھے، انہوں نے بھی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ اپنی اپنی تمناؤں کا اظہار کر کے دعا کرنے کی درخواست کی اور پھر سب نیچے آ گئے۔

میرک شاہ صاحب کی عمر جیسا کہ معلوم ہوا سو سال سے لگ بھگ ہے۔ موصوف کرمان سے تشریف لائے تھے، اور ایک عرصے سے شالیمار ہی میں قیام فرما ہیں۔ حجرے کے سامنے ہی ایک عالیشان مسجد۔ مدرسا اور خانقاہ بھی ہے۔ چائے اور بسکٹ ہر آنے والے کو تبرکاً پیش کیا جاتا ہے۔ ہم سب موصوف کی بزرگی سے بہت متاثر ہوئے۔ سوچا تھا کہ پھر حاضری دیں گے، لیکن موقع نہ مل سکا۔

شالیمار سے روانا ہو کر نشاط باغ پہنچے یہ باغ نورجہاں کے بھائی آصف جاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ شالیمار کی طرح یہ بھی کافی بلندی پر ہے، اور متعدد خطے زینوں کی شکل میں دامن کوہ تک چلے گئے ہیں۔ پہاڑی چشمے سے فواروں اور نہر کا پانی اس باغ کے حسن کو بھی دوبالا کرتا ہوگا، مگر اس سال تمام فوارے بند تھے، اور نہر میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ نشاط ڈل جھیل کے سامنے واقع

اہمیت کو بڑھا دیتا ہے۔ سامنے ہی شکارے لگے رہتے ہیں جو سیاحوں کو جھیل کی سیر کراتے ہیں۔ یہاں سے ایک سیدھا آبی رستا درگاہ حضرت بل بھی جاتا ہے۔ بہرحال باغ نہایت سرسبز شاداب اور رنگ برنگے پھولوں سے اب بھی سیاحوں کے دل لبھاتا ہے۔ ان باغوں میں چنار کے عظیم الشان اور ایسے قدیم درخت آج بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنے لگانے والوں کے جاہ و حشم کو دیکھا ہوگا یہ درخت سلطنت مغلیہ کی عظمت کے آج بھی گویا شاہد ہیں۔ یہاں ہم لوگ زیادہ دیر تک سیر نہ کر پائے تھے اس لیے اچانک بادل چھا گئے، اور بارش ہونے لگی۔ لوگ ہر طرف سے بھاگ کر سرخ بارادری میں پناہ لینے کے لیے پہنچے، لیکن اس وقت بارادری بند تھی، اور اب لے دے کر صرف داخلے کا گیٹ رہ گیا تھا، جس میں سر چھپایا جا سکتا تھا، لیکن یہاں پندرہ بیس افراد سے زاید کھڑے نہ ہو سکتے تھے، اور سیاح سو سے کم نہ تھے۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی، اور ہارون و شالیمار کی طرف سے آنے والی تمام بسیں بھری ہوئی آ رہی تھیں، اسی لیے کہ بارش کے باعث وہاں کی سیر کرنے والے بھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اگر کسی بس میں جگہ ہوتی بھی تو دو چار نفوس کی اور انہیں وہی لوگ حاصل کر سکتے تھے جو دوڑ کر زبردستی بس میں داخل ہو جاتے ظاہر ہے کہ ہم ایسا نہ کر سکتے تھے۔

شام کے وقت سری نگر سے آنے والی بسیں عموماً خالی آتی ہیں، اس لیے کہ کارڈنس کی تفریح کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ واپس ہونے والی بسیں بھری ہوئی جاتی ہیں، اسی لیے ہم نے یہ بات سوچی کہ سری نگر سے آنے والی خالی بس میں بیٹھ کر ہارون چلے جائیں، چنانچہ یہی کیا گیا، اور پھر پندرہ منٹ بعد وہی بس ہارون سے روانا ہو کر سری نگر کی طرف چل دی۔ بارش تیز ہو رہی تھی، لیکن ہم سب آرام سے بس میں بیٹھے تھے۔ نشاط گیٹ میں اب بھی بھیگے ہوئے سیاح کھڑے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم لال چوک پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں بس سے اترنا تھا، تانگا اسٹینڈ فاصلے پر تھا اور ٹیکسیاں اس وقت نظر نہ آ رہی تھیں بارش کا

تیزی میں فرق نہ آیا تھا، وقت کافی گذر چکا تھا، کھانا بھی پکنا تھا، ورنہ ہم پھر ہارون جاتے اور اسی بس میں واپس آتے۔

بس سے اتر کر بھیگتے ہوئے ہم سب نے ایک دکان کے برآمدے میں پناہ لی۔ دکاندار نے ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی اندر بلا لیا۔ تعارف کیا اور فرط عقیدت سے انہیں اخروٹ کھلانے لگا۔ اس وقت ہمیں اپنے کلین شیو ہونے پر بڑا غصہ آیا۔ داڑھی ہوتی تو اسی طرح ہماری بھی آؤ بھگت ہوتی۔ بہر حال اتنی بڑی داڑھی جیسی ماسٹر صاحب کی ہے جلدی تو ر کھائی - جا سکتی تھی، اس لیے پچھتا کر ہی رہ گئے۔ کچھ دیر بارش کا انتظار کیا، مگر کم نہ ہوئی تو سواریوں کی فکر ہوئی، لیکن اس وقت ٹیکسی اور تانگے والوں کا دماغ آسمان پر تھا، خالی نظر ہی نہ آتے تھے، اور نظر آتے تو رکتے نہ تھے۔ بہر حال ہم سب بھیگتے ہوئے دکان سے باہر آئے، تاکہ تانگا اسٹینڈ کی طرف جائیں۔ اچانک ایک نوجوان دوڑ کر ماسٹر صاحب کے پاس آیا، اور ہمیں ایک گیٹ میں کھڑا کر کے جلد ہی تین تانگے لے آیا، اور ہم سب ماسٹر صاحب کی داڑھی کو دعائیں دیتے، بھیگتے بھاگتے نرسنگ گڑھ پہنچ گئے۔

دوسرے دن صبح ناشتا کرنے کے بعد میں پھر ٹورسٹ آفس گیا تاکہ معلوم کر سکوں کہ آخر راشن ملے گا کہاں سے، اور مجھے اس قدر غصہ آیا ہے کلرک متعلقہ کا جواب سن کر بیان نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا، یہیں ٹورسٹ سنٹر کے برابر جو پارک ہے، اس میں ٹورسٹس کے لیے راشن ملتا ہے، میں نے بہت ضبط کر کے کہا آپ کو یہ بات یا تو ٹورسٹس سے بتا دینا چاہیے کہ راشن یہیں ملے گا یا کارڈ پر اس کی وضاحت ہونی چاہیے تھی۔ میں کل سے پریشان ہو رہا ہوں۔ قیام گاہ کا پتا دریافت کرنے سے میں نے تو یہی سمجھا تھا کہ اسی علاقے کی دکان سے مل جائے گا۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ قیام سیاح کا چاہے جہاں ہو راشن لینے وہ ٹورسٹ سنٹر ہی آئے۔

کلرک متعلقہ کا جواب ویسا ہی نامعقول تھا، جیسا عموماً ان کا ہوا کرتا ہے۔ کہنے لگا آپ نے دریافت کیا ہوتا بحث لا حاصل تھی، اس لیے میں ماسٹر اصغر علی صاحب کے ساتھ ہی راشن کی دکان پہنچا اور راشن لینے کا کام انہیں سپرد کر کے پھر ٹورسٹ سنٹر گیا۔

میرے کرم فرما جناب ڈاکٹر عبدالمنان صاحب (شاگرد رشید جناب ڈاکٹر زیدی صاحب) نے مجھے مجتبیٰ حسن صدیقی صاحب سابق کمشنر کشمیر کا ایک خط میر نصر اللہ صاحب ڈائرکٹر ٹورزم کے نام لکھوا کر دیا تھا، جسے میں نے لکھنؤ ہی سے پوسٹ کر دیا تھا، لیکن اب تک ڈائرکٹر صاحب سے مل نہ سکا تھا، اس لیے میں نے سوچا کہ اس وقت موصوف سے شرف نیاز حاصل کر کے گلمرگ و پہلگام میں قیام کے لیے جگہوں کا ریزرویشن کرا لیا جائے۔ میر نصر اللہ صاحب کا دفتر ٹورسٹ سنٹر ہی میں ہے۔ اس وقت موصوف موجود بھی تھے۔ بڑے ہی اخلاق سے پیش آئے، اور فرمایا کہ اس وقت سرکاری قیام گاہیں بھری ہوئی ہیں، پھر بھی جو کچھ ممکن ہے وہ کیا جائے گا، اور پھر فوراً ہی بشیر احمد چشتی صاحب ریزرویشن افسر کو بلا کر نہ صرف ہدایات دیں بلکہ اسی وقت گلمرگ اور پہلگام کے ٹورسٹ افسران سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کر کے گفتگو فرمائی تاکہ ہمیں وہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ پھر ہم چشتی صاحب کے آفس میں گئے۔ چشتی صاحب نے ریکارڈ دیکھ کر ہمارے لیے گلمرگ میں کاٹیج، A-92 اور پہلگام میں ایک ڈارمیٹری ان تاریخوں میں ریزرو کر دی جن تاریخوں میں ہم وہاں قیام کرنا چاہتے تھے۔ خطوط ٹائپ ہوئے اور ان کی نقلیں ہمیں دیدی گئیں۔

اس مرحلے سے گذرنے میں کافی وقت صرف ہو گیا تھا، لیکن جب میں راشن ڈپو واپس پہنچا تو ماسٹر اصغر علی صاحب آرام سے کرسی پر بیٹھے متعلقہ کلرک سے باتیں کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کی نورانی داڑھی نے یہاں بھی سب کو متاثر کر لیا تھا۔

راشن تانگے ... رکھوا کر ہم جائے قیام پر پہنچے اس طرح گویا اپنا روپیہ کرایا صرف کرنے کے بعد ہم نے راشن حاصل کیا تھا۔ حساب لگانے پر وہ بازار بھاؤ سے زاید ہی پڑا۔ پھر لطف یہ کہ چاول، آ

غیر غنیمت تھا، لیکن آٹا بازار میں فروخت ہونے والے آٹے سے بہت خراب تھا۔ سیاحوں کو اس طرح کا راشن ملنے پر بھی حیرت ہوئی۔ بہرحال میں ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ سے درخواست کروں گا کہ وہ راشن کارڈوں پر چھپوا دیں کہ راشن ٹورسٹ سنٹر کے پاس ہی ملتا ہے۔

ہم گھر پہنچے تو کھانا تیار تھا، بھوک بےحد محسوس ہو رہی تھی، اس لیے دسترخوان پر بیٹھ گئے اور جو کچھ پکا تھا اسے بےحد رغبت سے کھانے لگے، مجھے حیرت تھی کہ میری اشتہا دو چند ہو گئی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں لیٹ گئی۔ شام کو اٹھا تو تیز ہوا کے ساتھ بارش ہو رہی تھی، اس لیے کہیں جانا نہ ہو سکا۔ موسم بارش کے باعث خنک گوار ہو گیا تھا، ورنہ سرینگر بھی لکھنؤ جیسا معلوم ہوتا تھا۔

شمیم سلمہ حسب عادت نہ جانے صبح سے رات تک کتنے چکر لگا چکے تھے، اس روز انہوں نے ایک اور کشمیری تاجر کا واقعہ سنایا۔ صبح اس کے ریسٹوران میں چائے پی چکے تھے، اور اس نے ۳۵ پیسے پیالی قیمت لی تھی۔ شام کو گئے۔ چائے پی روپیہ دیا تو اس نے ۶۰ پیسے واپس کیے۔ شمیم نے کہا صبح تو ۳۵ پیسے آپ نے لیے تھے۔ کیا شام کو ریٹ بڑھ گیا۔ بلا کسی معذرت کے اس نے کہا ۵ پیسے کا سکا نہ تھا، [illegible] دیجیے گا۔ اسی وقت انہوں نے ایک پنجابی کی دکان سے کوئی سامان ۵۰ پیسے کا لے کر روپیہ دیا تو اس نے یہ کہتے ہوئے ۵۰ پیسے کا سکہ دیا کہ چھٹکر ۴۵ پیسے نہیں ہیں، ۵ پیسے پھر کبھی دے دیجیے گا۔

اب مقابلہ کیجیے ایک کشمیری اور ایک پنجابی تاجر کا اور سوچیے کہ کون ترقی کرے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ کشمیریوں کے مقابلے میں پنجابیوں کا کاروبار بےحد ترقی پر ہے۔

چشمۂ شاہی کشمیر کی مشہور جگہ ہے، اور گارڈنس میں اسے غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ یہاں گورنمنٹ نے ہٹس بھی تعمیر کرائے ہیں، میں قیام وہیں کرنا چاہتا تھا، مگر اچھا ہی ہوا جو بلا سوچے سمجھے ریزرویشن نہیں کرا دیا تھا۔

سری نگر کے مشرقی کنارے پر ڈل گیٹ سے جو سڑک نشاط باغ اور شالیمار کو جاتی ہے، جس پر دو روز قبل ہم گئے تھے، اسی سڑک پر ڈل گیٹ سے ۴ میل جا کر داہنی جانب جانے والی سڑک پر ڈیڑھ میل کے فاصلے پر چشمۂ شاہی ہے۔ یہ جگہ تاج محل بنوانے والے شاہجہاں نے منتخب کی تھی۔ ڈل لیک کے بالکل سامنے اچھی خاصی بلندی پر یہ چھوٹا سا خوبصورت باغ اپنے جائے وقوع اور میٹھے پانی کے چشمے کے باعث بہت زیادہ مشہور ہے، ہمیں اس کے دیکھنے کا بےحد اشتیاق تھا، لیکن معلوم یہ ہوا تھا کہ وہاں تک بسیں صرف اتوار ہی کو جاتی ہیں، اس لیے اتوار ہی کا دن اس کے لیے رکھا گیا، تاکہ ۱½ میل کا فاصلہ پیدل نہ طے کرنا پڑے۔

صبح جلدی جلدی ناشتے سے فراغت کی گئی۔ پکنک کے لیے حسنہ پوریاں اور آلو کی بھجیا اور کچھ حلوا پکا کر ناشتے دانوں میں بھر لیا گیا۔ ایک بالٹی اور چند گلاس دو ایک چادریں بچھا کر بیٹھنے کے لیے رکھی گئیں، اور ۱۰ بجے ہم لوگ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ لال چوک تک پہنچنے میں وہی دشواریاں پیش آئیں جو دو روز قبل آ چکی تھیں۔ لال چوک اتنا مصروف علاقہ ہے کہ خدا کی پناہ، اور یہ کشمیری تانگے والے بلا بے دھیان ہوتے ہیں، اتنی تیزی سے چلاتے ہیں کہ سڑکوں پر سے گذرنا دشوار ہو جاتا ہے، بس اسٹینڈ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ چشمۂ شاہی کی بس جا رہی ہے، مگر اس میں ۱۳ افراد کی جگہ نہ تھی۔ دوسری بس معلوم ہوا ایک گھنٹہ بعد جائے گی، حالانکہ بتانے والے نے یہ غلط بتایا تھا، لیکن ہم یقین کرنے پر مجبور تھے۔ بہرحال طے پایا کہ نشاط جانے والی بس پر ہی چلا جائے۔ پھر جاڑے میں ایک گھنٹے تک خانہ بدوشوں کی طرح کھڑے رہنے سے کیا فائدہ۔ نشاط جانے والی بس فوراً مل گئی۔ ہم سب روانہ ہو کر چشمۂ شاہی جانے والے موڑ پر اتر گئے۔

بائیں طرف ڈل لہریں لے رہی تھی اور داہنی جانب نہایت عمدہ سڑک چشمے کی طرف چلی گئی تھی، ہم سب پیدل ہی چل دیے، شمیم سلمہ تو اگر لکچرر نہ ہوتے تو [illegible] ہوتے، بلکہ میرے خیال سے انہیں یہی ہونا تھا۔ ان کے اور ندیم سلمہ کے علاوہ تمام بچوں کے لیے چشمۂ شاہی تک جانا مشکل تھا۔ بیگم، بانو بیگم، مسرت غزالہ، جمیلہ، نجم السحر اور کوئی چلنے میں تیز ہیں، مگر سب

لیے، میری خوش دامن صاحبہ کے لیے، اور ماسٹر اصغر علی صاحب کے لیے دیڑھ میل کی چڑھائی آسان نہ تھی۔ خصوصاً ماسٹر صاحب کے ایک پیر میں ایسی تکلیف ہے کہ چند قدم بھی وہ بآسانی نہیں چل پاتے، لیکن ہیں بڑے ہی جیالے اور حوصلہ مند۔ اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کو شرمندہ کرتے ہیں۔ لکھنؤ کی اکثر بزم اُن کے دم سے قائم رہتی ہیں [illegible] اس انہماک اور سلیقے سے کام کرتے ہیں کہ لوگ دنگ رہ جاتے ہیں، بہرحال چلنا تو تھا ہی ہم سب بھی چلے۔ کوئی آگے کوئی پیچھے۔ ایک اور کشمیری بھی پیدل ہی جا رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کی داڑھی نے انہیں مقناطیس بن کر کھینچا اور پھر دونوں میں اس طرح باتیں ہونے لگیں کہ شاید ماسٹر صاحب کو پیر کی تکلیف کا خیال ہی نہ آیا۔ اسی وقت ایک بس آتی نظر آئی۔ اس میں دو تین جگہیں تھیں، اس لیے میں اپنی خوش دامن صاحبہ اور ندیم سلمہ کو لے کر اس میں بیٹھ گیا۔ ماسٹر صاحب بہت آہستہ چل رہے تھے، اس لیے دور تھے۔ بس ان کا انتظار نہ کر سکتی تھی، اس لیے جلدی اور ہم چند منٹ میں چشمۂ شاہی کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اور سب بھی آگئے۔ ماسٹر صاحب کا برا حال تھا، مگر وہ نہ جانے کن سی دلچسپ باتیں ان کشمیری صاحب سے کر رہے تھے کہ دیڑھ میل پیدل چلے آئے۔ گیٹ پر چیری، گلاس اور کھیرے بک رہے تھے۔ بچوں نے چیری اور گلاس خریدے، غزالہ نے کھیرے لیے۔ سری نگر کے کھیرے کافی بڑے اور نہایت لذیذ ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر گیٹ کے سامنے ہی منڈیر پر ستانے کے بعد ہم [illegible] باغ میں داخل ہوئے۔ یہاں سے جھیل کا منظر صاف نظر آتا تھا [illegible] پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ وہیں [illegible] چھوٹی سی عمارت میں ملایا گیا ہے [illegible] حوض ہے جو پانی گرتا ہے، وہ اسی حوض [illegible] ہے، پانی پینے کے لیے [illegible] سا تھا۔ ہم اس بالٹیاں اور [illegible] ورم تک بھرے جا رہے تھے۔ اس پانی کی [illegible] حلقے میں اتنی شہرت ہے کہ لوگ دور دور سے پینے ہی کے سبب بار بار آتے ہیں [illegible] باضمہ بھی ہے اور صحت مند بھی۔

ہم لوگوں نے گیٹ سے داخل ہو کر بائیں جانب کے ایک سایہ دار سبزہ زار پر چادریں بچھا دیں۔ بچے بالٹی اور گلاس لے کر چشمے کی طرف گئے، پانی پیا گیا ۱۲ بجے گئے تھے اس لیے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کھیرے تراشے گئے، اور پوریاں نکال کر پلیٹوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ خواتین کا گروپ ایک چادر پر تھا، مردوں کا دوسری چادر پر۔ پوریاں بہت خستہ اور لذیذ تھیں۔ بھجیا میں غزالہ نے اپنا مخصوص مسالہ ڈالا تھا، جس سے بھجیا اتنی لذیذ ہو جاتی ہے کہ گوشت کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ کشمیر کا آلو بھی بہت لذیذ ہوتا ہے، اوروں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا [illegible] اور ماسٹر صاحب نے اس روز اتنا کھایا کہ شاید اس سارے سفر کے دوران اتنا کبھی نہ کھا سکے تھے، ہو سکتا ہے کہ یہ چشمۂ شاہی کے پانی کی تاثیر ہو جسے ہم سب نے آتے ہی پی لیا تھا، اور برابر پیتے جا رہے تھے۔ بہرحال کھانے سے فراغت ہوئی تھی۔ اتنی مختصر سی ہے کہ [illegible] ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے دیکھا جا سکتا ہے، ہم لوگ جہاں بیٹھے تھے وہاں سناٹا تھا، لیکن رفتہ رفتہ مجمع اتنا بڑھا کہ کئی پارٹیاں اس جگہ بھی آکر پھیل گئیں۔ دیکھا تو لوگ مسلسل چلے ہی آ رہے تھے۔ نہ جانے کتنی بسیں اس عرصے میں آچکی تھیں۔ اس لیے اب وہاں بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ طے پایا کہ واپس چلا جائے، بھیڑ بھاڑ میں تفریح کا لطف طالب علموں ہی کو آسکتا ہے ہم ایسے بڈھوں کو نہیں۔

سامان سمیٹا گیا، اور [illegible] اتر کر گیٹ سے باہر آگئے، اور واپس جانے والی بس کا انتظار کرنے لگے۔

چشمۂ شاہی کی [illegible] بے حد شاندار ہیں۔ گو ہم نے انہیں [illegible] سے نہ دیکھا [illegible] لیے کہ ان کا [illegible] ایک سول [illegible] مگر سب صاف [illegible] نظر آ رہی تھیں۔ یہ اچھے خاصے بنگلے ہیں۔ ان میں [illegible] شوقین [illegible] اور فارغ البال لوگ سکون حاصل کرتا ہے، ان سے [illegible] ہو سکتی ہے، کہ شہر سے یہ اتنی دور ہیں [illegible] یہاں [illegible] ان میں قیام وہی حضرات کر سکتے ہیں جو کبھی [illegible] اوروں پر سیر کشمیر کے لیے جاتے ہیں۔ [illegible] ضروریات

زندگی کی فراہمی ایک دشوار مسئلہ بن جائے گی۔ کم سے کم اگر ہم لوگ یہاں ٹھہر گئے ہوتے تو سخت پریشانی ہوتی۔

پکنک کا پروگرام تمام دن کے لیے بنایا گیا تھا، جبکہ ہم لوگ چشمۂ شاہی پر ایک گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ واپس ہوتے وقت اتنی بسیں جاتی ہوئی ملیں کہ شاید سہ پہر تک وہاں ہزارہا لوگ جمع ہو گئے ہوں گے۔ چشمۂ شاہی کی سیر کو بھول کر بھی فیملی کے ساتھ اتوار کو جانا مناسب نہیں۔ عام دنوں میں انتشار نہیں ہوتا، البتہ بسیں وہاں تک نہیں جاتیں۔ ڈیڑھ میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوتا ہے یا پھر ٹیکسی پر جائیے۔ پانچ روپے میں ٹیکسی وہاں پہنچا دیتی ہے۔

پھر کہاں جائیں۔ شمیم سلمہ نے کہا شکارے پر سیر کی جائے۔ ایک روز قبل وہ شکارے کا نرخ وغیرہ معلوم کرنے گئے تھے۔ سب ہی بچوں کو شکارے پر بیٹھ کر سیر کرنے کا شوق تھا۔ شکارے، چشمۂ شاہی سے آنے والی سڑک جہاں بین روڈ سے لب ڈل ملتی ہے وہاں بھی ملتے ہیں، مگر یہاں ان کے نرخ بہت زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے ہم لوگوں نے ڈل گیٹ پر اتر کر شکارے کی سیر شروع کرنا چاہی، شمیم سلمہ نے دو شکارے ۴ گھنٹے کے لیے چوبیس روپے میں طے کیے۔ اور ان سے یہ معاہدا ہوا کہ ڈل سے پہلے نگین جائیں گے، وہاں سے درگاہ حضرت بل ہوتے ہوئے پھر ڈل گیٹ آ جائیں گے اور سفر ۴ گھنٹے سے کم میں مکمل نہ ہونا چاہیے یہ ہم لوگوں کی گویا کاروباری چال تھی کہ وقت کا بھی تعین کر لیا تھا، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ دو ہی گھنٹے میں الٹا سیدھا چکر لگا کر ہمیں اتار دیں۔ بچے شکارے پر بیٹھ کر بہت خوش ہوئے۔

شکارے، جنہیں ہم بارہا فلموں میں دیکھ دیکھ کر للچا چکے تھے، اس وقت ہمیں اپنے اندر لٹائے بٹھائے رواں دواں تھے۔ ڈل کا خوبصورت نظارا ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ قریب ہی قطار کی شکل میں عظیم الشان ہاؤس بوٹ حد نگاہ تک کھڑے نظر آ رہے تھے، یکایک یہ سارا منظر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہمارے شکارے جس تنگ سی نہر سے چلے جا رہے تھے، جس کے بائیں

جانب قدیم طرز کے کچّا مکانات تھے۔ تقریباً ہر مکان کا زیریں حصہ گھاٹ کی شکل میں تھا دائیں جانب کے مکانات دیہاتی وضع کے خراب اور خستہ حالت میں تھے کچھ دور چلنے کے بعد دائیں جانب اسی نہر کی شاخیں پھوٹی ہوئی تھیں جن کے کنارے ولو کے درخت لگے ہوئے تھے۔ کشمیر میں ولو کے درخت بے شمار ہر خطے میں پائے جاتے ہیں، وہاں کے لوگ اسے "ویر" کہتے ہیں۔ جیسے شمشاد کو سفیدا اور اس کی شاخیں بید کا کام دیتی ہیں اس پر وہاں کی ایک عظیم صنعت کا دار و مدار ہے۔

شکارے چلتے رہے۔ نہر چونکہ دونوں طرف آبادی کے درمیان ہے، اس لیے نہایت گندی اور گھناؤنی ہے پانی کی بدبو اور مکینوں کی تعفن آمیز سکانیت سے ایسی کراہیت پیدا ہونے لگی تھی، میں نے شکارے والے سے کہا یہ تم کہاں لے آئے ہو ڈل کہاں رہ گئی۔

اس نے کہا۔ یہ ڈل ہی ہے اور یہی رستا ہے جو نگین اور حضرت بل جاتا ہے۔

میں نے کہا، میں اس رستا سے نہیں جانا چاہتا۔ گندگی سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔

اس نے کہا بس تھوڑی دیر بعد صاف پانی میں پہنچ جائیں گے، بہرحال ہم کر بھی کیا سکتے تھے، شکارے اس متعفن راہ سے گزرتے رہے، بلکہ ماحول کی گندگی اور زیادہ بڑھتی گئی۔ ابتدا میں لکھنا بھول گیا۔ آج کی پکنک میں ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کی ہمشیرا مسز فدا صاحبہ بھی شریک تھیں۔ وہ کشمیری ہیں، اس لیے میں نے ان سے کہا آپ کشمیری زبان میں اس سے بات کریں کہ یہ کس گھناؤنے ماحول میں ہمیں لے آیا ہے۔ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ کیا واقعی حضرت بل کے لیے یہی آبی رستا ہے، وہ بیچاری کبھی ایسی تفریح کے لیے آئی ہی نہ تھیں۔ گھر کی مرغی تو دال برابر ہوتی ہے۔ یہ ہاؤس بوٹ، یہ شکارے، یہ ڈل اور نگین جو جاذبیت اور کشش باہر والوں کے لیے رکھتے ہیں، کشمیر والوں کے لیے نہیں رکھتے۔ انہوں نے کشمیری زبان میں شکارے والے سے پوچھا، مگر فائدہ کچھ نہ ہوا۔ ہم بڑبڑاتے رہے۔ ناک رومال سے بند کیے لیے عاجز آ گئے تھے، مگر یہ گندے نالے کا رستا ختم ہی نہ ہونے آتا تھا۔

دشواری یہ تھی کہ ہم ابھی تک سری نگر کی آبادی سے قطعی واقف نہ تھے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ بائیں جانب کی آبادی اس آبادی کا عقبی حصا ہے جو ڈل گیٹ سے درگاہ حضرت بل تک جانے والی سڑک پر دائیں جانب ملتا ہے تو یقیناً ہم زبردستی شکارے رکوا کر اترتے اور سڑک پر پہنچ جاتے، لیکن ہم تو یہی سمجھ سکے تھے کہ اگر ہم واپس بھی ہونا چاہیں تو اسی غلط رستے سے ہی لوٹنا ہوگا، اور گذرے رستے کی طوالت سے آنے والے اچھے احوال کی امید قریب تر تھی۔ بار بار بے ایمان شکارے والا یہی کہتا کہ بس اب صاف رستا آیا ہی چاہتا ہے۔

بہر حال ہر مصیبت کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ تقریباً کامل ایک گھنٹے کی دم الٹا دینے والی اس فضا سے نکل کر ہمارے شکارے قدرے صاف شفاف پانی میں چلنے لگے، اور پھر ایکا ایک دائیں جانب ایسا حسین اور پرکیف منظر نگاہوں کے سامنے آگیا کہ ساری بوریت ایک لخت ختم سی ہوگئی۔ یہ نگین جھیل تھی چمکتا ہوا صاف شفاف پانی در پردا پہاڑی سلسلا جس کے دامن میں چشمے شاہی، نشاط اور شالیمار جیسے خوبصورت باغ ہیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر وسط نگین میں ایک چھوٹا سا جزیرا اور اس کے ارد گرد شاندار قسم کے ہاؤس بوٹ۔ یہیں پر ایک تیراکی کا کلب بھی ہے جو بڑے بڑے ہاؤس بوٹس پر قائم ہے۔ یہاں سول منچلے کلب کی زندگی کا لطف لے رہے تھے یہاں سرف رائڈنگ SURF RIDING کا نظارہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا ہی عجیب و غریب تھا۔ ایک مشین بوٹ تیز رفتاری سے چل رہی تھی اور ایک تیراک لکڑی کے گاودم تیلے پٹڑے پر کھڑا ایک رسی کے سہارے کشتی کے عقب میں کھنچا چلا جا رہا تھا۔ یہ مظاہرا مختلف طریقوں سے دکھایا گیا، اور ہم سب بےحد محظوظ ہوئے کشتیوں پر پھلوں اور پھولوں کی سجی ہوئی دکانیں قریب آ گئیں۔ بچوں نے کچھ خریداری کی اور پھر ہمارے شکارے رواںا ہو کر صاف پانی میں چلتے ہوئے ایک آبادی کے کنارے پہنچ گئے یہی حضرت بل ہے، شکارے ساحل سے جا لگے اور ہم سب اتر کر اوپر سڑک پر آ گئے۔ ماسٹر صاحب درگاہ شریف کی طرف چلے گئے، اور میں چائے کی خواہش میں دیوانا وار دکانوں کی طرف راغب ہوا۔ مختصر سا معمولی بازار ہے، بسکٹوں کی دکانیں تو تھیں، مگر چائے کی ایک بھی دکان نہ تھی۔ ہمیں سخت حیرت ہوئی۔ چائے مل جاتی تو شاید درد سر میں کچھ کمی ہو جاتی۔ میں اس وقت ایسی تکلیف میں تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شمیم سلمہ بچوں کو لے کر بسکٹ کی دکان پر گئے۔ سارے کشمیر میں ایک خاص قسم کے بسکٹ نظر آتے ہیں۔ شہر میں بھی اور دیہات میں بھی۔ شمیم سلمہ نے یہی بسکٹ خریدے، مگر جب بچوں نے کھائے تو تھوک دیے معلوم ہوا کہ بےحد بدمزا تھے۔ میں تکان سے اتنا نڈھال ہو رہا تھا کہ درگاہ شریف تک نہ جا سکا۔ ماسٹر صاحب اور خواتین، البتا وہاں ہو آئیں۔ اس جگہ بھی ناواقفیت نے سخت دھوکا دیا۔ یہ بازار اصل میں حضرت بل کی آبادی کا عقبی گندا حصا ہے۔ سڑک پر شاندار چائے کی دکانیں ہیں، مگر ہمیں اس سڑک کا علم ہی نہ تھا۔

گھر والی کو میرے درد سر سے بڑی فکر تھی، اس نے دیکھا کہ شکارے والے چائے بنا کر پی رہے ہیں تو چند پیالیاں ان سے بنوا کر ان میں سے ایک ہمارے لیے بھی لے آئی۔ میں ان گندے شکارے والوں کے برتن وغیرہ شکارے ہی میں دیکھ چکا تھا۔ چائے شیشے کے گلاس میں آئی تھی، مگر پینے کو دل نہ چاہتا تھا، لیکن درد سر اور چائے کی خواہش نے کہا۔ آنکھ بند کر کے پی بھی لو۔ اور میں نے سارڈن کی ٹکیا زبان پر رکھ کر چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ نہ جانے یہ کیسی چائے تھی کہ خد بخد قے ہونے لگی۔ چائے اور گولی تھوک کر میں نے نل سے پانی لیا کلی کی اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں اور سب لوگ بھی آ گئے تھے اس لیے شکارے روانا ہو گئے۔

اب ہم لوگ، خصوصاً میں اتنا تھک گیا تھا کہ اڑ کر جائے قیام پر پہنچ جانا چاہتا تھا، اس لیے میں نے شکارے والے سے کہا جلد سے جلد ہمیں ڈل گیٹ پہنچا دے اور پھر ہم جلد ہی ڈل گیٹ پہنچ گئے۔ ٹکٹس مجھے جھیلنا

میں سب سے زیادہ پسند آئی۔ یہ ڈل جھیل سے ملی ہوئی ہے، بلکہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ واپسی کا رستہ دلکش اور صاف تھا جا بجا ہمارے شکارے تیرتے ہوئے کھیتوں اور کنول کے کھیتوں کے درمیان سے گذرتے رہے۔ غرض جاتے وقت جو بدمزگی ہوئی تھی نگین کی سیر اور واپسی کے رستے کی دلکشی سے تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ بعد میں علم ہوا کہ شکارے والے ہمیں شارٹ کٹ سے لے گئے تھے، اور یہ ہماری ناواقفیت اور اجنبیت تھی کہ ہم نے یہ بات بھی ان سے طے نہیں کرلی تھی۔ ہر نئے شہر میں سیاحوں کو اکثر ایسا تجربا ہوجایا کرتا ہے۔ تقریباً ۲۵ سال قبل کلکتہ گیا، اور چیت پور روڈ کے اس حصے میں ٹھہرا جو ذکریا اسٹریٹ سے ملحق ہے۔ صبح ایس۔ اے۔ بی بخشی کمپنی جانے کے لیے ٹیکسی پر بیٹھا تو آدھ گھنٹے کے بعد کوئی ٹولہ اسٹریٹ پہنچا۔ ٹیکسی والا رقم لے کر چلتا بنا۔ بعد میں جب بخشی صاحب نے میری قیام گاہ دریافت فرمائی تو میں نے کہا۔ کافی دور لوور چیت پور روڈ میں قیام ہے۔ انہوں نے ہنس کر فرمایا۔ جگہ تو ایک فرلانگ بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ٹولہ اسٹریٹ کے پاس کھڑے ہوکر جب کوئی ٹیکسی والے سے کوئی ٹولہ اسٹریٹ چلنے کو کہے گا تو وہ سمجھ ہی جائے گا کہ یہ اجنبی ہے۔ ہم نے شکارے والوں کو اس گندے رستے کی طرف جاتے ہوئے ٹوکا ہوتا تو وہ سمجھ جاتے کہ ہم اجنبی نہیں ہیں اور پھر وہ ہمیں صاف رستے سے لے جاتے۔

غرض چار گھنٹے کی شکارے کی سیر نے اتنا تھکا دیا تھا کہ گھر پہنچنا دشوار ہوگیا۔ بلا شبہ شکارے پر ڈل اور نگین کی جھیل بہترین تفریحی مشغلا ہے۔ سری نگر میں، لیکن ہم پھر کبھی شکارے پر نہیں بیٹھے۔

غزل

ہاشم قنوجی

جگر نصیب دولت دردِ جگر نہ ہو | وہ زندگیٔ عشق کبھی معتبر نہ ہو
اے گردشِ حیات مٹا دے مجھے مگر | مٹنے کا میرے دوست پہ کوئی اثر نہ ہو
جب بھی مستقل ہے عبارت ہے زندگی | لازم ہے مشکلوں کا پریشاں [illegible]
ہاشمؔ مخالفت کا زمانے کا غم نہیں | مرے لالے کا ثبات کی رسم نظر نہ ہو

پنڈت خوشدل ایڈیٹر "دیش سیوک"

وطن کے خادموں کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی

وطن کے خادموں کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی
چمن میں بلبلوں کی خامشی دیکھی نہیں جاتی
اجالے راستوں میں تیرگی دیکھی نہیں جاتی
وطن کی انجمن میں ابتری دیکھی نہیں جاتی
جو خود گمراہ ہیں وہ کیا دکھائیں گے ہمیں رستہ
کسی صورت سے ان کی رہبری دیکھی نہیں جاتی
فقط دولت کمانا جنکا مقصد ہے زمانے میں
اب ایسے لیڈروں کی لیڈری دیکھی نہیں جاتی
کلی سہمی ہے گل ناخوش ہے، گلچیں پریشاں ہے
چمن والوں کی یہ افسردگی دیکھی نہیں جاتی
سمجھ خوف خدا دل میں نہ پاس آدمیت ہے
بشر اتنی برے خود سری دیکھی نہیں جاتی
ریاکار ہیں جو شیطان کو بھی مات دیتے ہیں
اب ایسے سادھوؤں کی سادگی دیکھی نہیں جاتی
غم دوری میں تو آنکھوں پہر مغموم رہتے ہیں
اب ایسے بلبلوں کی بے کلی دیکھی نہیں جاتی
ہمیشہ ہم کا رواں کوئی تو خوش ہوتا ہے دل اپنا
مگر رہزن کے ہونٹوں پر ہنسی دیکھی نہیں جاتی
گوارہ کرلیا ہم نے ستم غیروں کا ہنس ہنس کر
مگر اپنوں کی ہم سے بے رخی دیکھی نہیں جاتی

غم زیادہ ہماری میں بھی خوشدل ہی ہنستا ہوں
مگر لوگوں سے میری خوشدلی دیکھی نہیں جاتی

محمد حسین حسان

حسین حسان کی خدنوشت

پیدایش ۱۹۰۷ء وطن پیلی بھیت - والدین کا انتقال بچپن میں ہو گیا - بچپن میں قیام زیادا تر بریلی میں رہا یہی جاے پیدایش ہے - ہندستانی فارسی گھر پر پڑھی - عربی بریلی کے اسلامی مدرسے میں، پھر دارالعلوم ندوۃ العلما میں عربی کی تکمیل کی - ۱۹۲۷ء میں جامعا میں آگیا - انگریزی پڑھی - ۳۰-۱۹۳۱ کانگرس کی تحریک میں شرکت کی وجہ سے تعلیم کا سلسلا ختم ہو گیا -

دلی کانگریس نے ہندستانی اور انگریزی، ہندی میں کانگریس بلیٹن نکالنے کا پروگرام بنایا تھا - ہندستانی کے انچارج برادر محترم شفیق الرحمان قدوائی مرحوم تھے - انگریزی کے آنجہانی لالا رگھونندن سرن (ایل - اے - کینٹب) میں ہندستانی بلیٹن میں محترم شفیق صاحب کے ساتھ کام کرتا تھا - تقریباً سال بھر یہ سلسلا چلتا رہا - پھر شفیق صاحب جیل چلے گئے پھر میری باری آئی بہت دنوں تک کوتوالی اور دریا گنج کے تھانوں میں، اور پھر دلی جیل میں رہا - کافی دنوں رہا - مدت یاد نہیں -

میرے معاملے کی نوعیت دلچسپ ہے - غالباً انہی دنوں پنڈت جواہر لال نہرو آٹھ دن کے لیے پیرول چھٹ کر آے تھے، کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ ہندستان ٹائمس کے منیجر جناب کرہلی صاحب نے پنڈت جواہر لال کی اس زمانے کی تقریریں شایع کر دی تھیں - پرنٹر پبلشر مجھے بنایا تھا، اور ہم لوگ گرفتار ہو گئے - پنڈت موتی لال نے اس مقدمے کی خاص اجازت دی تھی - یہ مقدما اس وقت کے مجسٹریٹ مسٹر السیر کی عدالت میں چلا، عدالت کا اجلاس جیل ہی میں ہوتا تھا - کئی اجلاس ہوے میرے اوپر جرم ثابت نہ ہو سکا، کرہلی صاحب کو غالباً سزا ہو گئی - جیل سے چھوٹنے کے چند دنوں بعد لائبریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے میرا تقرر مکتبۂ جامعا میں ہو گیا، اور پھر "پیام تعلیم" میرے سپرد کر دیا گیا -

مضمون لکھنے کی مشق کا سلسلا ندوے کی تعلیم کے دوران، بلکے اس سے پہلے سے جاری تھا - "الناظر" لکھنؤ، "نقیب بدایون" "زمانہ کان پور"، "شمع" آگرا اڈیٹر حسن عابد جعفری آگرہ وغیرا میں چھپتے رہے ہیں - رسالا جامعا میں بھی یہ سلسلا جاری رہا - عربی مضامین کے ترجمے اور ایک طویل مضمون "محمود غزنوی بزم ادب" جو کئی مہینے تک مسلسل جامعا میں شایع ہوتا رہا -

"پیام تعلیم" ۱۹۲۶ء میں جامعا کے کاموں سے عوام کو باخبر کرنے کے لیے اور نئے نئے تعلیمی مسایل سے مانوس کرنے کے لیے نکالا گیا تھا - مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم اور عبدالمجید خواجا صاحب مرحوم کی ایما کو بھی اس میں دخل تھا - ذاکر صاحب مرحوم اور عابد صاحب تو گویا اس کے بانیوں میں تھے - "پیام تعلیم" کے پہلے پرچے میں ان دونوں کے پیغام بھی ہیں - ایک عرصے تک اس کی ادارت

سعید انصاری صاحب کے سپرد تھی - اور جب مجھے یہ کام سونپا گیا تو میں نے آہستہ آہستہ اسے بچوں کا پرچا بنا دیا - محترم ذاکر صاحب مرحوم اور جناب حامد علی خان صاحب مرحوم کو یہ بات پسند آئی ان دونوں مرحومین نے اور جامعہ کے اور چھوٹے بڑے لوگوں نے مدد کی "پیام تعلیم" بھی آگے بڑھتا رہا - بچوں کے مفید پرچوں میں اس کا شمار ہونے لگا - اشاعت بھی تیزی سے بڑھنے لگی - حیدرآباد، کشمیر وغیرہ میں محکمۂ تعلیم نے اس کی سرپرستی کی، اور سرکاری طور پر اس کی خریداری منظور فرمائی -

قبلہ ذاکر صاحب مرحوم، محترم پروفیسر مجیب پروفیسر رشید احمد صدیقی - سید عابد حسین صاحب نے اور اس زمانے کے دوسرے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کے لیے مضمون لکھے، نظمیں لکھیں خصوصاً شفیع الدین نیر صاحب کی نوازشیں مسلسل جاری رہیں - ان کے علاوہ نئے نئے لکھنے والے پیدا ہوئے، ان میں مرحوم ابو طاہر صاحب بی ایس سی کا نام سرفہرست ہے - اس کے تاسیس نمبر یا سالانا نمبر بہت شان و اہتمام سے نکلتے تھے ہندستانی دنیا خصوصاً بچوں کی دنیا میں دھوم مچ جاتی تھی -

"پیام تعلیم" نے ایک یہی کام نہیں کیا بچوں کے لیے نظم و نثر میں لکھنے والوں کا ایک حلقہ بھی پیدا کر دیا - افسوس ہے کہ ۱۹۴۷ء کی گڑبڑ نے اس حلقے کو تتر بتر کر دیا - کچھ پاکستان کو پیارے ہوئے -

اس عرصے میں کتابیں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا - سب سے پہلی کتاب آں حضرت کی سیرت پر "سرکار دو عالم" کے نام سے لکھی، بہت مقبول ہوئی - میسور کی ریاست میں کورس میں بھی شامل ہو گئی - سترہ اٹھارہ ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں - دوسری کتاب "دنیا کے بچے" نئی چیز تھی نئے انداز سے لکھی گئی تھی اس کے بھی لگ بھگ بیس بائیس ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور اب تک نکل رہی ہے - تیسری کتاب "نامورانِ اسلام" خاص محنت سے لکھی گئی تھی - قبلہ ذاکر صاحب مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی نے چھپنے سے پہلے نظرِ ثانی فرمائی تھی - غالباً ۱۹۴۵ء میں چھپی تھی - یہ بہت مقبول ہوئی ہاتوں ہات بک گئی، ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد چھپنے کی نوبت نہیں آئی - اس میں ڈاکٹر اقبال، اور مولانا محمد علی تک کا حال ہے، اب اس پر نظرِ ثانی کی جا رہی ہے -

چوتھی کتاب "ہماری زمین" ہے - اس میں بچوں کے لیے زمین کی عمر تاریخ وغیرہ کا حال ہے موجودہ سائنس دانوں کے خیال سے استفادہ کیا گیا ہے - انداز کہانی کا رکھا ہے - یہ بھی دوبارہ دلی کے ایک پریس میں چھپ رہی تھی - کچھ فرمے چھپ بھی گئے تھے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں سب کچھ ضایع ہو گیا اور کتاب ناپید ہے -

اس زمانے میں مشہور روسی مصنف کی کتاب "ایک ہزار ایک سوالات" ہندستانی میں اپنایا - "انوکھا عجایب خانہ" نام رکھا - یہ پہلی بار حکومت کشمیر کی مدد سے چھپی پھر مکتبۂ جامعہ نے چھاپی - کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں - یہ زیادہ تر جانوروں کی کہانیاں ہیں ان میں سے کچھ چھوٹے بچوں کے لیے تھیں، مکتبۂ جامعہ نے چھاپی تھیں - اب ان کے نام بھی یاد نہیں ہیں -

۱۹۴۷ء کے بعد رسالہ بند ہو گیا - جامعہ کی مدد سے میں نے اوکھلے سے نکالا، مگر چل نہ سکا - پھر مکتبہ دوبارہ قایم ہوا تو "پیام تعلیم" بھی نکلا، کچھ دنوں میں نے اسے ترتیب دیا، مگر پھر میرا تعلق جامعہ کے تعلیم بالغان کے ادارے، تعلیم و ترقی سے ہو گیا، ہندستانی سیکشن میں تصنیف اور تالیف اور مسودے پر نظرِ ثانی کا کام میرے سپرد تھا - بچوں کے لیے آسان اور سادہ زبان لکھنے کی عادت ہو گئی تھی اس لیے یہ کام میرے سپرد کیا گیا -

اس سلسلے میں بے شمار مسودوں پر نظرِ ثانی کی خدمت بھی کچھ کتابیں لکھیں، چند چھپ گئی ہیں، کچھ مسودوں کی صورت میں ہیں، غالباً دیمک کی نذر ہو گئیں، چھپی ہوئی کتابوں کے نام یہ ہیں -

(۱) الزام کس پر (۲) آستین کا سانپ (۳) الٹی

(۴) برف کا گھر (۵) چاند (۶) دیمک کتنی ذہین۔ (۷) تاؤ کے اپدیش وغیرا ہیں۔ چھپی کتابوں میں زین کی ملیالی ہیں، رامو نے پڑھنا سیکھا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہاں خوب یاد آیا۔ میں نے بچوں کے لیے انڈونیشیا پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اسی زمانے میں برادر محترم شفیق الرحمان قدوائی مرحوم یونسکو کی طرف سے انڈونیشیا تشریف لے گئے تھے، میں نے یہ مسودا ان کی خدمت میں پیش کیا، اور عرض کی کہ وہیں انڈونیشیا جاکر پڑھیے گا۔ شفیق صاحب نے واقعی وہاں جاکر اسے مقیدے سے پڑا، اور بہت تعریفی خط لکھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے، یہی نہیں انہوں نے "انجمن ترقی اردو" کے سکریٹری صاحب سے کتاب چھاپنے کی سفارش بھی کی۔ اس وقت قاضی عبدالغفار صاحب انجمن کے سکریٹری تھے، مگر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ ادارۂ تعلیم و ترقی نے چند کتابیں چھاپی ہیں۔ مثلاً "دیا نہیں ہے۔" وغیرا۔

نہ جانے کیوں، ۱۹۶۳ء میں محترم غلام ربانی صاحب "تاباں" جنرل منیجر مکتبۂ جامعا اور ان کے رفیقوں خصوصاً سید احمد ولی صاحب کو "پیام تعلیم" دوبارا نکالنے کا خیال آیا، اور قرعۂ فال میرے نام پڑا۔ یہ اب تک نکل رہا ہے (۱۹۷۳ء) خدا اسے عمر نوح عطا کرے۔ عام رسالوں کے ساتھ ساتھ اس کے سالنامے بھی بہت شاندار ہوتے ہیں، ان سالناموں کے علاوا چند خاص نمبر مثلاً حالی نمبر، ذاکر نمبر، غالب نمبر۔ تھتھا نمبر کہانی نمبر بہت زیادا پسند کیے گئے۔

مکتبۂ جامعا سے تعلق سے پہلے دو کتابیں محترم تاباں صاحب کی فرمایش پر لکھیں۔ میر تقی میر اور میر انیس ان کتابوں کے بھی پہلے اڈیشن ختم ہوگئے ہیں دونوں کتابیں دوبارا نہ جانے کب چھپتی ہیں۔

ہمارے نئے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب نے مکتبۂ و "پیام تعلیم" کے ماتحت بہت سی کتابیں چھپوائی ہیں۔ ان میں دو کتابیں چھوٹے بچوں کے لیے میری بھی ہیں۔ تیسری کتاب "چچا غالب" بھی ہے، اسے میں نے ایڈیٹ کیا ہے۔

ناوک حمزاپوری

غزل

آنکھیں ہوں تو بوند بھی دریا دکھائی دے
ذرے میں آفتاب کا جلوہ دکھائی دے

میدان حشر و نشر یہ دنیا دکھائی دے
ہر شخص اپنے آپ میں کھویا دکھائی دے

تقدیر سے جو وہ رخ زیبا دکھائی دے
عرش بریں پر اپنا نصیبہ دکھائی دے

اپنی غرض کا آدمی اندھا دکھائی دے
کیسے کسی کو درد کسی کا دکھائی دے

ہر جو زروش گیہوں دکھاتا دکھائی دے
چہرے کو دیکھتا ہوں تو غازہ دکھائی دے

وہ کیا کرے گا لیکے حیات دوام خضر
جس کو پہاڑ عمر دو روزہ دکھائی دے

جی بھر کے ایک بار بھی تو دیکھ لو مجھے
شاید یہ شکل پھر نہ دوبارہ دکھائی دے

چلنے کی پاؤں میں جو سکت ہو تو خود بخود
منزل کی سمت نت نیا رستہ دکھائی دے

ناوک سبھی کو دیکھ رہا ہوں میں بار بار
اس بھیڑ میں کوئی تو شناسا دکھائی دے

مفتوں کوٹوی

منیر شکوہ آبادی کی قصیدہ گوئی

منیر شکوہ آبادی مرحوم کی شخصیت ہندستانی ادب میں کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ ہندستانی شاعری اپنے ایسے پرگو اور زودگو شاعر پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اور حق یہ ہے کہ استادانہ کمالات کا مظاہرا کیا ہے۔ ہمارے یہاں ہر صنف خصوصی نزاکتیں اور لطافتیں رکھتی ہے۔ اس کے تقاضوں کو پورا کرنا، مہارت تامّا کا ہی طلبگار ہے، اور فن دانی وادب پرستی کا بھی۔ مرثیا گوئی کے لوازمات کچھ اور ہیں، قصیدا نگاری کے کچھ اور، غزل کی زبان اور اس کا لہجا کچھ اور ہی ہے۔ پھر اس ظرف کو جس شراب طہور سے بھرا جاتا ہے اس کا رنگ و نور ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہاں جناب منیر کی قصیدہ نگاری اور غزل گوئی کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے، جس اندازا ہوگا کہ اگرچے ادب اور سخن کے یہ دونوں میدان، ایک دوسرے سے انتہا زدہ اختلاف رکھتے ہیں، لیکن جناب منیر کے پاؤں کسی لغزش سے آشنا نہیں ہوئے، بلکے یہ اپنے رہوار قلم کو بے تکان دوڑاتے چلے گئے ہیں۔ طبیعت کا جوش و خروش اور وجدان و سیلان ہر ہر قدم پر تحسین و آفرین کی صدائیں بلند کروالیتا ہے اور یہی ان کا کمال فن ہے۔

منیر شکوہ آبادی کی قصیدا گوئی

آداب قصیدا گوئی سے منیر مرحوم اپنے پیش رووں سے کچھ کم نہیں۔ تشبیب، گریز، مدح، اور دعا جو قصیدا کے چار عناصر ہیں۔ ان میں منیر کمال فن کا بڑا مظاہرا کرتے ہیں، منقبتی قصیدا امام مہدی کی ابتدا میں اگرچے کچھ تکلف معلوم نہیں ہوتا، لیکن گریز کے بعد پھر جو مدح میں قلم اٹھایا ہے تو کمال کر دکھایا ہے۔

کرے جو کسب ضیا جلوہ گاہ حضرت سے
شعاع مہر بنے جا بدوب خانۂ زنبور
ترے نمک کی قسم ایکبار اگر کھائیں
تو گرسنہ نہ ہوں پھر عمر بھر اناث و ذکور
جو شک کو راہ کھٹک جائے کوئی دیوانہ
دکھائے عقل اندھیرے میں اس کو شمع شعور
ترے زمانہ میں فرزبرٹے خط تقدیر
جو چشم کور میں ہو سرمۂ شب دیجور
نظر میں لغزش افعی ہو صاف شعلۂ طور
بجائے خامہ میسر ہو موج چشمۂ نور
دوات میں عوض صوف ہو لباس حرم
ورق کے بدلے بہم پہنچے صفحۂ دل حور
تمام حسن ز ملک جمع ہوں پئے امداد
لکھا نہ جائے ترا وصف تا بہ روز نشور

اب زیادہ پیش کرتے ہیں سے

جو نامے دہر کی [illegible] تجھ سے لایا ہوں
[illegible] تجھ کو بصورت [illegible] کر دیا مجبور
مجھے [illegible] قصیدہ کا
[illegible] ہو حاصل زہ جاہ عیش و سرور

مولانا سید محمد کی مدح میں جو قصیدا ہے اس کی تمہید اس طرح کی ہے کہ صبح کا ساحول بڑا پرفضا ہورہا تھا، میں نے دیکھا کہ ملائکہ طبق نور لیے لکھنؤ کی طرف رواں ہیں ؎

سوال میں نے کیا ان سے بعد تسلیمات
کہ اے ملائکہ فضل ایزد وہاب
وہ کون بندۂ مقبول حق ہے جس کے لئے
رواں ہو تحفۂ قدسی لئے شتاب شتاب
دیا جواب کہ اے نقش بوریائے الم
کیا خطاب کہ اے مبتلائے رنج و عذاب
ہم اس ولی کی زیارت کو جاتے ہیں ہر صبح
کہ جو ہے قبلۂ دیں مرشد اولی الالباب
ستون کعبۂ اسلام عرش اعظم علم
گل بہشت کمالات، خضر راہ صواب
امام و سید نا مدظلہ العالی
کہ مہر برج شریعت ہے جسکی مہر خطاب
یہ سن کے مدحت اقدس کی ہو گئی مجھے فکر
کہا یہ مطلع تو رشک مہر عالمتاب ہے

اور پھر مدح کی طرف رجوع ہوتے ہیں، دعا میں اساتذہ قدیم کا سا انداز ہے۔

واجد علی شاہ بادشاہ غازی کے مدحیا قصیدے میں یہ بہت گہرے ڈوبے ہیں۔ دریائے معانی کی غواصی کرکے کئی گوہر نکالے ہیں، یہ مطلع لکھ کر ؎

آئینہ سخن کے لئے ہو گہر آب میں
ہاتھ آئے سیر کشتی اسکندر آب میں

تین چار شعر کے بعد غزل کی طرف رجوع ہو گئے ہیں۔ غزل کا مطلع ہے ؎

آئی ہے موج خندۂ گل اکثر آب میں
بیضہ ہے عندلیب کا ہر گوہر آب میں

اس مقطع سے پھر قصیدے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ؎

اس بحر میں ہے ناؤ قصیدہ کی اے منیر
غواص دل کے ہاتھ لگیں گوہر آب میں

کچھ مدحیا اشعار سے حظ حاصل کیجیے ؎

تنور دست جود سے پیدا ہوا طلسم
مچھلی کے فلس بن گئے ترمن زر آب میں

رکھتے ہیں فیض شاہ سے سنگین دل آب و تاب
پارس کی قدر پانے لگے پتھر آب میں
وہ عدل ہے کہ ربط نقیضین ہو عیاں
ہر قطرہ آگ میں رہے ہر اخگر آب میں
دیکھیں یہ عدل تو ضعفا سے قوی ڈریں
مچھلی کے پر لگا کر بنیں خنجر آب میں
غالب ہوئے ہیں سخت دلوں پر خدا پرست
آہن بجھاتے رہتے ہیں آہن گر آب میں

گھوڑے کی تعریف بھی ہے اور فیل خاصا کی بھی، دو شعر فیل خاصا کی تعریف کے سنیے ؎

زنجیر اس کے پاؤں کی طوفان ترح میں
کشتیٔ کائنات کو ہو لنگر آب میں
دریا کو اس کا سایہ خطر اگر کرے
پیدا ہو مشک تر، عوض عنبر آب میں

نواب ذوالفقار علی خاں بہادر کی مدح میں جو قصیدا ہے، اس میں سواری کا حال دیکھیے ؎

یہ بڑھا تیری سواری سے عروج اور وقار
پست ہے مثل زمیں گنبد چرخ دوار
بہر تسلیم خمیدہ ہے سر فیل فلک
کیا کروں فیل سواری کی بلندی اظہار
ایسی دیکھی نہیں رفتار سیہ مستی کی
اکثر اٹھتا ہے تماشے کے لئے ابر بہار

تلوار کی تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

فتح ہے جس میں شیریں کے ہمیشہ ہمراہ
جوئے شیر سحر عید ہے تیری تلوار
دام گیسوئے پری سے بھی زیادہ ہے زرہ
چار آئینہ ہیں پیشانیٔ خوبان بہار
کیا ترے عدل کی تعریف ہوائے چشمۂ فیض
آب و آتش میں تخالف نہیں باہم زنہار
شب گیسو میں کرے دزد نگہ کیا چوری
ہند و خال بتاں آپ بنا چوکیدار
رات کے قبضہ میں ہے تیغ سے تو بیمی
جبشی گشت کو پھرتا ہے لگائے تلوار
تھک گئے حشر خرامی سے حسینان جہاں
ٹھوکروں سے بھی تو ہوتا نہیں فتنہ بیدار

گوسفندوں کی چراگاہ ہوا کلۂ گرگ
دہن شیر ہے گہوارۂ آہوئے تتار
دود قلیاں سے معطر ہوئی بزم عشرت
باغ قالیں میں کھلا سنبل فردوس بہار
سبق آموز فلاطون ہیں غلامان حضور
عقل کامل تری شاگرد ہے اے عرش وقار

نواب تحمل حسین خاں کے قصیدے میں جو گہرباری کی ہے۔ اس کی آب و تاب دیکھنے کے قابل ہے تمہید ہی بڑی پرشکوہ ہے ؎

قلزم فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر
اپنے کوزوں میں لئے بھرتے ہیں دریا گوہر
دست گیری ہوئی پامالوں کی کس کو منظور
آبلوں سے ہوئے کس واسطے مانا گوہر
کس خدا دوست کے ہاتھوں میں پہنچنے کے لئے
کرتے ہیں دانۂ تسبیح سے رشتا گوہر

مدحیہ اشعار کی چمک دمک ملاحظہ فرمایئے ؎

فیض والا سے نہیں اہل عدم بھی محروم
قرط بخشش سے ہوئے بیضۂ عنقا گوہر
آپ کے فیض نے جب ابر کرم برسایا
رعد کے بدلے گرجنے لگے کیا کیا گوہر
تیرے دریائے کرم کی نہ ملے گی کبھی تھاہ
آب میں اپنے عبث کھاتے ہیں غوطا گوہر
اہل تقویٰ پہ اگر آپ گہر افشاں ہوں
دانہ کے بدلے چگے مرغ مصلا گوہر
زال دنیا نے بھی ہاروں میں پروئے موتی
روز لوٹے تری سرکار سے صدہا گوہر

کمال تو یہ ملاحظہ ہو کہ اس ردیف میں بھی گھوڑے ہاتھی اور تلوار کی مدح کر دکھایا ہے ؎

لب دریا جو کرے گرم روی توسن خاص
اڑ چلیں بطن صدف سے شرر آسا گوہر
ہاتھی ایسا ہے سبک رو کہ قدم سے جس کے
ٹوٹتا کیا کہ نہ ہو نام کو میلا گوہر
دیکھ کر موتیوں کی جھول پہ سب کہتے ہیں
پہنے پھرتی ہے عروس شب یلدا گوہر
تیری شمشیر شرر دم کا جو تیزی اس پائیں

قطع کردیں صدف بحر سے رشتہ گوہر
کوئی اس سیف سے تشبیہ اگر برج کردے
اپنے روزن میں چھپائے پھریں دریا گوہر

اور سنیئے ؎

آپ کا نام جو اطفال کریں ورد زبان
دودھ کے دانت بنیں منہ میں مصفا گوہر

دعا کے بعد مدعا ملاحظہ ہو ؎

منہ میرا گوہر انعام سے ہو مالا مال
دہن فکر کے ہوں دانت سراپا گوہر
اپنے مداح پر اب کیجئے بخشش کی نگاہ
بخشیئے آج یم فیض سے آقا گوہر

منیر مرحوم کے ایک قصیدے میں حیات اور موت کا مناظرا سنیئے جو قصیدے کی شان بھی ہے اور ان کی بلندئ تخیل کی آن بھی ؎

زمانے بھر کی بلاؤں میں مبتلا تھا میں
قضا میں جان سے تھا۔ جان مجھ سے تھی بیزار
ادہر تو کھینچتیں تھیں سخت جانیاں دامن
ادھر قضا میرے لے جانے کے لئے تیار
میں طرفہ رد و بدل، تازہ کش مکش میں تھا
مرے لئے ہوئی ہستی و مرگ میں تکرار
ہر اک کو دوراں میں دعوئ افضلیت تھا
ہر ایک کرتی تھی اپنی فضیلتیں اظہار
بیان دعوئ ہستی یہ تھا کہ سن اے مرگ
میں تجھ سے بڑھ کے ہوں آگاہ ہیں صغار و کبار
مرے طفیل سے قائم ہیں آسمان و زمیں
مجھی سے ہیں مہ و خورشید مطلع انوار
میرے پیالے میں آب حیات ہے لبریز
تری شراب میں مخلوط زہر عقرب و مار
حراب ڈھے ہوئے مقبرے تری جاگیر
مرے نصیب میں سونے کے قصر مینا کار
ترے دماغ کو حاصل عفونت اموات
مرے مشام میں عطر نفیس مشک تتار
مرے نصیب میں بانگ نے و نغمۂ عیش
تری بساط میں ہے نوحہ اور نالۂ زار
کہا یہ مرگ نے بس بس خموش اے ہستی

کچھ اس میں راست ہے، کچھ لاف ہے تری گفتار
میں وہ ہوں جس سے لرزتے ہیں سرکشان جہاں
میں وہ ہوں جس سے ہیں عاجز ستم گر و اشرار
مرے سبب سے شہیدوں کو ہے حیات ابد
مرے سبب سے ہیں پیوند خاک بدکردار
مرے وسیلے سے ابرار زینت فردوس
مرے طفیل سے اشرار ہیں وقود النار
پسند آتی ہے تو کس کو ضعف پیری میں
کہ اپنی جان سے ہو جاتے ہیں بشر بیزار
غرور کرکے ہوئے مدعی خدائی کے
ترے سبب سے سلاطین ظالم و جبار
خدا نے حکم دیا قبل ان تموتو کا
جہاں میں مرنے سے مشتاق رہتے ہیں ابرار

گریز کی شان ملاحظہ ہو ؎

گذشتہ را صلوات اب بغور حال کو دیکھ
کہ تیرے پاس بہت بد ہیں کم ہیں نیکوکار
پیران خدا میرے شہر میں سب ہیں
کہ جن سے نقش کف پا سے خلد ہے گلزار
خصوصاً ان میں شہ انبیاء حبیب خدا
شفیع امت و محبوب ایزد غفار
صفائے آئینہ لا الٰہ الا اللہ
جلائے سرمۂ مازاغ، واقف اسرار

یہ قصیدہ نعت میں ہے ۔ جناب منیرؔ ہر صنف سخن میں کامیاب ہیں ۔ عبور کامل رکھتے ہیں ۔ ان کے قصیدوں میں بڑی شان و شوکت اور برتری و عظمت ہے ۔ قصیدے کا کوئی جز ایسا نہیں جس میں کہیں جھول نظر آئے ۔ تشبیب ہے تو لاجواب، گریز ہے تو بے مثال، مدح ہے تو عرش پیما، دعا ہے تو مقبول و رسا الفاظ میں دید یا ہے، خیالات میں شان و شکوہ ہے ۔ بیان میں تازگی و شگفتگی ہے ۔ اظہار میں شائستگی اور برجستگی، حسب موقع و محل گہر باری اور مدح نگاری کرتے چلے جاتے ہیں، نہ قافیہ و ردیف کی دشواریاں انہیں مزاحم ہوتی ہیں، نہ تاثرات و جذبات کے اظہار میں یہ قاصر نظر آتے ہیں، اور یہی ان کے فن کا جلال اور ان کی شخصیت کا جمال ہے ۔

منیرؔ شکوہ آبادی کا معیار غزل

دوسری کئی خوبیوں کے ساتھ ہماری قدیم غزل فنی مہارت اور پختگی مشق کے اظہار کا ذریعہ بھی رہی ہے ۔ صنائع اور بدائع کی بہتات استعارے اور تشبیہ کی کثرت، لفظی اور معنوی آرائش، رعایات اور مناسبات کا التزام ۔ غزل کے ضروری عناصر رہے ہیں ۔ اس سے قدرت بیان کا اظہار زور کلام کی نمائش، اور افکار و خیالات کی رفعت اور ندرت دکھانی مقصود ہوتی تھی ۔ استادانہ کمالات انہیں میں مخفی تھے سخت زمین اور مشکل قوافی کا انتخاب اور پھر اس میں سخن آرائی کرنا، ہنرمندی اور فنکاری کا ثبوت بہم پہنچاتا تھا ۔ شاہ نصیرؔ اس میدان کے مرد تھے ۔ لکھنوی اساتذہ نے اس انداز کو زیادہ لگایا ۔ آتشؔ مرحوم فرماتے ہیں ؎

آتشؔ زمین شعر ہو ہر چند سنگلاخ
لغزش سے آشنا نہیں مرد سخن کے پاؤں

قصاید میں ایسے ہی ردیف اور قافیے منتخب کیے گئے، اور زور سخن اور استادانہ کمال دکھایا گیا ۔ غزل میں بھی اس جدت و ندرت کے مظاہرے کیے گئے ۔ طرحی مشاعرے اول تو خود ہی آزمائش اور امتحان کے معرکے تھے ۔ پھر اگر کسی سخت زمین اور مشکل قافیے اور ردیف والے مصرع کا انتخاب ہوگی، بلکہ انتخاب کیا جاتا تھا، زور قلم دکھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی ۔ سخن سنجوں اور سخن فہموں کی دلچسپیاں بڑھ جاتی تھیں ۔ منیرؔ شکوہ آبادی مرحوم کی کئی غزلیں مشکل قوافی اور ردیف کی حامل اور یہ غواص سخن ۔ جولانی طبع دکھاتا چلا گیا ہے ۔ حروف تہجی سے دیوان کی ترتیب، خود ہی مشکل قوافی اور ردیف پیدا کر دیتی تھی، اور صاحب دیوان کو ہر حرف میں کم سے کم دو چار غزلیں ضرور کہنی پڑتی تھیں ۔ منیرؔ مرحوم کو بھی اپنے دواوین کی ترتیب میں اس کا پاس رکھنا پڑا ہے، لیکن اس مرد سخن کے پاؤں لغزش سے کبھی آشنا نہ ہو سکے، اور جہاں قدرت بیان

حاصل ہو وہاں طبع ۔ اور مشکل زمینیں پیدا کر کے بھی کامیاب غزلیں کہہ دینا کونسی بڑی بات ہے۔ منیر مرحوم کی غزلیں طویل بھی ہیں اور عموماً سخت زمینوں کو باطنی و ظاہری آرائشوں سے نکھارنا کار ے دارد والا مضمون ہے۔ منیر مرحوم کا کلام موجود ہے۔ آپ آزمائش کر لیجیے۔ انہیں کامیاب پاییے گا۔ کوئی سی غزل لے لیجیے۔ اس میں کئی مصرعے آپ کو ایسے مل جائیں گے جن کے لیے مصرع اولا بہم پہنچانا منیر جیسے مشاق سخن ہی کا کام تھا۔ مثال کے طور پر اگر نیچے کے اشعار کے ثانی مصرعوں پر اولا مصرعے خود لگانے کی کوشش کی جائے اور بعد میں منیر مرحوم کے اولا مصرعے دیکھے جائیں تو سطور بالا کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی میں کسی کد و کاوش سے نہیں، مجموعۂ کلام کے اوراق الٹ پلٹ کر چند ایسے اشعار لکھ دیتا ہوں ؎

عیب جیب کے دیکھتے ہیں عبث آپ گھر میں بال
پڑ جائیں گے حضور کی تیغ نظر میں بال

پہنے ہنا کے ہار جو آتے پلنگ پر
اے بحر حسن بہہ گئے موج رسن میں پھول

کس قدر ہے شعلہ افشاں آتش رنگ حنا
بن گئے ہیں پہونچیوں کے نگ شرارے ہاتھ میں

سیل سرشک سے تہ و بالا ہوا مکان
پانی پر اب پلنگ ہے پانی پلنگ پر

دل پکا یا گرمیٔ روز فراق یار نے
آتش خورشید سے پکا مرا پھوڑا ہوا

اب کی فصل گل میں وحشت کی جو یہ کثرت رہی
شاخ آہو پر بنے گا آشیان عندلیب

تیرے سخن میں ہے حسن نزاکت
کاوش کو ہوگی پنبۂ مہتاب کڑی بات

ہندستانی شاعری کے ساتھ ہی ساتھ شاگردی اور استادی کی رسم بھی چلی آ رہی ہے۔ یہ ایک دوسرے سے بڑی قریبی وابستگی رکھتی ہیں۔ استاد اپنے تلامذہ کے خیال و بیان میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ آداب شعر گوئی کی تربیت دیتا ہے، شعر گوئی کے طور طریق سکھاتا ہے، صنایع اور بدایع، خامیوں اور خوبیوں، بلندیوں اور پستیوں سے آگاہی بخشتا ہے۔ ان کی فطری استعداد، ذاتی صلاحیت اور نجی رجحانات کی فنی تراش خراش کر کے انہیں اجالتا ہے، سنوارتا ہے اور جلا دیتا ہے۔ جذبات و خیالات کو پستی، سوقیت و عامیت کے گرد و غبار سے مصفا و مجلا کر کے ان میں بلندی متانت و وقار کی تابناکیاں پیدا کرتا ہے۔ اظہار اور ابلاغ زبان و بیان خیال و افکار سب کچھ ارتقائی و ارتقاعی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں، اور ایک دن شاگرد خود استادی کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ استاد کی اس جگر کاوی۔ دماغ سوزی اور محنت و خدمت کا صلا سعادت مند شاگرد اس کے ادب و احترام، اس کی قدر دانی اور عظمت شناسی سے دیتے ہیں۔ تن من دھن اسی کے لیے وقف رکھتے ہیں۔ منیر شکوہ آبادی مرحوم اس سلسلے میں بلند شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے اساتذہ کے فن اور کمال کو اجاگر کیا، بلکہ ہمیشہ ان کی ہدایات اور روایات کی پابندی کی، چنانچہ نواب کلب علی خان والئی رامپور نے جن کی دربار داری میں منیر مرحوم تھے، جب اس زمین میں ناسخ مرحوم کا مشہور مطلع ہے ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

گریباں کا قافیہ بہتر سے بہتر لانے کی پابندی کے ساتھ اپنے درباری شعرا سے غزلیں لکھنے کے لیے کہا تو اپنے استاد رشک مرحوم کا حوالا دیتے ہوئے منیر مرحوم نے یہی عذر کیا کہ میں ان کی ہدایت کے مطابق اس زمین میں بغیر عطف و اضافت کے اس قافیے کو نہیں لا سکتا۔ نواب صاحب کے اصرار پر منیر مرحوم نے غزل کہی اور اس غزل میں ۳۲ گریباں کے قافیے کہے، لیکن سب عطف و اضافت کے ساتھ۔ جتنی بار اس واقعے کو دہرایا جائے شاگرد و استاد کا ربط باطنی اجاگر ہوتا چلا جاتا ہے۔ شاگرد کی عقیدت اور استاد کی عظمت دل پر اثر کرنے والی ہے۔ منیر کے استاد اول ناسخ مرحوم تھے، ایما کے ایما سے انہوں نے جناب میر علی اوسط رشک کا شاگردی قبول کی تھی۔ ان کے یہاں فنی پابندی

سخت تھی۔ منیر مرحوم نے اپنا ایک مطلع رشک مرحوم کو سنایا ؎

گنبد قبر عاشقاں ٹوٹے
اے زمیں تجھ پہ آسماں ٹوٹے

استاد رشک نے مطلع کی داد دی، لیکن فرمایا، لوگ بولتے یوں ہیں۔ آسمان (باعلان نون) ٹوٹے آسمان (باخفائے نون یعنی نون غنہ کے ساتھ) کوئی نہیں بولتا۔ دوسرا مصرع بدلو، منیر مرحوم نے تعمیل حکم کی ؎

روز دل ہائے مےکشاں ٹوٹے
اے خدا جام آسماں ٹوٹے
دشمنی اس زمیں کی دیکھو
گنبد قبر دوستاں ٹوٹے

جناب منیر جہاں تک غزل کا سوال ہے، اور اپنے استاد کی پابندی کا تعلق غزل میں استاد کے ارشادات کی پابندی کو وضعداری، رواداری اور سعادت مندی سمجھتے ہیں، لیکن دوسرے اصناف سخن میں وہ اپنے استاد مرزا دبیر کے معتقد و پیرو ہیں۔ مرثیوں اور قصیدوں میں قطعوں اور رباعیوں میں وہ اس رکھ رکھاؤ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اس واقعے کا بار بار دہرانا بھی موجودہ ماحول کی سازگاری کا سبب ہوگا، اور اسی لیے التفات خصوصی برتا گیا ہے۔ اپنے اساتذہ کے احترام میں ان کی غزلوں کے کئی مقاطع موجود ہیں جن میں یہ بڑی شیفتگی اور خوش عقیدگی سے ان کی شفقت و عظمت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے چند مقطعوں کا اندراج یہاں بے جا نہ ہوگا، ابتدا اس مقطع سے کیجیے ؎

ہو پائے اس رشک بس طوف کربلا
چل اے منیر خدمت استاد کے لیے

رشک سے استاد کے فیض تلمذ سے منیر
فکر صائب مدح کے لائق ہماری ہوگئی

رشک کے فیض تلمذ سے منیر
شاعروں میں تو بھی یکتا ہوگیا

محروم ہوں میں خدمت استاد سے منیر
کلکتہ مجھ کو گور سے بھی تنگ ہوگیا

ہوگیا کامل منیر استاد کے اعجاز سے
آج فرصت مل گئی۔ دیوان پورا ہوگیا

بعد فنا بھی فیض سخن ہے جہان میں
صدقے منیر حضرت ناسخ کے گور پر

ہوں جدا رشک سے استاد کی خدمت سے منیر
فرخ آباد میں کیوں کر ملے آرام مجھے

کیا جانیں منیر شاعری ہم
استاد شفیق کا کرم ہے

یہی نہیں، جس طرح جناب دبیر کے لیے ایک مرثیہ غزل ہے۔ اسی طرح جناب رشک کے لیے بھی دیوان میں ایک مرثیہ غزل موجود ہے۔

شاگرد اور استاد کی عقیدت اور عظمت کی مکمل تصویر یہاں موجود تھی اسی لیے اس تصویر کے تمام خد و خال مکمل بہ تفصیل پیش کیے گئے ہیں۔

منیر مرحوم غزلیں بڑی طول طویل کہتے ہیں پھر بھی سیری نہیں ہوتی تو قافیہ بدل کر اسی زمین میں دوسری غزل شروع کر دیتے ہیں، مقطع میں اس امر کا اشارہ ضرور کر دیتے ہیں۔

ان کے پہلے دیوان منتخب العالم سے کچھ مطلعے پیش کر رہا ہوں جن سے ان کی دشوار پسندی کا پتا چل سکے گا۔ مطلعوں سے ہی ان کے زور طبیعت اور قدرت بیان کا اندازہ کیجیے ؎

رفتہ رفتہ پست اتنا مسکن دوں ہوگیا
عقدۂ امساک قفل گنج قاروں ہوگیا

گذر ہر بحر میں ہوتا ہے خضر طبع موزوں کا
ہمارا کالبد، بجرا بنا دریائے مضموں کا

راہ کر کے اس بت گمراہ نے دھوکا دیا
گر پڑے اندھے کنوئیں میں چاہ نے دھوکا دیا

بڑھ چلا عشق تو دل چھوڑ کے دنیا اٹھا
خود بخود جوش مئے ناب سے شیشا اٹھا

ستم سہتے ہیں پر غمزہ نہیں اٹھتا
مرتے ہیں مگر ناز مسیحا نہیں اٹھتا

ردیف الف کے مطلعے ہی پیش کیے ہیں۔ پھر ان میں سے سہل قافیہ اور ردیف کی غزلیں چھوڑ دی ہیں۔ ایک غزل میں کئی کئی مطلعے ہیں۔ میں نے صرف

پہلا مطلع لکھا ہے - میں پھر کہوں گا کہ منیر صاحب کی مشاقی، پختگی، مہارت و قدرت کا اندازہ لگانا ہو تو انہیں مطلعوں کے ثانی مصرعوں پر اولا مصرع لگانے کی کوشش کی جائے اور پھر منیر مرحوم کا زور سخن آزما لیا جائے - یہ ضیغم ادب ہی کامیاب نظر آئے گا -

آخر میں ایک غزل پیش کر رہا ہوں، تشبیہ اور استعارے کی بہاریں دیکھیے اور منیر مرحوم کی سوجھ بوجھ کا اندازہ لگایئے ؎

تمہاری زلف و رخ کا لطف ہم آئینہ لقا سمجھے
اسے بال آئینے کا اور اس کو آئینہ سمجھے
اگر اس صاف چھپتی پر ہوئے برہم تو جانے دو
کسوئی زلف کو عارض کو ہم لوح طلا سمجھے
خزانہ زر در رو ہے سانپ ان پر زہر کھاتے ہیں
گہن زلفوں کو عارض کو مہ برج ضیا سمجھے
معاذ اللہ ہم کیونکر جعلی چیزوں سے نسبت دیں
بنفشہ اس کو اور اس کو گل باغ وفا سمجھے
جو اس تشبیہ سے بھی ہو پریشانی طبیعت کو
اسے کافور سمجھے اس کو مشک جاں فزا سمجھے
اگر گھٹتی ہو قدر حسن اس تشبیہ نازک سے
اسے شام مراد اس کو چراغ مدعا سمجھے
نہیں کچھ آبرو اس میں بھی زلف روئے زیبا کی
اسے آئینہ دولت اسے بال ہما سمجھے
جو یہ تشبیہ و عارض پر نہ ہو صادق
شب معراج اس کو اور اسے نور خدا سمجھے
غزل یہ نظم کی فرمائش نواب سے میں نے
قصور اس کا ہے میری فکر کو جو نارسا سمجھے
منیر ان ساری تشبیہوں کے بعد اب اور کیا کہئے
اسے قرآن، اسے سطریں اگر سمجھے بجا سمجھے

ہندستانی زبان کا ساری دنیا میں بول بالا ہو

رضی شرفی ڈھاکا

غزل

شہر ہوس میں گرمئ بازار دیکھئے
دلدادگان حسن طرحدار دیکھئے
آشفتگئ شوق کا اظہار دیکھئے
پہنچا کہاں پہ آج وہ دلدار دیکھئے
خنجر بدست لشکر جرار دیکھئے
اور سجدہ گروں میں جبہ و دستار دیکھئے
اب کربلائے اور صاحب کردار دیکھئے
بھٹکا کہاں پہ قافلہ سالار دیکھئے
کس نے کہا کہ وقت کی رفتار دیکھئے
روٹی کی فکر چھوڑیئے رخسار دیکھئے
دستور زرگری کا یہ معیار دیکھئے
مجرم ہے کون؟ کون ہے سردار دیکھئے
بیدی - سرکشن و ساغر و ساحر کے ساتھ ساتھ
فیض و فراق و جوش کے افکار دیکھئے
اپنی ہی شکل دیکھنا گر چاہتے ہیں آپ
ہر روز اٹھ کے صبح کا اخبار دیکھئے
تشنہ لبی کا ذکر نہ اب چھیڑیئے رضی
پیر مغاں کا حکم ہے سرکار دیکھئے

شمس العلما خاجا حسن نظامی

روزنامچا

۲۵ صفر ۱۳۵۰ھ دو یک شنبا ۱۲ جولائی ۱۹۳۱ء دلی

مشیت الہٰی کا روزنامچا

بلال حبشی

میں نے دیکھا کہ تو آج کل اس تلاش میں ہے کہ ظلمت اور سیاہی میں اپنے پروردگار کے حقیقی جمال کو حاصل کرے۔ ذرا سن کہ میں تیری انسانی خصلت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔

تجھ انسان کی عادت ہے کہ اپنے ذہن اور اپنے دماغ سے قیاسی چیزیں پیدا کرتا ہے، اور یہ تیری ازل کے دن سے عادت ہے کہ خدا کی جستجو میں نئی نئی باتیں پیش کرتا رہتا ہے۔ کبھی تو نے کہا کہ خدا تارا ہے، کبھی کہا کہ چاند ہے۔ کبھی کہا سورج ہے کبھی کہا سمندر ہے، کبھی کہا دریا ہے اور جب تو نے اس کی صفات مقرر کرنی چاہیں تو پہلے اپنی آنکھوں کو دیکھا اور کہا خدا بصیر ہے، اپنے کانوں کو دیکھا تو کہا خدا سمیع ہے۔ اسی طرح سب اپنی ذاتی صفتوں کو دیکھتا گیا اور انہی کے قیاس سے خدا کے صفاتی نام رکھتا گیا۔ ایسے ہی نور کا معاملہ ہے۔ خدا نے قرآن مجید کی سورۂ نور میں اپنے نور کی مثال دی ہے، وہ بھی انسانی قیاسات کو مدنظر رکھ کر تجھ انسان کو سمجھانے کے لیے دی ہے، ورنا اس کا نور نہ زرد ہے نہ سفید ہے نہ کالا ہے نہ لال۔ ایک لالٹین میں شمع روشن ہے، اور اس کے چار شیشے ہیں اور ہر شیشے میں اس کی روشنی دیکھنے والے کہتے ہیں کہ شمع کا نور لال، جو سبز دیکھتے ہیں وہ سبز کہتے ہیں جو نیلا دیکھتے ہیں وہ نیلا کہتے ہیں۔

تجھ سے پہلے بھی محی الدین ابن عربی ایک انسان نے ظلمت اور تاریکی کو ذات الوہیت کا مظہر سمجھا تھا آج تیرا ذہن بھی ادھر ہی گیا۔ سن اکبر الہ آبادی کا شعر سن ؎

یہ اختلاف صورت فطرت کی مستیاں ہیں
یہ انکشاف معنیٰ ذہنوں کی ہستیاں ہیں

مگر خدا نہ کالا ہے نہ گورا نہ روشنی ہے نہ تاریکی کیونکے یہ سب چیزیں تو اس کی مخلوق ہیں، لیکن چونکے ساری مخلوق اسی کی ذات کا جلوا ہے، اس واسطے خدا وہی ہے جو بندا تصور کرے اس نے خود کہا ہے انا عند ظن عبدی بی۔ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔

آج ہی آج کہ تیرے شوق کے مطابق بلال حبشی کا کا پتا بتاتی ہوں وہ بہت کالا تھا اور ظلمت حقیقی کا مجسما تھا، مگر وہ جمال محمدی کا شیفتا تھا اور فریفتا تھا۔ تو یوں کہہ کہ ذات الوہیت نے وجود بلال کو کرہ ظلمت بنایا تھا اور اس کے اندر تجلیاں محمود دار کر کے رخ محمدی دیکھنا چاہا تھا۔ آنکھ بند کر جب میرا یہ کہنا سچ ہو [illegible]

[illegible] کا روزنامچا

[illegible]

راویؒ امین حیدرآباد سے لکھتے ہیں، میں اس کثیر تعداد میں ہوں جو حضرت کا روزنامچا باالالتزام پڑھا کرتے ہیں۔ حالیہ پرچے سے روزنامچا شیت کے تحت میں جو مضمون شایع ہو رہا ہے وہ نہایت مفید اور موثر ہے۔ خاص طور پہلا مضمون بہت سبق آموز ہے، دنیا میں کام کرنے والے آدمی کو دنیا کے سب واقعات کو خواہ وہ موت اور پیدائش ہی کیوں نہ ہوں عامتہ الورود سمجھنا چاہیے یہ کامیابی کا راز یہی ہے۔

مولانا معینی شاہ نظامی

حیدرآباد دکن سے لکھتے ہیں، ہم منتسبان سلسلۂ نظامیہ کو اس کا بجا افتخار ہے کہ اس زمانے میں حق سبحانہٗ نے آپ کو نظام دلی کا آفتاب بنایا ہے چالیس برس پہلے تک نظامیہ سلسلۂ کی اتنی شہرت نہ تھی، مگر جب سے حضرت کا ظہور ہوا ہے، اس سلسلے کی گھر گھر دھوم مچ گئی ہے، گویا آپ سلسلۂ نظامیہ کے موجودہ زمانے میں مجدد ہیں، خدا آپ کو حیات خضر ہی دیرگاہ رکھے۔

جواب

معینی شاہ صاحب نے بہت اچھا قصیدہ لکھا۔ سلسلۂ نظامیہ کے مجدد حضرت مولانا فخر الدین دہلوی تھے، ان کے انتقال کو ستو برس ہو چکے تو خدا نے مجھے مامور کیا، لیکن مجدد کا لفظ اتنا بڑا ہے کہ میں اپنی ذات سے اس کو منسوب نہیں کر سکتا۔

ایک نظامی

ریاست پونچھ کشمیر سے وہاں کے مظالم کی تفصیل لکھتے ہیں یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں ۹۸ فی صدی مسلمان آباد ہیں، اور ان پر ایسے مظالم ہو رہے ہیں کہ ان کا اظہار قلم کے ذریعے ممکن نہیں۔ نظامیہ ٹولی کی نسبت لکھتے ہیں کہ آپ کی تحریر سے اثر ہو رہا ہے۔

دوسرے نظامی

مظفر آباد کشمیر سے لکھتے ہیں کہ سیلاب سے بہت نقصان ہوا۔ ہم سب تو اس خیال میں تھے کہ فرعون کی غرقابی کے لیے قدرت نے کوئی کرشمہ دکھایا۔

سید کشفی شاہ نظامی

رنگون سے لکھتے ہیں کہ قربانی کی ضرورت ہے قربانی کے بعد اسلام زندہ ہو جائے گا، اور نبی فاطمہ کی اجتماعی قوت خدا کے فضل و کرم سے تمام اہل اسلام کو ایک مرکز پر جمع کر دے گی۔ مال کے ساتھ جان کی قربانی بھی ضروری ہے۔ میں نے ان دونوں قربانیوں کے لیے سر نیاز جھکا دیا ہے روزنامچے کی اشاعت اور تبلیغ کا خاص طور سے بندوبست کر رہا ہوں۔

فضل الدین نظامی

فتح آباد ضلع امرتسر سے لکھتے ہیں روزنامچا ہر ہفتے دوسروں کو پڑھ کر سناتا ہوں، یہاں کے نظامی بھائیوں کے پتے لکھتا ہوں، ان سب کے نام روزنامچا جاری کر دیجیے، تجارت پیشہ نظامی جماعت کی انجمن بنائی جائے تو اس میں میرا نام بھی درج کر دیجیے آپ کو جو کام کرنا ہو جلدی کیجیے زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ جناب کے رخصت ہوتے ہی جماعت منتشر ہو جائے۔

میرے خیال میں جو شخص آپ سے بیعت کرے اس پر لازم ہو کہ ایک دفعہ آپ سے ملنے کے لیے جائے اور ہمیشہ روزنامچا پڑھے رسمی بیعت کر لینا اور بے خبر ہو جانا فضول ہے دوسری بات یہ کہ نظامی بیت المال ضرور بنانا چاہیے کہ ہر نظامی اس میں سالانہ ایک روپیہ جمع کیا کرے۔ امیر زیادہ بھی دے سکتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ سب نظامیوں کی ایک فہرست شایع ہونی چاہیے تاکہ ایک

دوسرے سے واقف ہوجائے -

محمد اسمٰعیل نظامی

نے کوئٹہ بلوچستان سے اطلاع دی ہے کہ وہ نوکری سے علحدہ ہو گئے ہیں، اپنا لا آرہے ہیں -

توحیدی شاہ

نے رنگون برما سے اطلاع دی ہے کہ وہ حضرت محبوب الٰہی کے سالانا عرس میں شرکت کے لیے دلی آئیں گے -

برکت علی نظامی

بجوہا پنجاب سے لکھتے ہیں کہ اپنی بساط کے موافق روزنامچے کی تبلیغ کرتا رہتا ہوں، مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے طلبا کے بال کٹوا دیے - فیشن سے بچنا بہت ضروری ہے -

مولانا مفتی محمد انوار الحق صاحب

نے ریاست بھوپال سے روزنامچے کی امداد کے لئے پانچ روپے بھیجے ہیں، اور یہ لکھا ہے کہ میں نہ نظامی ہوں نہ اپنے آپ میں وہ صفات پاتا ہوں جن کی آپ برگزیدہ اصحاب سے توقع رکھتے ہیں نہ مجھ میں یہ قابلیت ہے کہ روزنامچے کی نشر و اشاعت میں حصہ لے سکوں، لیکن پھر بھی میں روزنامچے کو پسند کرتا ہوں، اور اس کو دلچسپی سے پڑھتا ہوں، اس لیے میری دلی خواہش ہے کہ وہ جاری رہے، اور ہو سکے تو روزانا ہوجائے اس لیے ایک نہایت ہی قلیل رقم بھیجتا ہوں، تاکہ واحدی صاحب کے کثیر نقصانات کی تلافی کا ایک جز بن سکے -

... چشتی نظامی

احمد آباد سے لکھتے ہیں - بیت المال کی اسکیم کو وسعت دینا چاہیے، ہر درجہ سے روزانا ایک پیسہ لازمی طور سے وصول ہونا چاہیے جو دولت مند ہیں ان سے زیادہ رقمیں لی جائیں - اس کے علاوا زکات اور خیرات و صدقات بھی سب بیت المال میں جمع ہوں آٹھ دس مرید جمع کر لیجیے، اور ان کو اپنے ہاں رکھ کر کام کرنے کا طریقہ سکھا دیجیے، اور پھر ان کو مختلف علاقوں میں بھیجیے تاکہ وہ آپ کی منشا کے مطابق تنظیم کا کام کریں (یہ رائے مجکو بہت مفید معلوم ہوتی ہے - حسن نظامی) ٹوپیوں کے متعلق میری رائے ہے کہ ابر اکالا ہو اور استر زرد ہو -

نیکی شاہ نظامی

ضلع بھاگلپور سے لکھتے ہیں - کمترین حضور کی ہر تحریک میں دل سے شامل ہے، اگرچہ بڑھاپے اور علالت کی وجہ سے کسی عملی کام کے قابل نہیں ہے - انشاءاللہ پنشن آنے کے بعد کسی ایک شخص کے نام اپنی طرف سے روزنامچا جاری کرا دوں گا - ٹوپی کا خواستگار ہوں اپنے سر کے موافق بنوا دیجیے -

اللہ بخش خان نظامی

نے آ... سے لکھا ہے تحریک کے ہر مشکل کام کے لیے تیار ہوں، روزنامچے سے ہم کو خاص لگاو اور تعلق ہے -

غلام محمد نظامی

... ضلع جالندھر سے لکھتے ہیں - حضور انور کے حکم کے بموجب روزنامچے کی ترقی کا کام کروں گا، اور ہر خدمت انجام دوں گا -

غلام نبی نظامی

بمبئی سے لکھتے ہیں انشاءاللہ ہر سرد و گرم نرم و مشکل کام کرنا اپنا فرض سمجھوں گا جس کے لیے حضور مجکو منتخب فرمائیں

محمد اسرائیل خان نظامی

آدرا سے لکھتے ہیں کہ اسرائیل نام عبرانی نے پسند نہیں کیا، مگر مجھے ... [illegible]

ترقی کی روح پھونکنے والا ہوگا -

جواب

اگر عورتوں نے یہ نام پسند نہیں کیا تو محمد اسماعیل نام رکھ دو -

نبی بخش نظامی سلیمانی

نے بیکانیر ہاؤس سے تین روپے بھیجے ہیں، اور لکھا ہے کہ چھپر گر جانے کی خبر پڑھی خدا کا شکر ہے کہ آپ کے بچے سلامت رہے، ان کے صدقے کے لیے تین روپے بھیجتا ہوں -

میں نے ایک روپیا خیرات کر دیا، اور دو روز نامچے کے فنڈ میں دے دیے - (حسن نظامی)

توکلی شاہ نظامی

نے بنگو ہرا سے کئی خریدار بھیجے ہیں —

شیخ رحمت علی نظامی

نے جاے باسا ضوبے بہار سے لکھا ہے، روزنامچا حضور کا برابر پڑھتا ہوں، اور تبلیغ کی کوشش کرتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ روز نامچا روزانا ہو جاے عید میلاد کے لیے جو حکم ہوگا اس کی تعمیل کی جاے گی -

نواب صفدر یار خان نظامی

حیدرآباد سے لکھتے ہیں میں ایک عرصے سے جاگیر میں تھا - حیدرآباد واپس آنے کے بعد روز نامچا پڑا جو تیتے فرزند حسن ثانی کی مبارک باد دیتا ہوں - میری لڑکی صفدر النسا بیگم نظامی کو بھی خدا نے بیٹا دیا ہے -

عبدالشکور نظامی

تمدن والے گھورندی پونا سے لکھتے ہیں روز نامچے کے تین خریدار بھیجتا ہوں (یہ صاحب ۱۹۱۱ء میں مرید ہوے تھے جب میں مصر اور شام و حجاز کے سفر کے لیے

جا رہا تھا (حسن نظامی)

محبوب بانو نظامی

حیدرآباد سے لکھتی ہیں کہ ستراویں کی نیاز خدا کے فضل سے کامیاب رہی تنظیمی احکام کی تبلیغ کروں گی امید ہے کہ میرے آقا اپنی کنیز کو کارلایقا سے فراموش نہ فرمائیں گے - زرد رنگ ٹوپی کا اور دوپٹا کا ہر لحاظ سے بے حد مناسب ہے - روز نامچے کی نسبت عرض ہے کہ ہفتا وار رہنا چاہیے - روزانا ہو جاے تو میرے آقا پر بہت زیادا محنت کا بار ہو جاے گا - حضور اقدس کی صحت اور سلامتی سب پر مقدم ہے زاید اخراجات کے لیے قیمت بجاے دو روپے سالانا کے تین روپے سالانا کر دی جاے - پیارے جبرئیل کو اپنی گود میں لیکر تصویر کھنچوا لیے اور ایک کاپی کنیز کو بھی عنایت فرمایے -

جواب

اور بھی بہت سے خط جبرئیل کی تصویر کے لیے آے ہیں مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکا انسان ہے فرشتا نہیں ہے، اور اس کی تصویر کھنچ سکتی ہے - لوگ چاہتے ہیں کہ اس کی تصویر روز نامچے میں شایع کر دی جاے، اور میں بھی اس کو پسند کرتا ہوں، کیونکہ میرے سب بچوں کی تصویریں اکثر نظامیوں کے پاس ہیں صرف جبرئیل تصویریں نہیں ہیں - بعض احباب کی راے ہے کہ سواے حوریاز کے باقی سب بچوں کا ایک گروپ شایع کر دیا جاے، جس میں جبرئیل کی تصویر بھی ہو -

محمد رفیق خان صاحب نہرادی

کراٹ سے لکھتے ہیں آپ نے مجکو بھی بذریعے روزنامچا بسلسلے تنظیم جماعت نظامیا یاد فرمایا ہے - میں اگرچے نظامی نہیں ہوں پھر بھی ہر ممکن خدمت کے لیے تیار ہوں، روز نامچے کے خریداروں کے پتے بھیجتا ہوں -

ذاتی

آج چند ضروری اطلاعوں کی وجہ سے روز نامچے کے

پروگرام میں تبدیلی کر دی - کل سے پھر سورا پروگرام ہوجائے گا - صبح سے دوپہر تک دفتر میں کام کرتا رہا دوپہر کے بعد دلی گیا - واحدی صاحب اور مولانا سیفی صاحب کے ساتھ بازار سے ضروری سامان خریدا - مغرب سے پہلے گھر میں واپس آیا گلے کی تکلیف باقی ہے، لیکن زیادہ اذیت نہیں ہے کوثر کا بخار کم ہے، مگر زید کو بخار ہوگیا ہے - آخری چہارشنبہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں حضور محبوب الٰہی کے مزار کو گلاب اور کیوڑے سے غسل دیا جاتا ہے، اس تقریب میں دور دور کے آدمی آتے ہیں، بارش ہوئی، مگر بہت کم خشکی ہوگئی ہے -

کشمیر کے مسلمانوں کی داستانیں روز آنا آرہی ہیں - حکومت نے ظلم و تعدی کا دور چلا لگا دیا ہے - میں نے مہاراجہ کے نام ایک طویل خط لکھنا شروع کیا ہے اتمام حجت مقصد ہے، ورنہ نتیجا معلوم ہے کہ کچھ نہیں ہوگا -

پہلے زمانے میں مسلمان مل کر کام کرتے تھے، مگر آج کل معاملہ برعکس ہو گیا ہے، اس لیے انفرادی طور سے ہر ایک کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ خدمت اسلامی دینی ہے -

۲۶ صفر ۱۳۵۰ھ دو شنبہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء دہلی

مشیت الٰہی کا روزنامچا

کالا سانپ

اگر تو انسان کی بے عقلی پر ہنسنا چاہے تو میں کیوں کہ یہ آدم زاد شروع سے کالے سانپ کو ہیکل الوہیت کا مظہر خاص سمجھتا آیا ہے - ہندو، مصری، بابلی، رومی، یونانی سب ہی مشہور قومیں کالے سانپ کو پوجتی تھیں، اور اس کے بت بناتی تھیں - اب کم عقل آمیز حمق انسان کو کالے سانپ کی پوجا کی طرف رغبت دلاتا ہے -

تو اپنی بات پر آگیا تو بھی کالے سانپ کی سیاہی سے (نور حقیقی کا نتیجا پیدا کرنا چاہے گا)

تو احمقوں میں شرکت نہ کر سانپ اور گائے جو مقبول جانور ہیں مخلوق ہیں ان سب کے اندر میرا ہات ہے، اور میں خدا اپنا اختیاری بات نہیں ہوں ہاں تجکو کالے سانپ کی چمک اور سیاہی اور اس کی دلیری و جرأت سے سبق لینے کی اجازت ہے، جو وہ آدمی کے سامنے پھن اٹھا کر اور پھنکار مار کر آنکھ میں آنکھ ڈال کر دکھاتا ہے -

اس کی پھنکار میں صوت سرمدی کا ایک مقام بھی کبھی کبھی ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی سیاہی سے جو تجھ کو آدمی نتیجا پیدا کر، مگر وہ نتیجا محض ذہنی اور [illegible] ہوگا

پورے گل [illegible]، چراغ محفل کے کالے دھویں کو دیکھ، آہ دل کی سیاہ باطنی پر نظر کر پھر برسات کی کالی گھٹا کی بہار پر بھی آنکھ اٹھا، کوئی کیا جانے کوئی کیا سمجھے تو تو بس "ظلمت نور رب ہے" یہی [illegible] جا -

رسول اللہ کا روزنامچا

کالا کمبل

دیکھنا کالے عمامے والے فاتح مکہ کو دیکھنا یہ تو کالا کمبل بھی اوڑھتے ہیں یا ایہا المزمل کہنے والا ان کو اسی کالی کملی کے سبب مزمل و مدثر کے القاب سے یاد کیا کرتا تھا -

خاجا نظام کا روزنامچا

حیدری فقیر

(کل والی تاریخ میں) خاجا ذکر اللہ بالخیر نے ارشاد فرمایا ایک ترک تھے جن کا نام حیدر تھا - لوہا ان کے ہات میں موم ہو جاتا تھا، اور وہ لوہے کا طوق اور زنجیریں پہنا کرتے تھے - چنگیز خان کا خروج ہوا تو انہوں نے اپنے مریدوں سے کہا یہ شخص فتح یاب ہوگا، کیونکہ میں ایک غیبی قوت اس کے ساتھ دیکھتا ہوں - یہ کہہ کر حیدر ایک غار میں چلے گئے، اور غائب ہوگئے (خاجا حسن علا سنجری نے) عرض کی حیدریا خاندان کے فقیر جو لوہا پہنتے ہیں، اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہوگی؟ ارشاد ہوا ہاں وہ حیدر کی تقلید میں لوہا استعمال کرتے ہیں۔

آج کل بھی حیدرآباد میں فقرا بکثرت پائے جاتے ہیں، اور وہ سب لوہا پہنتے ہیں۔

خاکسار کے غلام کا روزنامچہ

بالوں کو لپیٹ دیا

آج میں نے داڑھی کے بال کم کرا دیے اور سر کے بال لپیٹ کر سکھوں کی طرح رومال میں باندھ دیے کیونکہ تمام گلے پر ورم ہے، اور شفا نہیں نکلتا ہوں تو بال گلے پر لپٹ جاتے ہیں، اور زخم سے زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔

داڑھی تمغۂ شریعت ہے، اور سر کے بال انوار علوی جذب کرنے کا ذریعہ ہیں، ان ہی سے تجلیات بالا دماغ پر اور بالوں کی نوکوں سے کندھوں کے اعصاب میں، اور وہاں سے دل کے اندر جاتی ہیں۔

میں نے تمغۂ شریعت کو کم کیا تو صورت ایسی ہوگئی جیسے ایال کٹا ہوا ببر شیر یا لنگوٹی بند کا ندی، پھر بھی میری داڑھی حدود شرع سے زیادہ کم نہیں ہوئی ہے۔

صحیفے کی تبلیغ

حیدرآباد دکن کا روزانہ اخبار صحیفہ ہر ہفتے روزنامچے کے مضامین کا بڑا حصہ اپنے مقدس صحیفے میں شایع کرتا ہے۔ یہ اس کی ایسی تبلیغ ہے کہ اخبار دین احمدآباد کے بعد اور کوئی نظامی اتنی بڑی تبلیغ روزنامچے کی نہیں کر سکتا۔ لہذا ہر نظامی کو اخبار صحیفے کے ایڈیٹر مولانا اکبر علی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

آج دلی نہیں گیا دل بھر دفتر میں کام کیا آج آنکھ پر ورم تھا ایک نازک اندام پھنسی آنکھ کے اندر ہو گئی تھی۔ بارہ بجے تک آنکھ بند کر رکھوا تا رہا، اس کے بعد تکلیف بڑی تو پھنسی کو دبا کر پیپ صاف تکلیف تو ہوئی مگر پڑھنے میں آسانی ہو گئی ورم کم ہو گیا۔

بڑی بزدلی ہو ہی، اگر آنکھ کے نا خاندانی مہمان کو جبراً نہ نکالتا۔ رات کو بوندیں آئیں، مگر بارش نہ ہوا، آج شا ماکی قوالی نہ سنی ساستا رہا صبح صادق

کے وقت آنکھ کھلی (حیدرآباد کا محاورہ ہے آنکھ ہشیار ہوئی) آخر ماہ چاند بھی نہ دیکھا نہ کل دیکھا تھا۔

۲۰ / ۲۰ خور ۱۳۵۰ف ۱۳ / منگل ۱۴ / جولائی ۱۹۴۱ء (روز)

مشتی ہوالہی کا روزنامچہ

برف

پانی خاک سے مقدار میں زیادہ ہے، مگر بے چین ہے خاک کو ہر وقت سکون ہے پانی کو کسی وقت قرار نہیں اور تو نے یہ بھی دیکھا کہ وہ تو ہر رنگ کو قبول کر لیتا ہے زرد سے ملا زرد ہو گیا لال سے ملا لال ہو گیا، مگر جب یہ پانی برف بن جاتا تو پھر کوئی رنگ قبول نہیں کرتا۔ تو پانی نہ بن خاک بن اور پانی بننا ہو تو برف بن، تاکہ زہر پڑے تو بہہ جائے، شہد پڑے تو پھسل جائے۔ برف کو نہ زہر کا ڈر نہ شہد کا شوق۔

میں پانی کی باطنی ہواؤں کو خارج کر دیتی ہوں تو وہ جم کر برف بن جاتا ہے۔ انسان برف کا عاشق ہے گرمی کے موسم میں اس کو برف سے بڑی محبت ہو جاتی ہے تو کہتا ہوں نہیں کہ کیوں؟

میں کہوں گی یوں کہ برف پانی کے ذروں کی تنظیم کا دوسرا نام ہے اور ہر چیز کی تنظیم جب مکمل ہو جاتی ہے تو وہ چیز محبوب خلایق بن جاتی ہے، اور اس میں ایک خنکی یعنی ہاں خنک کرنے والی خنکی پیدا ہو جاتی ہے۔

بدایوں کا چاند

صفر کے مہینے کا چاند اپنی ۲۶ منزلیں پوری کر کے چند رات کے بعد غروب گیا تو ہندستان کے مشہور شہر بدایوں میں آخری چہارشنبہ کو ایک سید کے گھر میں ایک چاند پیدا ہوا، اور اس کا نام محمد رکھا گیا۔

اس چاند کے باپ کا نام احمد تھا جو علی کے بیٹے تھے، اور اس چاند کی ماں کا نام زلیخا تھا، جو عرب کے ... [illegible]

جو اپنے کنبے کے ساتھ بخارا سے ہندستان آئے، اور لاہور میں ٹھہرے۔ لاہور میں سید علی کے ہاں سید احمد اور سید عرب کے ہاں زلیخا کی ولادت ہوئی۔

پھر یہ کنبا بدایوں میں آ کر رہنے لگا، سید احمد اور بی بی زلیخا کی شادی ہوئی اور ان سے پہلے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جن کا نام جنت رکھا گیا، پھر صفر کے آخری چہار شنبے کو وہ چاند پیدا جس کا نام محمد اور عرف نظام الدین اور القاب سلطان المشائخ محبوب الٰہی اور اولیا مشہور ہوئے۔

یہ چاند پانچ برس کی عمر میں یتیم ہوا اور ۱۶ برس کی عمر میں تعلیم پوری کی پھر بوا والدا اور بہن کے ساتھ حدیث کی تعلیم پوری کرنے کے لیے یہ چاند دلی میں آیا، اور یہاں کی تعلیم مکمل کر کے اجودھن (پاک پٹن ضلع منٹگمری، پنجاب) میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے پاس حاضر ہو کر بیعت کی خلافت لی اور دلی کی نیابت حاصل کر کے یہاں سکونت اختیار کی۔

بدھ کو پیدا ہوا، بدھ کو مکتب میں بیٹھا۔ بدھ کو بیعت کی۔ بدھ کو خلافت ملی، بدھ کو بتاریخ ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ ۹۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آج چشتیا خاندان کے اس ماہتاب کی پیدائش کی رات ہے چاروں طرف سے ہندو مسلمان نظامی عورت مرد گلاب کیوڑے کے شیشے لیے چلے آتے ہیں۔ رات کے تین بجے جو اس ماہ کامل کے طلوع کا وقت ہے، روضے کے پردے چھوڑ دیتے ہیں، سب نظامی مراقب بیٹھ جاتے ہیں مسجد درگاہ کے امام صاحب اور خواجہ نو کے بھائی سید ابن عربی صرف دو آدمی اندر جاتے ہیں، گلاب کیوڑے سے مزار کو غسل دیتے ہیں، نیا غلاف چڑھاتے ہیں، پھولوں سے اور عطر سے مزار کو بساتے ہیں، کھ سامنے کا پردا اٹھاتے ہیں، قوال دھیمے سروں میں تہنیت گاتا ہے۔

آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے
خواجہ نظام کے گھر رنگ ہے

سب نظامی پروانوں کی طرح دوڑتے ہیں، اور اپنے سر اس محبوب کے قدموں میں جھکا دیتے ہیں، صبح کی اذان ہوتی ہے، جماعت کے بعد قاقا خانی کی رسم ادا کی جاتی ہے، اور سب نظامی رخصت ہو جاتے ہیں۔

گذشت

چار بجے تک دفتر میں کام کیا پنجاب سے ایک صاحب نوکری کے لیے آئے تھے، میں نے صفائی سے کہا کوئی جگہ نہیں ہے، خفا ہو کر کہا اتنی صفائی؟ یہ بھی نہ کہا کہ میں خیال رکھوں گا، میں نے ہنس کر کہا کیا میں تم کو دھوکا دیتا جھوٹ بولتا؟

عصر کے بعد زنانے میں بیٹھ کر مغرب تک تحریری کام کیا حرزیا نو بھی غسل شریف کی شرکت کی تقریب کے لیے آئی ہیں، بچوں میں اس تقریب کی عام خوشی ہو رہی ہے۔ کل اسکول اور سب دفتر بند رہیں گے، اور میں بھی کچھ کام نہ کروں گا، گرمی بہت ہے گلے کی تکلیف برجور ہے۔ سینے تک ورم اور سرخی ہے، بیماری خیال کرتی ہوگی میں نے اس آدمی کو دبا لیا، اس کو کیا خبر کہ اس معاملے میں مجھ کو سمجھنا غلطی ہے، میں اس سے نہیں دبا۔

غسل شریف

شام کو بیگو برا سے شیخ داود آئے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں بیگو برا میں لکڑی کا بیوپار کرتے ہیں، حسین خانے کے بالا خانے پر ٹھہرے بیعت ہونے کی غرض سے آئے ہیں۔

رات کے تین بجے میں بررڈنگ کے سب کروں اور اپنے بچوں کے ساتھ درگاہ میں گیا۔ شیخ داود بھی گئے۔ درگاہ زایرین سے بھری ہوئی تھی، کہیں جگہ باقی نہ تھی، سب خاموش تھے۔ سید ابن عربی روضے شریف کے اندر غسل میں مصروف تھے، قوالی ہو رہی تھی۔

غسل کے بعد صبح کی نماز جماعت سے پڑھ کر حسین خانے میں آیا، نظامی سلسلے کے بھائی وہیں ملنے آتے رہے، اخبار "الامان" کے ایڈیٹر منشی عبدالحمید صاحب بھی آئے۔

منشی صابر علی صاحب محرر دفتر "الامان" کو نہیں دیکھا، حالانکہ وہ آٹھویں دن درگاہ میں آتے ہیں، بڑے پکے عقیدے کے ہیں، خدا کرے تندرست ہوں۔

ابر چھایا ہوا ہے، ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، محبوب کے یوم میلاد کی برکت سے چاروں طرف فرحت و مسرت پھیلی ہوئی ہے۔

پورڈ نگ کے بچے اور کھیلے کی سیر کرنے گئے۔

میں نے آج کچھ کام نہیں کیا، دلی اور درگاہ کے سب دفتر بھی بند رہے مجھے پچھلی رات درگاہ میں ایسے چکر آئے کہ موت کا وقت معلوم ہونے لگا، مگر ایک گھنٹے کے بعد حالت درست ہو گئی، وجہ یہ تھی کہ رات کو بواسیر کا خون بہت آیا تھا۔

خاجا باز اور حور باز بھی درگاہ میں گئی تھیں، عورتوں کی جگہ مردوں سے الگ ہوتی ہے۔

احترام اسلام اشک

ہندی غزل

کیوں ہردے ساگر کا منتھن ہو گیا
کیا کسی مورت کا درشن ہو گیا
مسکرا دیں وہ تو سمجھو دوستو
میری باتوں کا سمرتھن ہو گیا
درشن راحاین کے ہم تم آ گئے
آج پھر آباد مدھوبن ہو گیا
کیا تمہارے روپ کا ورنن کروں
جس نے دیکھا تم کو درپن ہو گیا
آپ کے پد چنھ پر جو بھی چلا
اشک اس کا مارگ درشن ہو گیا

گوہر سہارنپوری

ایک سابق وزیر کی آہ و زاری

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ لیلی وزارت کا میرے ہاتھ آنا
وہ ساتھ سب کے جانا وہ سیر کل جہاں کی
ایٹ ہوم کی بہاریں وہ سب کا مل کے کھانا
پبلک کی محفلوں میں وہ جھومنا خوشی سے
تقریریں سن کے میری وہ تالیاں بجانا
ہیں رونقیں کہاں وہ اب اپنے اجڑے گھر میں
وہ موٹروں میں آنا اور موٹروں میں جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
نوکر کا صبح آ کر وہ میرا منہ دھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ لیلیٰ وزارت
آباد جس کے دم سے تھا میرا سب گھرانا
تڑپا رہی ہے مجھکو رہ رہ کے یاد اس کی
تقدیر میں لکھا تھا اس طرح بیٹھ جانا
جب سے چھٹی ہے کرسی یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

مطلوب احمد

یورپ کی مشہور سائنس داں مادام کیوری

مادام کیوری کا نام ان کے گراں بہا سائنسی انکشافات اور ایجادات کی بدولت تاریخ کے زریں صفحات میں ہمیشا دمکتا رہے گا - انہوں نے ریڈیم اور پورنیم جیسے شعاع دار مادے دریافت کر کے سائنس کی دنیا میں تو تہلکا مچایا ہی تھا، طبی میدان میں بھی نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ ریڈیم کی بدولت عصبی امراض اور سرطان کے علاج میں کافی ترقی ہوئی ہے - اس کے علاوا اس دریافت سے زمین کے مختلف طبقات اور آثار قدیما کی تحقیقات میں بھی بہت مدد ملی ہے -

مادام کیوری ایک مشہور سائنس داں ہی نہیں تھیں، ان کی زندگی کے اور بھی بہت سے تابناک پہلو تھے - وہ ایک کامیاب بیوی اور مثالی ماں بھی تھیں - انہوں نے تجربے اور تحقیقات کے دوران میں غیر معمولی مصروفیت کے باوجود اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ وہ ایک بیوی اور ماں بھی ہیں۔ وہ دن بھر اپنے شوہر کے ساتھ تجربات میں مصروف رہتیں، مگر یہ ان کا ہمیشا معمول رہا کہ لنچ سے گھنٹے آدھ گھنٹے پہلے ہی گھر پہنچ کر اپنے شوہر کا پسندیدا کھانا غذا اپنے ہات سے تیار کرتیں - جب ان کے شوہر پیٹر پیئر کیوری ان کی غیر معمولی مصروفیت اور تھکن کے پیش نظر کھانا وغیرا تیار کرنے سے انہیں روکتے تو بہت محبت سے کہتیں "دیکھیے جناب جب آدمی کا معدا خالی رہتا ہے تو وہ کوئی کام نہیں کر سکتا، اور جب کھانا بہر حال کھانا ہی ہے تو کیوں نہ اچھی طرح سے کھایا جائے، اور پھر کھانا پکانے سے کون سا آدمی تھک جاتا ہے - حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنے ہات سے پکانے میں بڑا لطف آتا ہے"

غرض اس طرح کی باتیں کر کے وہ روزانا یہی کوشش کرتیں کہ کھانا اپنے ہات ہی سے تیار کریں اسی طرح رات کے چند گھنٹے انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی مادام ایرین کیوری کے لیے مخصوص کر رکھے تھے، جو آگے چل کر اپنی ماں ہی کی طرح اپنے زمانے کی مشہور سائنس داں بنیں - مادام ایرین کیوری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "میری کیوری، میری ماں" میں لکھا ہے کہ "حقیقی معنوں میں میری ماں نے ہی مجھے سائنس داں بنایا - انہوں نے شام کے چند قیمتی گھنٹے میرے لیے مخصوص کر رکھے تھے، جن میں مجھے وہ خود تعلیم دیتیں، اور ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ میرے تجربات کو وہ خود اپنے ہاتوں سے میری کتاب میں درج کر دیتیں - آج میری تمام تر شہرت اور عزت کے پیچھے ان ہی کا ہات ہے۔

مادام کیوری کا اصل نام میری سکلوڈووسکا تھا وہ سنہ ۱۸۶۷ء میں پولینڈ کے ایک شہر میں پیدا ہوئیں - ان دنوں پولینڈ پر روس کا قبضا تھا، اور پولینڈ والے آزادی کے لیے برسرپیکار تھے - اپنے ملک کے دوسرے نوجوانوں کی طرح مادام کیوری بھی فرضی ناموں سے اخباروں میں مضامین لکھتیں اور پمفلٹ شایع کراتیں - پولیس ان کی تلاش میں سرگرداں رہتی، لیکن ان کا سراغ لگانے سے قاصر

رہتی - جب مادام کیوری کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہوئی تو وہ فرانس چلی آئیں، تاکہ کسی نہ کسی طرح سائنس کی تعلیم بھی حاصل کرتی رہیں۔ فرانس میں انہیں بہت غریبی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے کھانے، رہنے اور پہننے پر روزانا آدھے فرانک سے زیادا خرچ نہ بیٹھتا، انہوں نے فرانس میں ایک لیبوریٹری کی شیشیاں اور ٹیوب دھونے کی ملازمت کرلی، تاکہ اسی بہانے تجربات کا خود بھی مشاہدا کرسکیں - اسی لیبوریٹری میں ان کی ملاقات پیئر کیوری سے ہوئی، اور پھر جلد ہی یہ ملاقات شادی میں بدل گئی - شادی کے بعد دونوں میاں بیوی نے اپنے ہی گھر میں ایک چھوٹی لیبوریٹری قایم کرلی، جہاں مختلف مادوں پر دونوں تجربات کرتے۔ سالہا سال تک تجربات کرتے رہنے کے بعد آخر کامیابی نے ان کے قدم چومے اور جولائی سنہ ۱۸۹۸ء میں انہوں نے ریڈیم اور پھر اسی سال انہوں نے دسمبر میں پولونیم مادا دریافت کرلیا - پولونیم کا نام انہوں نے اپنے آبائی وطن پولینڈ کی مناسبت سے رکھا تھا -

جب مادام کیوری نے ان دونوں بیش قیمت مادوں کی دریافت کا اعلان کیا تو فزِکس اور کیمسٹری کے عالموں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا، کیونکہ اس وقت عام طور سے یہی باور کیا جاتا تھا کہ ذرے کی مزید تقسیم نہیں ہوسکتی، مگر مادام کیوری نے یہ ثابت کردکھایا کہ ذرا (ایٹم) جس کا ایک مرکز بھی ہوتا ہے مادے اور قوت پر مشتمل ہوتا ہے، جو بعد میں قوت میں تبدیل ہوجاتا ہے، پھر یہی قوت بعد میں دوبارا مادا بن جاتی ہے -

ایک طرف مادام کیوری اپنی دریافت پر مصر تھیں تو دوسری طرف دنیا بھر کے سائنس داں اس بات پر اڑے ہوے تھے کہ وہ ریڈیم اور پولونیم کے وجود کو اسی وقت تسلیم کریں گے جب انہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ مادام کیوری نے جرأت سے کہا "میں ایک غریب عورت ہوں - اگر کہیں سے مناسب مقدار میں پچ لینڈ کی تلچھٹ مل جائے تو میں اس سے ریڈیم اور پولونیم نکال کر دنیا کو دکھا دوں گی"، اور اس پر آسٹریا کے ایک امیر شخص نے ایک ہزار کیلو گرام پچ لینڈ انہیں بھیج دیا، اور فرانس کے ایک اسکول نے اپنی فزِکس کی پوری لیبوریٹری ان کے تصرف میں دے دی - سنہ ۱۸۹۹ء میں انہوں نے تجربا کرنا شروع کیا - وہ مسلسل آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے تک آگ کی بھٹی کے سامنے بیٹھ کر پچ لینڈ کو صاف کرتیں، اور اس سے ریڈیم نکالنے کی کوشش کرتیں اس عمل کے درمیان ان کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا بار بار جھلس گئے، مگر انہوں نے کوئی پروا نہیں کی - کسی نئے فارمولے کی تلاش میں رات کو وہ دیوانوں کی طرح چکر لگاتیں، اور سوچ بچار میں اس قدر ڈوبی رہتیں کہ پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی، اور انہیں خبر تک نہ ہوتی - آخر ان کی محنت کا پھل ملا، اور پورے تین سال کے بعد سنہ ۱۹۰۲ء میں وہ ریڈیم نکالنے میں کامیاب ہوگئیں - رات کو جب انہوں نے ریڈیم نکالا تو پورا کمرا روشنی سے جگمگانے لگا۔ روشنی اس قدر تیز تھی کہ انہوں لیبوریٹری کی بتی تک بجھا دی کچھ ہی دن بعد انہوں نے پورے دس گرام ریڈیم نکال کر دنیا کے سامنے رکھ دیا -

اس دریافت کے بعد مادام کیوری کے لیے افلاس کے دور کا خاتما ہوگیا - فرانس کی سائنس اکیڈمی نے انہیں ڈاکٹری ڈگری دینے کے علاوا دس ہزار فرانک کی گراں قدر رقم بھی دی - اس کے علاوا ان کی غریبی کے پیش نظر دنیا بھر کے مال داروں نے انہیں تحفے تحایف بھیجے - امریکا نے انہیں ایک شاندار لیبوریٹری اور دوسری سہولیات مہیا کرنے کی پیش کش کی، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا "میں اس فارمولے کو راز میں نہیں رکھوں گی - میرے پاس اب خدا کا دیا ہوا بہت کچھ ہے، اس لیے جس طرح دنیا والوں نے میری مدد کی ہے، اس قیمتی مادے کا تحفا دے کر میں بھی ان کے احسان کا بدلا چکانا چاہتی ہوں"، اور واقعی انہوں نے نہ صرف یہ کہ بدلا چکایا، بلکہ الٹا احسان کیا کیونکہ انہی کی اس [illegible] - دنیا کے علاج میں زبردست آسانیاں پیدا [illegible] اور کینسر جیسے موذی مرض کا بھی

علاج ممکن ہو سکا۔ اس طرح فزکس اور کیمسٹری کی دنیا میں بھی انقلاب رونما ہوا اور سیکڑوں سال کے غلط نظریات ایک دم ختم ہو گئے۔

مادام کیوری کی اس بیش قیمت دریافت پر ۱۹۰۳ء میں انہیں نوبل پرائز دیا گیا، مگر کچھ ہی برس بعد ان پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، کیونکہ قدرت نے ان کے محبوب شوہر کو ان سے دور کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں ان کے شوہر پیئر کیوری اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مادام کیوری نے پیرس میں ایک ریڈیم انسٹی ٹیوٹ قایم کیا۔ جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے تجربات کے لیے اور بھی زیادہ وقت دینا شروع کر دیا، کیونکہ زخمیوں کے آپریشن کے لیے کافی تعداد میں ریڈیم کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب انہوں نے اپنے ساتھ اپنی سترا سالا بیٹی ایرین کیوری کو بھی لے لیا۔ دونوں نے پوری پوری رات آنکھوں میں کاٹ کر ریڈیم تیار کیا، اور اسے اسپتال میں بھیجا۔ ان کی اس کوشش سے ہزاروں زخمی شفایاب ہو گئے۔

کچھ ہی سال بعد تاریخ نے ایک اور کروٹ لی، اور ان کی یہی لڑکی مادام ایرین کیوری جن کی تعلیم و تربیت کا مادام کیوری کو بہت زیادا خیال رہتا تھا سائنس کی ایک نامور عالم اور مشہور محقق بن کر اپنی ماں ہی کی طرح ہوئیں اور اپنی ماں ہی کی طرح نوبل انعام حاصل کیا۔

غزل

شعور نازش

میں کیا کروں جو مرے راستے میں دار ملے
مجھے تو اس سے غرض ہے کہ میرا یار ملے

متاع غم سے جو ہر لمحہ ہم کنار ملے
وہی خلوص و محبت کے راز دار ملے

عجیب وقت جنوں تھا کہ جب دعاء مانگی
مجھے خزاں ہو میسر تجھے بہار ملے

بڑھاؤں دست طلب کس لئے ادھر میں شعور
جہاں سے دامن ہستی کو صرف خار ملے

ارمان شام نگری

غزل

شب غم پاتا ہے گو درد میں لذت کوئی
پھر خواہش ہے کہ ہو وصل کی صورت کوئی

پیار شیوہ ہے مرا پیار کئے جاتا ہوں
مجھ سے کرتا ہے تو کرتا رہے نفرت کوئی

اک جھلک میں مجھے کر ڈالو شہید غمزہ
رہ نہ جائے غم دوراں سے ضرورت کوئی

حسن مغرور تو خود بین ہی ہوا کرتا ہے
اس کی نظروں میں نہیں عشق کی وقعت کوئی

کاش وہ آئے دم نزع بھی پرسش کے لئے
بعد مردن بھی نہ دل میں رہے حسرت کوئی

رونما ہو گی تری فتنہ طرازی سے ضرور
میری دنیائے محبت میں قیامت کوئی

آمد فصل بہاری سے یہ ڈر ہے مجھکو
گل کھلائے نہ کہیں پھر مری وحشت کوئی

راس آتا نہیں آرام و سکوں کا ماحول
بھول جاتا ہے اگر اپنی مصیبت کوئی

درد انسان کی تڑپ ہے جو تڑپتا ہے مدام
کیا بتائے گا اسے درد کی عظمت کوئی

عبدالخالق پروفیسر پٹنا یونیورسٹی

[illegible]

مولانا شبلی نعمانی کا نثری اسلوب

مولانا شبلی نعمانی کے نثری اسلوب کا جایزہ لینے سے قبل مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اسلوب کے مفہوم کا تعین کر لیں، تاکہ ایک نثر نگار اور صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے ان کا مقام متعین کرنے میں سہولت ہو۔

اسلوب کو عام طور پر طرز تحریر یا انداز نگارش کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی کسی مصنف کی تحریر کی جو مخصوص نہج روش اور ڈھرا ہوتا ہے اس کا تذکرہ کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں ادیب کا انداز تحریر آسان سلیس و سادہ اور عام فہم ہے، اور فلاں کی طرز تحریر گنجلک، مغلق اور پیچیدہ ہے اور فلاں کا انداز بیان رنگین، مرصع، اور زور آمائی ہے، بلاشبہ اسلوب کا مفہوم اس سے واضح ضرور ہو جاتا ہے، لیکن یہ مفہوم سطحی ہے۔

اسلوب وہ آئینہ ہے جس میں فن اور فنکار دونوں اپنے تمام نشیب و فراز اور رنگ و آہنگ کے ساتھ منعکس ہو جاتے ہیں، اس کی گہرائی میں اترنے سے حیرت انگیز اور تعجب خیز نتیجا برآمد کرتا ہے۔ اسلوب کو بہتر طور پر برتنے سے اگر علم و فن کو دوام حاصل ہوتا ہے تو یہ فنکار کی شخصیت کو بھی بے نقاب کرتا ہے، اس کی مزید توضیح یہ ہو سکتی ہے کہ ہر ادیب کے سامنے دو منزلیں آتی ہیں پہلی منزل تجربے اور مشاہدے کی ہے یعنی فنکار جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے وہ اس کے احساس کو جھنجوڑ کر اور جذبات میں تلاطم پیدا کر کے تخلیق پر اکساتا ہے، اس کے بعد دوسری منزل پیشکش کی آتی ہے۔ جس میں فنکار مشاہدے اور تجربے کو اپنے فکر و شعور ذوق و ظرف، مزاج و میلان کی روشنی میں دیکھتا اور انہیں پیش کرتا ہے، یعنی ایک طرف خارجی اثرات کار فرما ہوتے ہیں، اور دوسری طرف داخلی محرکات اسکے اظہار کے لیے مجبور کرتے ہیں، اس کے لیے جس وسیلے ابلاغ کا سہارا لیا جاتا ہے، اسے اس موضوع کا اسلوب کہتے ہیں۔

اسلوب کی وضاحت دو طرح سے کی گئی ہے۔ فنکاروں اور دانشوروں کے ایک طبقے نے خارجی اجزا مثلاً الفاظ کے انتخاب میں سلیقہ مندی، فقروں کی تراشش اور خراشش میں مہارت، پیراگراف کی ترکیب میں چابکدستی، صنعتوں کے فنکارانہ استعمال وغیرا کی اہمیت کے لحاظ سے اسلوب کی وضاحت و صراحت کی ہے، کیونکے اسلوب، طرز، اسٹائل، شیلی اور اسٹائل اپنے بنیادی مفہوم کے لحاظ سے زیب و زینت عطا کرنا، کلام کو حشو سے پاک کرنا بیل بوٹے بنانا وغیرا معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قدیم سنسکرت کے عالموں مثلاً اچاریا بھرت، راج شنکر اور بھوج نے رتی (   ) لفظ کا استعمال اخلاق و آداب تراش و خراش کے لیے کیا ہے، یہی مفہوم انگریزی مصنفوں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ ہندی میں اس کے لیے شیلی (   ) مستعمل ہے جس کی تشریح ان لفظوں میں ملتی ہے

یعنی شیلی نام ہے حسن اخلاق واطوار اور خوبی فطرت و عادت کا -

ملک الشعرا محمد تقی بہار نے اسلوب یا سبک کو اس کے بنیادی مفہوم میں ہی استعمال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں -

"سبک در اصطلاح ادبیات عبارتست
از روش خاص ادراک وبیان افکار
بوسیلۂ ترکیب کلمات وانتخاب الفاظ
طرز تعبیر سبک یک اثرادبی وجہ خاص خود
از لحاظ صورت ومعنی و القا می کند و آں
نیز بنوبۂ خویش وابستہ بہ طرز تفکر گویندہ
یا نویسندہ در بارۂ حقیقت می باشد"
(سبک شناسی جلد اول مقدمہ)

انگریزی کا ایک مصنف اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کسی فرد کے لیے جو اہمیت سلیقا، تہذیب اور ادب کی ہے، تحریر میں یہی اہمیت اسلوب کو حاصل ہے، یعنی اسلوب تحریر کی تزیین وتحسین کا واحد وسیلا ہے، ورسس فولڈ کہتا ہے -

what maner is to the individual style is to the writer. It i, right, therefore to say that style is the man in the same sense and with the ... -strations as we say manirs makth man

یہی آواز باز گشت ایک دوسرے مصنف آرتھر کوئیلر کوچ کے یہاں سنائی دیتی ہے -

what style in writing is much the something as good maners in other human intercouse

غرض انگریزی مصنفوں میں بھی ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو اسلوب کو تحریر کی دلکشی اور زیب وزینت دینے کا وسیلا سمجھتے ہیں - اس کے لیے انتخاب الفاظ تصرفات الفاظ تراشش وخراش ترتیب وتنظیم اور ربط وہم آہنگی کو انتہائی ضروری سمجھتے ہیں، یعنی انہوں نے اسلوب کے خارجی اجزا ہی پر قناعت کی ہے، لیکن فنکار جس تخلیقی جذبے سے دوچار ہوتا ہے

اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے - ہربرٹ ریڈ کا خیال ہے کہ یہ نہ تو ذریعے تزئین ہے، اور نہ مشق و مزاولت سے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی ہے - یہ اس صلاحیت کا نام ہے کہ اپنے مافی الضمیر کو بہتر پیرائے میں کس طرح پیش کیا جائے -

دوسرا طبقا مصنف کی تہہ دار شخصیت کی تہیں کھول کر اس کے تخلیقی جذبے کے محرکات کا سراغ لگانے کی سعی کرتا ہے - اس کے نزدیک جس طرح انسانی شخصیت پیچیدا تہہ دار، مرکب درمرکب ہوتی ہے، اور اس کو سمجھنا اور سمجھانا اتنا آسان نہیں ہوتا اسیطرح اسلوب بھی پیچیدا اور مرکب درمرکب ہوتا ہے، اسلوب میں انفرادیت، شخصیت کی گونج، اس کے نکھار اور اس کی انانیت سے پیدا ہوتی ہے، گویا اسلوب میں شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، اسطرح دونوں لازم وملزوم ہیں - یہی سبب ہے کہ ایک ہی موضوع پر جب مختلف فنکار طبع آزمائی کرتے ہیں تو ان کے پیش کرنے کے طریقے میں فرق واختلاف ہوتا ہے - اسلوب کا یہ فرق شخصیت کے اختلاف کا نتیجا ہوتا ہے -

اس سلسلے کی نہایت اہم اور جامع تعریف لارڈ بفان کی تسلیم کی گئی ہے - اس کا خیال ہے کہ "اسلوب ہی انسان ہے" بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف ایجاز بلیغ کی عمدا مثال ہے - اسلوب ہی انسان ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی شخصیت کے تمام نقوش الفاظ وعبارت کی شکل میں ابھرتے ہیں، اور اس سے جو اسلوب بنتا ہے اس میں مصنف کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے -

ایمرسن کہتا ہے کہ یہ انسان کے ذہن کی آواز ہے، اور ہڈسن کا خیال ہے کہ یہ شخصیت کا عکس ہوتا ہے - غرض ابلاغ کا مسلا ایک اہم مسلا ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - جب ہم کچھ کہتے ہیں تو ہمارا مطمع نظر یہ ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اس کو سنیں، اس سے اثر پذیر ہوں، اور ہم اس کا ردعمل دیکھیں - ایک فنکار جب کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے مطابق میڈیم اس لیے اختیار کرتا ہے کہ اس کے ذریعے وہ اپنی بات دوسروں تک

پہنچانا چاہتا ہے، اسکے لیے جہاں خارجی اجزا (مثلاً انتخاب اور تصرفات الفاظ، فقروں کی تراش وخراش اوران کے درمیان ربط و ہم آہنگی) پر عالمانا عبور ضروری ہے، وہاں شخصیت میں ندرت، عظمت، نکھار اور توازن بھی لازمی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کا شمار ہندستانی کے ایسے ہی انشا پردازوں میں ہوتا ہے جو نثر کے خارجی اجزا پر عالمانا اور فنکارانا عبور رکھنے کے ساتھ ایک وقیع تہہ دار، متنوع اور نکھری ہوئی شخصیت کے بھی حامل تھے، یہی سبب ہے کہ ان کا اسلوب بڑا قابل قدر بے مثال اور ہندستانی ادب کے لیے مایۂ افتخار ہے۔ انہوں نے جہاں الفاظ کی نشست و برخاست، اور حسن استعمال، فقروں اور جملوں کی صناعانا تنظیم وترتیب اوران کے درمیان حسین اور فنکارانا ربط وہم آہنگی اور توازن، موضوع کی وضاحت کے لیے منطقی استدلال کا لحاظ رکھا ہے، وہاں اپنی انفرادیت وانانیت، شخصیت کی گونج اور اپنے خون جگر کو بھی شامل کیا ہے۔ الفاظ کا استعمال تو سبھی کرتے ہیں، لیکن خون جگر کی آمیزش بڑے فنکار ہی کا کام ہے۔ مولانا شبلی کا فن اس لیے زندہ اور پائندہ تابناک، تابدار رہے گا کہ انہوں نے اپنے فن میں خون جگر کو بھی شامل کیا ہے، اور وہ فن کبھی مر نہیں سکتا جس میں خون جگر کی آمیزش کی گئی ہو۔

نقش ہیں سب نا تمام خوں جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

عظیم شخصیتیں ہر ملک اور ہر زمانے میں کمیاب ہوتی ہیں ان میں کچھ تو ایسی ہوتی ہیں کہ زمانا انہیں ان کی زندگی ہی میں قدر و منزلت عطا کر کے قبول عام کی سند بخشتا ہے، اور کچھ کی اہمیت ان کی موت کے بعد تسلیم کیجاتی ہے۔ غالب کو عمر بھر اپنی ناقدری کا شدید احساس رہا۔ سرسید احمد خاں کو مرتد اور نیچری کے لقب سے نوازا گیا، لیکن مولانا شبلی ان خوش نصیبوں میں ہیں جنہیں قبول عام اور شہرت دوام کا شرف اپنی زندگی ہی میں حاصل ہوگیا تھا یہ ہندستانی زبان اور ادب کی خوش بختی تھی کہ ہندستانی کو شبلی جیسا خادم ملا جس نے [illegible]

حسن ونکھار پیدا کردیا، مہدی افادی نے صحیح لکھا ہے۔

"غالب زندا ہوتے تو شبلی کو اپنی ہندستانی سے فاسے کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لایق کردیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑیوں اور ثقا بہنوں، یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔"

(افادات مہدی ص ۱۵۸)

شبلی نعمانی سرسید کے رفقا میں علمی اور ادبی نقطۂ نگاہ سے سب سے بلند وبالا شخصیت کے حامل تھے۔ سرسید، حالی، ذکاء اللہ اور نذیر احمد نے نثر ہندستانی میں جو اضافے کیے ہیں وہ بلا شبہا اہم اور قابل ستایش ہیں، لیکن ان میں سے کسی ادیب کی شخصیت ادبی حیثیت سے اتنی وقیع تہہ دار، بلند قامت اور رچی ہوئی نہ تھی جو مولانا شبلی کو قدرت نے ودیعت کی تھی، یہی سبب ہے کہ جب انہوں نے تصنیف وتالیف کا آغاز کیا تو نہ صرف مسلمانوں میں بیداری پیدا کی، بلکے نثر ہندستانی کے دامن کو گل ہائے رنگ رنگ سے بھر دیا۔ انہوں نے جس موضوع کی طرف توجہ کی اس کا حق ادا کردیا، جس چیز کو لیا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ وہ ایک ادیب اور ادیب تھے، ادب میں ادبیت کے قایل تھے، لیکن یہ جانتے تھے کہ ایسی ادبیت جو موضوع کا احاطا نہ کر سکے یا موضوع پر غالب آجائے غیر مناسب ہوتی ہے، اس لیے انہوں نے مولانا محمد حسین آزاد کی رنگینی و رعنائی اور مرصع کاری سے اجتناب کیا۔ ان کا شعور ایک ناقد کا شعور تھا، اس لیے وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ سرسید کی تقلید غیر مفید ہے، ایسی سادگی جو غیر فطری، خشک اور بے کیف ہو، اور ایسی سلاست جو میکانکی معلوم ہو۔ ادب کے لیے سود مند نہیں ہوسکتی چنانچہ مولانا شبلی نے جہاں وہ تنقید ہو یا تاریخ، تذکرا ہو یا سوانح، میانا روی اختیار کی، جس میں نہ تو سرسید کی سادگی کا رنگ زار ہے نہ آزاد کی مینا کاری اور طلسمی دنیا سادگی، اور سلاست ہے تو وہ بھی فطری حسن، پر ہزار آرائشیں و زیبائشیں قربان ہیں،

اور رنگینی اور جوشِ بیان ہے تو وہ بھی حقیقی اور موضوع سے مکمل طور پر ہم آہنگ، ار عنائی اور مرقع کاری ہے تو وہ بھی حسبِ حال ۔

مولانا میں علمی مذاق قدرت کا عطیا تھا، جس کو ان نامی گرامی اساتذہ نے چمکایا تھا، جو اپنے وقت کے مسلم الثبوت استاد تھے، جن کے ذریعے ان کے شعور کو تابندگی اور ذہن و فکر کو جودت ملی، اور جب وہ علی گڑھ پہنچے تو وہاں انہیں ایک نئی دنیا نظر آئی، ایک طرف زندگی کی نئی ہوائیں چل رہی تھیں، اور دوسری طرف سرسید کا کتب خانا تھا جو بہترین اور منتخب کتابوں کا مجموعا تھا، اس سے بڑھ کر شبلی کی علمی تشنگی بجھانے کے لیے اور کیا سامان چاہیے تھا جس نے شبلی کو شبلی بنا دیا ۔

مولانا کے ذہن اور شعور کی بالیدگی اور شخصیت کے ارتقا کا یہ پس منظر بڑا شاندار اور تابناک ہے، اگر سرسید کی جوہر شناس طبیعت اس گوہر نایاب کو سرتاج نہ بناتی تو اس کی شہرت دوسری نوعیت کی ہوتی ۔ ان کی ذہنی نشو و نما میں علی گڑھ کا بھی حصا رہا ہے ۔

سرسید، محسن الملک، وقار الملک، ذکاءاللہ، چراغ علی وغیرا معاشرے اور قوم کی تہذیب و اصلاح اور فلاح و ترقی چاہتے تھے، اس لیے ان کی کوششیں اسی دائرے میں محدود تھیں، ادب خصوصاً نثر کی خدمت اور اصلاح ثانوی حیثیت رکھتی تھی ۔ مولانا شبلی نعمانی کا مطمع نظر ان لوگوں سے قدرے مختلف تھا ۔ انہوں نے اپنی قوم کو صرف ترقی یافتا قوموں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے بجائے ان کے علوم و فنون پر نگاہ ڈالی، اس کو مسلمانوں کا سنہری زمانا یاد دلایا اور اس سے اس میں اپنے علوم و فنون اور اپنی تاریخ و تہذیب کو زندا کرنے کا جذبا پیدا ہوا ۔ زاویۂ نگاہ کا یہی وہ اختلاف ہے جس سے انہیں اپنے ہم عصر ادیبوں پر فوقیت حاصل ہے، اور یہی وہ جذبا ہے جس نے مولانا شبلی کو ایک عظیم، مایۂ ناز اور بے مثال ادیب بنا دیا ۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مغربی علوم و فنون سے مرعوب نہیں ہوتے، انہیں اسکا فخر ہے کہ ان کے اسلاف دنیا کی مثالی قوم تھے، اور خود ان کے علوم و فنون کا سرمایا قابلِ فخر ہے، اور ترقی یافتہ قوموں کے ہم دوش ہونے کے لیے ہمیں اپنے اسلاف کی پیروی کرنی چاہیے، ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

"یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا ہے، فلسفے نے بلکل نئی صورت پیدا کر لی ہے، منطق میں نئے برگ و بال پیدا ہو گئے ہیں، معانی اور بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا فلسفا بن گئی ہے، مذہبی مباحث کے نئے نئے پہلو نکل آئے ہیں ۔ اسی گذشتا خیال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدید کو پیشِ نظر رکھکر وہی کرتے جو انہوں نے علوم قدیم کے ساتھ کیا تھا ۔ علم کلام کو فلسفۂ جدید کے مقابل میں مرتب کرتے یا تاریخ اور واقعا نگاری اور وسایل جدیدا کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے اور سب سے بڑھ کر یہ تمام علوم و فنون دکھا کر فیصلا کرتے کہ کونسی چیزیں کس حد تک قبول کرنے کے قابل ہیں، اور ان کی تحقیقات کو علوم قدیما کے ساتھ کیونکر پیوند کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ نئے رستے میں کیونکر قدم اٹھانا چاہیے، اور قدیم اور جدید راہیں کہاں پر جا کر مل جائیں گی ۔" (بحوالۂ شبلی کا مرتبا ہندستانی ادب میں ۵۸)

مولانا شبلی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی تصنیفوں کو درجۂ ذیل خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔

(۱) سیرت اور سوانح — سیرۃ النبی ۔ سیرۃ النعمان ۔ سوانح
(۲) تذکرا اور تنقید — شعر العجم ۔ موازنۂ انیس و دبیر ۔ حیاتِ خسرو ۔
(۳) تاریخ اور تحقیق — المامون ۔ الفاروق ۔ جہانگیر اور تزک جہانگیر ۔

(۴) علم الکلام - الغزالی - الکلام - علم الکلام -
(۵) مقالات اور مکتوبات   مقالات شبلی آٹھ حصوں میں
مکاتیب دو جلدوں میں -

یہ کوئی حتمی تقسیم نہیں، ان میں سے سوانح کو تاریخ اور تاریخ کو سوانح اور تنقید میں شمار کیا جا سکتا ہے، ممکن ہے اس تقسیم کا مدعا صرف ان کے نثری اسلوب کی نشاندہی ہے -

صاحب طرز ادیب زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے، اس کے پیش نظر یہ حقیقت رہتی ہے کہ اس کا اسلوب موضوع سے پورے طور پر ہم آہنگ ہو، اسی ہم آہنگی میں اس کی کامیابی کا راز ہے، اس لیے موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے - مولانا شبلی نعمانی ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے، اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تصنیفوں میں ایک ہی اسلوب اختیار کیا ہے - موضوع کے لحاظ سے ان کا اسلوب بدلتا رہتا ہے، مگر ان سب میں انفرادیت کی شان ہوتی ہے - یہی انفرادیت ان کو دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے - مولانا نے مختلف موضوعات کی وضاحت کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے ہیں، اور جس موضوع پر لکھا ہے، اس کا پورا حق ادا کر دیا ہے جہاں علمی طرز کی ضرورت تھی وہاں علمی طرز اور جہاں سادگی اور سلاست اور وضاحت و صراحت کی ضرورت تھی وہاں سادگی اور سلاست اختیار کی ہے، مگر ان کی سادگی میں بھی پرکاری ہے -

سیرت اور سوانح کے عنوان سے جن تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی طرز تحریر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جس اسلوب کو اختیار کیا ہے، اس سے بہتر اسلوب ممکن نہ تھا - ان کی تنقیدی بصیرت ساتھ ساتھ چلتی ہے، اس لیے کسی تحریر میں کوئی کمی یا خامی نظر نہیں آتی - مثلاً سیرۃ النبی کو لیجیے اس کے دیباچے میں انہوں نے سیرت نگاری پر جو سیر حاصل بحث کی ہے، اور سیرۃ پر جو مواد فراہم کیا ہے وہ اسکا ثبوت ہے کہ مصنف کو موضوع پر عالمانہ عبور
[illegible]

نگاری پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، مصنف کی بصیرت ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے، اور مقصد تصنیف بھی واضح ہو جاتا ہے -

" اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے، اس سے زیادہ استوار طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں عالمانہ درجے کی کتابیں لکھی جا کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں، اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے - ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسن اخلاق کی تعمیل کرائی جائے - اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ اصلی سب سے زیادہ کامل سب سے زیادہ اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، تحریری نقوش پیش کیے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے، بلکے فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آ جائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، جس کا ایک ایک اشارا اوامر سلطانی بن جائے -"

(دیباچہ سیرۃ النبی ص۱)

سیرۃ مولانا کی آخری اور معرکتہ آرا تصنیف ہے، اس کا اسلوب نہایت پختہ، اثر انگیز اور دلنشین اور ایجاز بلیغ کا بہترین نمونا ہے، ہربرٹ ریڈ کا خیال ہے کہ اچھی اور معیاری نثر اپنی خصوصیات کے سبب شاعری سے قریب ہوتی ہے، یعنی جو اجزا شاعری کو حسین اور عظیم بناتے ہیں وہ نثر کو بھی حسن اور پائیداری عطا کرتے ہیں - مولانا شبلی کی نثر میں جہاں الفاظ کا حسن انتخاب، جملوں کی ہم آہنگی، عبارت کی روانی، تشبیہ اور استعارے کا فن کارانہ استعمال نظر آتا ہے، وہاں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ موضوع کو مصنف نے اس طرح قبول کیا ہے کہ وہ اس کی شخصیت میں تحلیل ہو گئے ہیں، اور اس نے اس [illegible] ادراک، تخیل اور جذبے کا

مدد سے پیش کیا ہے کہ اس میں تخلیقی نثر کی شان پیدا ہو گئی ہے - ایک اقتباس ملاحظہ ہو -

" عین اس وقت جبکہ معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینھ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے۔ ہات اور پانوں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں، جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمنوں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آ رہی ہیں، عین اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدۂ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علی عین شدت جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے، فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلا نہیں ہوتا - عین اس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہات پانوں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آ رہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آ جاتا ہے، دفعتہً نماز کی صفیں قایم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز، رجز کے بجاے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش تہور و جاں بازی کا غیظ اور غضب، اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۲۵۰)

مولانا ایک دیدہ ور نقاد اور الفاظ، معانی کی اہمیت قدر و قیمت سے بخوبی واقف تھے، اس کا اظہار انہوں نے کئی جگہ کیا ہے! اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں -

(۱) " الفاظ گراں اور نامانوس نہ ہوں، ثقیل اور بھدے نہ ہوں کہ ان کے تلفظ میں زبان کو دقت محسوس ہو، واضح رہے کہ کوئی لفظ بذاتہ نہ ثقیل ہے نہ کریہہ، مگر دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر ثقل و کراہت پیدا کر دیتا ہے، بے جوڑ بے ضرورت اور بے موقع استعمال سے بعض اچھے الفاظ بھی برے ہو جاتے ہیں، اس لیے انشا پرداز کا فرض ہے کہ نوا سے کلام کا ہر وقت لحاظ رکھے، اور کسی منظر کو زیادہ طول نہ دے کہ بے جا طوالت سے فحواے کلام کا خیال اکثر ادیبوں کے دماغ سے جاتا رہتا ہے، اور وہ بے جوڑ، اور بھرتی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں، جس سے عبارتیں بے آہنگ ہو جاتی ہیں "

(۲) " طرز ادا سہل اور سادا ہو، لیکن سپاٹ اور بے رنگ نہ ہو - "

(۳) " روز مرا اور عام بول چال کا استعمال ہو، لیکن وہ زبان عوامی نہ ہو، بلکہ مہذب لوگوں کی ہو"

(۴) " بیان میں سلاست اور روانی ہو، اسما اور ضمایر کی غیر ضروری تکرار سے عبارت میں کراہت آ جاتی ہے،

(۵) " الفاظ ایک سطح کے ہوں، عربی کے ادق الفاظ اور بھاشا کے نرم الفاظ کا ایک ساتھ استعمال تنفر پیدا کر دیتا ہے جو فصاحت کے لیے معیوب ہے -

(۶) عبارت نہ اتنی مختصر ہو کہ مطلب خبط ہو جاے اور نہ اتنی طویل کہ جی اکتا جاے - "

(۷) " عبارتوں کی ترکیب اور ساخت میں ایک توازن قایم رہے - "

حسن معنی کے لیے وہ مندرجۂ ذیل امور کو ضروری قرار دیتے ہیں -

(۱) " یہ تو معلوم ہے کہ الفاظ ایک قسم کی آواز ہیں اور آواز کی مختلف صورتیں جن سے مطلوب احوال پیدا کیے جاتے ہیں، اس لیے الفاظ کا انتخاب معانی کے اعتبار سے ہونا چاہیے - رنج و غم کے الفاظ ایسے ہوں جن سے افسردگی اور اضمحلال ٹپکے، مسرت و شادمانی کے لیے ایسے ہی الفاظ ہوں جن سے عشرت و شادمانی کی فضا پیدا ہو سکے، حسن و عشق کے اظہار کے لیے دل کش اور نرم و گداز الفاظ لاے جائیں - "

(۲) " اگر کلام میں تاکید اور زور پیدا کرنا مقصود ہو

سیاق و سباق کے اعتبار سے الفاظ بھی اسی طرح کے استعمال کرنے چاہییں۔"

(۳) "معنی مقصود نفس الامر کے خلاف نہ ہو۔"

(۴) "جس سماں کو بیان کیا جائے اس کی پوری تصویر اس لیے ضروری ہے کہ جس سماں کا بیان کرنا مقصود ہے، اس کا پورا نقشہ سامنے ہو اور جو آئے اظہار اختیار کیا جائے اس پر پورا دسترس ہے"

(۵) "معنی کی ادائیگی میں مراتب کا احساس ملحوظ رہے۔"

(٦) "معنی کے لیے انتخاب الفاظ صحیح ذوق موجود ہو۔ الفاظ ایسے ہوں جو زیادہ سے زیادہ عرصے تک زمانے کا ساتھ دے سکیں۔"

اس روشنی میں مولانا کی انشا کو دیکھیے تو اس معیار پر ان کی عبارتیں پوری اترتی ہیں، اب اس حیثیت سے پیش کردہ اقتباس کا جائزہ لیجیے مذکورۂ بالا عبارت میں مولانا کا جذبہ خوب شدت کے ساتھ موجود ہے، جذبات کا ایک سیل ہے جو الفاظ کی صورت میں امڈا چلا آتا ہے، تصویریت Personification اور مرقع نگاری پورے آب و تاب کے ساتھ تاباں ہے، محاکات کی اہمیت نثر میں بھی، بشرطیکہ حسب موقع ہو۔ مولانا کی تصویریں، حقیقی فطری اور زندہ اور پائندہ ہیں۔ معرکۂ جنگ کی منظر کشی کے لیے جو الفاظ انہوں نے استعمال کیے ہیں وہ نہایت موزوں بر محل اور بالکل مناسب ہیں۔ اس اقتباس کے ہر فقرے سے تصویر تیرا ابھرتا ہے، معرکۂ کار زار گرم ہے، تیروں کا مینہہ برس رہا ہے، تمام میدان لالا زار بن گیا ہے، ہات اور بادل اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں۔" یہ فقرے اس حسن کاری کے ساتھ ترتیب دیے گئے ہیں کہ ہر فقرا اپنی مکمل اور آزاد حیثیت رکھتے ہوئے بھی زنجیر کی کڑی کی طرح ایک دوسرے سے مربوط اور پیوستا ہے۔ تشبیہ و استعارے اگر نادر، اچھوتے اور شگفتا ہوں تو شاعری اور نثر دونوں کی دلکشی میں اضافا کرتے ہیں۔ اس اقتباس میں نہایت عمدا اور شگفتا تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال ہوا ہے، "تیروں کا مینہہ برس رہا ہے"۔ ہات اور بادل اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں" جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں۔" دشمنوں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑی آرہی ہیں۔ دفعتاً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے، تشبیہوں کا حسین استعمال۔ ایجاز اور اختصار بلیغ کا یہ نمونا ملاحظا ہو۔ ہر لفظ ایک کیفیت اور ایک سماں پیدا کر رہا ہے، سپا سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش، تہور و جانبازی، غیظ و غضب اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے۔ جوش و خروش کے عجز و نیاز کی صورت اختیار کر لینے، تہور و جانبازی، کے، تضرع و زاری، میں تبدیل ہو جانے اور غیظ، و غضب، خشوع و خضوع، بن جانے کی کیفیت کو شبلی جیسا عظیم اور جینیس genius نثر نگار ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یہی بات سیرۃ النعمان اور دوسری تصنیفوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔

شعر العجم کی نثر اپنی دل آویزی کے لحاظ سے لاجواب ہے۔ اس کتاب کو فارسی شاعری کی تاریخ اور فارسی شعرا کا تذکرا بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاریخ اور تذکرے سے قطع نظر تحقیق و تنقید کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ کتاب بڑی اہم ہے۔ اس میں مولانا نے شاعری، تخیل، محاکات، تصرفات الفاظ، اور ادراک، احساس، فصاحت و بلاغت وغیرا کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کئی حیثیتوں سے اہم ہے، شعر العجم سے قبل مولانا محمد حسین آزاد اپنی زعفران زار نثر میں آب حیات لکھ چکے تھے اور مولانا حالی کا مقدما شعر و شاعری بھی لکھا جا چکا تھا۔ یہ دونوں کتابیں نثری اسلوب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن تنقیدی نقطۂ نگاہ سے ان میں تھوڑی سی یکسانیت بھی ہے، اور فرق بھی۔ آزاد نے جستا جستا تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں، اور مولانا حالی نے مختلف عنوانوں کے تحت شاعری کے اجزا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ شبلی نے شعر العجم میں ان مباحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انگریزی مصنفوں اور شاعروں کے خیالات سے استفادا

کیا ہے، اور خود بھی ایک متوازن رائے پیش کی۔ شاعری کی تعریف، اس کی اہمیت و ماہیت کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے جن لوگوں کو اختلاف ہے وہ بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

تحقیق، تنقید اور تاریخ تینوں لازم ملزوم ہیں، تحقیق تنقیدی شعور کے بغیر ناقص رہتی ہے۔ ایسا محقق جس میں تنقیدی شعور نہ ہو سطحی ادب اور عالا ادب میں تفریق و امتیاز نہیں کر سکتا، اسی طرح تاریخ بغیر تحقیق کے ذخیرۂ کذب و افترا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اور ادب سے ان سب کا رشتا ہے۔ اگر وہ ادبی تقاضے پورے نہیں کرتیں تو ادبی نقطۂ نگاہ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مولانا شبلی اس راز سے پوری طرح باخبر تھے، اس لیے شعر العجم میں انہوں نے تاریخ، تنقید اور تحقیق کی سرحدوں کو ملا دیا، اور اس صناعانا چابک دستی سے کہ موضوع کا حق بھی ادا ہو گیا، اور ادب و فن کے تقاضے بھی پورے ہو گئے، شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں۔

"اپنے معاصرین میں شبلی کا مرتبا ادب میں نہایت بلند ہے، یہ بلندی اور بڑائی اس وجہ سے نہیں ہے کہ انہوں نے بہت بڑا ذخیرۂ ادب چھوڑا نہ اس وجہ سے کہ وہ ہر فن پر عبور رکھتے تھے، بلکہ اس لیے ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا اس انداز سے لکھا کہ شگفتگی اور حقیقت دلچسپی اور افادیت قایم رہی۔ عالا سے عالا اور پیچیدا سے پیچیدا علمی اور فلسفیانا مسایل کو سلیس اور بلیغ انداز میں بیان کر دینا علاما شبلی کی انشا پردازی کی خاص خصوصیت ہے۔"

"شعر العجم" کے ایک اقتباس سے یہ واضح ہو جائیگا کہ یہ طرز تحریر کتنی سائنٹفک اور سیرۃ النبی۔ کے اسلوب سے کس قدر مختلف ہے۔

" اصل شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو، لیکن جو لوگ بے تکلف شاعر بنتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے یہ تعلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں، ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود ہیں، لیکن اگر ایکٹ کی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کر دے تو سارا پارٹ غارت ہو جائیگا۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے، دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے، جو کچھ کہتا ہے اپنے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے کہتا ہے تو شاعر نہیں، بلکہ خطیب ہے، اس سے یہ واضح ہوگا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کا نتیجا ہے، بخلاف اس کے خطابت، لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرا ہے، اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے۔" (شعر العجم ص جلد چہارم)

اس اقتباس میں مولانا نے شاعری اور خطابت کے فرق کی وضاحت کی ہے اور اپنے تنقیدی خیالات کو پیش کرنے کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ منطقی تجزیاتی اور توضیحی اسلوب ہے، تجزیاتی اسلوب میں دلایل و براہین اور منطقی استدلال ناگزیر ہے، جو پیش نظر نکات اور حقایق کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نگاہ ڈالتے اور منطقی استدلال کے ذریعے پیش کرتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسے پر تاثیر انداز میں پیش کر دیا ہے، اسلوب کا یہی وہ مقام ہے جہاں خارجی اور داخلی اجزا کلی طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر اسلوب کا مسلا ذوقی بھی ہے، اور وجدانی بھی، موضوع اور الفاظ میں مصنف کے جذبات اور احساسات جو رنگ بھرتے ہیں وہ اسلوب کی صورت میں رونما ہوتا ہے، چونکے فنکار کو زبان اور الفاظ پر عبور حاصل ہے، اور اس کی طبیعت میں وسعت اور گہرائی ہوتی ہے اس لیے اسلوب بھی جاندار اور وسیع ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔ " ان کے اسلوب کی اولین صفت وہ قوت اور جوش ہے جو ان کے احساس کا ...

احساس عظمت کی پیداوار ہے، یہ احساس جب کسی مقصد عظیم کے ساتھ مل جاتا ہے تو مصنف کے اظہارات میں غیر معمولی جوش اور قوت پیدا کر دیتا ہے۔ شبلی کی نثر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فکری قوت اور منطقی توانائی کے ساتھ ساتھ لطف اور اثر بھی پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فکر کے خاکوں میں تخیل کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا تخیل اصل میں اسی رجحان نظری کے زیر اثر مبالغہ و اغراق کی وہ صورتیں اور تصویریں تلاش کرتا ہے جو خود مصنف کی پر جوش ہیجان پسند طبیعت کی پیداوار ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین اور سامعین کے لیے بھی جوش انگیزی اور ہیجان خیزی کا سامان بہم پہنچاتی تھیں۔ (بہترین مقالات مرتبہ اختر جعفری ص ۵۵۹)

مولانا کی تاریخ اور تحقیق کی کتابوں کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادبی تقاضے بھی پورا کرتی ہیں، اور مصنف کی شخصیت کی ترجمان بھی ہیں الفاروق ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر خود مصنف کو ناز تھا، اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "اب ان کو علمی تشنگی بجھانے کے لیے کنووں اور نہروں کا پانی نہیں سمندر درکار تھا، الفاروق جس کے لکھنے کے لیے وہ بیتاب تھے، اس کے لیے ہندستان کے کتب خانے کافی نہ تھے، اس کے لیے مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کو کھنگالنے کی حاجت تھی، انہوں نے ان کتب خانوں سے استفادہ کرکے ہندستانی ادب میں ایک گراں بہا اضافہ کیا۔ الفاروق تاریخ اور سوانح کا ایک سنگم ہے، جس میں تاریخی اور سوانحی اجزا خوبصورتی سے سموئے گئے ہیں۔" (حیات شبلی ص ۱۹۱)

مولانا کی تاریخی تصانیف کے طرز سے واضح ہے کہ تاریخ نویسی میں بھی ان کا انداز نہایت دلچسپ و دلنشین ہے۔ تاریخ کی داغ بیل مولانا محمد حسین آزاد نے ڈالی اور اس کو اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ تاریخ پر افسانے کا گمان ہونے لگا۔ نہ تاریخ نگاری کا اس قدر رواج تھا، مولوی ذکاء اللہ کے پیش نظر تاریخی وقایع کی اہمیت تھی، اس لیے انہوں نے اسے پوری دیانت کے ساتھ پیش کر دیا، لیکن یہ پیشکش اس قدر پھیکی تھی کہ پڑھنے والوں کے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی، یہ تاریخی دیانت ان کی شہرت میں رکاوٹ بن گئی۔ مولانا شبلی ادیب پہلے ہیں مورخ بعد میں۔ وہ جانتے تھے کہ تاریخی واقعات اکٹھا کر دینے سے تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اس لیے انہوں نے تاریخ کی خشکی کو ادب کی چاشنی سے پر لطف بنا دیا۔ تاریخ میں واقعات کی کڑیاں اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ منطقی ربط ہر جگہ قایم رہتا ہے۔ مضمون کی خشکی دور کرنے کے لیے جا بجا دلچسپ تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا ہے۔ الفاروق کے دیباچے میں انہوں نے طرز تحریر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ اس کے لیے انہوں نے بہترین اسلوب اختیار کیا ہے۔ اسی اسلوب کے متعلق سرسید فرماتے ہیں۔

"ہندستانی زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان و طرز بیان جدا گانہ ہے، تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخی طرز کو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے، ہمارے لایق مصنف (شبلی) نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے، اور باوجود تاریخی مضمون ہونے کے کیسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخی اصلیت بدستور اپنی اصلی حالت پر موجود ہے جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے، نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے، اور نہ بھونڈے کو زیادہ بھونڈا، اور اصل میں یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

غرض مولانا کی نثر اس قدر سلجھی اور منجھی ہوئی ہے کہ ہر قسم کے خیالات بآسانی ادا کیے جا سکتے ہیں یہاں تک الکلام اور علم الکلام جیسے خشک موضوع کے لیے بھی اس قدر واضح اور رواں پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے کہ اسلوب کی دل کشی اور جاذبیت میں فرق نہیں آنے پاتا۔

نازش پرتاب گڈھی

احساس

میری تنہائی ہے ماحول کی گردن پہ سوار
یہ ابھی اور نکھر اور سنور جائے گی
وقت سے تھکی ہوئی بوڑھی طوائف کی طرح
دل کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں کرے گی سنگار
یوں مری سمت کرے گی نگہ داد طلب
جیسے میں اس سے گریزاں تھا نہ جب اور اب
اور میں ہوں کہ اسی سرد سی تاریکی میں
اپنی تنہائی کی آغوش میں مجبور نڈھال
جانے کتنی ہی صدیوں سے پڑا ہوں یوں ہی
وقت کی پلکوں پہ مچلا ہوا آنسو ہے وجود
نفس زیست کا عالم نہ محبوب اور نہ شہود
سرد و بے جان فضا فرش سے تا کاہکشاں
دیر سے ذہن میں ہے کوئی تصور نہ خیال
دل کے گوشوں میں یقیں ہے نہ گماں ہے نہ سوال

پرتو لکھنوی

غزل

نہیں پہچانتے اب ہمنشیں اہل چمن مجھ کو
نظر بدلی، زباں بدلی تو کہدیں بے وطن مجھ کو
روش سے راہبری کی ہے کچھ ایسا سوءِ ظن مجھ کو
کہ اب مدنظر ہے پیروی راہزن مجھ کو
نہ کرنا غیر تم اپنا شریک انجمن مجھ کو
بتا دو بس چمن کی خیریت اہل چمن مجھ کو
میں اب بھی التجا کو ننگ خودداری سمجھتا ہوں
کسی دن مار ہی ڈالے گا میرا بانکپن مجھ کو
ہوس دیوانہ کر کے لے گئی کوہ و بیاباں تک
بہت دور اب نظر آتے ہیں قیس و کوہکن مجھ کو
لبھانے کے لیے جب صبح غربت سامنے آئی
بڑی حسرت سے یاد آنے لگی شام وطن مجھ کو
کبھی ہوں ہمزباں شمع گہہ دلسوز پروانہ
کسی صورت سے رہنا ہے میان انجمن مجھ کو
گذر کے حد سے نیکی بھی بدی ہو جاتی ہے اکثر
ہے اب یزداں پرستی میں غرور اہرمن مجھ کو
ازل سے جامۂ ہستی جو سب نے آج تک پہنا
ملا انعام قسمت میں وہی ملبوس کہن مجھ کو
مری دیوانگی پر ہنستے ہیں ذرے بیاباں کے
سمجھتے ہیں یہ آزاد اک گرفتار چمن مجھ کو
کیا برباد ایسا آسماں نے دشت غربت میں
نہیں کرتی قبول افسوس اب خاک وطن مجھ کو
میں سمجھوں گا قیامت کا کیا احسان دنیا نے
غبار دشت نے بھی گر دیا اٹھ کر کفن مجھ کو
یہ گردن ہے، وہ خنجر ہے عمل ہو گفتگو کیسی
سنایا جائے کیوں افسانۂ دار و رسن مجھ کو
میں سمجھا تھا کہ میرا دم ہے روح انجمن لیکن
اسی رونق سے بیٹھی ہے اٹھا کر انجمن مجھ کو
بڑی ہی دل شکن ہوتی ہے گردش وقت کی پرتو
اب اک غربت سرا معلوم ہوتا ہے وطن مجھ کو

محمد امین

زلزلے اور ان کی کہانی

زلزلا کسے کہتے ہیں ؟ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ جنبش یا ہلنے کو زلزلا کہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قسم کی جنبش یا ہلنے کو زلزلا کہتے ہیں۔ یہاں زمین کا ہلنا یا جنبش کرنا مقصود ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ زمین کے اندر کچھ تبدیلیاں آتی ہیں، اور اس کے اندرونی حصے کی چٹانیں ادھر ادھر کھسکتی ہیں یہ سب اتنے زوردار طریقے سے اندر اتنے بڑے پیمانے پر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کا وہ خاص حصا اور اس کے آس پاس کے علاقے ہل جاتے ہیں، جسے ہم کہتے ہیں کہ جھٹکا آگیا یا زلزلا آگیا۔ کبھی کبھی یہ جھٹکا زوردار ہوتا ہے۔ کبھی ہلکا اور کبھی مسلسل کئی جھٹکے آجاتے اس طرح لوگ دہل اٹھتے ہیں، اور خوف دہراس کی وجہ سے سمجھتے کہ خدا کا قہر نازل ہو گیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر تو ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ زمین جس پر ہم چلتے پھرتے ہیں، دوڑتے ہیں، کھیلتے ہیں ٹھوس ہے پھر ایسی ٹھوس چیز کا ہلنا کیا معنی ! لیکن یہ تمھاری نظر کا دھوکا ہے۔ زمین اوپر اوپر جیسی دکھائی دیتی ہے ویسی نیچے، گہرائی میں اور اندر کی طرف نہیں ہے۔ اصل میں بناوٹ اور ساخت کے لحاظ سے اس کی تین قسم کی پرتیں ہیں۔ سب سے نیچے اور میلوں گہرائی میں جو پرت ہے وہ بہت موٹی، ٹھوس اور لوہے کی طرح اٹل ہے، اسی لیے اس کو زمین کا دل بھی کہتے ہیں۔ اس کے اوپر درمیانی حصا ہے جو پگھلے ہوئے مادے کی طرح گولائی میں پھیلا ہوا ہے۔ سب سے اوپر یعنی سطح پر جو پرت ہے وہ سب سے پتلی پرت ہے۔ یہ زیادا تر مختلف قسم کی چٹانوں کی بنی ہے۔ اس حصے میں سمندر، میدان اور پہاڑ بھی ہیں۔ پہاڑیں تو کئی قسم کے ہوتے ہیں، لیکن سب سے نمایاں اور شاندار قسم کے پہاڑ وہ ہیں جن کو نئے پرت دار قسم کے پہاڑ کہتے ہیں، جیسے ہمارا ہمالا، قراقرم، ہندوکش، یورپ کا آلپس، شمالی امریکا کا راکی، جنوبی امریکا کا انڈیز وغیرا۔ ان سارے پہاڑوں کا پورا خطا دنیا میں اوپری پرت پر پھیلا ہوا ہے، اور ان کے سلسلے سمندروں میں بھی چلے گئے ہیں۔

علم طبقات ارض یعنی چٹان اور زمین کی جو خاص سائنس ہے، اس کے لحاظ سے اور جغرافیا کے لحاظ سے دنیا کا سب سے کمزور خطا وہ ہے جس پر پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے سیسمک بلٹ یعنی زلزلوں کے لحاظ سے سب سے خطرناک خطا بھی کہا جاتا ہے۔ ان پہاڑوں کے نیچے چٹانوں کے دباو، اور بوجھ کی وجہ سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زمین کی شکل وصورت کو بدلنے والے جو عناصر ہیں جیسے گلیشیر، بہتا ہوا پانی یہ بھی چٹانوں کو کاٹ کر، گھس کر ادھر ادھر کھسکاتے ہیں اور لڑھکاتے رہتے ہیں۔ اس طرح چٹانوں کا بوجھ نیچے کی پرتوں پر کہیں گھٹ جاتا ہے، اور کہیں بڑھ جاتا ہے۔ نیچے کی پرتیں یا چٹانوں کی تہیں جب بوجھ اور دباو کی تاب نہیں لا سکتیں تو وہ یا تو خود دھنس جاتی ہیں یا ادھر ادھر کھسک جاتی ہیں۔ ان کے دھنسنے یا کھسکنے کی وجہ سے زمین ہل جاتی ہے۔ اسی وجہ سے گڑگڑاہٹ بھی ہوتی ہے، اور جتنی دیر تک چٹانوں

پڑتیں اور تہیں سیٹ نہیں ہو پاتیں، وہ اپنی طاقت اور جنبش سے آس پاس کے علاقوں اور بستیوں کو ہلاکر رکھ دیتی ہیں۔

ابھی حال میں پاکستان جو زلزلا آیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے۔ آؤ دیکھیں کہ اس زلزلے کی کیا تفصیلات ہیں —

۲۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو پاکستان کے شمالی حصے میں ایک زبردست زلزلا آیا اور کئی گاؤں اس کی لپیٹ میں آکر تباہ و برباد ہو گئے۔ زلزلا کی پہلی جنبش ہفتے کے روز ۵ بج کر ۱۵ منٹ پر شام کو محسوس ہوئی، اور یہ طے ہے کہ یہی جنبش سب سے خطرناک اور تباہ کن تھی، اس لیے کہ اس وقت شام ہو چلی تھی، اور گاؤں کے باشندے اپنے اپنے گھروں میں اور جھونپڑوں میں باہر کی سخت سردی سے بچنے کے لیے پناہ لیے ہوئے تھے۔ ستم بر ستم یہ کہ اس کے بعد زلزلا ختم نہیں ہوا، بلکہ ۲۸ر دسمبر کی رات کو رات بھر دس دس اور پندرہ منٹ کے بعد کئی بار جھٹکے محسوس کیے گئے۔

ایک ماہر امریکن سائنس داں نے زلزلے والے علاقوں کا دورا کیا ہے، اس نے یہ کہا ہے کہ پہاڑ کے دامن جو گھاٹیاں اور وادیاں ہیں، جن میں کئی گاؤں بسے ہوئے ہیں، ان میں مزید جھٹکے اور زلزلے آنے کے خطرات ہیں، اسی سائنس داں نے یہ بھی کہا ہے کہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء کی خطرناک رات میں جھٹکے ان گنت بار آئے تھے اور کم سے کم ۱۰۰۰ (ایک ہزار) بار تو ضرور یہ محسوس کیے گئے ہوں گے۔

زلزلے نے سب سے زیادا مصیبت قراقرم پہاڑ کے علاقے میں ڈھائی ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰۵ کلومیٹر ہے۔ اس وادی میں جتنے بھی گاؤں آباد تھے، ان میں ۸۰ فیصدی تباہ ہو گئے۔ زلزلے نے کیا کم تباہی مچائی تھی کہ گرنے والی چٹانوں نے اور قیامت برپا کر دی۔ زمین ایک دم ہل جانے کی وجہ سے ہزاروں ٹن پہاڑوں کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتی رہیں، اور انہوں نے اپنی مار، بوجھ اور دباؤ کی وجہ سے ہر چیز کو چکنا چور کر کے رکھ دیا۔ کئی گاؤں، تو کئی

سیکڑوں نیچے دب گئے، اور چٹانوں کے ملبے نے ان میں رہنے والوں کو اٹھنے اور سانس لینے کی مہلت ہی نہیں دی۔ قراقرم کی شاہ راہ جو چین کی سرحد تک جاتی ہے، اس پر برف اور چٹانوں کے بڑے بڑے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر ڈھیر پڑے تھے، اور جگہ جگہ سڑک بند ہو گئی تھی، پلوں اور پلیوں کا بھی تہس نہس ہو گیا تھا، ان کی وجہ سے نئی بنائی شاہراہ ۴۵ میل تک بے کار ہو گئی تھی۔

زلزلے کے علاقے سے قراقرم کی شاہراہ گذرنے کے باوجود جن جگہوں میں واقعتاً زلزلا آیا تھا وہ بہت دور پہاڑی اور کوردہ علاقے میں بسے ہوئے تھے، اس لیے تباہی اور صحیح صورت حال کا اندازا فوراً نہیں ہو سکا۔ بہر حال امداد کے لیے پاکستان کی فوج نے فوراً کام سنبھال لیا، اور ہیلی کوپٹروں سے زلزلے کے مصیبت زدا لوگوں کو سہارا دینے کے لیے اس نے عملی قدم اٹھایا۔ سب سے پہلے زخمی لوگوں کو ہیلی کوپٹروں سے اٹھا اٹھا کر راولپنڈی کے اسپتالوں میں پہنچایا گیا۔ ان زخمی لوگوں میں ۴۱ سال کا نوجوان قیماخان بھی تھا۔ یہ پاٹن گاؤں کا رہنے والا تھا، جو راولپنڈی کے شمال میں ۲۱۶ کلومیٹر دور قراقرم کی اسی وادی میں واقع تھا۔ راولپنڈی کے ہسپتال میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے زلزلے کی مصیبت کا جو تجربا اسے ہوا تھا، اس کے متعلق اس نے یہ بیان دیا۔ "میں اپنے مکان کے اندر بیٹھا ہوا تھا کہ زلزلا آ گیا۔ سارا مکان ڈھیر اور بر ڈھیر پڑا، لیکن قسمت اچھی تھی بال بال بچ گیا، لیکن میرے تین اعزا میری چچی، میری بہن اور ایک آدمی اور یہ تینوں نہ بچ سکے، اور ملبے میں دب کر ختم ہو گئے۔ ہمارا گاؤں بھی سارا کا سارا تباہ ہو گیا تھا۔" جن لوگوں نے زلزلے کی ساری کیفیت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، ان میں ایک محمد یسین حتی تھا، اس نے ہسپتال کے اپنے بستر علالت سے بیان دیا کہ زلزلا آتے ہی چٹانوں کے بھاری بھاری ٹکڑے اور پتھر پہاڑوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے، اور نیچے وادی میں ان کی ڈھیر لگ گئی۔ اس طرح بہت سے آدمی دب کر مر گئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ زلزلا

ایک بار نہیں، بلکہ بار بار اور کئی بار آیا تھا۔

دوسرے زخمی مریضوں نے یہ رپورٹ دی کہ زلزلہ آنے کی خبر سرحد کے قصبے الوتا آباد کو بلکل نہیں معلوم ہوتی تھی، اور وہاں کے لوگ اس سے بلکل بے خبر تھے۔ جھٹکا لگنے کے بعد موت کے گھاٹ اترنے سے جو لوگ بچ گئے تھے، ان میں سے کچھ لوگ ڈر کر، جان بچانے کے لیے بھاگے، اور اس طرح کافی دیر کے بعد باہر کے لوگوں کو اس قہر کا علم ہوا۔ پاٹن کے تباہی والے علاقے سے انگریزی اخبار ڈیلی ٹیلی گراف کے اخباری نمایندے نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان سے ہو کر جانے والی جو بڑی اہم قسم کی کراکورم کی شاہراہ چین بنا رہا ہے، زلزلے کی وجہ سے اس کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔ یہ شاہراہ چینی سرحد سے ۱۵۰ میل تک پاکستان کے اندر مکمل ہو چکی تھی اور چین کے انجنیئر، ماہرین اور مزدور جنرل ٹکا خان کی ہدایت کے مطابق وہاں موجود تھے۔ دونوں ملکوں کی ماہرین کی ٹیمیں یہ کوشش کر رہی تھیں کہ کراکورم کی شاہراہ کو دونوں طرف سے آمد و رفت کے لیے خوب چوڑی سڑک بنا دی جائے، لیکن ان کی بد قسمتی کہ اسی وقت زلزلے کی بلا نازل ہو گئی۔ پاکستانی فوج کے دس افسران زلزلے کی وجہ سے مر گئے، اور ۵۰ زخمی ہو گئے۔ چین کے محض تین ہی فوجی افسر مرے تھے۔ ان کے نقصانات اس لیے کم ہوئے کہ یہ لوگ خیموں میں پڑاؤ ڈال کر رہتے تھے نہ کہ مٹی اور چٹانوں کے بنے ہوئے مکانوں میں۔

۵۴ میل کی لمبائی تک کراکورم کی شاہراہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس پر چٹانوں کے ڈھیر کے ڈھیر پہاڑوں سے ڈھر کر گر پڑے ہیں۔ پل اور پلیاں جو بنی تھیں وہ سب ستیا ناس ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب سب سے پہلے گاؤں کو جو تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ ہر طرح کی امداد پہنچائی جاری ہے۔ اس کے بعد کراکورم کی شاہراہ کو درست کیا جائے گا، اور جہاں جہاں سے یہ ٹوٹ گئی ہے، اسے ٹھیک کیا جائے گا۔ چینی بھی امداد پہنچانے میں ہاتھ بٹا رہے ہیں، اور پناہ گزینوں کو ہر طرح کی امداد بہم پہنچا رہے ہیں۔

چین کراکورم کی شاہراہ کو بہت اہمیت دے رہا ہے، خاص طور سے اس لیے اور کہ روس سے وہ گھبراتا ہے، روسیوں نے پہلے ہی سے افغانستان میں قریب قریب پاکستان اور چینی سرحد تک ہر موسم میں کام دینے والی ایک اچھی اور نئی سڑک بنا رکھی ہے، جو ہندوکش پہاڑیوں سے ہو کر افغانستان سے روس کے علاقے میں چلی گئی ہے۔

زلزلہ ایک قسم کی بلا ہیں، اور یہ جب کبھی آتے ہیں تو خدا کا قہر بن کر نازل ہوتے ہیں، اور تباہی اور بربادی کے انبار لگا دیتے ہیں۔ پچھلے پانچ سالوں میں زلزلوں نے کم سے کم ایک لاکھ انسانوں کو غارت کر دیا ہے، خصوصاً چین، ترکی، پیرو، ایران، نکاراگوا اور میکسیکو میں۔

ریڈیو پاکستان کی خبر کے مطابق زلزلے کی وجہ سے نہ صرف سوات کے علاقے، بلکہ ہزارا اور ہستان کے علاقوں میں بھی بری طرح نقصان پہنچا ہے۔ بی۔ بی۔ سی یعنی انگلستان کے ریڈیو کی خبر کے مطابق مرنے والوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ سکتی ہے، اور ۱۲ گاؤں یا تو بلکل تباہ ہو گئے یا زلزلے نے ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے، اور بیس ہزار انسان جو بچ گئے ہیں وہ بری طرح زخمی ہیں، اور ان کی حالت بڑی ابتر بتائی جاتی ہے۔

امداد پہنچانے والے فوجی اور دوسرے رضاکاروں نے سینکڑوں مرد پڑی ہوئی لاشوں کو دفن کر دیا، تاکہ کوئی وبا نہ پھیلنے پائے۔ طبی امداد پہنچانے والوں نے زلزلے سے متاثر ہونے والے علاقے کی سرحدوں پر عارضی اور ادھر سے ادھر منتقل ہونے والے ہسپتال کھول دیے ہیں، اور فوج کے ۱۵ ہیلی کوپٹر راولپنڈی سے دوائیں، غذا اور کھانے پینے کے دوسرے سامان اور کمبل وغیرا برابر پہنچا رہے ہیں، اور جو لوگ بہت زیادہ زخمی ہیں، ان کو نکال کر راولپنڈی واپس لا رہے ہیں، اور وہاں سے ان کا علاج کرانے اور

بلکہ [illegible] ان کو

داخل کر رہے ہیں۔

ادہر ادھر کی خبروں سے پتا چلتا ہے کہ راولپنڈی کے شمال مشرق میں ۲۰۰ کلو میٹر دور "پختونستان" سے متصل پولاس کا علاقہ ہے۔ زلزلے نے سب سے زیادہ نقصان یہاں پہنچایا ہے، اور محض اس علاقے میں ۱۵۰۰ آدمی ہلاک ہو گئے ہیں، اور ۳۰۰۰ زخمی ہیں پولاس کے علاقے سے تھوڑا اور شمال میں شوری گڑ نام کا ایک گاؤں ہے، اس کی آبادی دس ہزار تھی، اس میں سے ۵۰۰ آدمی زلزلے کی وجہ سے ختم ہو گئے، اور ۲۰۰۰ زخمی ہیں۔ دوبیر اور جلائی گاؤں کی آبادی بیس ہزار تھی۔ ان میں مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار ہے، اور زخمی لوگوں کی چار ہزار شروع میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ محض پاٹن نام کے قصبے کو بھاری نقصان پہنچا ہے، لیکن زلزلے کا اثر دور گاؤں میں بھی بہت ہے۔ پاٹن میں محض پانچ سو آدمی ہی مرے ہیں، اور دو ہزار زخمی ہیں۔ دوسرے گاؤں اور بستیاں جن پر زلزلے نے کاری ضرب لگائی ہے، یہ ہیں کیال، کیرو، مندوز اور زید قار۔ علاوہ ان گاؤں کے کراکورم کے پہاڑی علاقے میں ایک ہزار فارم بھی ہیں۔ ان میں کیا نقصان پہنچا ہے کسی کو نہیں معلوم اگرچہ یہ طے ہے کہ یہ بھی زلزلے کی لپیٹ میں ضرور آئے ہیں۔ برف باری کی وجہ سے گاؤں سے ناتہ قایم نہیں ہو سکا تھا، اس کے بعد ان سے جو رابطہ قایم ہوا تو زلزلے سے مرنے والوں کی تعداد بڑھ کر کل ۵۲۰۰ تک پہنچ گئی ہے، اور سولا ہزار سے زیادہ لوگ زخمی ہیں۔

تند، تیز اور برفیلی ہوا اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے کئی دن کے بعد لدے پھندے تین ہیلی کوپٹر دوائیں خیمے اور کمبل لے کر بڑی مشکلوں سے بشام پہنچے۔ اصل میں انہیں پاٹن جانا تھا جو کہ بشام سے ۴۵ کلو میٹر اور شمال میں دریائے سندھ کی تنگ اور نوکیلی وادی میں واقع ہے، لیکن باوجود کوشش کے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ تند اور برفیلی ہواؤں کا زور اور بڑھ گیا اور تنگ گھاٹی کے اوپر سے ہو کر اڑنا بڑا ہی خطرناک تھا۔ خاص قسم کا ایک فرانسیسی ہیلی کوپٹر بڑی مشکلوں سے اور بڑی جدوجہد کے بعد پاٹن تک جا سکا۔ اس ہیلی کوپٹر میں چینی سفیر لودی یاد صاحب تشریف فرما تھے، ظاہر ہے کہ زلزلے کے اس علاقے میں چینیوں کا اپنا مطلب اور مفاد ہے، اس لیے اور کہ کراکورم کی شاہراہ بنانے میں وہ پورا پورا تعاون اور مدد دے رہے ہیں، جو کہ شمال میں چینی سرحد پار کر کے سنکیانگ کے صوبے تک چلی گئی ہے۔

پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو خود امداد کے سارے انتظامات کی نگرانی کر رہے ہیں۔ فوری امداد کے لیے انہوں نے حکومت پاکستان کی طرف سے تین لاکھ ڈالر (ایک ڈالر تقریباً آٹھ روپے کے برابر ہوتا ہے) کی منظوری دی ہے۔

زلزلے کی وجہ سے بڑا بھاری نقصان ہوا ہے۔ تعجب نہیں کہ یہ کروڑوں تک پہنچ جائے۔

بین قومی ادارے (یو- این- او) کے سکریٹری جنرل کرٹ والڈ ہایم کی ہدایت کے مطابق اسلام آباد میں جو یو- این- او کا امداد پہنچانے والا شعبہ ہے، اس نے زلزلے کے مصیبت زدہ لوگوں کی ہر طرح کی امداد بہم پہنچانے کا بیڑا فوراً اٹھایا ہے۔ پاکستان کی فوج کے افسران اور سپاہیوں کے ساتھ وہ تعاون کر رہا ہے۔

اسی دوران ہماری محبوب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے پاکستان کے وزیر اعظم کو ہمدردی کا پیغام بھیجا ہے، اور امداد کے لیے انہوں نے دو ہزار کمبل بھیجے ہیں۔

پہلی جنوری سنہ ۱۹۷۵ء کو سعودی عرب کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ زلزلے کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کے لیے وہ پاکستان کو دس ملین ڈالر (ایک کروڑ روپے) دے گا۔ لیبیا نے ۱۲ عشاریہ ۸ ملین ڈالر (ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ۸۰ ہزار روپے) کی امداد دی ہے۔ امریکا نے ۲۵ ہزار ڈالر، کناڈا دس ہزار ڈالر۔ برطانیا نے ۴۴ ہزار ڈالر اور آسٹریلیا نے ۲۵ ہزار ڈالر کی امداد دینے کا اعلان کیا ہے۔

۷ جنوری سنہ ۱۹۷۵ء کو یو- این- او نے ۵۶۹٫۲۰۰ ڈالر کی قیمت کی غذا اور خوراک فوری طور سے

پناہ گزینوں کو بہم پہنچائی ہے -

موجودہ دس سال کا زمانہ سب سے خطرناک ثابت ہوا

۱۹۷۴ء کا سال جاتے جاتے بھی کافی دکھ اور پریشانی دے گیا، جیسے ہی یہ ختم ہونے کو آیا تھا کہ خطرناک اور بڑے ہی تباہ کن زلزلے نے ہمارے برصغیر کو ہلا کر رکھ دیا، اگرچہ اس کا مقابلہ اگر ہم کوئٹہ کے ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے زلزلے سے کریں تو اس کے نقصانات اس وقت کے نقصانات کے مقابلے میں بہت کم ہیں - اس زلزلے سے ۵۲۰۰ آدمی مرے ہیں، جبکہ کوئٹہ کے زلزلے سے ۶۰,۰۰۰ آدمی ہلاک ہوئے تھے -

پچھلا خطرناک اور بہت بڑا زلزلہ ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء کو چلی میں آیا تھا، جہاں جھٹکے کی لہروں کی لپیٹ میں ہزاروں آدمی آ گئے تھے ۵۰,۰۰۰ تو اسی وقت ختم ہو گئے تھے ... ۵۰,۰۰۰ زخمی تھے اور آٹھ لاکھ آدمی بے گھر ہو گئے تھے -

چار سال پہلے ۲۸ مارچ سے ۳۱ مارچ تک لگاتار زلزلے پہ زلزلے آتے رہے، اور ترکی کے شہر گدیز اور عمت کو ہلا کر رکھ دیا تھا - ان جھٹکوں کی وجہ سے بارہ ہزار آدمی مر گئے تھے، اور نوے ہزار بے گھر ہو گئے تھے -

۱۹۷۲ء میں ایران میں زلزلہ آیا تھا - اس کے صوبے فارس کے جنوبی حصے میں جو پاکستان سے بہت دور نہیں ہے زبردست جھٹکے آئے تھے، اور پچاس گاؤں کو انہوں نے دہلا دیا تھا - اس طرح ۵ ہزار آدمی مر گئے تھے اور ایک ہزار پانچسو زخمی ہو گئے تھے - ۱۹۷۲ء ہی میں وسطی امریکا کے ایک ملک نکاراگوا میں زلزلہ آیا تھا - اور جھٹکوں کی وجہ سے اس کی راجدھانی مناگوا تباہ ہو گئی تھی - نقصانات کا اندازہ پوری طرح نہ ہو سکا، لیکن نکاراگوا کی وزارت اطلاعات نے اعلان کیا تھا کہ بارہ ہزار مردہ لاشوں کو دفن کیا گیا تھا، اور مناگوا کی تین لاکھ آبادی میں سے آدھی سے زیادہ آبادی بے گھر ہو گئی تھی اور ۵۰ فیصدی عمارتیں یا تو ڈھے گئی تھیں یا ٹوٹ پھوٹ کر بے کار ہو گئی تھیں -

بہر حال جہاں تک ہماری یادداشت کام کرتی ہے، حال میں سب سے خطرناک زلزلہ ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو چین کے شنسی صوبے میں آیا تھا، اس کے بہت خطرناک ہونے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس زلزلے کی لپیٹ میں آ کر ۸ لاکھ بیس ہزار آدمی مر گئے تھے - اتنا بھاری جانی نقصان بہت کم زلزلوں سے ہوا یا ہوتا ہے -

اسی طرح ۱۱ اکتوبر ۱۷۳۷ء کو ایک بھیانک زلزلہ کلکتہ میں بھی آیا تھا، جس کی وجہ سے تین لاکھ آدمی ہلاک ہو گئے تھے -

قراقرم کے پہاڑی سلسلے میں واقع پاٹن اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں ۲ جنوری ۱۹۷۵ء کو صبح ہوتے ہوتے کئی جھٹکے محسوس کیے گئے - اس طرح ایک بار پھر بھگدڑ مچ گئی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب کی بار کوئی نقصان نہیں ہوا -

۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء کو کابل اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں زلزلہ آیا تھا، اس کے جھٹکے ہلکے تھے، اس لیے کابل ریڈیو کے اعلان کے مطابق کسی قسم کا جانی اور مالی نقصان نہیں ہوا تھا، اس زلزلے کا مرکزی نقطہ (جہاں سے زلزلہ ابھرتا ہے یا شروع ہوتا ہے) کابل سے ۱۶۵ کلومیٹر دور شمال مغرب میں واقع تھا -

پہلی جنوری ۱۹۷۵ء کو ترکی میں زلزلہ آیا تھا، اور اس کے جھٹکے جنوب مشرق میں عدانا کے شہر میں صبح سویرے محسوس کیے گئے تھے، ڈر کے مارے بہت سے شہری اپنے مکانات خالی کر کے گلیوں میں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے، اس شہر کی آبادی ۲ لاکھ ۵۰ ہزار ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی قسم کا کوئی جانی اور مالی نقصان نہیں ہوا -

۱۹ جنوری ۱۹۷۵ء کو ڈیڑھ بجے دوپہر کے بعد ہمارے ملک کے ہماچل پردیش کے دو ضلعوں یعنی لاہول اسپتی اور کنور میں سخت قسم کا زلزلہ آ گیا تھا - ۲۰ جنوری کو بھی پانچ بار اور جھٹکے محسوس کیے گئے تھے -

جس علاقے میں زلزلا آیا ہے، اس کی اونچائی تین ہزار میٹر تھی، اور بلندی کی وجہ سے زیادا تر وہ علاقے برف کے نیچے ڈھکے ہوئے تھے، اس لیے فوری امداد پہنچا نا مشکل تھا، اس کے باوجود کوشش کرکے دو ہیلی کوپٹر خیمے کمبل، کھانے کا سامان اور طبی امداد لے کر اترے، ڈاکٹروں کی ٹیمیں بھی طبی امداد کے لیے پہنچ گئی ہیں۔ ہماچل کی حکومت نے اپنے افسران کو ہدایت کردی ہے کہ زخمی لوگوں کی ہر طرح امداد کی جائے۔ پردیش کی حکومت کے ساتھ فوج کے جوان لوگوں اور افسران بھی ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اس زلزلے نے کافی نقصان پہنچایا تھا، اس میں فوج کے کئی جوان بھی شکار ہوگئے تھے، سات گاؤں بلکل تباہ ہوگئے اور ۵۴۳ آدمی یعنی عام شہری مرگئے تھے، سروے کے مطابق ۱۴ کلو میٹر کا علاقا جس میں لی پر، کورک، سمرو، ہرنگ، گرئی، جینگو، اور شلکاد کے گاؤں ہیں، ان کو بری طرح نقصان پہنچا ہے۔ تبت جانے والی سڑک جگہ جگہ چٹان کے تودوں اور ٹکڑوں سے اٹی پڑی ہے۔ ہماری سرحد کے دوسری طرف یعنی چین کے علاقے تبت میں اس زلزلے کا مرکزی نقطا ہے، اس لیے تبت میں نقصان بہت زیادا ہوا ہے۔ لوگوں نے خصوصاً ہماری فوج کے جوانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ڈھیروں پہاڑی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر تبت میں گری تھیں۔

۲۲ر جنوری کی صبح کو لاہل اسپیٹی اور کنور کے ضلعوں میں پھر جھٹکا آیا، اور مصیبت زدا لوگوں کو ایک بار پھر سے زلزلے نے پریشان کردیا۔ پاکستان کے شمالی حصے میں ایبٹ آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں بھی ۲۲ر جنوری کو زلزلا آیا، ۲۱ر جنوری کی رات میں کراچی میں بھی ہلکا سا زلزلا آیا تھا، اور ۲۲ر جنوری ۱۹۷۵ء کی رات میں دس بجے کے قریب ہماری راجدھانی دلی میں بھی ہلکا سا جھٹکا آیا تھا۔ راجستان میں بھی لوگوں نے اسے محسوس کیا۔ پنجاب میں بھی جھٹکا آچکا ہے۔ ان سب کا مرکزی نقطا دور ہمالیا) میں تبت کے اندر ہے۔

۲۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء سے اب تک برصغیر ہندستان پاکستان میں جتنے زلزلے آئے ہیں وہ ادھر ہمارے پڑوس کے ملکوں میں، جیسے افغانستان، تبت اور ترکی وغیرا میں یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کا ہر ایک کا مرکزی نقطا مغربی ہمالا اور قراکورم، ہندوکش سے کوہ قاف ہے، اور کوہ قاف اور مغربی ہمالا کے درمیان جتنے بھی پہاڑی کا سلسلے ہیں ان میں نئی دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ چٹانوں کی ساخت، ان کی تہوں میں توڑ پھوڑ، الٹ پلٹ پیچ و خم اور نئے نئے بل پڑ رہے ہیں۔ فوج کے افراد نے زلزلے سے متاثر ہونے والے علاقوں کا ہوائی جہاز سے مشاہدا کرکے ان تبدیلیوں کی تصدیق کی ہے، اور پیشین گوئی کی ہے کہ ابھی مزید زلزلے آسکتے ہیں۔

زلزلوں کی پیشین گوئی

برصغیر ہندستان اور پاکستان ہمارے پڑوسی ملک اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جتنے بھی زلزلے آتے ہیں، چنانچہ بڑے ہوں یا اوسط درجے یا معمولی قسم کے، ان میں سے ہر ایک کے متعلق سب سے زیادا پریشان کن بات یہی ہے کہ وہ بلا آگاہ کیے ہوئے آناً فاناً آجاتے ہیں۔ اس کا نتیجا یہ ہوتا ہے کہ لوگ جو ان علاقوں میں یا ان کے قرب و جوار میں رہتے ہیں وہ ایک دم پریشان ہو اٹھتے ہیں، اور زلزلے کی ایکا ایک آفت جانے کی وجہ سے اتنا وقت بھی نہیں ملتا کہ لوگ بچ کر بھاگ نکلیں۔

روس کے سائنس داں اور زلزلے کے ماہرین عرصے سے زلزلے کی تباہی سے بچنے کے لیے اس بات کی تحقیقات کرتے رہے ہیں کہ کس طرح زلزلوں پر قابو حاصل کیا جائے۔ مشاہدے تجربے اور مسلسل چھان بین کے بعد انھوں نے ایک ایسا طریقا نکالا ہے کہ زلزلوں کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ روس کے سائنس داں موسم کی پیشین گوئی کی طرح دو یا تین دن پہلے یہ بتا دیتے ہیں کہ زلزلا

آنے والا ہے، ہشیار، اور اپنے اپنے بچاؤ کی صورت نکال لو۔

کیا تم نے "تاشقند کا نام سنا ہے؟ آبادی کے لحاظ سے روس کا یہ چوتھے نمبر کا شہر ہے۔ یہ وسط ایشیا میں واقع ہے، اور تمہیں یاد ہوگا کہ ہمارے سابق محبوب وزیر اعظم لال بہادر شاستری، ہندستان اور پاکستان کے تنازعے کو سلجھانے کے بعد تاشقند ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ہاں تو تاشقند میں سنہ ۱۹۶۶ء میں ایک خاصا بڑا زلزلا آیا تھا۔ اس کی وجہ سے سارا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ شہر ایک تہائی حصہ تو بالکل تباہ اور برباد ہو گیا تھا، اور ۰۰۰ر۴۰ر۳ آدمی بے گھر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۷۴ء میں یعنی پچھلے سال چار جھٹکے لگے، لیکن ان کی وجہ سے وہاں کے عوام پریشان نہیں ہوئے۔ نہ ان پر کسی قسم کی ہیبت طاری ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر موقع پر جھٹکے اور زلزلے کی طاقت اور جھٹکا لگنے یا شروع ہونے کی پہلے سے پیشین گوئی کر دی گئی تھی۔ زمین کے ماہرین اور زلزلے کی نوعیت سمجھنے والے حضرات نے ۴۸ گھنٹے سے ۶۰ گھنٹے پہلے زلزلے کے بارے میں صاف صاف بتا دیا تھا۔ یہ پیشین گوئی نہ صرف ہر اعتبار سے صحیح تھی، بلکہ ماہرین نے یہ تک بتا دیا تھا کہ زلزلا کس وقت آئے گا، کہاں سے شروع ہوگا، اور کتنی طاقت کا ہوگا۔

تاشقند کے زلزلے کے انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے ایک سے ایک اعلا دماغ ماہرین کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلطان خدزلیوف اور ان کی ٹیم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں نے تاشقند کے زمین دوز پانی کے ذخیرے کا مطالعا کیا۔ زمین کی سطح سے نیچے یعنی تقریبًا ساٹھ ہزار فٹ کی گہرائی میں جو پانی ملتا ہے اس کی کیمیائی ساخت پر توجہ دی۔ چٹانوں کی مختلف تہوں اور پرتوں کو بورنگ مشین سے کاٹ کر تاشقند کی زمین کے نیچے اور گہرائی تک پندرا خاص قسم کے سوراخ کیے ان سوراخوں میں سے کھینچ کر پانی کے ان پندرا نمونوں کو بار بار پرکھ کر اور جانچ کر دیکھا گیا، بلکہ اب بھی وقتًا فوقتًا پانی کے نمونے خاص خاص وقفے سے نکالے جاتے ہیں، اور ان کا باقاعدا معائنا کیا جاتا ہے۔ "تاشقند میں زلزلوں کے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سوے لیناف کا کہنا ہے کہ جب زلزلے کا وقت قریب آتا ہے تو پانی کا رنگت بدلنے لگتی ہے، اور بہت کافی حد تک پرکھ کر یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔ ابھی بالکل سو فیصدی یہ اندازا نہیں ہو سکا ہے کہ پانی کی رنگت میں خاص قسم کی کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے، لیکن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کا کہنا ہے کہ ہم نے جتنا بھی تائید اصلاحی معائنے، مشاہدے، اور تجربے سے حاصل کیا ہے، یہ زلزلوں کی پیشین گوئی کے سلسلے میں ایک زبردست اور اہم قسم کی کامیابی ہے، اور دنیا میں زلزلوں کا جو خطرا ہے، اس کے اندر کے جو لوگ بھی یا جس ملک کے ماہرین بھی ہم سے معلومات فراہم کرنا چاہیں تو ہم ان کو بتانے کے لیے تیار ہیں۔

تاشقند میں ایک نمایاں کام یہ بھی ہوا ہے کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں سخت ترین زلزلا آنے کے بعد "تاشقند کو فن تعمیر کے ماہرین نے یہ طے کیا کہ تاشقند کی نئے سرے سے تعمیر میں عمارتیں اس قسم کی بنائی جائیں جو کہ زلزلا پروف ہوں یعنی جن پر جھٹکوں کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ اس سلسلے میں تجربا کیا جا رہا ہے، اور بہت حد تک کامیابی ہو رہی ہے۔ فلیٹ اور اپارٹمنٹ کی نو منزلا جو عمارتیں مکمل ہو رہی ہیں وہ رہائش کے لیے ابھی نہیں دی جا رہی ہیں، بلکہ ان کی چھتوں پر بہت بھاری قسم کے وائبریٹر میں (عمارت کو ہلانے والی مشین فٹ کیے جا رہے ہیں۔ یہ وائبریٹرس چھتوں کو اور پوری عمارت کو اس طرح ہلائیں گے گویا کہ وہ زلزلے سے ہل رہی ہیں۔ اس طرح وہ اور مستحکم ہو جائیں گی، اور بالکل زلزلا پروف ہو جائیں گی

ہندستانی بولو۔ ہندستانی لکھو۔ ہندستانی پڑھو

ماہر القادری ایڈیٹر "فاران"

کتابت کی غلطیاں

کوڑا لکھا تو کاف کا مرکز اڑا دیا
منشی گیری کے نام کو بٹہ لگا دیا

بچپن میں ایک لطیفہ سنا تھا کہ ایک کاتب بہت خوش خط تھا، مگر اس کو یہ بری عادت پڑ گئی تھی کہ کتابوں میں کہیں کہیں اپنی طرف سے اضافہ یا ردو بدل کر دیا کرتا تھا، ایک صاحب ان کے پاس آئے، اور قرآن کریم کا ایک نسخہ اسے دیتے ہوئے کہا کہ ہم اس کی نقل آپ سے کرانا چاہتے ہیں جتنی اجرت بھی آپ مانگیں گے دی جائے گی، مگر یہ خدا کا کلام ہے، اس میں اپنی طرف سے گھٹانا بڑھانا گناہ نہیں کفر ہے۔ خوش نویس صاحب بولے توبا توبا بھلا میں ایسی حرکت کر کے اپنی عاقبت خراب کر سکتا ہوں۔ آپ نشاط خاطر رکھیں نقل ٹھیک مطابق اصل کی جائے گی۔ سال ڈیڑھ سال بعد خوش نویس صاحب قرآن کریم کتابت کر کے اس شخص کے پاس لے گئے۔ کتابت کی صحت کا ذکر آیا تو وہ کاتب اور خطاط بولا" میں نے آپ کے دیے ہوئے نسخے کی ہو بہو نقل کی ہے، اعراب اور نقطے تک پوری ذمے داری اور احتیاط کے ساتھ لگائے ہیں، ہاں میں نے اتنا کیا ہے کہ یہ اللہ کی مقدس کتاب ہے اس میں رسولوں اور نبیوں کے نام اور قصے آتے ہیں، میں نے سوچا کہ اس میں شیطان لعین کا کیا کام، اس لیے جہاں جہاں شیطان کا نام آیا وہاں میں نے آپ کے والد قبلہ کا نام لکھ دیا ہے۔ کاتب کی اس وضاحت پر وہ بیچارا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ تو اس کاتب اور خوش نویس کا قصہ ہے جو قصداً کتابوں میں اپنی طرف سے ردو بدل کر دیا کرتا تھا، مگر ہر مصنف اور اخبار نویس کو اس کا تجربہ ہوگا کہ کاتب صاحبان کتابت میں نادانستہ طور پر ایسی شوخیاں اور غلطیاں کر جاتے ہیں کہ بعض اوقات ہنسی آتی ہے اور زیادہ تر کوفت ہوتی ہے۔

عربی زبان میں کاتب صاحب کو جس جانور سے تشبیہ دی گئی ہے اس کا ہم قصداً ذکر نہیں کرتے کہ کہیں کاتب صاحبان عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوا ہم پر دائر نہ کر دیں اور ہم بیٹھے بٹھائے مذاق ہی مذاق میں پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ ہاں فارسی کی ایک کہاوت نقل کیے بغیر ہم باز نہیں آ سکتے، وہ کہاوت یہ ہے کہ۔

" نقل را چہ عقل "

یعنی کسی تحریر کی نقل کرنے میں عقل کی کیا ضرورت ہے جیسا لکھا ہوا ہے، عین عین اس کی نقل کرتے چلے جاؤ، مگر اس کا تو رونا ہے کہ نقل [illegible]

صاحبان ایسی ایسی ترمیمیں اور اضافے کرتے ہیں کہ بعض وقت جی میں آتا ہے کہ بطور احتجاج کاتب صاحب کی دوات کی سیاہی اپنے چہرے پر مل لیں۔

کتابت میں غلطیاں رہ جانے کے بہت سے سبب اور وجوہ ہیں یہ کہ کاتب صاحبان کی علمی لیاقت واجبی سی ہوتی ہے، اگر کوئی کاتب خاصا پڑھا لکھا بھی ہو وہ لکھنے میں عبارت کے سیاق وسباق پر توجہ رکھے تو اس کی کتابت کی رفتار سست ہو جائے گی۔

پروف ریڈر صاحب کا تساہل بھی کتابت کی غلطی کا ذمے دار ہے، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسٹنگ ساز یا پروف ریڈر یا خود مضمون نگار کے قلم کی لغزش بیچارے کاتب صاحب کے سر منڈا دی جاتی ہے۔

بعض مضمون نگار انتہائی بدخط ہوتے ہیں، ان کی لکھی ہوئی تحریر پڑھتے میں آنکھیں پناہ مانگنے لگتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوات سے کوئی چیونٹا نکل کر کاغذ پر چہل قدمی فرما کر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گیا ہے۔ بعض مضمون نگار لفظوں کو کھا جاتے ہیں، اور ڈکار بھی نہیں لیتے۔ مثلاً "زندگی کو پر بنانے کے لیے بڑی جدو کی ضرورت پڑتی ہے آدمی کو مستقل اور برد بار ہونا چا۔" اس عبارت میں "پر" (پر رونق) "جدو" (جدوجہد) اور "چا" (چاہیے) مضمون نگار صاحب تساہل فرما گئے۔

بدخطی کا ذکر چھڑا تو ایک لطیفہ یاد آیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ڈاک خانے نہ تھے۔ ہرکارے اور قاصد دستی خط لے جایا کرتے تھے، گاؤں کا ایک شخص جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا محلے کے منشی جی کے پاس گیا جو اجرت پر خط لکھا کرتے تھے، اور بدخطی میں اپنی مثال آپ تھے۔

"منشی جی! میرے بڑے بھائی کو خط لکھ دیجیے۔" گاؤں والے نے درخواست کی۔

"بھیا میری ٹانگوں میں تکلیف ہے۔" منشی جی نے جواب دیا۔

"مگر خط تو ہاتھ سے لکھا جاتا ہے میاں" اس شخص نے کہا۔ بات یہ ہے کہ میں جس کسی کو خط لکھتا ہوں وہ خط کسی دوسرے سے نہیں پڑھا جاتا اسے پڑھنے کے لیے بھی مجھی کو وہاں جانا پڑتا ہے۔ منشی جی بولے۔

ایسے بدبخت لوگوں کی تحریریں راقم حروف کی نگاہ سے گذری ہیں جن کو پڑھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں میرے ہاتھ میں قانون ہو تو بدخطی کو جرم قرار دے دوں! جب سے ٹائپ کی مشین نکلی ہے لوگ خط کے معاملے میں بے پروا ہو گئے ہیں، پرانے زمانے میں خوش خطی شرافت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔

میں دوسروں کو دوش کیا دوں خود میرے اپنے رسالے "فاران" میں کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کاتب کی لکھی ہوئی کاپیاں میں خود پڑھتا ہوں، مگر پھر بھی مضمون نگاروں کو شکایت رہتی ہے، اور یہ شکایت بیجا نہیں ہوتی ایک صاحب ہیں شہیر نیازی ان کے نام کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ "ی" کے نیچے دو نقطوں کی جگہ تین نقطے لگا دیے گئے، اور ایک نقطے کے اضافے "شہیر" (ی کے ساتھ) کو "شہپر" (پ کے ساتھ) بنا دیا۔

کاتب صاحبان عام طور پر "مرے اور میرے" "ترا اور تیرا" میں کوئی خاص فرق نہیں کرتے۔ نثر میں تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، مگر نظم میں مصرعے ساقط الوزن ہو جاتے ہیں۔

میں نے "شاہدرباد" ایک مضمون میں لکھا تھا مضمون چھپ کر جو سامنے آیا تو "شاہد دبار" پڑھنا پڑا۔ اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ میاں بیوی میں جھگڑا رہتا تھا، بیوی خاصی تیز مزاج تھی اور شوہر بیوی سے دبتا تھا، ایک دن شوہر نے تنگ آ کر کہا۔

"یا اللہ یا تو میں مر جاؤں یا ——"

وہ کہنے والا تھا کہ "یا تو میری بیوی مر جائے"

یا پر بیوی نے گرجدار آواز میں کہا۔

"یا — کیا — یا" شوہر گھبرا کر بولا۔

"یا میں بھی ہی مر جاؤں۔"

تو کتابت کی صحت کے معاملے میں مضمون نگاروں،

کتابت کی غلطیاں

ہر ہفتے روز نامچے میں کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ میں بھی پورا وقت خرچ کرکے کاپی پڑھتا ہوں اور واحدی صاحب بھی باقاعدہ نظر ثانی کرتے ہیں پھر بھی ایسی غلطیاں رہ جاتی ہیں جن سے بعض اوقات مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ۱۶ر جولائی کے روز نامچے کا کاپیوں کا گم ہو جانا تکلیف

اور اہل قلم کا کچھ اس شوہر جیسا حال ہے اپنے مضامین کی مرمت وہ بیچارے گوارا کرتے رہتے ہیں۔

یہ جو عام شہرت ہے کہ کاتب صاحبان سے کتابت کی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں تو بعض اہل قلم اس شہرت کی آڑ میں کبھی کبھار بعض اپنی غلطیاں کاتبوں سے منسوب کر دیتے ہیں۔

کاتبوں کی غلطیوں کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں اور نئے لطیفے بھی واقعے کی صورت میں ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں راقم حروف روز نامے "مدینہ بجنور" کے ادارے سے وابستہ تھا، انگریزی کی ایک جز کا ترجمہ کرکے میں نے "ذیل" سرخی یوں قایم کی۔

"بنگال میں گورنر نے ریڈیو کا انتظام کر دیا۔"

اب جو کاپی پڑھی تو اس میں لکھا تھا۔

"بنگال میں گورنر نے "رنڈیوں" کا انتظام کر دیا۔"

وہ تو بڑی خیر ہوئی کہ اس غلطی پر میری نظر پڑ گئی ورنا خبر یونہی چھپ جاتی تو حکومت شدید نوٹس لے سکتی تھی کہ تم نے ہز ایکسلینسی گورنر بنگال کو کو تزساق PIMP بنا ڈالا۔

میرے قیام حیدرآباد کے زمانے میں ایک صاحب نے بیان کیا کہ میں نے ایک رسالے میں جوش ملیح آبادی صاحب کی نظم یا مسلسل غزل کا نام "بادۂ جوشش" پڑھا۔ کاتب صاحب نے "بادۂ جوشش" کی "ب" کا نقطہ اڑا کر "ب" کے شوشے کو یونہی سا چھوڑ کر "م" بنا دیا۔

حضرت اکبر الہ آبادی کے ایک مضمون کا عنوان "کونسلوں میں سیٹ تھا" انہوں نے اخبار میں "گھونسلوں کا بیٹ" پڑھ کر اپنا سر پیٹ لیا۔

اب سے تقریباً چالیس برس پہلے کا ذکر ہے پنجاب میں احرار کے مشہور لیڈر چودھری افضل حق اور میاں سر فضل حسین کے درمیان سیاسی اختلاف تھا، جس نے خاصی شدت اختیار کرلی تھی۔ پھر ان میں صلح و صفائی ہوگئی۔ لاہور کے ایک روز نامے (غالباً زمیندار) کے سب ایڈیٹر نے اس خبر کو حال درج کرتے ہوئے یہ سرخی لگائی۔

"چودھری افضل حق نے میاں فضل حسین کی لیڈری قبول کرلی۔"

کاتب صاحب نے لیڈری کی "ر" اڑا دی اور اس ترمیم کے بعد یہ سرخی جلی حرفوں میں یوں شایع ہوئی۔

"چودھری افضل حق نے میاں فضل حسین کی لیڈی قبول کرلی۔"

کاتب صاحب کے صرف ایک حرف "ر" ہضم کر جانے سے مفہوم کیا سے کیا ہو گیا، اور بات کتنی سیریس ہو گئی۔

نقطوں کے اختلاف کے سبب آج تک راقم حروف کی سمجھ میں یہی نہیں آیا کہ حضرت امیر خسرو کے دیوان کا نام "غرۃ الکمال" ہے یا "عزت الکمال" کسی جگہ "ر" پر نقطہ پڑھنے میں آیا۔ اور کہیں "ع" پر۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاتب تو درست لکھتا ہے، مگر پڑھنے والے کم سواد ہوتے ہیں، اس لیے وہ پڑھنے میں فاش غلطی کر جاتے ہیں۔ دلی میں ایک صاحب اپنا نام عربی قاعدے کے مطابق "عبدالقدیر والا خوان" لکھا کرتے تھے، انگریزی میں اس کا ترجمہ Abdu gadeer and Brothers

یار لوگ یہ سمجھے جس طرح مرثیا خوان اور مولود خوان ہوتے ہیں، اسی طرح یہ صاحب کوئی والا خوان ہیں اسی لیے عام طور پر لوگ "والا خوان" (اخوان بروزن انسان) کی جگہ "والا خوان" (خوان بروزن شان) پڑھنے والے کے معنی ہیں بولا اور پڑھا کرتے تھے۔

حیدرآباد دکن میں ایک ضلع کا نام "بیڑ" (ڑ کے ساتھ) ہے باہر کے لوگ جو حیدرآباد میں نئے نئے آتے تھے۔ وہ "بیڑ" کو "بیٹر" (مشہور پرند) پڑھا کرتے تھے۔

وقت پر شایع نہ کیا جا سکا، اگر روزانا شایع ہونے لگے تو وقت کی پابندی بہت اچھی ہو جائے گی۔

کتابت کی غلطیاں

ہندستان کا کوئی ایسا اخبار یا رسالا نہیں جس میں کتابت کی کوتاہیاں نہ ہوتی ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق جب سے ہندستانی صحافت وجود میں آئی ہے، غالبًا مدیر صاحبان اور قارئین ہمیشا ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہے ہیں، جن کی بنا پر کاتبوں کی استادی کے سینکڑوں قصے مشہور ہیں، اور اس کے ساتھ ان کے لطیفے بھی۔ !

روزناما "پیام وطن" کی ایڈیٹر شاہدا باقی جب کاتبوں کی روز روز کی عقل مندی سے تنگ آگئیں تو انہوں نے کاتب کے بجائے اپنے پروف ریڈر کو پیٹ ڈالا۔ آغا حشر کاشمیری نے ہملیٹ کا ہندستانی ترجما کیا، جب وہ شایع ہو کر مارکیٹ میں آیا تو انہوں نے دلی میں اس کی ایک کاپی دیکھی۔ جگہ جگہ کتابت کی غلطیوں کی بہتات تھی۔ وہ اس پر آگ بگولا ہو گئے اور کاتب کو بلا کر اس قدر گالیاں دیں کہ اس بے چارے کا جو حال ہوا سو ہوا، لیکن علاما آرزو لکھنوی، بیخود دہلوی اور سیماب اکبرابادی اتنے دم بخود ہوئے کہ حال سے بد حال ہو گئے۔

مخدوم محی الدین مرحوم نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک واقعا سنایا تھا کہ وہ جس زمانے میں کلکتا سے "الہلال" نکالتے تھے، انہوں نے ایک دن اپنے کاتب سید علی بہادر کو دس روپے کا نوٹ انعام دیتے ہوئے کہا کہ یہ دس روپے اس لیے دے رہا ہوں کہ تم میری غلط ہندستانی کو کبھی کبھی صحیح کر دیتے ہو۔

جگر مراد ابادی کہا کرتے تھے کہ مجھے شیر سے زیادا کاتبوں سے اس لیے ڈر لگتا ہے کہ یہ لوگ آسانی سے جگر کو اجگر بنا دیتے ہیں۔

ایک مرتبا اخبار میں علاما مشرقی کی بجائے علاما مستری چھپ گیا تو اس پر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس زور سے قہقہا بلند کیا کہ علاما مشرقی کو بجد ناگوار گذرا، اور وہ قدرے جھنجلا کر بولے۔ "مگر شاہ صاحب آپ یہ بھول گئے کہ گذشتا سال اسی اخبار میں جناب والا کا نام بھی عطاء اللہ شاہی بخار چھپا تھا۔ اس پر محفل میں ایک قہقہا اور بلند ہوا۔ شیخ عبداللہ نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے مولانا ظفر علی خان نے جان بوجھ کر آپ دونوں حضرات کے نام کاتب سے غلط لکھوائے ہیں۔ محفل پھر قہقہا زار ہو گئی، لیکن گاندھی جی نے جلدی سے درمیان میں بول کر سب کو چپ کر دیا۔

" نہیں جی نہیں۔ مولانا جی ایسے آدمی نہیں ہیں۔"

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کاتبوں کی غلطیاں دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ "اللہ کرے زور قلم اور زیادا!"

مولانا اشرف علی شاہ صاحب تھانوی نے کاتبوں کا نام کاتب تقدیر رکھ چھوڑا تھا۔ خاجا حسن نظامی بیک وقت سات آٹھ پرچوں کے ایڈیٹر تھے ان کے یہاں کاتبوں کی فوج رہا کرتی تھی، اور جب خاجا صاحب تفریح کے موڈ میں ہوا کرتے تو اپنے تمام کاتبوں کو بلا کر یہ بات سمجھایا کرتے کہ جب دنیا کی ہر بات لوح محفوظ پر لکھ دی گئی ہے تو تمہاری کتابت کی غلطیوں کا تذکرا بھی اس میں لکھا ہوگا اس لیے تمام کے تمام کاتب بے قصور۔ اگر تم سے بھول میں کوئی غلطی سرزد ہو بھی جائے تو اس کا ذمے دار خدا ہے۔ تم نہیں۔ ورنا من جانب اللہ والا فارمولا یکسر غلط ثابت ہو جائے گا۔

ویسے تو دنیا میں کوئی بھی خوش نویس ایسا نہیں کہ جس سے اس طرح کی بھول چوک نہ ہوتی ہو۔ انتہا یہ کہ مغل دور کے خط نستعلیق کے خطاط اعظم استاد میر پنجا کش رضوی سے بہ قول نیاز فتحپوری سال میں ایک یا دو بار کتابت کی غلطی ضرور ہو جایا کرتی تھی۔

کاتب، دوران کتابت میں اگر اپنے حواس خمسہ کو پوری طرح استعمال نہ کرے تو معمولی سی لغزش قلم۔ دعا کو دغا۔ شراب کو سراب۔ خدا کو جدا۔ اور اکتوبر کو کبوتر بنا سکتی ہے، لیکن اس کے برعکس

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ غریب کاتب کو وقت پر پیسا نہیں ملا تو اس کا موڈ آف ہو گیا، اور اس نے اسی بگڑے ہوئے موڈ میں میر تقی کو میرا تقی۔ احسان دانش کو انسان دانش۔ شورش کاشمیری کو گوشت کاشمیری۔ قتیل شفائی کو قسیل شفائی اور ساغر نظامی کو لاغر نظامی بنا ڈالا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب اس کے پیسوں کو کافی دیر ہو گئی تو وہ انتہائی جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر ظہیر کاشمیری کو زہر کاشمیری۔ غلام نبی خیال کا نام گمنام نبی خیال۔ انور رضوی کا ادبار رضوی اور رضوی اور جوش کا رد عمل جوش بیانا شروع کر دیا۔

عبدالمتین نیاز

چچا غالب کے نذر

میں جو پڑھنے میں مبتلا نہ ہوا
فرض اسکول کا ادا نہ ہوا
ہو گیا فیل امتحان دے کر
جی چرا کر مرا بھلا نہ ہوا
ممی تم سے ہو اور کیا امید
ٹافیوں کا جب آسرا نہ ہوا
عذر کروں کیسے آپ سے ڈیڈی
ایک دن بھی مرا کہا نہ ہوا
چاند پر بھی پہنچ گیا انسان
امن اب تک مرے خدا نہ ہوا
آدمیت کی اس نے لاج رکھی
جو کسی سے کبھی خفا نہ ہوا
سب زبانوں کا ہو گیا [illegible]
صرف اردو زباں کا نہ ہوا
آؤ سن لو یہی ہے وقت عمل
پھر نہ کہنا ہمیں پتا نہ ہوا
ہم بھی کہتے "چچا" نیاز اس کو
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا

پنڈت خوش دل ایڈیٹر "دیش سیوک"

دیکھتا ہوں میں

یہ کیسا انقلاب چرخ ہے پیش نظر میرے
کہ ہر بستی میں اب رنگ بیاباں دیکھتا ہوں میں
شگفتہ پھول کھل کھل کر گرے اور گر کے مرجھائے
وطن کے گلستاں کو آج ویراں دیکھتا ہوں میں
خوشی سے ناچتے تھے جو بوقت جشن آزادی
انہیں بھی دیش کی حالت پہ گریاں دیکھتا ہوں میں
سر تدبیر ٹکرا کر در تقدیر سے ٹوٹا
وطن کا ہر طرح حال پریشاں دیکھتا ہوں میں
جو مل جل کر کیا کرتے تھے پہلے قوم کی سیوا
انہیں آپس میں اب دست و گریباں دیکھتا ہوں میں
کسی کے دین و ایماں کا بھروسہ کیا کرے کوئی
سر بازار بکتے دھرم و ایماں دیکھتا ہوں میں
ملا اک بھی نہ ہندوستانی اپنے دیش میں مجھکو
بہت عیسائی اور ہندو مسلماں دیکھتا ہوں میں
صداقت کیوں نہ ہو ابتر بپاروں کی نگاہوں میں
بیوپاری جھوٹ کا ہر ایک انساں دیکھتا ہوں میں
عجب بنگالی کا چکر ہے ہر شے آج مہنگی ہے
دھنا خزانہ زر کو آج ارزاں دیکھتا ہوں میں
جدھر جاؤ جہاں جاؤ قیامت ہی قیامت ہے
قیامت ہے قیامت پر پریشاں دیکھتا ہوں میں
زمیں پھٹ جائے گی اور آسماں سے آگ برسے گی
کہ سہمے جیتے جاتی آہ سوزاں دیکھتا ہوں میں
جہاں کے رہنے والے ہر طرح آزاد و خوشدل ہیں
وہاں بھی موت کا منظر نمایاں دیکھتا ہوں میں

رئیس امروہی

حاصلِ شوق

تم نے اے مطربانِ صبحِ بہار
صبح کے گیت گا کے کیا پایا

تم نے اے دوستانِ مجلسِ شب   مجلسِ شب سجا کے کیا پایا
تم نے اے ساقیانِ بزمِ نشاط   مئے عشرت پلا کے کیا پایا
اے جگر خستگانِ زہرِ حیات   تم نے یہ زہر کھا کے کیا پایا
تم نے اے عاشقانِ خانہ خراب   اپنی دنیا لٹا کے کیا پایا
جو نہ اپنا سمجھ سکے تم کو   ان کو اپنا بنا کے کیا پایا

بول اے مرغِ خوش نوا تو نے
صبح دم چہچہا کے کیا پایا

بول اے قاصدِ صبا تو نے   غنچۂ دل کھلا کے کیا پایا
تو نے اے شوقِ خانماں برباد   اپنا سب کچھ گنوا کے کیا پایا
دوستو! اپنے آشیانوں پر   تم نے بجلی گرا کے کیا پایا
ساتھیو! اپنے غنچہ زاروں میں   تم نے کانٹے اگا کے کیا پایا
کھو گئے تم سے دور جا کر ہم   تم نے نزدیک آ کے کیا پایا
تم نے ساحل پہ آ کے کیا کھویا   ہم نے کشتی جلا کے کیا پایا
شمعِ رنگ و چراغِ لالہ نے   اشکِ خونیں بہا کے کیا پایا
کس کا دستِ دعا قبول ہوا   آپ نے ہاتھ اٹھا کے کیا پایا

آج بھی ہر طرف اندھیرا ہے
جگنوؤ! جگمگا کے کیا پایا

آج بھی چار سو ہے سناٹا   دوستو گنگنا کے کیا پایا
آنے والوں کو کوئی بتلائے   ہم نے منزل پہ جا کے کیا پایا
کوئی نقاشِ مرگ سے پوچھے   نقشِ ہستی مٹا کے کیا پایا
اے ہوائے خزاں! بتا تو نے   شعلۂ گل بجھا کے کیا پایا

اب تو ہر دم یہ سوچتا ہوں رئیس
کھو کے کیا کھویا پا کے کیا پایا

خرداد - تیر - امرداد ۱۳۸۴ف ہندستانی ادب اپریل - مئی - جون ۱۹۷۵ء

عزیز ملک

یاترا

اے آبِ رودِ جہلم تجھے یاد ہوگا - !

بہار کے دن تھے - مغرب کے افق پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں - نیل گوں آکاش پر سرخ اور قرمزی گوٹے کن رنگوں کا حاشیہ سجاتی چلی جارہی تھیں۔ دریائے جہلم کے کنارے پر آنکھوں میں کھب جانے والے سبز پوش درختوں کے جھنڈ کے قریب تین مسافر کھڑے بڑے غور سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے - ایک ان میں سے درویش صفت تھا اور باوقار شخصیت کا مالک جیسے روحانیوں کے قافلے سے بچھڑ کر اپنے کارواں کی تلاش میں ادھر آنکلا ہو - باقی دو اس کے خادم تھے جو عرفان کی طلب میں اسے اپنا راہبر مان کر پیچھے پیچھے آگئے تھے کہ راہی جب نکل چلتے ہیں تو کسی روز منزل مل ہی جاتی ہے - اگرچہ منزل تک پہنچنا بڑا کٹھن مرحلا ہے، مگر ہمت والے جب کمر باندھ لیتے ہیں تو مصیبتوں کی گھاٹیوں اور مشکلوں کے پہاڑوں کو عبور کرکے ہی دم لیتے ہیں - درختوں سے پھلوں کا خراج لیتے ہیں جھرنوں کا پانی پیتے، ہوا کی لطافتوں کو جذب کرتے اور پھولوں کی خوشبو دامنِ مراد میں سمیٹ کر تپتے سورج سے اجالا مانگ کر راہِ طلب کو ناپتے ہیں لیکن ان تین مسافروں کے سفر کی ایک منزل دریا کے اس پار پہنچ کر ختم ہو رہی تھی -

درویش صفت بزرگ نے فضا کی پہنائیوں میں دور دور تک نظر دوڑائی - افق پر سورج کا شرابی سا رنگ دھیرے دھیرے کالا پڑ رہا تھا - درختوں کے پتے ہوا میں سرسرا رہے تھے - دریا کا پانی پوری رفتار کے ساتھ آگے اور آگے بڑھتا چلا جارہا تھا - اسے یہ منظر خوش آگیا - آب و گل سبزا نے فطری سکوت سے مل کر آفاقی ماحول کو جنم دے دیا تھا -

اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا "دادو، اوے نورے کیوں کیسی جگہ ہے ؟ دادو اور نورے نے بیک زبان جواب دیا -

"جی شاہ جیو ! بڑی سوہنی تے عالا - !"

تینوں مسافروں نے وہیں اپنے شکستہ بوریے پھیلا دیے - درویش کا بستر، دہقان کا پیراہن یتیم کی بجھی بجھی سی آرزوئیں، مفلس کی دامن کا لباس، کسی عاشق مہجور کے من کی پیاس - یہ سب بلند و بالا صنوبر کی شاخ بے ثمر سے مانند اداس اور بے آس ہوا کرتے ہیں - پھر وہ تینوں لپک کر دریا کی طرف ڈھلوان پر اترے اور خنک پانی سے وضو کیا - مغرب کا وقت نکلا جا رہا تھا - نماز گزاری اور دعا کے لیے ہات اٹھا دیے - معلوم نہیں، جب یہ لوگ اپنے گھر بار اور عزیزوں کو چھوڑ آئے تھے تو اب ہاتوں کا کاسا بنا کر کس شے کے متمنی تھے - ہاں شاید مال و دولت دنیا کے علاوہ ابھی کچھ مانگنے کی چیزیں ہوا کرتی ہیں - کیا سکون قلب اور تسلیم و رضا میرے داتا کی عطا نہیں ؟

رات کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا، اور سکوت شب کے مہیب سناٹے گمبھیر ہوتے جاتے تھے - دور دور دریا کے اس پار چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے جن میں کہیں کہیں کوئی چراغ جلتا نظر آنے لگا - چراغوں کی جھلملاتی روشنی جب فاصلے سے دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان گھروں میں زندگی کے آثار باقی اور روشنی کے جگنو چمکتے رہیں گے یہ معمورے فانی آباد رہے گا -

وہ تھکے ماندے بھی تھے - انہیں بھوک بھی لگ رہی تھی - تھیلے میں تھوڑے سے بھنے چنے موجود تھے تینوں نے مٹھی مٹھی بھر چبائے اور بھوک کی عفریت کو دلاسا دے کر بہتے پانی سے چلو بھر بھر کر پیاس بجھائی، پھر کچھ سستائے، اور عشا کی نماز کے بعد درود اور وظائف میں لگ گئے -

دفعتاً نورے کو کچھ خیال آیا اور اس نے کہا شاہ جیو! کیسی سہانی رات اور ہو کا مقام ہے -

" ہاں ہے "، شاہ جیو نے جواب دیا اور بقدر سکوت کے بعد کہا - " میرے بچو! در آئے ازل بھی تو کچھ نہ تھا، ہو کا دشت تھا، اور خالق کائنات کی تنہا ذات تھی - دشت ہو، اور ذات باری نے مل کر ارباب ازل پر ہو کا ترانا سنایا - "

شاہ جیو کی بات سنتے ہی داود کی روح وہیں آگئی اور اس نے سلطان باہو علیہ الرحمت کے بیت ترنم کیساتھ والہانا انداز میں سنانا شروع کیے -

دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ہو اور ہو کی ردیف کو سانس کے زیر و بم کی سان پر کس کر کچھ ایسے پلٹے دیے کہ رات تو کیا، ساری کائنات، بلکے ذات تک اس لے کی ڈوری میں بندی چلی آئی - فلاؤں نے خیمے کی طنابیں کھینچ گئیں -

رات کچھ دیر وہ سوئے بھی ہوں گے، مگر جن کے دل جاگتے ہیں ان کی آنکھیں سو بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے - گھڑی بے ارادا و شعور ہر آن ٹک ٹک کرتی ہے اور قلوب جاری ہوں تو اللّٰہ اللّٰہ کی صدا کانوں میں ہر وقت گونجتی ہی رہتی ہے بلکے صبح جاگی تو رب کے آثار ملے ہیں

معمور تجلی، در و دیوار ملے ہیں

اے آب رود جہلم! تیرے کنارے آج تین مسافر اترے ہیں - شاہ جیو کا نام سید عبد الخالق ہے داود اور نورا، ان کے مریدان با صفا ہیں، یہ عبادت کی خاطر پرسکون ماحول کی تلاش میں یہاں آئے ہیں -

رات ختم ہوئی، اور سحر اجالے کی سوغات لے کر بیدار ہوئی، سحر کا جلوا ویرانے میں بہار کی آمد اور نوخیز لڑکی کے جوبن پر نکھار کے اولین آثار، ایک ہی حقیقت کے روپ ہیں - سید صاحب نے دریا کے رخ کھڑے ہو کر بہتے پانی کی شفاف رو پہلی چادر پر حد نظر تک اپنی نگاہیں گاڑ دیں - وہ حد کہ جہاں افلاک کے دھندلے کنارے پانی کی گہرائیوں میں ڈوبے جاتے ہیں ان کی نظر تھر تھراتے پانی کی سطح پر تیرتی چلی گئی - انہوں نے سوچا کتنی حسین و دلکش فضا ہے - کبھی اپنے وقت پر برسات ہوگی تو بارش صرف دریا پر ہی نہیں برسے گی، بلکے کنارے پر موجود زمینوں کو بھی سیراب اور شاداب کر جائے گی - پیاسی مٹی اس آبیاری کے بعد گندم کے بیج کو اپنی کوکھ میں لے کر پروان چڑھائے گی اور گندم سنہری بالیاں اور خوشے ہستیوں اور خشیوں سے جھومیں گے لہرائیں گے -

چند دن گذرے، گرمیاں آگئیں اور پھر برسات کا موسم شروع ہوگیا - طوفانی بارشوں سے دریا میں طغیانی آگئی - پانی کی مار امار سے نشیبی حصے میں واقع بہت سے گاؤں بہہ گئے، مکینوں نے مشکل سے جان بچائی، اور طے ہوا کہ سال بسال اس مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں نہ نشیب سے اوپر کی طرف نقل مکانی کر جائیں - اس تجسس میں کچھ لوگ اس جگہ آنکلے جہاں تین مسافر اپنے مولا سے لو لگائے بیٹھے تھے، یہ مقام بڑی حد تک محفوظ تھا، اس لیے یہیں مستقل قیام کا فیصلا ہوا آنے والے چند ہی دنوں میں بہت سارے خاندان اپنا بچا کچا سامان لاو لائے، اور کچے پکے مکانوں کی نیو رکھ دی - دیکھتے دیکھتے اچھا خاصا گاؤں آباد ہوگیا - ان میں دو چار گھرانے ہند ولا کے بھی تھے جو ان دنوں دیہاتوں میں چھوٹی موٹی دکانیں کھول کر دھندا کرتے اور عمر بیتاتے

تھے - یہ بات نہیں تھی کہ مسلمان کاروبار کرنا نہیں جانتے تھے، بلکہ حادثاً یہ ہو گیا تھا کہ ان کی سیرچشمی۔ اکبر اعظم ہی کے وقت سے تجارت اور مالیات کے شعبے ڈوڈرملوں کے سپرد کر رکھے تھے اور آپ زمین داری کرنے ہی میں لگے رہے۔ گاؤں کا نام سید صاحب کی نسبت سے "چیک سیداں" مشہور ہو گیا۔ سید صاحب اور ان کے دو نوں مریدوں کے لیے کبھی گھاس پھوس کے چھپر دیے گئے۔ ایک مسجد کی چار دیواری بن گئی اور پنجگانہ نمازوں کا باجماعت سلسلہ شروع ہو گیا۔

سید صاحب کی ذات مرکزی حیثیت اختیار کر گئی اور ان کے حسن اخلاق نے لوگوں کو اپنا گرویدا بنا لیا۔ شاہراہیں سکڑتی ہیں تو بیٹھک ہی کی جانب آتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ اپنی چھوٹی بڑی حاجتیں اور مشکلات لے کر انہیں کی خدمت میں آتے۔ شہر جہلم اور نواحی دیہاتوں سے بھی لوگ بکثرت رجوع کرتے۔ اس مقبولیت سے سید صاحب کے روحانی مشاغل میں خلل تو واقع ہوا، مگر آخر مشیت کے سامنے جھکنا ہی پڑا۔

کئی ماہ و سال گذر گئے۔ سرد گرم زمانے کتنی کروٹیں لیں۔ سید صاحب میں بڑاپے کے آثار نمودار ہو گئے۔ گاؤں کے بچے جوان، اور جوان کہولت کی منزلیں طے کرنے لگے۔ آنے والی روحیں آتی رہیں اور جانے والے برابر اپنی منزل کو پہنچتے رہے۔ ایک روز گاڑی میں ایک سکھ وارد ہوا، اور سید صاحب کو پوچھتا ہوا ان کے آستانے پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ مضبوط، قد اونچا، چڑھی ہوئی داڑھی، اجلا لباس اور جھکی جھکی سی نگاہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے سید صاحب کے قریب گیا، اور چرن چھو کے بے ساختہ کہا۔

مو ہی جوت سمجھ تے رلی
جگمگ جگمگ لاٹاں مارے

سید صاحب نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پوچھا۔

"سردار جی کیا نام ہے؟"

"سنت سنگھ" اس نے بتایا۔

"کیا کام ہے؟" سید صاحب نے پوچھا۔

"بس دیدار مرداں" اس نے جواب کہا۔

سید صاحب نے اس کے باطن پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ کرتے دھرنے والا آدمی ہے، اور اپنے خیال میں پختہ ہو چکا ہے۔

وہ مودب سامنے بیٹھا رہا۔ سید صاحب دوسرے آنے والوں سے باتیں کرتے رہے، کچھ دیر میں سب لوگ اٹھ کر جا چکے تو سید صاحب نے اسے اشارے سے قریب بلا کر کہا۔

"سنت سنگھ! جس گیان دھیان میں تم مشغول ہو، اگر ذرا سا پلٹا دے کر، اب اس انداز میں چلو تو منزل تک پہنچنے میں آسانی رہے گی۔"

سنت سنگھ نے منت گذاری اور احسان مندی کے ساتھ سید صاحب کے پاؤں چھو کر اپنی انگلیوں کو آنکھوں سے لگایا، اور پھر چوم لیا۔ سید صاحب نے کہا اب تم جاؤ، اور جس طرح میں نے تعلیم دی ہے اس سے چمٹ جاؤ۔ وہ آداب بجا لا کر رجعت قہقہری کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا، اور دہلیز پر بوسا دیکے کر جس طرف سے آیا تھا، ادھر کو لوٹ گیا۔

لوگوں نے اسے آتے اور واپس جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سید صاحب سے جا کر پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ کسی نے ادھوری تعلیم کر دی تھی - انقباضی کیفیت میں مبتلا تھا۔ خدا کے فضل سے میں نے پلٹا بنا کر جس پیڑ کا سکل تھا وہیں لگا دیا ہے۔ چند روز میں تم تماشا دیکھنا۔ گلاب کی طرح کھل جائے گا۔"

اور ہوا بھی یہ کہ دو ہفتے بعد وہ اپنا سوٹ کیس اور بستہ لے کر آستانے عالی پر آ پہنچا۔ لوگوں نے دیکھا کہ چہرے پر اور ہی رنگ ہے اور کیفیات میں ڈوبی ہوئی آنکھیں مسلسل شب بیداری کا راز فاش کر رہی ہیں۔ سید صاحب نے حال دریافت کیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سر کو ہلکی سی جنبش دی مسکرا دیا اور پھر اپنے خیال میں غرق ہو گیا۔

سید صاحب نے بھانپ لیا کہ اب یہاں مستقل قیام کے ارادے سے آیا ہے، چنانچہ آستانے کے سامنے آٹا دال گڑ شکر بیچنے والے ہندو دکاندار

نراین داس سے بڑا کر کہا کہ جب تک کوئی متبادل انتظام نہیں ہوتا، سنت سنگھ تمہارے یہاں رہے گا۔ اس کے کھانے والے کا بندوبست ابھی تم کرو اور یہ تمہیں نقد پیسے ادا کر دیا کرے گا۔ نراین داس اس کا بستر اور ٹرنک اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔

چند ہی دنوں میں گاؤں کے چھوٹے بڑے سنت سنگھ سے گھل مل گئے۔ وہ صبح سویرے گھاٹ پر نکل جاتا، اور وہاں گیان دھیان میں لگا رہتا۔ پھر جب سید صاحب کے حجرے سے برآمد ہونے کا وقت آتا وہ بھی مجلس میں آ کر بیٹھ جاتا۔ سید صاحب کی باتیں سنتا۔ وہ اپنے دامن کو موتیوں سے بھرتا رہا اور اس کا ذہن کھلتا چلا گیا۔

دوپہر کے بعد گاؤں والے چوپال میں جمع ہوتے تو کبھی وہاں بھی جا بیٹھتا، لیکن اسے اکثر چپ ہی لگی رہتی۔ کوئی شخص جتنی بات پوچھتا اسے اتنا ہی مختصر جواب دے دیتا۔ تاہم سب لوگ کسی بات پر ہنستے تو وہ بھی خوش طبعی میں شریک ہو جاتا۔ ہوتے ہوتے تکلفات کے پردے اٹھتے گئے۔ اب بزرگ اور جوان بھی اس سے مذاق اور چہلیں کرنے لگے۔ وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی دل لگی کی باتیں سنتا اور اس تصور سے اس کا چہرا دمک اٹھتا کہ سید صاحب کی نگاہ التفات کے صدقے میں ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے، اور محبت میں رفتہ رفتہ سب حجاب اٹھ جاتے ہیں۔

ایک روز نشست جمی ہوئی تھی۔ کسی نے پوچھا۔ "سردار جی! آپ تو ماس کھاتے ہوں گے۔"

اس نے جواب دیا "اور آپ نے کبھی کھلایا ہوتا تو کھا لیتا۔"

ایک اور مسخرے نے لقما دیا "سردار جی ماس تب کھاتے تھے جب شراب پیتے تھے، اور شراب اس روز پیتے تھے جب جوئے یا سٹے میں تگڑا مال یا ہاتھ لگتا ہو گا۔"

لوگوں نے قہقہا لگا دیا۔

سنت سنگھ نے بس اتنا کہا، "توبہ، توبہ۔ چھی چھی چھی"۔ دوسرے نے پوچھا۔ "سردار جی آپ نے شادی وادی بھی کی یا کہ نہیں۔"

سنت سنگھ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "دوستو! فضول باتوں سے کیا حاصل، اگر میں کہوں کی ہے تو آپ کو کیا نفع پہنچے گا، اور اگر کہوں کہ نہیں کی تو آپ کیا انتظام کر دیں گے۔"

جواب معقول اور مسکت تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، لیکن آج لوگ اس سے کچھ نہ کچھ کہلوانے ہی کے موڈ میں تھے۔

چنانچہ ایک سخن ساز نے بات چلانے کے لیے پوچھا "سنت سنگھ جی! آپ اتنے دنوں سے یہیں ہیں کوئی کام دھندا، سوائے نام جپنے کے ہم نے آپ کو کرتے نہیں دیکھا گویا آج کل کے دور میں کوئی کام نہ کر کے آپ بڑا کام کر رہے ہیں پھر بھی دال روٹی سہی، آپ کا خرچ کیسے چلتا ہے اور اب سنا ہے کہ آپ گلی کا نکڑ والا مکان خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر کیا راز ہے؟ اگر کوئی نسخہ کیمیا کا یاد ہے تو ہمیں بھی سکھا دیجیے۔ وہ آپ نے سنا نہیں ونڈ کھائیے۔ کھنڈ پکائیے۔"

سنت سنگھ کی کشادہ پیشانی پر گہری شکنیں نمودار ہو گئیں، اس نے دور خلا میں گھور کر دیکھا۔ پھر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کاکا جی! میں سردار سنگھ ٹھیکیدار کا اکلوتا بیٹا ہوں جہلم شہر میں ہزاروں روپے کی جائیداد کھڑی ہے۔ ایک منشی رکھا ہوا ہے جو آتا اور ہر ماہ مجھے آ کر دے جاتا ہے۔ کسی دن میں بھی وہاں کا چکر لگا آتا ہوں میرے باپ کا اس وقت دیہانت ہوا جب میں میٹرک میں تھا۔ باپ کے بعد میں ہی اپنی ماں کا واحد سہارا تھا۔ اس کے دل میں کتنی امنگیں ہوں گی۔ اس نے میری شادی بھی ایک جگہ ٹھہرا دی تھی، لیکن کرنا رب کا یہ ہوا کہ وہ ایک روز گوردوارے سے واپس آ رہی تھی کہ ایک تیز رفتار لاری کی ٹکر سے تانگا الٹ گیا اور ماں جی کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ پھر چارپائی پر ایسی گری کہ مر کر ہی اٹھی۔ اس کا کریا کرم میرے یہاں آنے سے چند ہفتے پہلے ہوا تھا۔ اس طرح میری شادی کے لاواں پھیرے دھرے رہ گئے

میں اب پچاس کے پیٹے میں ہوں۔ ان دنوں اٹھارہ برس کا نوجوان تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ میری منگیتر دلیپ کور بڑی خوبصورت لڑکی تھی اس کے والدین نے بہت زور مارا کہ شادی کی تاریخ مقرر کر دی، مگر میں نے کہا جب تک ماں جی تندرست نہ ہوں گی میں شادی نہیں کرونگا۔ دلیپ کور کی عمر تو کچھ زیادہ نہ تھی پر جوانی اس پر گھٹا بن کر آئی تھی جو دیکھتے دیکھتے کدو کی بیل کی طرح بڑھتی پھیلتی چلی گئی۔ اب اس کے والدین میری ماں کی صحت یابی کا کب تک انتظار کرتے جوان کنواری بیٹی پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب ماں باپ اس کے سراپا کو دیکھ کر خوف سے لرز جاتے ہیں۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے دلیپ کور کو کہیں بیاہ دیا۔

"یہ کہانی تو بہت دلچسپ ہے سردار جی" چودھری محبوب حسین نے گھٹنے ہلاتے ہوئے کہا۔ سنت سنگھ نے بھوئیں سکیڑ کر کہا۔ "دلچسپ نہیں بڑی دکھ بھری ہے۔ چودھری صاحب کوئی تیس برس مسلسل بیمار ماں کی تیمار داری کر کے دکھائے اور اپنی جوانی کو اس کے چرنوں میں بتاشے کی طرح گھول کر رکھ دے تو میں جانوں اصل کا پتہ ہے۔ کوئی ہے تو سامنے آئے۔ میں اس کے پاؤں پر اپنی عقیدت کی آنکھیں مل کر کلیجے کی آگ بجھاؤں۔"

چودھری محبوب نے پوچھا "سردار جی سچ سچ بتانا آپ کو کبھی عورت کا خیال آیا بھی ہے کہ نہیں؟" سنت سنگھ نے کہا "آیا کیوں نہیں جب شریر میں جان اور جیب میں پیسے ہوں تو گندم کی روٹی اپنی مستی دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ ہمارے پڑوس میں ایک کھاتے پیتے مہاجن کا گھر تھا وہ خود تو ڈھل چکا تھا، لیکن پہلی بیوی کے مرنے پر ایک نوجوان لڑکی بیاہ لایا۔ دوستو! میری بات کو گرہ باندھ رکھنا۔ آج تم نے مجھے چھیڑ تو دیا ہے، لیکن تم بھی کیا یاد کرو گے، چھٹپن میں جب کسی کی شادی ماں باپ کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ انہیں کرنا ہے کہ بیٹے کے سہرے کی خوشی دیکھ لیں، اور جب کسی نوجوان کی شادی ہو تو پاس پڑوس والے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ چلو اپنے کام سے لگا ہماری بہو بیٹیوں کی عزت محفوظ ہوئی، اور جب کسی بوڑھے کی عقل پر پتھر پڑتے ہیں اور وہ نئی شادی کر کے لاتا ہے تو محلے بھنگڑا ناچتے ہیں کہ ہمارا کام مفت میں بن گیا اور بیٹھے بٹھائے "ہو جالو" ہاتھ آ گئی۔" "تو پھر اس بوڑھے مہاجن کی جوان پتنی کا کیا ہوا؟" چودھری محبوب حسین نے چسکا لیتے ہوئے پوچھا۔ سنت سنگھ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہونا کیا تھا، وہ جوان لڑکی میری ماں جی کو دیکھنے کے بہانے وقت بے وقت ہمارے آنے جانے لگی۔ ماں جی کی طویل بیماری نے ان کی آنکھوں کا نور تک چھین لیا تھا، پھر وہ ہل چل بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ وہ لڑکی جب دن میں کئی کئی بار آتی جاتی تو میں متوجہ ہو گیا۔ ایک بھرپور اور بھاری بھرکم

پر چلتے چلتے زمانہ گزر گیا تھا۔ طبیعت ویسے بھی صاف ہوا ڈھونڈنے کے لیے آمادہ تھی، وہ آتی تو کبھی اپنے بڑے بڑے نیم منوّر نین کبھی ٹکر ٹکر دیکھ کر لجا سکاتی اور کبھی کہنی سے ٹھوکا دیتی ہوئی گزر جاتی۔ کبھی انگڑائیاں لیتی اور انگلیاں چٹخاتی کسی انامہوا اپنے پھیپھڑوں میں پھیلنے کے لیے بازو ڈھیلے چھوڑ کر لمبا سانس لیتی تو جسم کے کنگورے اپنا جادو جگاتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرا اور اس کا دل برابر ساتھ ساتھ دھڑک رہا ہے۔ چودھری صاحب آدمی شراب پیے گا تو مستی چڑھے گی دماغ کی رگوں میں اترے گی تو آنکھوں میں گلابی ڈورے کھنچیں گے۔ پھر عورت ذات وہ ناگن ہے جس کو دیکھتے ہی سے مستی اور نشہ طاری ہو جاتا ہے۔" "اچھا تو پھر کیا ہوا" چودھری محبوب حسین نے بے تابی سے دریافت کیا۔ سنت سنگھ بولا۔ "ہوا یہ کہ تیز آندھی کا ریلا آیا اور بند کو اڑا کر توڑتا ہوا نکل گیا۔ چودھری صاحب پیاس اپنی جگہ کتنی شدید سہی میونسپلٹی کا نلکا تو وقت سے کھلے گا۔ اب اگر برداشت نہ ہو سکے تو نالی کا گدلا پانی جب چاہو پی لو۔"

پھر سنت سنگھ نے کچھ دیر رک کر کہا "دوستو! میں لہو کے اس داغ کو آج تک آنسوؤں سے دھو رہا ہوں، مگر جوانی کی نادانیوں کا رنگ اتنا گہرا اور پکا اترا کہ دامن دل سے ابھی تک نہیں چھوٹا۔ ویسے تو میری طبیعت میں مذہبی لگاؤ شروع ہی سے تھا، مگر احساس گناہ کے بعد اتنا شدید ردعمل ہوا کہ میں نے طوفانی دوڑ لگا دی اور جہاں بھی کوئی سادھو مہاتما، جتی ستی، مست ملنگ، ملا، پنڈت، سیانا، پیر فقیر دیکھا اس کے چرن چھو آیا۔ وہ گرو دکھ کہا ہے کہ مجھے ہر شخص نے دلاسا دیا، اور ہر ایک نے یہی بتایا ؎

لوکو مرم نہ بھولو کوئی ات ات پر بھو سوئی

اور یہی لگن مجھے آپ کے گاؤں اور سید صاحب کی جوتیوں میں لے آئی۔ اب مجھے نہیں مرنا اور جینا ہے۔" "مگر" ایک شخص نے رنگ محفل بدلنے کے لیے کہا۔ "سردار جی! آپ کو ایک شادی تو کر ہی لینی چاہیے۔ ابھی آپ کچھ زیادہ بوڑھے تو نہیں ہو گئے۔ دیکھیے نا۔ زندگی کوئی نہ کوئی ساتھی چاہتی ہے اور شغل میلے سے جی بہلتا ہے۔" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سید صاحب خلاف معمول ادھر آ نکلے۔ تمام لوگ تعظیماً کھڑے ہوئے تو پوچھا۔ "سنت سنگھ کیا ہو رہا ہے؟" "کچھ نہیں شاہ جیو! یہ لوگ مجھے شادی کی تلقین کر کے اپنا دل بہلا رہے ہیں۔"

سید صاحب نے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ جیون ساتھی ضرور ہونا چاہیے، وہ تمہیں اپنے گرو گوبند سنگھ جی کا قول یاد نہیں کہ۔ دولت گزران۔ بیوی ایمان۔ اور اولاد نشان ہوا کرتی ہے۔" یہ کہہ کر سید صاحب چلے گئے۔ سنت سنگھ بھی وہاں سے

مل گیا، اور لوگ پہ میگوئیوں میں مصروف ہو گئے۔

سنت سنگھ نے سید صاحب کے اشارے کو پا لیا، اور اگلے روز وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے کیمبل پور چلا گیا۔ وہاں ایک ملک وکیل کی لڑکی سرجیت کور سے اس کی شادی کی بات طے ہوگئی۔ بیساکھی کے بعد رخصتی قرار پائی۔ واپس آکر سنت سنگھ نے گلی کے نکڑ والا مکان خرید لیا۔ اس کی مرمت اور سفیدی کرائی۔ چار پائیاں، فرش و فروش، کھانے پکانے کے برتن اور دوسرے لوازمات اپنے آبائی گھر سے منگوا لایا۔ گاؤں والوں کو بھی پتا مل گیا کہ مٹھائی دھٹائی کھانے کے دن قریب آ گئے۔ بیساکھی کے تہوار سے ایک روز پہلے وہ سید صاحب سے اجازت لے کر پنجہ صاحب گیا۔ وہاں درشن اور اشنان سے فراغت پاکر کیمبل پور پہنچا اور ایک ہفتے کے بعد سلک کی چادر میں لپٹی ہوئی سرجیت کور کو بیوی بنا لیا۔

اے آب رود جہلم! ایک اور مسافر ترے کنارے آ لیا

سرجیت کور ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی — سانولا رنگ، جھکی جھکی آنکھیں جیسے ان سے صرف دیکھنے کا کام لیتی ہے۔ کسی کو دکھا نہیں سکتی۔ مونھ پر چیچک کے ایسے کھردرے داغ جیسے پرانی دیوار پر جابجا اکھڑا ہوا پلستر ہوتا ہے۔ میانہ قد، بال نہ لمبے نہ چھوٹے عمر چالیس کے قریب وہ دلہن تب ہی جب لڑکی سے عورت بن گئی تھی۔ چالیس برس کی عورت، وہ اپنے چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی، اگرچہ شکل و صورت بری نہ تھی، مگر چیچک کے آزار نے اس کی نسوانی دلکشی میں ان مٹ دراڑیں ڈال دی تھیں۔ کتنے ہی رشتے آئے اور واہ گورو، واہ گورو پکارتے لوٹ گئے۔

اس کے سارے بہن بھائی بیاہے گئے، ان کے سہاگ کی تنہائیوں کے راگ فضا کی وسعتوں میں تحلیل ہوئے مدتیں گذر گئیں، اور وہ سب گھر گرہستی میں مصروف ہو چکے، مگر سرجیت کور ابھی تک آنگن میں نہ ختم ہونے والی رات کے سناٹوں میں تنہا کھڑی تھی۔ اس کی نسوانی امنگیں بیدار ہو ہو کر پھر سو چکی تھیں۔ اسے کسی راہ گذر کا نشان نہ ملا جو چمن کی بہار تک پہنچتا۔ پھر پورنیما تھا بچپن اور جوانی کے درمیان زمانہ تو بہن بھائیوں کی مشترکہ خوشیوں کے جھرمٹ میں بیت گیا۔ تینوں بہنیں میٹرک تک پڑھیں۔ گھر پر راگ ودیا سیکھنے کا موقع بھی ہوا۔ سرجیت کور نے رقص کی مشق بھی کی۔ اس کا بدن اس فن کے لیے موزوں بھی تھا، پھر جب شباب کی دہلیز پر قدم رکھا، اور اس کے لیے پہلے پہل ایک رشتے کا پیام آکر بات ختم ہوگئی تو اس کے کان میں بھی بھنک پڑ گئی، وہ کچھ مضمحل سی ہو کر کمرے میں آ گئی۔ آئینہ اٹھا کر اپنے چہرے کو مختلف زاویوں سے غور دیکھا، اور پھر جھنجھلا کر آئینے کو دیوار پر دے مارا۔ چھن چھن چھناک کی آواز پورے مکان میں دردمند چیخوں کی طرح گونجی۔ اس کی ماں رسوئی سے ننگے پاؤں دوڑی آئی، آئینہ کرچ کرچ ہو کر کمرے میں بکھرا پڑا تھا۔ سرجیت کور میز کے سہارے بات چپ چاپ کھڑی تھی۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیوں بیٹی! آئینہ کیسے ٹوٹ گیا؟"

سرجیت کور نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "بس ٹوٹ گیا۔" ماں بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ سرجیت کور نے محسوس کیا۔ [illegible] یہ صدا ہی ہے۔ توڑ دیا۔ [illegible]

جاب [illegible] آئے [illegible] ماں کی تقاضے مایوس ہوگئی۔ گاؤں والیاں اکثر [illegible] آتی جاتی تھیں۔ وہ بھی پڑوس [illegible] آئی، مگر کسوئی کھوئی سی [illegible] گاؤں [illegible] اس کی چہلک دیکھ لی تھی۔ شوخی نفس [illegible] ابھی ہے۔

ایک بانکے نے دوسرے سے کہا "یار سنت سنگھ بھی لوا پڑی سندر گڈی کہیں سے تلاش کر کے لایا ہے۔ ڈھیلا ڈھالا لباس، شکل نہ عقل، گرگٹا بہوی سی چیچک کا چہرا، نہ چھے ختنی رنجت کا کوئی تاثر اس کے چہرے کی سلوٹیں جیالی پرا بھرتا ہیں۔" دوسرا بولا، "نہ جانے کہاں سے یہ پرلی سانچہ ڈھالا ہے۔ سنو اس کی رنگت اور چہرا دیکھ تو ایسا لگتا ہے، جیسے کھنکھنا [illegible] گیا اور مٹی [illegible] ہو گئی، جو نقش جمال ابھرا تھا بگڑ کر رہ گیا۔"

اصل میں سرجیت کور کی اندرونی وال عورت ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ سنت سنگھ اسے کیا سمجھتا تھا

وہ خود بھی جاگنا نہیں چاہتی تھی ؎

بہت دنوں کا سویا منوا جاگت جاگت جاگے ہے
کوئی سر ہنے والا ہو تو خود نمائی بھی انگڑائی لے ۔

برس بھر کے بعد اس کے لڑکی پیدا ہوئی ۔ امرت کور اس کا نام رکھا ۔ چھٹی کے نہان کے بعد وہ آنگن میں بچی کو لیے بیٹھی تھی ۔ پاس پڑوس سے بھی عورتیں آ کر جمع ہو گئیں ، انہوں نے خلاف معمول اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی ، اور مسکراہٹ کیسے نہ ہوتی اس نے اپنی ہی جیسی ایک جنس کو جنم دیا تھا ۔ اب اسے تھپک تھپک کر لوریاں دے دے کر دودھ پلا پلا کر پالنا پوسنا تھا ۔ بچی خاصی خوبصورت تھی ، ماں کو اپنے چہرے کی بد نمائی کے داغ دھبے دھلتے نظر آئے وہ محسوس کرتی کہ ضیائے خورشید کا کوئی ٹکڑا اڑ کر اس کی گود میں آ گرا ہے ۔ بس اسی خیال سے اس کے ویران تاریک اور اجاڑ دل کی بستی میں چاندنی بکھرنے لگی ، اپنے حصے کے غم اپنے حصے کی خوشیاں سب نیلی چھت والے کی دی ہوئی ہیں ، غم کی مدت طویل سہی پر ذرا سی کرن خوشی کی بھی تو جگمگائی ۔

دو تین ماہ بعد گاؤں کے چودھری کی لڑکی کے بیاہ پر رت جگا ہوا ۔ باہر سے دو میراثنیں بھی بلائی گئیں ۔ بزم شبانہ جانے اور ناچنے گانے کے لیے سرجیت کور بھی شریک ہوئی ۔ اس نے جانے سے پہلے ٹرنک کھولا ، اور ایک ایک کپڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا ، بسنتی رنگ کی شلوار ، قمیص منتخب کی ۔ اسی رنگ کا دوپٹا اوڑھی سونے کی انگوٹھیاں ، جھمکے چوڑیاں اور چندن ہار بدن پر سجا کر امرت کور کو گود میں اٹھائے وہاں پہنچی ۔ اس نے سڈول بدن کے خطوط چست لباس سے جھلکے پڑتے تھے ۔ سب کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے اس پر مرکوز ہو کر رہ گئیں ، لڑکی لباس عروسی پہن کر ہی دلہن کہلاتی ہے ۔

شادی کا گھر تھا خوشیوں کے آنگن میں بہاروں کا کارواں اتر آیا تھا سرجیت کور پاؤں پاؤں بڑھتی ہوئی عین دلہن کے سامنے جا کر بیٹھ گئی وہیں ڈھولک بھی بج رہی تھی ۔ ایک بے سری لڑکی رول رول کر کے کوئی گیت گا رہی تھی ، لیکن محفل ابھی جمی نہیں تھی ۔ کچھ دیر میں ایک میراثن نے گھنگرو باندھے ۔ دوسری نے ڈھولک پر تھاپ دی ، چھن چھن باجے پائلیا ۔ سرجیت کور کے بدن میں ایک لہر سی دوڑ گئی ۔ برسوں کے بعد وہ ایک کھوئی ہوئی دنیا میں ایک بار پھر لوٹ آئی ۔ اپنے بچپن کے خوابوں کی دنیا میں ۔ ڈھولک اور گھنگروؤں کے آہنگ نے گدگدا کر اس کے اندر والی عورت کو گہری نیند سے بیدار کر دیا ۔ امرت کور اس کی گود میں میٹھی نیند سو رہی تھی ، لیکن سرجیت کور آج کتنی ہی مدت میں جاگ اٹھی اس نے امرت کو دری پر اپنے گھٹنے کے قریب لٹا دیا ، اور نور دنغمے کی لے میں گم ہو گئی ۔ گانے والیوں نے مصرع اٹھایا ؎

دیس پنجاب نی اڑیو پھل گلاب نی اڑیو

ادھر تان ابھی لگی ہی تھی کہ ادھر ے خیال میں سرجیت کور نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا دی ، وہ سر تال سے خوب واقف تھی اور ؎

رقص کرتی تھی جس پر اس کے لہجے میں وہ ترنم تھا

محفل میں سناٹا چھا گیا ۔ ڈھولک والی تو بالکل ہی خاموش ہو گئی ، البتہ ناچنے والی تالیں کے لیے مصرعے اٹھاتی ، اور پھر سرجیت کور تنہا ہی تان لگاتی چلی گئی ، دو چار گیت اس انداز میں چلے ، پھر اس نے جو گھنگرو باندھ لیے اور کھڑی ہو گئی ، دیکھتے دیکھتے اس کے شوق کا طوفان ان حدوں سے جا ٹکرایا ۔ جہاں زماں و مکان دونوں موم بن کر پگھل جاتے ہیں ۔ وہ اس رات کی رانی بن گئی تھی ، اور باقی سب عورتیں اس کی دیوداسیاں تھیں ، — جنکے منھ حیرت سے کھلے رہ گئے تھے — کوئی برس بھر بعد ایک روز سید صاحب نے سنت سنگھ سے " کاش میں چند روز رک سکتا ، مگر میرا وقت آ گیا ہے ، اب کے تیرے گھر لڑکا پیدا ہوگا ۔ اس کا جودھ سنگھ نام رکھنا ۔ میرے بعد اگر گاؤں سے جانا چاہو " تو میری طرف سے اجازت ہے ۔

خدا کی شان اگلی ہی صبح سید صاحب نماز فجر کے دوران سجدے کی حالت میں رضا ہو گئے ، چند دنوں بعد جودھ سنگھ پیدا ہوا ۔ سید صاحب کے بعد سنت سنگھ پر اداسی چھا گئی ۔ اب وہ زیادہ تر سید صاحب کی لحد کے پائینتی بیٹھ کر وقت گذارتا ۔ وہ اپنے دل کو چک سیداں میں چھوڑ کر شہر کیسے چلا جاتا ۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ یہیں جیے اور مرے گا ۔ سنت سنگھ بہر حال سکھ تھا ، مگر اسے اہل بیت کرام سے خصوصی عقیدت تھی ۔

محرم کے دنوں میں عشرہ بھر شربت کی سبیل لگاتا، اور ننگے سر ننگے پاؤں خود وہاں کھڑا ہوتا، پیالے بھر بھر کر بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں کو پلاتا۔ سید صاحب کو گذرے دس برس ہو چکے تھے، لیکن اس کا معمول جیسا ان کی زندگی میں تھا اب بھی اسی طرح جاری تھا۔ ان دنوں امرت گیارہ برس کی اور جودھا دس برس کا ہو گیا تھا۔ محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ اس کی سبیل پر پورا گاؤں امنڈ آیا تھا۔ امرت اور جودھا اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ سرجیت کور تازا تازا شربت بنا کر لاتی اور ٹب میں انڈیلتی چلی جاتی۔ اتنے میں پیرٹ کے عمروں کی ایک ٹولی نگر نگر گھومتی اس گاؤں میں آ پہنچی۔ عمروں کے خاندان بڑی درد بھری لے میں نوحے پڑھنے۔ پہلے ان لوگوں نے خوب جی بھر کر شربت پیا پھر نوحے سنانے لگے ؎

نواسہ یوں پیمبر کا شہید کرنا ہوگا

پہلے ہی مصرعے پر سنت سنگھ کو کیفیت ہو گئی، اور اس نے وارفتگی میں اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ایک اور نوحا شروع ہوا "اسیران کربلا کے دردناک مصایب" ان اشعار تک پہنچتے پہنچتے سنت سنگھ کی حالت غیر ہو گئی ؎

جب کاروان شہر مدینہ لٹا ہوا پہونچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسین کا آگے دھرا ہوا اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سر کھلا ہوا

کیفیت کا زور بڑھتا گیا اور اسی عالم میں سنت سنگھ لوٹ پوٹ ہوتا رہا۔ آخر چت لیٹ گیا، اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

امرت کور نے ایک ان ہونی بات دیکھ کر جودھے سے پوچھا "کیوں جودھے کیا بابو سو گیا ہے؟" جودھا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سرجیت کور تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور کہا، "اس کی بے خاب آنکھوں نے کتنی راتوں کو سحر میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے، افسوس اسے نیند آ لی تھی، افسوس اسے سو جانا تھا۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ جہلم اور کیمبل پور میں اس کے رشتے داروں کو اطلاع ہو گئی تھی، پانچ بجے تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ٹھیک سے ان میں اس روز کسی گھر کے اندر چولہا نہیں سلگا۔ سب لوگ اس کے مکان کے باہر جمع تھے۔ بڑے بوڑھے ایک دوسرے کو دیکھتے اور سرگوشی کے انداز میں کہتے۔۔ "ہم ستہ آ مہ سکھ ہو دیکھا نکلا جینے چپکے چپکے سفر طے کیا اور اپنی منزل کو پا لیا۔۔۔"

داود اور نوزا دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ نوزے نے کہا "مجھے یاد ہے سید صاحب نے ایک روز سنت سنگھ سے کہا کہ "شاخ کے ساتھ لٹکے رہنے سے کچھ حاصل نہیں، مزا جب ہے کہ پھل اترے تو رنگ، بو، اور ذائقہ لیکر اترے۔" قریب شام مرگھٹ کی طرف ایک خاموش ہجوم رواں تھا، اس کے عزیزوں نے اس کی لاش چتا پر رکھ آنچ دکھا دی" شعلے بلند ہوئے، اس کے سینے میں بھی عمر بھر کی چنگاریاں سلگتی رہی تھیں۔ الفت و محبت کی تابناک آنچ نے مدتوں پہلے ہی اسے بھسم کر رکھا تھا۔

العشق نار یحرق ما سوای اللہ (عشق وہ آگ ہے جو اللہ کے سوا ہر شئے کو بھسم کر دیتی ہے)

کریاکرم کے بعد اس کے بعض قریبی رشتے دار گاؤں میں ٹھہرے انہوں نے بہتیرا زور مارا، مگر سرجیت کور کو گاؤں میں رہنے پر اصرار تھا، کیوں کہ اس کے بچے گاؤں کی فضا سے مانوس تھے اور گاؤں کے تمام مرد و زن اسے اپنی بہن سمجھتے تھے۔

پانچ برس اور گذر گئے۔ وقت کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے منتشر اجزا کو ایسا مضبوط جوڑ دیتا ہے کہ کوئی دراڑ باقی نہیں رہنے دیتا، سنت سنگھ بہت دور نکل گیا تھا۔ اب شاید ہی اس کی یاد کسی کو آتی ہو گی۔ امرت کور عمر کی اس حد تک پہنچی جہاں ہتھیلی کے چھالے کی طرح لڑکیوں کی حفاظت کی جاتی ہے، مگر دیہاتوں کی سادا فضا آلودگی سے پاک صاف ہوتی ہے، اور یہ قصہ تو اس زمانے کا ہے، جب کہ گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچانے والی لپٹن کی چائے، دیہاتوں میں نہیں پہنچ پائی تھی۔ شہروں کی ہفت رنگ ثقافت جو سینما سے شروع ہوئی اور ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی اب اونچے ہوٹلوں تک آ پہنچی ہے، جہاں شب عشرت منائی جاتی ہے، دور ارسطو و رنگ کی محفلیں برپا ہوتی ہیں، ان دنوں دیہات تو کیا شہر بھی اس لعنت سے بڑی حد تک پاک تھے۔ امرت کور کی عادتیں ستھری ہوئی تھیں، اس کی آنکھوں میں معصومیت کی وہ جھلک تھی جس کی روشنی سنت سنگھ کی گیان دھیان میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کے اندر موجود تھی وہ ان خیالات کا حسین عکس تھی جس کا پرتو سید صاحب نے سنت سنگھ کے دل میں اتار دیا تھا۔ ایک روز وہ اپنے بھائی جودھے کو بلانے نکلی جو گھاٹ پر نہانے گیا ہوا تھا، رستے میں پرانے برگد تلے گاؤں کے نمبردار کا بیٹا دلدار

تھا، وہ اٹھارا بیس برس کا تنومند نوجوان تھا، اس نے امرت کور کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا وہ بھی اسے دیکھتی ہوئی گذر گئی - چند قدم آگے جاکر اس نے مڑ کر دیکھا، وہ برابر اس کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑا تھا، وہ جب جودھے کے ساتھ واپس آئی تو اسے وہیں کھڑا پایا، مگر اس مرتبہ بھائی کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی گذر گئی - اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا، مگر عشق و ہوس میں نگاہ ہی کا فرق تو ہے، نینوں کا تیر کمان سے نکل کر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا تھا - کچھ دنوں میں خاموش نگاہوں کا اتفاقی تصادم ایک لگن میں تبدیل ہو گیا ہے

بھاگ نہ پیچھے لاجسم   نے عشق نہ پیچھے ذات

ایک روز انہوں نے ایک دوسرے سے دو چار باتیں بھی کیں مگر لڑکی معصوم تھی - لڑکا بدمعاش تھا - ایک شام وہ نرائن داس کی دکان سے لالٹین میں تیل ڈلوانے گئی رستے میں دلدار نے اسے روک کر ہات پکڑ لیا - امرت نے اس کا ہات جھٹک کر کہا - دلدار اپنی حد سے نہ بڑھ انسان بن - مگر دلدار تو محبت کی تکمیل چاہتا تھا - ع

تکمیل محبت جسے کہتے ہیں ہوس ہے -

دلدار نے اس کی معصوم فطرت سے کھیلنے کی کوشش جاری رکھی اور اس کے کمر تک لٹکتے ہوئے بالوں کو اپنے شوق کے ہاتوں میں تھام کر رال ٹپکاتے ہوئے کہا "امرت! تیری زلفوں کے بال نہیں ریشمی جال ہیں اور میں ان کا زنجیری ہوں - "

امرت نے بال اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے "ہٹ پرے - اگر تو سچ کہتا ہے کہ میری زلفوں کا زنجیری ہے، تو میں ان بالوں کو کاٹ کر اگر تیرے حوالے کر دوں تو کیا تجھے قرار آجائے گا، اور میرے خیال سے فارغ ہو جائے گا - دلدار کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا - چند دن اور گذر گئے -

عاشقی صبر طلب ہے اور تمنا کی بے تابی کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی، دلدار ہوس کے اقتضا پر پاپڑ بیلتا اور من ہی ناپاک لڈو گھوتا رہا -

آخر ایک اندوہناک صبح طلوع ہوئی - پو پھٹنے کے وقت کھیت کی طرف جا رہی تھی، آج اس کی ماں کسی وجہ سے اس کے ساتھ نہ جا سکی - دلدار کئی دنوں سے ٹوہ میں تھا، وہ مینڈ پر سے گذرتی ہوئی آگے بڑھی ہی تھی کہ آہنی گرفت میں آگئی - اس کا دل دھڑکنے لگا، وہ آن واحد میں سمجھ گئی کیا ہونے والا ہے، اور جبر و قدر مل کر کیا گل کھلانے والے ہیں، اس کی بے بسی نے بڑی عاجزی کے ساتھ دہائی دی، "تجھے دہائی ہے!"

لیکن - لیکن - فضا میں دور دور تک امرت کی درد انگیز چیخوں کا شور بلند ہوا، عرش اعظم ہل گیا ہوگا - مگر یہ پاپی ذرا اپنی جگہ پر ہی قائم تھی، کیونکہ ابھی کوئی خاص قیامت بپا نہیں تھی - وہ معصوم لڑکی گھر سے چپ چاپ نکلی تھی، واپس آئی تو اس کی آنکھوں میں ساون کی جھڑی لگی تھی -

سرجیت کور گھر سے نکل کر سیدی سید صاحب کے مزار پر آئی اور چوکھٹ تھام کر پکاری -

"شاہ جیو! یہ کیا اندھیر ہے، تمہاری نگری میں ایک پردیسن کی دنیا الٹ گئی -

پھر وہ اشکبار آنکھوں کے ساتھ نمبردار کے گھر گئی، وہ حویلی کے باہر کھاٹ بچھائے حقے کی نے منہ میں دبائے بیٹھا تھا - سرجیت کور دھڑام سے اس کے پاؤں پر گری اور کہا "بھا جی! یہ دیکھو دلدار نے کیا کرتوت کی -"

نمبردار نے چند تانئے پہلے دلدار کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا - چارپائی سے اٹھا - بڑے اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا اندر گیا، اور اسے بالوں سے گھسیٹ کر باہر لایا اور فرش زمین پر لٹا کر پسلیوں کے دائیں بائیں اور چھاتی کے اوپر اتنے گھونسے اور لاتیں ماریں کہ دلدار نے دم توڑ دیا - گاؤں بھر میں کہرام مچ گیا، نمبردار کے نسبتی بھائی آئے اور بہنوئی سے پوچھا -

"ایک کافر لڑکی کے پیچھے سوہنے گبرو بیٹے کا خون کیوں کیا؟"

"نمبردار بولا" کافر اور مومن سب خالق کی مخلوق ہیں، سنت سنگھ ہمارے گاؤں کی زینت اور ہمارا مہمان تھا، اس کی اولاد ہماری امانت ہے - میں نے زانی بیٹے کو شرعی حکم سے زیادہ سزا تو نہیں دی ہے"

عصر کے وقت جنازہ اٹھا - باپ نے خود قبر میں اتارا،

اور کفن سرکا کر بیٹے کی پیشانی پر آخری بوسا دیا، کچھ بھی تھا آخر بیٹا تو تھا۔ رات آ گئی۔ گاؤں میں ہر طرف تاریکی اور ہیبت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب سہمے دبکے پڑے تھے۔ امرت کور جہاں اضطراب کو دل میں دبائے کبھی صحن میں ٹہلتی کبھی دالان سے گذر کر ایک کمرے میں جھانکتی کبھی دوسرے میں پھر تیزی سے زینے پر چڑھتی اور کھلی چھت پر سے آسمان کے ستاروں کو دیکھتی۔ ستارے تھے کہ بجھے بجھے سے انگارے جن کی راکھ کہکشاں کی گذرگاہ پر بکھر گئی تھی۔ وہ دوہرے رنج میں مبتلا تھی۔ دلدار نے جو کیا اس کی سزا پا گیا، مگر تھا تو وہ اس کے مرحوم بوڑھے بھائی کا بیٹا، لیکن پھر خیال آتا کہ اس کی بیٹی امرت کور کی عصمت، میزان کے پلڑے میں دلدار کی ابھرتی جوانی سے کچھ زیادا ہی وزنی ہے۔ ہائے یہ کیا ہوا۔ وہ دل پر ہات رکھ کر سرد آہ بھرتی۔ خیال کی رو پھر چل نکلتی۔ اسے نمبردار کا پھر خیال آ جاتا جسکے بڑھاپے کا واحد آسرا خدا اس کے ہاتوں مارا گیا۔ اب وہ اسے کہاں ڈھونڈے گا، اور اگر ڈھونڈے تو بھی تو کہاں پائے گا۔ پھر خیال آتا، مگر میں بھی تو امرت کور کی متاع عصمت کو تلاش کر رہی ہوں، دفعتاً اس کے دل سے ایک ماتمی لے درد میں نہا کر ابھری اور ہونٹوں پر چھا گئی، آج گاؤں میں کسی جشن اور رت جگے کا سر و سامان نہیں۔ آج وہ گھنگرو باندھ کر کہیں رقص نہیں کر رہی ہے۔ آج کہیں ڈھولک کے گیت سنائی نہیں دیتے۔ آج اس کے ہیجے کا سارا ترنم اندوہ بے کراں کی دل دہلا دینے والی چیخوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

اگر کوئی اور سننے والا یہاں موجود نہیں تو ستارو تم ہی سنو ؎

نہیں بیجھنے لعل گرا ہے   آرسی نہ بھیر دل، دو گیا

یہ شعر نہ جانے کتنی بار اس نے دہرایا اور پھر روتی ہوئی چھت سے اتر آئی، مگر غم عرش پر ہو فرش پر غم ہی رہتا ہے۔ دل ویراں میں اگر بہار آنا بھی چاہے تو آ نہیں سکتی۔

اگلے روز سر جیت کور دونوں بچوں کو لے کر جہلم چلی گئی، تین برس اور گزر گئے۔

اس درمیان امرت کور کی شادی ہوئی، اب ایک بچا بھی اس کی گود میں تھا۔

[illegible] ادا اس ہے، مجھے ذرا چک سیدان لے چلو، میرا بچپن وہیں گذرا، میری جوانی کا آغاز بھی وہیں ہوا" اور پھر وہ کچھ سوچ کر چپ ہو گئی۔

اس کا شوہر پڑھا لکھا نوجوان اور کسی دفتر میں افسر تھا، امرت کور تو اس کی جان تھی، اس کی زلفوں کے ریشمی بال ملتے ہوئے اس نے کہا۔

"امرت! اتنی عاجزی سے کیوں التجا کرتی ہو کہ مجھے چک سیدان لے چلو۔ وہاں تمہارے بچپن کی سہیلیاں ہوں گی، انہیں سے ملنے کو جی چاہتا ہے تو جس روز بھی تم کہو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

اگلے روز گاؤں کے باہر ایک تانگے سے وہ اترے بچا باپ کی گود میں تھا، امرت آگے آگے جا رہی تھی، اس کے شوہر کی سمجھ میں نہیں آیا وہ آبادی کے بجائے قبرستان کی سمت کیوں تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جاتی ہے۔ ایک قبر کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس نے اپنے ململ کے دوپٹے سے آنسوؤں کو پونچھا، پھر کچھ دیر یونہی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی، اور دوپٹے سے آنکھیں خشک کرنے کی ناکام کوشش میں لگی رہی، پھر اس نے شوہر کی کمر سے لٹکی ہوئی چھوٹی سی کرپان اتاری، اور اپنی زلف سر تا کمر سے بالشت بھر بال کاٹ کر، قبر کا اس دعا تاک سے پاک کر کے اس ریشمی لچھے کو قبر کی پائنتی رکھ دیا۔

پھر اپنے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے دوپٹے کو سر سے اتار کر قبر پر ڈال دیا، اور اپنے شوہر سے کہا۔

"آؤ چلیں۔"

اے آب رود جہلم! تیرے کنارے آج پھر تین آئے اور آ کر چلے گئے۔!

رباعی   مسترنکودری

ہر شاخ گناہ پھولتی پھلتی ہے
نیکی کف افسوس کھڑی ملتی ہے
اس نام کے رام راج میں اے مسترؔ
مظلوم کی گردن پہ چھری چلتی ہے

بڑے آدمیوں کے خطوط ایڈیٹر ہندستانی ادب کے نام

نواب مہدی نواز جنگ بہادر مرحوم

سابق

ناظم امداد باہمی حکومت مرحوم حیدراباد - معتمد یا ب حکومت سکریٹری

ایگزیکیٹو کونسل گورنمنٹ آف حیدراباد - ناظم یا کمشنر بلدیہ حکومت حیدراباد

چیرمن فوڈ کارپوریشن آف حیدراباد - معتمد یا سکریٹری صنعت وحرفت

حیدراباد - ایجنٹ برار حکومت حیدراباد، مقیم ناگپور - ام - ال - اے (بنجارہ ہلز

کانسٹی ٹیونسی سنہ ۱۹۵۲ء) اور وزیر یا منسٹر لیبر اور سوشل ویلفیر وغیرہ حکومت جدید

حیدراباد - گورنر گجرات سنہ ۱۹۶۰ء تا سنہ ۱۹۶۶ء

اعزازی خدمات

چیرمن حاکا HAKA حیدراباد - چیرمن نظامس) پرائیویٹ ٹرسٹ

چیرمن سالار جنگ اسٹیٹ ٹرسٹ - چیرمن سوشل ویلفیر کمیٹی -

(نواب صاحب مرحوم حیدرآباد میں اور بھی کئی ایک کمیٹیوں اور ٹرسٹس کے چیرمن اور پرسیڈنٹ رہے ہیں جن کے نام ہمیں اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں)

نواب مہدی نواز جنگ بہادر مرحوم کے والد مہاراجا سرکشن پرشاد بہادر، پیشکار سلطنت حیدرآباد اور صدر اعظم حکومت حیدرآباد کے استاد تھے، اور انہیں عربی اور فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مہاراجا کی دیوڑی سے کھلی گلی روز انا آیا کرتی تھی، اور یہ اسی گلی میں جایا آیا کرتے تھے۔ ان کا مکان دارالشفا میں تھا، اس لیے ان کی گلی یہاں سے نیاپل ہوتی ہوئی مہاراجا کی دیوڑی جایا کرتی تھی، اس لیے خد ہم نے بھی ان کے والد کو کئی بار دیکھا ہے۔ باتوں باتوں میں ایک بار مہدی نواز جنگ نے ہم سے کہا تھا کہ ان کے والد عربی فارسی کے عالم فاضل اور نہایت ہی قابل آدمی تھے، اسی بنا پر مہاراجا بہادر دل سے ان کی قدر کرتے تھے، اور بحیثیت شاگرد ان سے بہت کچھ علمی استفادا کیا تھا۔ مہاراجا کے اسٹیٹ سے مہدی نواز جنگ کے والد کو تقریباً چارسو روپے ماہوار تنخواہ مقرر تھی۔ انہیں استاد شاگرد کے قریبی تعلقات کے سبب مہاراجا بہادر اپنے استاد کے دونوں لڑکوں کی قابلیت اور صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ مہدی نواز جنگ کے بڑے بھائی تراب علی ناظم تپا یا ڈائیرکٹر پوسٹس تھے، اور مہدی نواز جنگ

ناظم امداد باہمی تھے۔ باپ کے تعلقات کے سبب مہدی نواز جنگ کو مہاراجا سے ملنے کا کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وجہ سے مہاراجا بہادر مہدی نواز جنگ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، اور یہی وجہ تھی کہ جب مہاراجا بہادر صدر اعظم باب حکومت یا پرائم منسٹر حکومت حیدرآباد بنے تو انہوں نے مہدی نواز جنگ کو اپنا معتمد یا سکریٹری مقرر کیا۔ مہاراجا بہادر نہایت ہی لائق فائق اور علمی ادبی آدمی نیز شاعر بھی تھے اسی لیے ان کو اپنی خدمت صدارت عظمیٰ سے کوئی دل چسپی نہ تھی، وہ بحیثیت ایک امیر کبیر اور جاگیردار ٹھاٹ کی اور عیش پرستانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے، اس وجہ سے صدارت عظمیٰ کا تمام کام بحسن وخوبی مہدی نواز جنگ انجام دیا کرتے تھے، اور مہاراجا بہادر امور سلطنت سے تقریباً بے نیاز تھے۔ اس وقت کا حیدرآباد یہ بہتر طریقے پر جانتا تھا کہ دوسرے معنی میں مہدی نواز جنگ نے صدارت عظمیٰ کی۔ مہاراجا بہادر اپنے معتمد کو مہدی کے نام سے پکارتے تھے اور مہدی نواز جنگ مہاراجا کو سرکار سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ضرورت پیش آتی تو مہاراجا بہادر اپنے مصاحب سے کہتے مہدی کو بلاؤ، اس حکم کی تعمیل میں مہدی نواز جنگ جاتے اور کہتے کہ سرکار نے یاد فرمایا ہے، اس کے بعد مہاراجا جو بھی کہتے اس حکم کی تعمیل کر دیتے تھے۔ مہاراجا بہادر کی کابینا میں کئی ایک صدرالمہام یا منسٹر س تھے، جن میں سر اکبر حیدری صدرالمہام یا منسٹر فینانس تھے۔ یہ شخص مانا ہوا فینانس کا ماہر تھا، اور ساتھ ہی ساتھ قابل اور ذہین آدمی بھی تھا۔ اس نے حضور نظام عثمان علی خان کے پاس بہت زیادہ رسوخ حاصل کر لیا تھا، اور عثمان علی خان سر اکبر کی ہر بات کو بغور سنتے اور اس کی منظوری بھی دیا کرتے تھے۔ نہ معلوم کس بنا پر مہدی نواز جنگ سر اکبر کی ہر تحریک کو بحکم صدر اعظم مخالفت کے ساتھ لوٹا دیا کرتے تھے۔ سر اکبر مہدی نواز جنگ

کی ان تحریکوں سے تنگ آگئے تھے۔ سراکبر اور رزیڈنٹ حیدراباد کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، چنانچہ اس رزیڈنٹ نے حضور عثمان علی خاں کے کان بھر دیے کہ مہاراجا کشن پرشاد امور سلطنت سے بلکل ہی غافل ہیں، اور اپنے معتمد یا سکریٹری کے اشاروں پر ناچتے ہیں، اور چونکہ وہ زیادا معمر بھی ہیں، اس لیے باب حکومت کے سینئر صدرالمہام یا منسٹر سراکبر کو صدر اعظم حکومت حیدراباد بنایا جائے، چنانچہ حضور والا نے اس سلسلے میں ایک فرمان جاری کردیا، اور سراکبر صدر اعظم حیدراباد بنے۔ سراکبر کے صدر اعظم بنتے ہی مہدی نواز جنگ رخصت لے کر گھر بیٹھ گئے۔ سراکبر نے اپنے کئی ماتحتین کے ذریعے مہدی نواز جنگ کو بلوایا کہ وہ خدمت پر رجوع ہوجائیں، مگر مہدی نواز جنگ نے صاف انکار کردیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر میں سراکبر کے معتمد کی حیثیت سے کام کرونگا تو سراکبر لازمی طور پر میری مخالفتوں کا بری طرح سے بدلا لینگے، اور نہ معلوم کس کس طرح سے مجکو حیران اور پریشان کریں بہرحال مہدی نواز جنگ اپنے فیصلے میں اٹل رہے اور سراکبر نے ایک دوسرے شخص کو اپنا معتمد یا سکریٹری بنایا جس وقت مہدی نواز جنگ نے رخصت لی تھی، اس وقت زین یار جنگ بہادر ناظم یا کمشنر بلدیا تھے زین یار جنگ اور مہدی نواز جنگ کے گہرے قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ زین یار جنگ حضور عثمان علی خاں کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے حضور سے عرض کی کہ سرکار مہدی نواز جنگ سے میں شخصی طور پر واقف ہوں۔ یہ نہایت ہی قابل شخص ہیں۔ مہاراجا بہادر کے صدارت عظمٰی سے ہٹتے ہی رخصت لے کر بیٹھ گئے ہیں، اس لیے حضور والا سے میری عرض ہے کہ اس خادم کو چیف آرکیٹکٹ حکومت حیدراباد کے عہدے پر ترقی دے کر مہدی نواز جنگ "ناظم یا کمشنر بلدیا بنا دیا جائے تو ہم دونوں خادمان قدیم حضور والا کے لیے ہمیشاہی دست بدعا رہیں گے، چنانچے عثمان علی خاں نے اس قسم کا فرمان جاری کیا، اور زین یار جنگ چیف آرکیٹکٹ بنے اور

مہدی نواز جنگ ناظم یا کمشنر بلدیہ بنائے گئے۔

یہ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے۔ اسی سنہ میں ہم نے بلدیہ یا میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد کا انتخاب لڑا تھا، اور حلقۂ اول بیرون کے نمائندے کی حیثیت سے پہلی بار بلدیہ میں آئے تھے۔ اس وقت کے کارپوریشن میں صرف ۳۶ ارکان یا ممبر تھے، ۱۳ منتخب اور ۲۳ نامزد ارکان ہوا کرتے تھے۔ جس وقت ہم منتخب ہو کر بلدیہ میں گئے تھے، اس وقت تک ابھی زین یار جنگ بحیثیت ناظم بلدیہ موجود تھے، چنانچہ پہلا سابقہ ہمیں زین یار جنگ ہی سے پڑا تھا۔ زین یار جنگ کا اور ہمارے ساتھ صرف ۶ مہینے تک رہا۔ اس کے بعد جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے مہدی نواز جنگ بحیثیت ناظم بلدیہ آئے تھے تو ان سے ہمارا تعلق ہو گیا۔ زین یار جنگ نے مہدی نواز جنگ کو جس روز جائزہ دیا تھا، تو مہدی نواز جنگ نئے ناظم سے ہم ۳۶ ارکان کا تعارف فرداً فرداً کرایا تھا، چنانچہ اس روز ہمارا جو تعارف ہوا، اور ہمارے ان کے شخصی تعلقات جو قایم ہوئے وہ مرتے دم تک قایم رہے، مرنے سے ایک مہینا پہلے آخری بار وہ ہمارے سابقہ مکان، ۹۹-اے، اعظم پورا شرقی۔ حیدرآباد ۳۶ پر اپنے بھانجے نواب سعادت علی خان جاگیردار اور وظیفہ یاب ناظم جنگلات کو اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ اس روز تین ٹوکروں میں ہمارے لیے مختلف تحفے تحایف لیتے آئے تھے۔ ہم نے ہات جوڑ کر عرض کیا کہ نواب صاحب آج تو بڑی زیادتی کی آپ نے ہمارے حق میں۔ آپ بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ اس مکان میں ہم تنہا رہتے ہیں، اس لیے ایک اکیلا آدمی اتنے زیادہ تحایف کو لے کر کیا کرے گا۔ ہمارے یہ کہتے ہی مسکراتے ہوئے فرمایا کہ دوسری خشک چیزیں تو دیر تک رہ سکتی ہیں، ہاں میوا بھی آپ چار چھ روز تک بلا تکلف استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کے یہ کہتے ہی ان کے

بھانجے نے کہا، رہنے بھی دو خانصاحب، آپ خوش قسمت ہیں کہ ماموں جان آپ کے لیے بذات خود تحفے تحایف لے کر آیا کرتے ہیں، کسی دوسرے کے گھر آج تک بھی ایک تحفا لے کر نہیں گئے ہیں۔ یہ سن کر ہم نے کہا کہ نواب صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مہدی نواز جنگ بہادر کی یہ عنایات بے کراں صرف آج ہی ہمارے حال پر نہیں ہوئی ہیں، بلکہ ہر وقت وقفے وقفے سے ایسے نعایم بے کراں سے ہمیں نوازا جاتا ہے، جس کے لیے ہمارا رواں رواں ان کا ممنون احسان ہے، اور تادم زیست رہے گا۔ اپنے بھانجے کو وہ میاں کہہ کر پکارتے تھے، چنانچہ اس وقت کہا، میاں، خانصاحب ہم سے خفا ہیں، ہمارے گھر نہیں آتے ہیں۔ میں نے بار ہا ان سے کہا کہ میرے گھر آ کر رہ جایئے، وہاں کی آب و ہوا ٹھیک ہے، اس لیے آپ کی صحت ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ سن کر ہم نے بات جوڑتے ہوے کہا، نہیں نواب صاحب محترم! ہم اور آپ سے خفا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے، بلکہ رسالے کا کام ہر وقت آڑے آتا ہے، کہاں بنجارا ہلز کہاں اور کہاں شہر حیدرآباد۔ کاتب یہاں، پریس یہاں، جلد ساز یہاں اور پوسٹ آفس یہاں۔ کام کے سب مراحل ہمیں یہیں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ہم آپ پاس آئیں تو دن بھر یہاں رہنا ہوگا، اور رات میں صرف سونے کے لیے بنجارا ہلز آئینگے، اس لیے ہمارے وہاں آ کر نہ رہنے کی اصل وجہ یہی ہے۔ یہ سن کر ہم سے کہا کہ اچھا خانصاحب! اگر آپ ہمارے ہاں نہیں آتے ہیں تو نہ آئیں، مگر میاں کے ہاں ضرور جایئے، ان کا مکان آپ کے مکان سے بہت قریب ہے، پولیس کے دواخانے کے مقابل ملک پیٹ میں ہے، مکان کا نام "نگینا" ہے۔ ہم نے کہا نواب صاحب محترم ہم خوشی سے جاینگے اور آپ سے وعدا کرتے ہیں کہ آپ کے گھر بھی ضرور بضرور آئینگے۔

نہ معلوم اس روز کس موڈ میں تھے، ہم سے دریافت کیا، خانصاحب آپ کی عمر کیا ہے؟ ہم نے کہا کہ ۶۳ ویں سال میں ہیں ہم۔ انہوں نے کہا خانصاحب میں ۷۳ میں ہوں، آپ سے دس سال بڑا ہوں،

اور بھانجے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا' دیکھیے میاں' میں خانصاحب سے دس سال بڑا ہوں' مگر میری صحت کتنی اچھی ہے - ہم نے ہات جوڑ کر جواباً عرض کیا' عالیجناب نواب صاحب محترم' آپ صد ہا سال جئیں' اور اس سے بھی زیادہ طویل عمر ہو آپ کی' ہمارے جینے سے کیا حاصل ہے' ہم بے کار محض اور کندۂ ناتراش ہیں - انہوں نے کہا کیوں ؟ ہم نے عرض کیا کہ یہی تحفے تحایف جو ہمارے سامنے رکھے ہوئے ہیں' اس سے ہم جیسے غریبوں کی پرورش ہوتی ہے - ہم نے کہا کہ یہ نوازش بے کراں صرف ہمارے حال پر نہیں ہے' ہم بہتر طریقے سے جانتے ہیں کہ آپ دوسرے حاجتمندوں اور مستحقوں کو بھی بلکل اسی طرح سے اپنے نعایم اور تحفے تحایف سے سرفراز فرمایا کرتے ہیں - بہرحال تقریباً ایک گھنٹا بعد وہ ہم سے رخصت ہوئے' اور افسوس کا مقام ہے کہ اس کے بعد ہم نہ ان کے گھر جا سکے اور نہ ان کے بھانجے کے گھر ہی گئے -

تقریباً ایک ہفتہ بعد صبح سویرے ہم رسالے کے کام میں مصروف تھے کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی' ہم نے دروازہ کھولا تو سامنے راجا صاحب' مددگار فینانس کھڑے تھے' ہم نے کہا آیے راجا صاحب' باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آیے' آپ ہم مل کر باتیں کرینگے - اس کے جواب میں انہوں نے کہا' نہیں' آپ نے کوئی خبر سنی ہے' ہم نے کہا راجا صاحب ابھی تو صبح ہوئی' ہم باہر کب گئے جو خبر سنتے' رسالے کے کام میں مصروف رہے ہیں ہم - یہ سن کر انہوں نے کہا' مہدی نواز جنگ کا انتقال ہو گیا - یہ سنتے ہی ہم نے سختی کے ساتھ نفی کر دی' نہیں نہیں راجا صاحب' مہدی نواز جنگ نہیں مر سکتے' آج سے ایک ہفتہ پہلے وہ ہمارے گھر آئے تھے' اور اس صوفے پر بیٹھے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ خانصاحب میں آپ سے دس سال بڑا ہوں' اور میری صحت کتنی اچھی ہے' اور ہم نے کہا تھا کہ نواب صاحب آپ صد ہا سال جئیں' اس واقعے کو ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے' راجا صاحب ...

تو صد وسی سال تک جئینگے ! یہ سن کر انہوں نے کہا، نہیں خانصاحب، مہدی نواز جنگ کا حقیقت میں انتقال ہوگیا ہے، روز نامہ اخبار "سیاست" میں "چھپتے چھپتے" میں یہ خبر لکھی ہے کہ رات کے بارہ بجے نواب صاحب پر دل کا سخت حملہ ہوا تھا، دوسرے حملے کے بعد وہ جانبر نہ ہوسکے اور ان کا انتقال ہوگیا۔ ہم نے کہا راجا صاحب، براہ کرم آپ ٹیلیفون پر یہ معلوم کیجیے کہ میت کہاں لائی جائے گی، اور کس وقت، چنانچہ راجا صاحب گئے اور فون پر معلوم کرکے آکر کہا کہ ۱۲ بجے دارالشفا میں لائی جائے گی، اس کے بعد میر مومن صاحب کے دائرے جائے گی، چنانچہ ہم اور راجا صاحب دارالشفا گئے، میت کچھ دیر بعد آئی تھوڑی دیر بعد جلوس جنازہ میر مومن صاحب کے دائرے کی طرف روانہ ہوا، اور ہم دونوں میر مومن صاحب کے دائرے تک گئے، جہاں پر نواب صاحب کو دفنایا گیا۔ مرحوم کے منجھلے بیٹے ہاشم مہدی وہاں موجود تھے، وہ ہم سے گلے لپٹ گئے اور روتے ہوے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کے ان کے کتنے گہرے تعلقات تھے۔ عمر میں پہلی بار ہم نے بھی اپنے محسن اعظم کے لیے آنسو بہاے اور کچھ دیر تک انہیں یاد کرکے روتے رہے۔ یہ ہاشم مہدی وہی ہیں جن کا ذکر نواب صاحب نے نیچے کے دو خطوں میں کیا ہے۔ ایک خط میں یوں ذکر کیا ہے کہ ہاشم کو آپ اپنے رسالے کا خریدار کیوں نہیں بناتے، اور دوسرے خط میں لکھا ہے کہ میں نے ہاشم سے کہدیا ہے کہ وہ اپنی کار سے کر روزانہ آپ پاس جایا کرے، اور آپ جہاں بھی جائیں آپ کو ساتھ لے جاے۔ پہلی شکل میں ہم نے نواب ہاشم مہدی کو رسالے کا خریدار اس لیے نہیں بنایا تھا کہ "ہندستانی ادب" پابندی کے ساتھ خود ان کے گھر ان کے والد محترم کے نام جایا کرتا ہے، اس لیے وہ لازمی طور پر رسالے کا مطالعہ کرتے ہونگے، ایسی صورت میں آٹھ روپے چندہ لینا ہمارے اصول کے خلاف تھا، اور ہم نے انھیں رسالے کا خریدار نہیں بنایا۔ دوسرے خط میں ہاشم مہدی کا دوبارہ ذکر

آیا ہے کہ میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ اپنی کار لے کر روزانہ آپ پاس جایا کرے، اور آپ جہاں بھی جائیں آپ کو ساتھ لے جایا کرے۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں نواب ہاشم مہدی اپنی کار لے کر آئے اور باپ کا یہ پیام ہم تک پہنچایا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ابا نے اپنی ایک دوسری کار بھی بھجوائی ہے، یہ کار بھی آپ پاس روزانہ آیا کرے گی آپ اس کار سے جو بھی کام لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ ان دونوں کاروں کی ضرورت کیوں تھی اس کی تفصیل بھی سن لیجیے۔ ہم نے ۱۹۲۹ء میں "جشن سال نو" کی بنا ڈالی تھی۔ یہ جشن ہر سال پہلی آذر کو منایا جاتا تھا۔ پہلی آذر حکومت حیدرآباد کے سنہ مالیہ کی پہلی تاریخ تھی، مگر اس روز نہ تعطیل ہی تھی، اور نہ اس کی کوئی سرکاری یا غیر سرکاری اہمیت ہی تھی۔ ہم نے آذر سے ایک مہینہ پہلے پہلی آبان کو سابق کتب خانۂ آصفیہ کی خالی عمارت میں (موجودہ جی۔ پی۔ او G.P.O. عابد روڈ۔ حیدرآباد) شہر کے ایک سو سے زیادہ افراد کو ہماری تحریک پر غور کرنے کے لیے بلایا تھا۔ تقریباً سب ہی حضرات آئے تھے جن میں ناظم بلدیہ مہدی نواز جنگ بھی شریک تھے۔ مہدی نواز جنگ نے ہماری تحریک کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی اور اپنی شخصی حیثیت میں نیز بحیثیت ناظم بلدیہ ہر طرح سے جشن کو کامیاب بنانے اور دامے۔ درمے۔ سخنے، ہر طرح سے جشن کو کامیاب بنانے کا وعدہ کیا، اور وہ وعدہ پورا بھی کیا، اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ محض مہدی نواز جنگ بہادر مرحوم ہی کی وجہ سے "جشن سال نو" ہر طرح سے سو فیصد طریقے پر کامیاب رہا۔

مہدی نواز جنگ کے منجھلے صاحبزادے نواب ہاشم مہدی اس وقت نظام کالج میں بی۔ اے آخری کے طالب علم تھے۔ کالج کو غالباً سرمائی تعطیلات تھیں، اس لیے انہوں نے ہمارے ساتھ پھرنے میں پورا پورا تعاون عمل کیا، اور جشن کے کاروبار کے سلسلے میں ہم جہاں بھی جاتے وہ اپنی ذاتی آسٹن کار میں ہمیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اور ایک دوسری کار ہم نے دوسرے کام کرنے والوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ نواب مہدی نواز جنگ مرحوم اور اب ہاشم مہدی کے احسانات کی انتہا یہ تھی کہ پیٹرول بھی وہ اپنے پیسوں سے خرید اکرتے تھے۔ ان باپ بیٹے

کے احسانات آج تک بھی ہمارے دل پر نقش ہیں - بی - اے کامیاب کرنے کے بعد نواب ہاشم مہدی حیدرآباد اسٹیٹ بنک (موجودہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد) میں ایک طویل عرصے تک سکریٹری کی خدمت پر تھے - بعد میں جنرل منیجر سے اختلافات کی بنا پر ملازمت ترک کر دی تھی اور کاروبار شروع کیا - کاروبار بہتر طریقے پر چلتا رہا - ہم نے سنا ہے بشیر باغ روڈ پر شاندار "ہوٹل نگر جونا" انہیں کا ہے، جو کامیابی کے ساتھ چلایا جا رہا ہے - نواب ہاشم مہدی باپ کی طرح ملنسار، خوش اخلاق بھی ہیں - اب ہم نیچے نواب مہدی نواز جنگ بہادر کے وہ (۲۲) خط پیش کر رہے ہیں جو عرصۂ دراز سے ہمارے ہاں خزینے کی طرح محفوظ تھے - ان میں سے (۳) خط خود نواب صاحب کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ خط بحیثیت الحینب برار اور ۶ خط بحیثیت گورنر گجرات ٹائپ کیے ہوئے ہیں، جن کا ترجمہ ہندستانی میں خود ہم نے کیا ہے - ان میں سے ہر ایک خط سے اور انتہا یہ کہ ہر خط کے ہر ہر لفظ سے ہمارے متعلق خلوص اور محبت کے بے پناہ چشمے پھوٹ پڑتے ہیں، جن کے لیے ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نواب صاحب مرحوم کے احسان مند رہیں گے !

(۱) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۵ ر بہمن ۱۳۴۷ف - کرمی خاں صاحب — آپ نے جنوبلو اے ڈ ملیے سے متعلق جو شکایت روانہ فرمائی ہے اس کو دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ کی تحریر کا علم اہل معاملا کو ہوا، حالانکہ میں نے دفتر کو تاکید کی تھی، آپ کی تحریروں کو اس مثل میں جو اہل معاملا کے معائنے میں آ سکتی ہے علیحدہ کر لیا جائے - مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ انتظامی کمیٹی کی تحریریں اہل معاملا کی نظروں پڑیں گی تو بدمزگی اور انتظامی خرابی ہوگی - میں نے کا نتا صاحب کو بطور خاص دریافت کرنے کے لیے لکھا ہے - بعد وصول رپورٹ خاطی کے حق میں ضرور تدارک کیا جائے گا - خیر طلب - مہدی نواز جنگ

(۲) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۲۲ ر امرداد ۱۳۴۷ف - کرمی خاں صاحب زاد لطفکم - سلام علیکم -
آپ کا خط آج کے معائنے کی نسبت ابھی ملا - مولوی جی یم خان انجینئر سے آج معائنے کا تعین کیا گیا تھا آپ کو بھی دلچسپی نہیں اس لیے میں نے آپ پاس ٹیلیفون کے ذریعے یہ پیام بھجوایا تھا - میں معائنے کے لیے ... جلد ہیا کو لا رہا ہوں آپ دس بجے کے قریب گھر پر ہوں تو آپ کو بھی لے چلونگا - خط بھیجنے کا وقت نہ تھا، چار پانچ روز سے میں کچھ علیل تھا اور آج کا معائنہ بھی بجائے خود یقینی نہ تھا کل میں نے شام میں تصفیہ کیا کہ بہرحال معائنہ ہوگا اس لیے اطلاع قبل از قبل نہیں دی گئی - آپ جانتے کہ ٹیلیفون پر پیام پورے نہیں پہنچتے - آپ کو ٹیلیفون کے ذریعے پیام پورا پہنچنے سے زحمت ہوئی میں نے گھر پر یہ کیا تھا کہ امین صاحب کے ذریعے آپ کو پیام پہنچایا جائے - امین صاحب تمام معائنہ پر حاضر ہو لیا - مہدی نواز جنگ

(۳) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۶ ر آبان ۱۳۴۷ف - کرمی - مجھے آپ کے خط دیکھنے سے بڑا اطمینان ہوا کل شب مجھے بھی بعد حیرت ہوئی جبکہ صحیفہ میری نظر پڑی - صحیفے نے جس عجلت کے ساتھ شائع کیا ہے اس کو بے احتیاطی ہونا تصور کرتا ہوں - مجھے بھی ایک ذریعے آپ کی کسی تحریک کی اطلاع ملی تھی جس کا میں صداقت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں - اس تحریر کی حد تک مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یہ اشاعت آپ کے علم میں لائے بغیر نہیں ہوا ہے - اعتبار کی

[illegible]

اشاعت کی حد تک آپ تردید ہی کرادیں تو مناسب ہے کہ یہ خبر غلطی سے شائع ہوئی ہے۔ فقط ۔ مہدی

(۴) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۲۸ آبان ۱۳۴۷ف - سات بجے صبح - خدمت معتمد صاحب کمیٹی جشن سال نو (جی - ام - خان ایڈیٹر "ہندستانی ادب" ہی بانی اور معتمد جشن سال نو تھے) - جناب ناظم صاحب آرائش بلدیہ نے ٹیلیفون سے مجھے اطلاع دی ہے کہ والاشان شہزادہ اعظم جاہ بہادر نے آپ کی درخواست باغ عامہ کے نمائش پویلین کو استعمال کرنے کی منظور فرمائی ہے آپ اس پویلین کو استعمال کر سکتے ہیں - نوری ہیرمل صاحب کو آپ کا پتا نہ مل سکا تو یہ اطلاع پہنچانے کے لیے میرا ذریعہ اختیار کیا۔ فقط - مہدی نواز جنگ

(۵) بنجارا ہلز - حیدرآباد - آبان ۱۳۴۷ف - مکرمی جناب جی - ام - خان صاحب!
نواب حسن نواز جنگ بہادر نے جشن سال نو کے لیے بیس روپے چندا کا وعدا کیا ہے آپ کسی صاحب کو بھیج کر طلب کرلیں ۔ نواب صاحب کو کل آپ کے انکے پاس جانے کی اطلاع نہیں ہوئی فقط خیر طلب مہدی نواز جنگ

(۶) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۲۸ آبان ۱۳۴۷ف - مکرمی خان صاحب - آپ کے حسب خواہش دو موٹریں روانا کیا ہی ہیں (چھوٹی موٹر کو چلانے کے لیے اپنے لڑکے ہاشم کو بھیجا ہے۔ آپ اس موٹر کو استعمال کریں تو مناسب ہے کہ آپ کے جوش عمل کا اور محنت کا انکو اندازا ہو - ہاشم کو بیٹھے رہنے کا بہت شوق ہے اسلیے انکو آج یہ ڈیوٹی لگائی ہے - دوسری موٹر بھی روانا کیا ہوں اس کو بھی آپ آج کام میں لا سکتے ہیں - چھوٹی آسٹن آپ پاس روز انا آتی رہیگی - ڈرائیور کو تاکید کر دی ہے کہ وہ آپ ہی کے پاس جایا کرے - کل صبح سات بجے موٹر روانا ہوئی تھی لیکن سوا نو بجے ٹیلیفون آیا کہ موٹر نہیں پہنچی ہے - نہ معلوم کیا ماجرا پیش آیا - پٹرول وغیرا میں نے ڈلا دیا ہے اس کا بار آپ کی انجمن کو اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے - سال نو کی تقریب میں مجھے دلچسپی ہے اگر عامۃ الناس نے تحریک کو اختیار کیا تو یہ کامیابی اصول ہوگی - خدا ہمیں توفیق دے کہ گوشت اور ترکاری پلاؤ کی مہمل بحث میں مبتلا نہوں - بلند نظری اور عقل سلیم ہماری رہنما ہوں تمنا مخلص محمد مہدی

(۷) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۲ آذر ۱۳۴۸ف - مکرمی خان صاحب - آپ کی دعوت میں اس لیے نہ آسکا یہاں مجلس قایما میں شرکت ضروری تھی فقط - خیر طلب - مہدی

(۸) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۲۴ آبان ۱۳۴۸ف - مکرمی خان صاحب - آپ کا خط مورخہ ۲۱ آبان جھنڈیوں کی نسبت مہتمم کارخانجات عامہ کے نام معتمدی سیاسیات کا حکم حاصل کرکے محمد فاروق صاحب کے پاس بھیجدیا گیا ہے وہ انجنیر صاحب کے حوالے کردیں - انجنیر صاحب جھنڈیاں حاصل کرکے لگوادینگے۔ دسہرے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر جھنڈیاں لگانا مشکل ہوگا - باغ عامہ اور کتب خانۂ آصفیہ، دفتر بلدیہ اور چند مقامات پر جہاں آپ ضروری خیال کریں جھنڈیاں لگا سکتے ہیں - افضل گنج کا پل بھی موزوں مقام ہوگا - کوشش کرونگا کہ کچھ اور چندا جمع ہوجائے، لیکن عملاً میں کسی گھر پر جاتا نہیں ہوں - جو کوئی میرے پاس آئینگے ان سے ضرور کہونگا۔ ایک مشکل یہ ہے کہ زیادا تر بوجھ آپ ہی پر ڈالدیا گیا ہے، اگر سب ارکان کوشش کرکے تقسیم کرلیں تو دو دن میں ایک دو ہزار روپے امرا وغیرا سے جمع کرلینا بڑی بات نہیں ہے - غرض جو کچھ بھی آپ کر رہے ہیں، اس تقریب کی ابتدا کو چھوٹے پیمانے پر ضرور کامیاب بنائے گی فقط - خیر طلب - محمد مہدی

(۹) حیدرآباد ہاؤز ناگپور - ۲۷ جولائی ۱۹۴۸ء - کرم فرمائے بیکراں مصلح زبان ہندستانی جی - ام خان لطف زاد تسلیم - آپ کے دو کرم ناموں کا جواب میرے ذمے ہے - اس خط کا مقصد آپ کے محبت ناما مورخہ ۱۷ شہریور کا جواب ہے آپ کی اور ہاشم کی دوستی کی ابتدا نہایت دلچسپ ہے اور آپ نے اس کو خوب نبھایا - ہاشم بھی بہت خوش ہوتا جو آپ آسکتے مجبوری ہے آپ کا خط انکے پاس روانا کر رہا ہوں - آپ کو شاید معلوم ہو کہ شادی کے تیسرے دن ہاشم اپنی دلہن کے ساتھ یورپ چلے گئے ان شاء اللہ سوا سال کے بعد واپسی ہوگی - اصلاح زبان کی تحریک آج زیادا اہم ہوگئی ہے خصوصاً جیسے دلی ریڈیو نے نشریات کا سلسلا شروع ہوا - مجھے آپ کی اس تحریک کے سلسلے میں معلوم کمیٹی سے طلب کرنے کی تجویز ... اس عرصے میں وہ کمیٹی طلب نہیں کی گئی

اس کمیٹی کا انعقاد ممکن نہیں ہو ا آئیندا سفر میں کوشش کرونگا کہ ایک کمیٹی ہو ہی جائے۔ ناگپور چند روز
لیے ہو سکے تو آجائیے چ آرام مل جائے گا۔ میں نے اپنے لیے بہت کافی کام پیدا کر لیا ہے۔ لسمل صاحب سے
ات ہو تو میرا سلام اشتیاق فقط مخلص دلی محمد مہدی

) ناگپور - ۴ - ۸ - ۴۷ء ۱۹ ء - کرم ادب نواز خان صاحب - کرم نامہ نے ممنون کیا - ایک ہفتے
، میں حیدرآباد جانے کے لیے کوشش کر رہا ہوں - سرکاری کام سے غالباً مجھے یہاں سے جلد نکلنا ہوگا۔
ناءاللہ اگست کے تیسرے یا چوتھے ہفتے میں آپ کو یہاں تشریف لانے کی زحمت دونگا لیکن شرط
ہوگی کہ آپ اپنے مکان کے باہر نکلنے کے وقت سے مکان واپس ہونے تک میرے مہمان ہونگے۔ یہاں ایک
ب سے آپ کو ملاؤنگا ان کو ادب میں دلچسپی ہے۔ وظیفا یاب ڈپٹی کمشنر ہیں۔ شاعری میں اکبر کا رنگ ہے۔
۷۵ سال کی ہے لیکن دو تین گھنٹے اپنا کلام سناتے نہیں تھکتے۔ آپ کا رسالا آزمائشی لفافا واپس رسل
، میں نے مانا کہ آپ کی ہندستانی سبھی پڑھ لیتے ہیں، لیکن آپ لفافے پر دیکھینگے حیدر آباد ہی میں کسی نے
زبانی سے ناگپور انگریزی میں لکھ دیا ہے۔ حیدر آباد کی حد تک اور دوسرے بڑے شہروں کے اردو میں پتا
فا ہی ٹھیک ہو تو انگریزی بھی صحیح ترسیل کی ضامن ہو جاتی ہے، ورنا کوئی آزمایش کی کوشش میں خط تلف
رے حیدرآباد میں میرے خطوں کے اوروں کے پاس اور دوسروں کے خطوط کے میرے پاس آنے کا سلسلا
برسوں سے قایم ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حیدرآباد کے ٹپا رساں تو انگریزی ہی ٹھیک پڑھتے رہا۔ مہدی ہندستانی۔
مید کہ آپ ہمہ وجوہ خیریت سے ہونگے دو چار روز میں حیدرآباد آتا ہوں اور وہاں فرصت ملی تو آپ
سے ضرور ملونگا فقط - مخلص محمد مہدی

(۱۱) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۳ر جنوری ۱۹۵۱ء - خدمت جناب جی۔ ام، خان صاحب -
براہ کرم حسب ذیل اداروں اور اشخاص کے نام سردست ایک مہینے کے لیے وطن روزانا (زیرا جرائی)
جاری فرمایا جائے۔

(۱) انجمن امداد علمی خواتین و اطفال قریب گھاٹ بازار
(۲) حیدرآباد اگریکلچرل کوآپریٹو اسوسیشن ہاکا ہاوز روبروے باغ عام
(۳) بنجارا اسکول حسینی میموریل بنجارا ہلز
(۴) بنجارا کلب بنجارا ہلز مطیع اعظم ہا
(۵) سید محمد مہدی مہدی نواز جنگ بنجارا ہلز
(۶) کرنل سید عباس مہدی بنجارا ہلز
(۷) سید ہاشم مہدی صاحب بنجارا ہلز
(۸) سید محمد مہدی صاحب بنجارا ہلز
(۹) سید لطیف مہدی صاحب بنجارا ہلز
(۱۰) مس مہدی سندی بنجارا ہلز فقط راقم۔ سید محمد مہدی مہدی نواز جنگ

(۱۲) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۵ر فروری ۱۹۵۲ء - مشفقی - کرم نامے نے ممنون کیا۔ میں نے غالباً
جمعہ کے ساتھ تاریخ بھی لکھدی ہے، اگر نہ لکھا ہو تو وہ جمعہ ۲۸ر فروری کا ہے۔ آپ کے مکان پر جمعہ
۲۸ر فروری کو ۱۱ بجے موٹر پہنچ جائے گی، آپ کے ساتھ آپ کے شاعر دوستوں کو لانیکا خیال خوشگن
(خوش کن) ہے۔ ندیم صاحب سے بات کرلی ہے۔ فقط۔ مخلص دلی محمد مہدی

(۱۳) انگریزی خط کا ترجما - بنجارا ہلز - حیدرآباد دکن - مائی ڈیر خان صاحب ۲۸ر فروری ۱۹۵۱ء
آپ کے ۲۳ر فروری ۱۹۵۱ء کے خط کا شکریا ادا کرتا ہوں۔ مجکو سخت افسوس ہے کہ اپنی علالت کے باعث

آپ کے خط کا جواب آج سے پہلے نہ دے سکا۔ مجکو یقین ہے کہ آپ نے حیدرآباد ومینس اینڈ چلڈرنس اسوسی ایشن کا سالانا چندا وصول کرلیا ہوگا۔ میں اس خط کے ساتھ آپ کو ۔/120 Rs کا ایک چک بھجوا رہا ہوں۔ یہ سالانا چندا میرا، مس نندی، بنجارا اسکول اور بنجارا کلب کا ہے۔ آپ نے مجکو لکھا ہے کہ مس نندی، سکریٹری بنجارا کلب اور ہیڈ مسٹرس بنجارا اسکول نے رسالا واپس کردیا تھا۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہیں آپ کا رسالا پہنچا ہی نہیں۔ میں خود بھی یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ آپ کا رسالا مجکو بھی پابندی سے نہیں مل رہا ہے۔ مجکو یقین ہے کہ یہ بدانتظامی بہت جلد دور ہوجائے گی۔ میں حیران ہوں کہ آپ نے میرے لڑکے ہاشم مہدی سکریٹری حیدرآباد اسٹیٹ بینک کے نام رسالا جاری کرنے سے کیوں انکار کردیا؟

آپ کا مخلص حقیقی مہدی نواز جنگ

(۱۴) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۷ - ۹ - ۱۹۵۲ء - کرمی جناب خاں صاحب تسلیم۔
آج میں دورہ سے آیا ہوں - دفتر سے کیمپ میں جاؤنگا - آج فرصت نہیں ہے، کل بھی نہیں ہے - جمعہ کی صبح سوا دس بجے آپ تشریف لائیں تو مناسب ہے - مخلص محمد مہدی

(۱۵) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۰ - ۱۲ - ۱۹۵۶ء - مشفقی خاں صاحب - امید کہ آپ ہر طرح خیریت سے ہونگے۔ مجھے آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میں نے رخصت کی درخواست کی ہے عملاً رخصت ہی پر ہوں، جس کسی روز آپ کو فرصت ہو تو تشریف لایئے۔ آپ اور لیبل صاحب کوئی دن مقرر کرلیں، افضل گنج سے صبح ۷ بجے ½ ۸ بجے ½ ۱۰ بجے جوبلی ہلز کی بس نکلتی ہے۔ غالباً تیسری بس آپ کے لیے موجب سہولت ہوگی۔ یہ بس میرے مکان کے قریب تک آتی ہے دوپہر کا کھانا بنجارا ہلز پر ہو تو بڑی خوشی ہوگی، اگر ۵ ار آبان پیر کا دن مقرر کیا جائے تو مناسب ہے، اس توقع پر کہ آپ تشریف لائینگے آپ کے رسالا دو لفافے جو محفوظ رکھے گئے ہیں مرسل خدمت ہیں، اور ایک لفافا انگریزی کا مرسل خدمت ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنے میں دلچسپی ہوتی آیا اس دفتر میں کوئی کارِ ومد اسسٹاپ نہیں ہیں - امید کہ آپ تشریف لاسکیں گے باقی بالمشافہ فقط - مخلص دلی محمد مہدی

(۱۶) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۵ - ۵ - ۱۹۵۶ء - کرمفرمائے بندا زاد اشفاقکم
آپ سے ملنے کو ایک عرصے سے فرصت کی تلاش کررہا ہوں، کئی مرتبہ مولوی محمد عبدالرحمان صاحب رئیس سے ملاقات ہوئی، ان سے خواہش کی جس کسی روز وہ اور آپ آسکیں مجھے اطلاع دیدیں اور میرے مکان پر ہم کلامی اور ہم طعامی کی صحبت ہوجائے۔ عبدالرحمان وعدا کرتے رہے میں خود ہی آپ پاس آنے کی اکثر کوشش کرتا رہا مگر نہ ہوسکا۔ آپ کے سابقا عنایت نامے کے لیے ممنون ہوں اس کا جواب بھی بالمشافا ادا کرونگا اور اس خط کا جواب بھی بالمشافا میرے تاثرات کو اسوقت تک کسی قسم کی جنبش اس لیے نہیں ہوئی ہے۔ اخباری اطلاعات کو میں اہمیت نہیں دیتا اگر اخباری اطلاع صحیح ہی ہو تو بات ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اگر خیرات نرسیم صاحب جج سے کل صبح دس بجے ملیں تو مناسب ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ جمعہ ۹ ار فروری کو دوپہر میں آپ میرے ساتھ ہم طعام ہوں۔ آپ کے مکان پر موٹر بھیجدونگا آپ دفتر آجائینگے اور میرے ساتھ مکان پر چلیں گے۔ براہ کرم اس کا جواب بھی کل صبح روانا فرمائے فقط بہت جلدی میں

مخلص دلی محمد مہدی

(۱۷) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۲۷ - ۵ - ۱۹۵۶ء - شفقی - سلام علیکم - کل ۲۸ ار فروری کی دوپہر میں آپ کو میرے مکان پر آنے کی دعوت دی تھی - آج شام یا ار یا سے دو مشیر ساز جنکا تعلق حیدرآباد قایم ہونے والے ایک بڑے کارخانے سے ہونے والا ہے ایک دن کے لیے آرہے ہیں - کل صبح دس بجے ایک اور بارا بجے دوسری کمیٹی مقرر ہوئی ہے - مجھے امید نہیں ہے کہ دو ڈیڑھ بجے سے قبل یہ کمیٹی ختم ہوسکے گی،

اور پھر چار بجے ایک کمیٹی بھی ہونے والی ہے، اگر میں آپ سے درخواست کروں کہ بجائے کل ظہر کے ۲۶ اردی بہشت
کو شام میں تشریف لائیں تو کیا آپ کو یہ تبدیلی قبول ہوگی۔ میری مجبوری اور آپ سے ملاقات کے اشتیاق کے
مدنظر امید کہ آپ ۲۶ اردی بہشت کو ضرور تشریف لا سکیں گے، اگر یہ تجویز پسند خاطر نازک ہو تو آپ کے مکان پر شام
کے چھ بجے سواری حاضر ہو جائے گی، مولوی عبدالرزاق صاحب قیصل کو بھی آپ ساتھ لا سکیں تو مناسب ہے۔
اگر ۲۶ر کی شام موافق نہ ہو تو ۵ر یا ۶ر کی شاموں سے کوئی ایک شام مقرر کرکے اطلاع دیدیں تو مناسب ہے فقط۔

مخلص محمد مہدی

(۱۸) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۲ - ۶ - ۱۹۵۶ء - کرم فرمائے بندہ خان صاحب!

کرم نامہ ملا - چپراسی نے کہا تھا کہ آپ نے ۱۶ر تاریخ مقرر کی ہے حسب دلخواہ لیا گیا - حسب قرار داد
سواری حاضر ہو جائے گی فقط - محمد مہدی

(۱۹) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۳۰ - ۷ - ۱۹۵۷ء - کرم فرمائے بندہ خان صاحب!

آج دوسری بس سے آپ آنے والے تھے آپ کا انتظار رہا، آپ کے لیے ٹھہرانے کا بھی انتظام تھا کہ آپ کھانے کے
بعد دوپہر کی بیدر کی بس سے جا سکیں۔ نہ معلوم کیا مجبوری ہوئی کہ آپ نہ آ سکے۔ آپ کے لیے کتابوں کی تلاش برابر
جاری ہے۔ حیدرآباد میں میڈوز ٹیلر کی کوئی بھی کتاب کسی بھی دکان میں نہیں ہے۔ بمبئی کو لکھوایا ہوں امید کہ
آپ خیریت سے ہوں گے۔ فقط - مخلص محمد مہدی

(۲۰) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۲ - ۹ - ۱۹۵۷ء - مکرمی خان صاحب زاد لطفہ - سلام علیکم!

آپ کے حسب خواہش جرمن خط اور اس کا ترجمہ ملفوف ہے۔ مترجم کی تلاش تھی۔ کچھ وقت صرف
ہوا - اس ترجمے کو ذریعے رجسٹری روانہ کر رہا ہوں، جس آدمی کو آپ کا مکان معلوم تھا وہ اب ہمارے پاس
نہیں ہے - آپ کی فرمائش کے ٹکٹوں کی تلاش دشوار ہے میں اس زبان سے ناآشنا ہوں کسی سرکاری
دفتر میں ہوتا تو ضرور انتظام کر دیتا - اب بھی کوشش کروں گا کہ کوئی بھلا مانس خیال میں آ جائے تو اس سے
یہ کام لوں - کبھی فرصت ہو جائے تو ٹیلیفون دیکر ضرور تشریف لائے - آپکا مخلص دلی محمد مہدی

(۲۱) بنجارا ہلز - حیدرآباد - ۱۲ - ۵ - ۱۹۵۹ء - کرم فرمائے بندہ خان صاحب -

میں چار روز قبل ایک جلسے میں ۶-۹-۵۸ میں تھا آپ کے بھائی سلیم خان صاحب سے ملاقات
ہوئی تھی - اسوقت اور اسکے بعد بھی آپ یاد آتے رہے - مجھے سخت انفلوئنزا ہو گیا تھا ۱۰۴، ۱۰۵ تک
حرارت ہوتی تھی چند روز تک پریشان رہا - اب اچھا ہوں کام کر لیتا ہوں، البتہ بہت کمزور ہوں علاج کچھ
بھی نہیں ہے دواؤں سے پرہیز کرتا ہوں، سادہ غذا کو موثر علاج خیال کرتا ہوں - آپ کا دل سے متشکر ہوں
اور خیریت کا خواہاں - نیاز مند محمد مہدی مہدی نواز جنگ -

(۲۲) آفس آف دی سکریٹری ٹو دی گورنر راج بھون - احمدآباد - الوٹس - نمبر ۶۱ - S O ۵ر مئی سنہ ۱۹۶۰ء

منجانب سکریٹری ٹو دی گورنر آف گجرات ٹو دی ایڈیٹر "ہندستانی ادب"، حیدرآباد -

ڈیر سر - آپ کے ماہوار رسالے "ہندستانی ادب" کی ایک کاپی میرے نام جاری فرمائیے، اس کا
سالانہ چندہ بعد میں روانہ کر دیا جائے گا -

مہدی نواز جنگ
گورنر گجرات - راج بھون
شاہی باغ - احمدآباد - ۱

(۲۳) انگریزی خط کا ترجمہ - الیڈم نمبر (۶۰۱) ۷ر اگست سنہ ۱۹۵۹ء

میرا پوزیشن نویسوا اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی بھی اخبار یا رسالے کو اشتہار دوں، اس
لیے میں اپنی مجبوری پر اظہار افسوس کرتا ہوں کہ آپ کی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ مجھکو امید ہے کہ
آپ میرے مطلب کو بخوبی سمجھ گئے ہوں گے!

آپ کا مخلص مہدی نواز جنگ

(۲۴) انگریزی خط کا ترجما ریفرنس نمبر (۶۰۲) ۸ راگست ۱۹۵۹ء

مہدی نواز جنگ منسٹر کو آپریٹیو اینڈ ہاوزنگ گورنمنٹ آف آندھرا پردیش حیدرآباد

ڈیر مسٹر جی - ام - خان!

مجھکو آپ کا لیٹر نمبر (۹۵۳) مورخہ ۳۱-۷-۱۹۵۹ء ملا - آپ نے اپنے مکان نمبر ۹۹-۱
اعظم پورا شرقی کی چھت میں خرابی کی نسبت شکایت کی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے مکان کے باہر کی
دیواریں بوسیدا اور ناقص ہوگئی ہیں - میں نے آج ہی ہاوزنگ بورڈ کے ایگزیکیٹو انجینیر لکھا ہے کہ وہ
آپ کے مکان کا فوری معائینا کرنے کے بعد فوری تعمیر اور ترمیم کی طرف توجہ کریں - اگر عہدے داران متعلق
جلد ہی اس فوری ترمیم کی طرف توجہ نہ دیں تو براہ کرم آپ مجھکو پھر سے لکھیے -

آپکا مخلص

مہدی نواز جنگ

(۲۵) انگریزی خط کا ترجما گورنر کی سیل ٹوٹ گئی / اب بجاؤ ستار سے

شخصی (پرسنل)

مہدی نواز جنگ

گورنر گجرات - راج بھون احمد آباد ۸ ار جون ۱۹۶۰ء

ڈیر مسٹر جی - ام - خان!

میرے گورنر گجرات بننے کے سلسلے میں آپ نے مجھکو دلی مبارکباد دی ہے، اس کے لیے آپ کا تہہ
دل سے ممنون ہوں -

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص

مہدی نواز جنگ

اس ٹائپ کے لیٹر پر بازو کے حصے میں ہاتھ سے لکھا ہے - میں جب حیدرآباد آؤنگا آپ سے ضرور ملونگا -

مہدی

(۲۶) انگریزی خط کا ترجما گورنر کی سیل ٹوٹ گئی / اب بجاؤ ستار سے

مہدی نواز جنگ

گورنر گجرات - راج بھون - احمد آباد شخصی (پرسنل) ۲۲-۱-۱۹۶۰ء

مائی ڈیر خانصاحب!

مجھکو آپ کے دو خطوط ملے ہیں، اور اس کے ساتھ دوسرا لیٹر پیپر بھی تھا - آپ نے مجھکو بھلایا نہیں، بلکہ یاد رکھا
ہے اس کے لیے میں آپ کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں - گورنر کی حیثیت سے یہاں پر میرا پوزیشن نہایت
نازک ہے، اور یہ پوزیشن مجھکو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں، سرکاری یا غیر سرکاری کسی بھی شخص سے
آپ کے رسالے کے لیے اشتہارات کی نسبت کہہ سکوں - اس لحاظ سے اس سلسلے میں آپ کی بتائی ہوئی
مہم سے مجھکو معاف رکھا جائے - میں آپ کے علمی ادبی کام کی دل سے قدر کرتا ہوں، اس لیے مستقبل قریب
میں، میں خود اپنی طرف سے شخصی امداد آپ کے رسالے "ہندستانی ادب" کے لیے روانا کروں گا۔

نیک تمناؤں کے ساتھ
آپ کا مخلص
مہدی نواز جنگ

نوٹ : ہم نے ۲۹ - ۱۰ - ۱۹۶۰ء کو یہ جواب دیا کہ ہم نے آج تک کبھی کسی بھی شخصی امداد نہیں لی ہے، اس لیے آپ کی شخصی امداد لینے سے بھی مجبور ہیں، ایڈیٹر -

(۲۷) انگریزی خط کا ترجما

گورنر کی سیل ڈوٹ لی
ب تماکو مناسب ---- ہے

مہدی نواز جنگ
گورنر گجرات - راج بھون - احمداباد
شخصی (پرسنل)
۱ - ۱۱ - ۱۹۶۰ء

مائی ڈیر خانصاحب !

میں آپ کے ۲۹ - ۱۰ - ۱۹۶۰ء کا شکریا ادا کرتا ہوں -

جہا تک مجکو یاد پڑتا ہے "صبا" ماہوار رسالے کو صرف پچاس روپے یا زیادا سے زیادا ایک سو روپے کی امداد نہیں دی گئی اور وہ رقم بھی آزاد میموریل فنڈ سے دی گئی تھی -

خانصاحب ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ I.C.S.W (انڈین کانفرنس آف سوشل ورک) کے مالی حالات کچھ بہتر نہیں ہیں - چندوں اور عطیوں سے جو بھی رقم آتی ہے، وہ صرف ضروری ضروری کاموں پر صرف کی جاتی ہے - اس کا باقاعدا حساب رکھا جاتا ہے، اور آڈیٹنگ بھی کروائی جاتی ہے - آپ بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ میں فطری طور پر حساب کتاب کے معاملے میں بہت زیادا سخت اور اصولی ہوں - خانصاحب ! اس بارے میں اور زیادا کہنے کی کیا ضرورت ہے، اس لیے کہ میری اصول پسندی حساب فہمی کے بارے میں آپ خد بھی تو مجکو بہتر طریقے سے جانتے ہیں !-

میں جہاں کہیں بھی رہا ہوں، اور جس خدمت پر بھی رہا ہوں ایک انسان کی حیثیت سے میں نے اپنے مفوضا فرائض، بہتر طریقے پر انجام دیے ہیں - یہی وجہ ہے کہ آج تک ایک شخص نے بھی مجھ پر نکتا چینی نہیں کی - میں نے اپنے پچھلے لیٹر میں یہ لکھا تھا کہ یہاں پر میرا پوزیشن نہایت ہی نازک ہے، وہ بلکل حقیقت پر مبنی ہے - میرے تعلقات عوام اور سرکاری افراد سے ایسے آزادانا نہیں ہیں، جیسے کہ حیدرآباد میں تھے - بحیثیت گورنر مجکو ہر وقت محتاط رہنا پڑتا ہے، اور میں کسی شخص سے بھی بے تکلفانا اور آزادانا طور پر نہ ہی مراسم رکھ سکتا ہوں اور نہ بات چیت کر سکتا ہوں - میں نے اپنے سابقا لیٹر میں اپنے اسی نرمے دارانا اور نازک پوزیشن کی طرف اشارا کیا تھا، جن کی وضاحت اس وقت بھی ضروری سمجھی، تاکے میرے بارے میں آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہو - خان صاحب ! میں نے حیدرآباد کے ایک مقامی اخبار میں یہ خبر دیکھی ہے کہ نواب بشارت علی خان مرحوم فرزند نواب عنایت علی خان ساکن چینچل گڑ کی لڑکی کی شادی ہوئی ہے - آیا یہ وہی دولے خان دیوڑی والے نواب ہیں، اور یہ کہ ان کے نام کے ساتھ سے (مرحوم) لکھدیا گیا ہے ؟ میں ممنون ہونگا آپ اس بات کی تحقیق کر کے اپنے آیندا خط میں مجکو بھی مو اطلاع ضرور دیں !

[redacted]

آپ کا مخلص
مہدی نواز جنگ

نوٹ : نواب مہدی نواز جنگ بہادر سے نواب بشارت علی خان مرحوم ساکن دولے خان دیوڑی چنچل گوڑہ کے تعلقات بہت اچھے تھے، اسی بنا پر مہدی نواز جنگ کے گورنر گجرات بننے کے بعد نواب بشارت علی خان نے اپنی دیوڑی واقع چینچل گوڑا میں ایک شاندار تقریب کی تھی، جس میں کئی سو معززین شہر شریک تھے - دعوت کا غیر معمولی انتظام کیا گیا تھا، جس سے ہر شخص متاثر تھا، اور خد مہدی نواز جنگ بھی خوش ہوئے بغیر نہ رہے

کسی نے سے پہلے نواب صاحب کی گلپوشی کی تھی۔ یہ زبردست اور لاجواب ہار اس سستے زمانے میں پچاس روپے سے کم کا نہ ہوگا۔ تقریب کے ختم پر اپنی کار میں جنگل گوڑا سے سیدھے ہمارے مکان اعظم پورا شریف چلے آئے۔ چاندنی رات تھی، اس لیے فٹ پاتھ پر آرام کرسیاں ڈالے ہم دو حضرات کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نواب صاحب کی کار آکر رکی اور ہم نے اٹھ کر ان کی کار کا دروازہ کھولا، خوش آمدید کہتے ہوئے ہم نے کہا کہ یہ آدھی رات گئے آپ ادھر کیسے چلے آئے؟ ایک زبردست پھول کا ہار لیے کار سے باہر نکلے اور مسکراتے ہوئے ہمارے گلے میں ڈالدیا۔ ہار نکالتے ہوئے ہم نے کہا، یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ جب میں پچھلی دفعہ آپ کے گھر آیا تھا تو آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ گورنر گجرات بن گئے ہیں، جس کے جواب میں، میں نے کہا تھا کہ میں خود بھی خبریں سن رہا ہوں، لیکن میرے نام نامزدگی کے سرکاری احکام نہیں آئے ہیں۔ آپ سے ملنے کے کچھ ہی عرصہ بعد احکام آگئے تھے، چنانچہ اس خوشی میں نواب بشارت علی خان نے آج بڑی شاندار دعوت کی تھی، اور یہ زبردست ہار بھی پہنایا تھا، مگر چونکہ اس ہار کے حقیقی مستحق آپ ہیں، اس لیے میں آپ کے لیے یہ ہار لے کر چلا آیا۔ ہم نے کہا کہ اس ذرہ نوازی کے سلسلے میں ہم آپ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس ہار کی حقیقی مستحق ہماری بہن آپ کی بیوی ہیں، اس لیے یہ ہار ہماری طرف سے انہیں پہنچا دیجیے۔ ہار دینے کے بعد ہم بری طرح سے ان کے گلے کا ہار بن گئے اور کچھ دیر تک بار بار ان کے گلے چمٹ چمٹ کر مبارکباد دیتے رہے۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی مبارکباد دی۔

ہم نے خط کے ذریعے نواب صاحب کو اطلاع دی تھی کہ بشارت علی خان کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ غلط نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا!

(۲۸) انگریزی خط کا ترجمہ

گورنر کی سیل

مہدی نواز جنگ
گورنر گجرات - راج بھون - احمد آباد   شخصی (پرسنل)
۲۱ - ۱۱ - ۱۹۶۲ء

مائی ڈیر خان صاحب!

جیسا کہ آپ کا خیال ہے کہ آپ کے شخصی لیٹرس کا جواب میں خود اپنے قلم سے لکھ کر دوں تو آپ یقین جانیے کہ نہ معلوم کب تک آپ کا لیٹر پوسٹ ہونے سے محروم رہے گا اور اگر میں اپنے P.A. کو ڈکٹیٹ کروا دوں تو ٹائپ ہو کر ایک گھنٹے بھر میں پوسٹ ہو جائے گا اس لیے میں نے اس بعد کے طریقے کو ترجیح دی ہے، اور جب کبھی آپ کے خط کا جواب دینا ہو اپنے P.A. کو بلوا کر ڈکٹیٹ کروا تا ہوں۔

آج صبح مجھکو "ہندستانی ادب" کا (۲۳) ویں سالگرہ نمبر ملا۔ میں آپ کو "ہندستانی ادب" کی (۲۳) ویں سالگرہ پر مبارکباد دیتا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ سخت اور کٹھن مالی مشکلات کے باوجود آپ رسالے کو پابندیٔ وقت کے ساتھ چلائے جا رہے ہیں۔ میں نے رسالے کے ایڈیٹوریل میں یہ خبر دلچسپی کے ساتھ پڑھی کہ آپ نے "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو باخبر کیا ہے کہ رجسٹریشن نمبر منسوخ ہونے کے باوجود آپ پورے پوسٹیج کے اخراجات کے ساتھ رسالے کو ہر مہینہ پابندیٔ وقت کے ساتھ پوسٹ کیے جا رہے ہیں۔ میں آپ کے اس کھلے اعتراف کی دل سے قدر کرتا ہوں کہ آپ نے پوسٹ آفس پر کوئی الزام عاید نہیں کیا، بلکہ صاف طور پر لکھدیا ہے کہ بھول یا غلطی خود آپ سے ہوئی تھی، اور مقررہ تاریخ کے اندر آپ نے رجسٹری کے لیے درخواست نہیں دی تھی۔ میں خود بھی ایسے کھلے اور صداقت آمیز اعتراف کا قایل ہوں، اور خود میں نے کئی ایک مواقع پر اس کا عملی ثبوت بھی دیا ہے۔ میرا ارادہ آیندہ جنوری کے مہینے میں حیدرآباد آنے کا ہے۔ اگر میں حیدرآباد آؤں تو ضرور بضرور آپ کے گھر آؤنگا! نیک تمناؤں کے ساتھ۔

آپکا مخلص حقیقی مہدی نواز جنگ

(۲۹) بنجارا ہلز ۔ حیدر اباد ۔ (اے۔پی) ۱۲ ۔ ۸ ۔ ۱۹۶۶ء

مہربان کرم فرما جی ۔ ام۔ خان صاحب زاد علم و فکرہ ۔ تسلیم!

اس خط کی ابتدا آپ کی جفا کشی کی قدر سے کرتا ہوں آپ کی جفا کشی میں آپ کی بلاکشی بھی شریک ہے جس کے لیے آپ زحمت کی پروا کیے بغیر محنت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ آپ اللہ کے فضل سے دھن کے پکے واقع ہوئے ہیں اس لیے ہراساں نہیں ہوتے اور اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے سلور جوبلی نمبر "ہندستانی ادب" کی نسبت رائے طلب کی ہے "سلور جوبلی نمبر ہندستانی ادب" ایک اچھا ڈائیجسٹ ہے جہاں تک کہ میں نے اپنی پسند کے مضامین کا اپنی فرصت کے لحاظ سے مطالعہ کیا میرا وقت اچھا گذرا اور میرے معلومات میں بھی شاید کچھ اضافہ ہوا۔ "ہندستانی ادب" کی اردو و ہندی ملی جلی زبان میں مزید ترقی چاہیے کہ گاندھی جی کے مقصد کی تکمیل ہو، میں ایک اوسط معلومات کا انسان ہوں اور ادبی ذوق بھی نہیں رکھتا البتہ ایسی کتابیں یا رسالے ضرور پڑھتا ہوں جن سے مسایل کے سمجھنے میں مدد ملے یا معلومات میں اضافہ ہو۔ آجکل انگریزی میں میرے پسند کے حسب ذیل میگزین ہیں "کارون" "امیرمنٹ" "ڈائیجسٹ وغیرا۔

اللہ آپ کو خوش رکھے ۔ مخلص مہدی نواز جنگ

(۳۰) انگریزی خط کا ترجما ۔

نقابی آفس ۔ ۳ ۔ ۲ ۔ ۸۶۴ / ۱۲ ۔ سلطان بازار ۔ حیدر اباد ۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۶ء

ڈیر شری جی ۔ ام ۔ خان ۔

مقامی کمیٹی ہندستانی پرچار سبھا کے چیرمن کی حیثیت سے میں آپ کو سبھا کی جنرل میٹنگ میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں ۔ یہ کمیٹی اتوار ۱۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو شام کے ۵ بجے ٹورسٹ ہوٹل ۔ کاچی گوڑا کی پہلی منزل میں منعقد ہوگی ۔

آپ خود بھی اپنے رسالے "ہندستانی ادب" کے ذریعے کئی سال سے ہندستانی زبان کی سیوا کر رہے ہیں۔ ہماری کمیٹی بھی ۱۹۳۸ء سے برابر ہندستانی زبان کا پرچار کر رہی ہے۔ چونکے آپ کا اور ہمارا مقصد بلکل ایک ہی ہے اس لیے مجکو کامل یقین ہے کہ آپ ضرور بضرور اس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت فرماکر ممنونیت کا موقع دینگے !

آپ کا مخلص

مہدی نواز جنگ

چیرمن ہندستانی پرچارنی سبھا حیدر اباد

(۳۱) مہدی نواز جنگ انگریزی خط کا ترجما بنجارا ہلز - حیدرآباد

ڈیر مسٹر جی - ام خان ہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۶۶ء

میں آپ کے تینوں خطوط کا شکریا ادا کرتا ہوں

(۱) نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ سے آپ کے رسالے کے لیے مالی امداد کے بارے میں یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ اس ادارے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے - میں آپ کو یہ مشورا دونگا کہ آپ چیرمن ٹرسٹ کے نام ایک ایسا ہی خط لکھ کر اپنے رسالے کی ایک کاپی کے ساتھ بھجوا دیجیے -

(۲) میں جس وقت سوشل ویلفیر فنڈ کا چیرمن تھا، مس روڈا مستری نے میرے تحت ایک طویل عرصے تک کام کیا تھا، مگر بعد میں اس نے مجکو ملکل ہی بھلا دیا - گجرات کی گورنری کے ختم پر جب میں گھر واپس آیا تو میرے لڑکے کی موت پر پرسا دینے کے لیے وہ صرف ایک بار میرے گھر آئی تھی اور اس کے بعد پھر کبھی نہیں آئی - ایسی احسان فراموش عورت میں کیسے اور کیونکر آپ کے رسالے کے لیے سفارش کر سکتا ہوں ؟

(۳) میں نے فلم اسٹوریس کے سلسلے میں آپ کا پرنٹڈ پرڑا تھا - گجرات میں مجکو کسی بھی فلم پروڈیوسر سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا - میں آپ کی قلمی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ نے محنت سے فلمی اسٹوریس بھی لکھی ہیں - میری دلی آرزو ہے کہ آپ کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی ہو - آپ کا مخلص حقیقی

مہدی نواز جنگ

(۳۲۲) بنجارا ہلز - حیدر اباد (اے - پی) ۴ جنوری ۱۹۶۷ء

مکرم و مہربان جوشیلے جی - منچلے ام خان صاحب - آپ کی مخلصانا کوششیں مشکور ہوں تسلیم کرم نامہ پہلی جنوری کا ابھی ملا - خط پڑھنے سے خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی، خوشی اس بات کی ایک سچے کام کرنیوالی ہستی کی امنگیں اس خط میں عیاں ہیں - دکھ اس بات کا کہ آپ پچیس برس سے اپنی اسکیم کو آگے بڑھانے میں قدم قدم پر رکاوٹوں سے مقابلہ کر رہے ہیں، میں کہہ سکتا ہوں آپ بڑی حد تک کامیاب ہیں، یہ واقعہ ہے "ہندستانی ادب" بجائے خود ہندستانی میں نہایت دلچسپ ڈائجسٹ ہے آپنے ڈھونڈ اور تلاش سے کام کے مضامین اسمیں فراہم کیے ہیں - آپکے سو صفحے والے خط کا جواب دینے کے لیے جی - ام خان کا قلم اور انکا زور قلم کہاں سے لاوں - آجکل میں احتیاطوں میں گھرا ہوں لکھتا کم ہوں بولتا کم ہوں سنتا کم ہوں، کبھی کچھ پڑھ لیتا ہوں کسی پسند کی جگہ جانے کو مجبور کیا جاوں تو کچھ بولدیتا ہوں -

آپ کے لیے گذشتہ مرتبہ چائے لانا بھول گیا تھا اگلی حاضری میں چائے اور خشک دودھ ساتھ لاونگا اور آپکے ساتھ ہلکی چائے پیونگا - پاپیاں ملجائیں تو ساتھ لاونگا، اور آپ کا خط بھی بالمشافہ آپ کے سوالوں کا جواب بھی دونگا - چہارشنبہ ۱۱ جنوری کو صبح گیارہ بجے آپ پاس حاضر ہونگا - حاضری کا وقت صبح کا ہے، اس لیے چائے بھی پیونگا اور کھیر بھی پیونگا بشرطیکہ ہلکی ہو اور کم میٹھی ہو -

تعارفی ایک خط بھی اپنے ساتھ لاونگا جو بلدیا کے میئر احمد آباد کے نام ہوگا -

یہ ملاقات تنہائی کی ہو تو بہتر ہے فقط

آپ کا عاجز قدرداں
مہدی نواز جنگ

REGD. No. H.16.

HINDUSTANI-ADAB

SADATH VILLA, 16-11-17, SALEEMNAGAR
COLONY-1, MALAKPET,
HINDUSTAN LTD

HYDERABAD-36, (A.P)

INDIA.

EDITOR,

G.M. KHAN

M.A. (OSMAN.)